فہرست مضامین

بزم تیموریہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیباچہ

تیموری سلاطین رزم و بزم دونون میدانون کے مرد تھے، وہ جس درجہ کے فاتح و کشورکشا تھے اسی درجہ کے علم پرور اور ادب نواز بھی، وہ ترکی اور فارسی دونون مین اور آخری دور کے بادشاہ اردو مین بھی کمال اور شعر و ادب کا نہایت بلند اور ستھرا مذاق رکھتے تھے، اور اس کے نکتہ سنج نقاد تھے، جیسا کہ ان کی نظم و نثر اور تذکرون کے بیانات سے ظاہر ہے،

ان کے دور مین ہنگامۂ کارزار کے ساتھ علم و ادب کی محفل بھی گرم تھی، انکا دربار ہر فن کے اصحاب کمال اور علماء و شعراء کا مخزن تھا، اور انکی سرپرستی مین بہت سے علمی و ادبی کام انجام پائے لیکن اس زمانہ مین تاریخ نویسی کا مذاق ایسا تھا کہ مورخین سارا زور قلم فتوحات اور کشورکشائی کی داستان سرائی مین صرف کردیتے تھے، اور علم و ادب کے حالات کی جانب انکی توجہ کم رہتی تھی، تاہم اس دور کی تاریخین انکے ذکر سے یکسر خالی بھی نہین ہین لیکن بزم کے مقابلہ مین انکے نقوش اسقدر دھندلے اور پراگندہ ہین کہ ان سے انکا پورا مرقع نظر نہین آتا،

تیموری سلاطین کی رزمیہ داستانین تو بہتون نے سنائی ہین لیکن انکی انجمن آرائی کے دلچسپ افسانے بہت کم لوگون نے سنائے ہین، اور گو ضمناً انکی ادب نوازی کے واقعات اور انکے عہد کے شعراء و ادباء کے متفرق حالات لوگون نے لکھے ہین لیکن ابتک پورے استیعاب کے ساتھ اس دور کا ادبی گلدستہ کسی نے تیار نہین کیا ہے، اسلیے دار المصنفین مین جب تاریخ ہند کی تدوین کا کام شروع ہوا تو خیال ہوا کہ تیموریون کے سیاسی و تمدنی حالات کے ساتھ انکی علم پروری اور ادب نوازی کا نقشہ بھی دکھایا جائے تاکہ ان کے کارنامون کا ہر رخ سامنے آجائے،

چنانچہ ہمارے رفیق سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب ایم اے نے جنکے متعلق تاریخ ہندوستان کے بعض حصے کیے گئے تھے، اس کام کو شروع کیا، اور معارف مین تیموری بادشاہون کے علمی ذوق کے عنوان سے مضمون کا ایک سلسلہ شروع کیا جو اتنا بڑھا کہ ایک کتاب کے بقدر ہوگیا، اسلیے اسکو مستقل کتابی صورت مین شائع کردینا مناسب معلوم ہوا، اسکی نظرثانی مین انھون نے بہت سے اور معلومات کا اضافہ بھی کیا ہے، اور اب اسکی ضخامت پہلے سے دوگنی ہوگئی ہے۔

تیموریون کے عہد کے علما و فضلا، اور شعرا و ادبا، اور انکے علمی و ادبی کارنامون کی فہرست بہت طویل ہے، اسلیے اس کتاب مین صرف ان ہی لوگون کو لیا گیا ہے جو انکے دربار سے متوسل تھے، اور انھی کا رنامون کو لکھا گیا ہے جو شاہان تیموری کی سرپرستی مین انجام پائے، ان مین بھی بہت سے شعرا کو طوالت کے خیال سے قلم انداز کردیا گیا ہے، بعض ممتاز شعرا، مثلاً فیضی، طالب آملی، نظیری، کلیم اور صائب وغیرہ پر اسلیے مختصر لکھا گیا ہے کہ انکی شاعری پر مفصل تبصرہ شعرالعجم مین موجود ہے، جس پر اضافہ ممکن نہ تھا، اور ان ہی کو دہرانا تحصیل حاصل تھا، بعض شعرا کے کلام کے انتخاب مین قصداً اختصار سے کام لیا گیا ہے، البتہ کہین کہین طویل قصائد بھی نقل کردیے گئے ہین کہ اس دور کی قصیدہ نگاری کا اندازہ ہوسکے،

اردو زبان کی ترقی مین تیموریون کا بڑا حصہ ہے لیکن یہ ایک وسیع موضوع تھا، اسلیے اس کتاب مین اس پر بحث نہین کی گئی لیکن محمد شاہ، شاہ عالم اور بہادر شاہ ظفر کی شاعری پر تبصرہ سے اسکا کسی قدر اندازہ ہو جائے گا،

بہرحال تیموری سلاطین کی علم پروری اور ادب نوازی کا یہ مرقع اصحاب نظر کی خدمت مین پیش ہے، اور ان کے نقص و کمال کا فیصلہ وہی کرسکتے ہین،

افسوس ہے کہ صحت کے اہتمام کے باوجود کتاب مین کتابت و طباعت کی غلطیان رہ گئی ہین جن کی صحت کے لیے آخر مین غلطنامہ لگایا گیا ہے، ناظرین تصحیح فرمالین،

سید سلیمان ندوی

۲۰ اگست ۱۹۴۳ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بابر

بابر نہ صرف ایک عدیم المثال سپاہی عظیم المرتبت فاتح اور اولوالعزم بادشاہ تھا، بلکہ ارباب بصیرت نے اس کو ایک بلند پایہ اہل قلم اور قابل قدر شاعر بھی تسلیم کیا ہے، وہ تیمور کی چھٹی نسل میں تھا، ترکہ میں میدانِ کارزار کی پامردی و شجاعت کے علاوہ علم و ثقافت سے شیفتگی و دلدادگی بھی پائی تھی، عام طور سے تیمور کو ایک ظالم اور سفاک فاتح سمجھا جاتا ہے، مگر اس کی یہ تصویر ان مورخوں نے کھینچی ہے جنھوں نے تعصب کی عینک لگا کر اس کا مطالعہ کرنے کی کوشش کی ہے، ورنہ ملک گیری اور کشور کشائی کی معرکہ آرائی کے ساتھ ساتھ اس نے علم فن کی انجمن آرائی بھی اسی طرح کی جس طرح ایک تاج و تخت کے مالک کو کرنا چاہیے، چنانچہ ارباب فضل و کمال خلوت و جلوت بلکہ میدان جنگ میں بھی اس کے ساتھ رہے، تزک تیموری میں خود اس کی زبان سے ہے کہ

"محدثین و ارباب اخبار و قصص کو میں اپنے پاس بلاتا، ان سے انبیاء، اولیاء، اور سلاطین کے قصے سنتا، سلاطین کے عروج و زوال کے واقعات معلوم کرتا، ان سلاطین کے قصے اور ان کی گفتار و کردار سے تجربے حاصل کرتا، اور دنیا کی تواریخ و آثار سے

مطلع ہوتا، مشائخ، صوفیہ اور عارفانِ خدا سے بھی ملتا، اور ان کی صحبت سے اخروی
فوائد حاصل کرتا، معرفت کی باتیں سنتا، ان کے خوارق عادت و کرامات کا مشاہدہ کرتا،
اور ان کی صحبت سے سرور حاصل کرتا تھا۔۔۔۔۔
میرا حکم تھا کہ جو لوگ سادات و علماء میں سے ہیں ان کا اعزاز و احترام کیا جائے،
ان کی ہر ضرورت کو پورا کیا جائے، ان کے ساتھ پوری رعایت ہو[1]

ملفوظات تیموری میں ہے:-
"جب میں تولمبہ پہونچا تو دریا کے ساحل پر خیمہ زن ہوا، تولمبہ ملتان سے قریب ہتر میل
کے فاصلہ پر واقع ہے۔۔۔۔۔۔ میرے وزراء نے تولمبہ کے باشندوں پر دو لاکھ روپے
کا تاوان عائد کیا تھا، اس کی وصولی کے لیے عمال بھی مقرر ہو گئے تھے، ان باشندوں میں
سادات بھی تھے، جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد میں سے تھے علماء اسلام بھی تھے،
جو وارث پیمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کہلاتے ہیں، سادات و علماء میرے دربار میں ہمیشہ تعظیم و
احترام کی نظروں سے دیکھے جاتے ہیں، اس لیے میں نے حکم دیا کہ ان سے تاوان نہ لیا جائے
بلکہ میں نے بلا کر خلعت اور عربی گھوڑے عطا کیے[2]

ملفوظات تیموری میں تیمور کی کشورکشائی اور جہانبانی کی کہانی خود اس کی زبانی ہے
جو اس کے دربار کے ارباب علم و دانش نے قلمبند کی ہے، **تزوک تیموری** میں ملکی و حربی نظم و نسق
کے ضوابط و قوانین ہیں، جو خود تیمور کی زبان سے ادا کیے گئے ہیں، ممکن ہے کہ مندرجۂ بالا اقتباسات
دربار کے اہل قلم کی حاشیہ آرائی سمجھی جائے، لیکن شرف الدین یزدی نے ظفر نامہ تیمور کی وفات
کے تیئیس سال بعد لکھی، اس میں مرقوم ہے:

[1] تزوک تیموری، مطبع فتح الکریم بمبئی، ص ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۲ [2] ملفوظات تیموری الیٹ، ج ۳ ص ۴۱۴

"صاحبقران کے ساتھ سفر اور حضر میں برابر سادات، علماء، فقہا، اہل فضل و دانش، بخشیان الیغود اور دبیران فارس رہتے تھے، فرمان شاہی کے مطابق وہ روزمرہ کے واقعات قلمبند کرتے، صاحبقران کے افعال و اقوال، ملک و ملت کے احوال اور ارکان دولت کے کوائف بڑی تحقیق کے ساتھ حیطۂ تحریر میں لائے جاتے، سخت حکم تھا کہ ہر واقعہ بغیر کسی تصرف اور اضافہ کے لکھا جائے، خصوصاً ذاتی اصالت و نجابت کے بیان میں کسی قسم کی رعایت یا مداہنت نہ ہو حتیٰ کہ صاحبقران کی شہامت و شجاعت کے ذکر میں بھی مبالغہ نہ ہو، چنانچہ اس حکم کو سامنے رکھکر اصحاب قلم و بلاغت واقعات کو نظم و نثر میں مرتب کرتے، یہ تحریریں صاحبقران کے سامنے پڑھی جاتیں اور وثوق کے ساتھ ان کی تصحیح ہوتی، اسی طرح ترکی اور فارسی میں وقتاً نثر اور نظم میں تالیف ہوتے، دربار کے بعض وابستگان واقعات کی تفتیش و تحقیق میں پوری کوشش کرتے.........[1]

تیمور ہندوستان میں محمود تغلق کے خلاف صف آرا ہوا تو شرف الدین یزدی کا بیان ہے کہ میدان جنگ میں ارباب کمال اور اصحاب علم اس کے جلو میں تھے،

در وقت تعیین مواضع سروران و اعیان مرحمت حضرت صاحبقران کہ در ہمہ حال شامل احوال اہل علم و کمال بودی از جمع علماء رفیع مقدار کہ ظفر کردہ در ملازم رکاب آنجا یلہ آثار بودند مثل خواجہ افضل پسر مولانا شیخ الاسلام سید جلال الحق والدین کشی و مولانا عبدالجبار پسر قاضی القضاۃ مولانا نعمان الدین خوارزمی.........[2]

ہر لڑائی کے بعد فتح و نصرت کی خوشی میں تیمور علماء و سادات کو انعام و اکرام سے مالا مال کرتا تھا،[3] دربار کے ایک جید عالم مولانا نظام الدین شامی نے تیمور کی فرمائش پر سادہ

---

[1] ظفر نامہ ج ۱ ص ۲۲، ۲۵، ۲۶۔ [2] ایضاً ج ۲ ص ۱۰۱۔ [3] ملفوظات تیموری، الیٹ ج ۳ ص ۴۷۵۔

اور سلیس فارسی میں اس عہد کی ایک تاریخ لکھی، اس کا نام بھی ظفر نامہ ہے، تیمور کی وفات سے ایک سال پہلے یہ تالیف ختم ہوئی۔[1] افسوس ہے کہ یہ ابھی تک زیور طباعت سے آراستہ نہیں ہوئی ہے۔

تیمور کی یہ علم نوازی اور علم پروری اس کی نسل میں برابر منتقل ہوتی رہی، تیمور کے پوتے الغ بیگ کی ہیئت دانی مشہور ہے، الغ بیگ کے دو لڑکے ممتاز شاعر اور نثر نگار تھے، بابر کے باپ عمر شیخ مرزا کو بھی یہ ثقافتی دولت میراث میں ملی، بابر نے اپنی تزک میں باپ کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:-

"ان کے اخلاق و اطوار یہ تھے حنفی مذہب اور خوش اعتقاد آدمی تھے، پانچوں وقت کی نماز پڑھتے تھے، قضائے عمری سب ادا کر دی تھی، بیشتر قرآن شریف پڑھا کرتے تھے، حضرت خواجہ عبید اللہ احرار کے مرید تھے، اکثر ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے حضرت خواجہ بھی ان کو فرزند کہا کرتے تھے، وہ خاصے پڑھے لکھے تھے خمسین (یعنی خمسۂ نظامی و خمسہ خسرو)، مثنوی (یعنی مثنوی جلال الدین رومی) اور تاریخ کی کتابیں ان کے مطالعہ میں رہتی تھیں شاہنامہ بہت دیکھا کرتے تھے، اگرچہ موزوں طبیعت رکھتے تھے، مگر شعر گوئی پر توجہ نہ کرتے تھے۔"[2]

عمر شیخ مرزا نے تاشکند کے مشہور چغتائی خان یونس خان کی لڑکی قتلق نگار خانم سے بھی شادی کی، اس کی ایک بڑی وجہ یونس خان کی علم دوستی بھی تھی، بابر قتلق نگار خانم ہی کے بطن سے تھا، یونس خاں کی ایک اور لڑکی خوب نگار خانم محمد حسین گورگان دغلت کے حبالۂ عقد میں آئی، اس سے ایک لڑکا حیدر میرزا دغلت تھا، جو تاریخ رشیدی کا مصنف ہے حیدر مرزا دغلت

[1] برٹش میوزیم کیٹلاگ (فارسی) ج ۱ ص ۱۷۰۔ [2] اردو تزک بابری مترجمہ میرزا نصیر الدین حیدر گورگانی ص ۷

اپنے نانا کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

"خان (یعنی یونس خان) مولانا شرف الدین علی یزدی کے ساتھ بارہ سال رہے، اور فضائل کا کسب کیا، ان کے ایسا خان ان سے پہلے اور بعد میں نہیں پیدا ہوا، جب مولانا کا انتقال ہو گیا تو خان یزد سے عراق، فارس اور آذربائیجان کی طرف چلے گئے، شیراز میں فضلاء کی مجلسوں میں شریک رہے، یہاں وہ استاذ یونس کے نام سے مشہور ہوئے ...... ان میں بہت سے فضائل تھے، قرآن کی قراءت خوب کرتے تھے، موزوں طبیعت بھی رکھتے تھے، موسیقی اور مصوری میں بھی ماہر تھے ....[1]

اوپر کی سطروں سے ظاہر ہو گا کہ بابر کے باپ اور ماں دونوں کا خاندان علمی حیثیت سے بھی متمول تھا، اس لیے اس کی ابتدائی تعلیم بلند پیمانہ پر ہوئی تھی۔ طفولیت سے عنفوان شباب کے زمانہ تک اس کے جو اتالیق اور اساتذہ مقرر ہوئے، ان کے نام شیخ مزید بیگ، بابا قلی علی خدائی بیرڈی بیگ، اور خواجہ مولانا قاضی عبد اللہ تھے، شیخ مزید بیگ کا ذکر بابر اپنی تزک میں اس طرح کرتا ہے:۔

"شیخ مزید بیگ میرے پہلے اتالیق تھے، ان کے قاعدے اور قرینے بہت اچھے تھے، وہ بابر مرزا (ابن بایسنغر میرزا ابن شاہرخ میرزا ابن امیر تیمور) کی خدمت میں بھی رہے تھے، عمر شیخ کی سرکار میں ان سے بڑا کوئی دوسرا امیر نہ تھا"[2]

بابر اپنے استاد اور پیر خواجہ مولانا قاضی عبد اللہ کے بارے میں لکھتا ہے:۔

"خواجہ مولانا قاضی کا نام عبد اللہ تھا، اور عرف خواجہ مولانا تھا، باپ کی طرف سے ان کا نسب شیخ برہان الدین قلیج تک پہنچتا ہے اور ماں کی جانب سے سلطان ایلیک ماضی تک

---

[1] تاریخ رشیدی ترجمہ ان۔ ایس۔ و۔ ای۔ ڈی۔ راس ص ۵، ۱۵ و ۴۷، [2] تزک بابری ص ۱۳ و ۱۴۔

ملک فرغانہ میں اس خاندان کے لوگ پیشوا، شیخ الاسلام اور قاضی رہے ہیں، خواجہ مولانا حضرت خواجہ عبید اللہ کے مرید تھے، ان ہی سے تربیت پائی تھی، مجھ کو خواجہ قاضی کے ولی ہونے میں کچھ شک نہیں ہے،...... مولانائے مرحوم عجیب شخص تھے، ڈر اور خوف تو ان میں نام کو نہ تھا، ایسا دلیر آدمی دیکھا نہ سنا، یہ صفت بھی ولایت کی دلیل ہے، دنیا دار کیسے ہی بہادر ہوں مگر کچھ دھڑکا اور اندیشہ رہتا ہے، خواجہ اس سے بالکل پاک تھے[1]"

یہ بتانا مشکل ہے کہ ان لائق اتالیق اور اساتذہ کی نگرانی میں بابر کے ابتدائی درس میں کون کونسی کتابیں تھیں، مگر تزک میں اس نے کلام پاک، سعدی کی گلستان و بوستان، فردوسی کی شاہنامہ، نظامی اور خسرو کے خمسے، شرف الدین علی یزدی کی ظفر نامہ، اور ابو عمر منہاج الجوزجانی کی طبقات ناصری کا جا بجا ذکر ہے، اس لیے قیاس بلکہ صحیح قیاس ہے کہ خاندانی روایات کے مطابق یہ کتابیں اس کی ابتدائی تعلیم کے درس میں ضرور رہیں، بابر کی مادری زبان ترکی تھی، مگر اس زبان کے علاوہ اس نے عربی اور فارسی کی بھی پوری تعلیم پائی، جیسا کہ مندرجۂ بالا کتابوں کے نام سے ظاہر ہے،

بابر سن شعور کو پہنچا تو آبائی مملکت کو علوم و فنون کا گہوارہ پایا، سمرقند، فرغانہ، خراسان، اور خصوصاً شہر ہرات ارباب فضل و کمال سے پر تھا، بابر نے ان مقامات کے علماء و شعراء سے بالواسطہ اور بلاواسطہ کسی نہ کسی طرح سے استفادہ ضرور کیا ہے، بچپن کے زمانہ میں اس نے مولانا عبد الرحمٰن جامی علیہ الرحمہ کی شہرت سنی تھی، اور جب وہ سریر آرائے سلطنت ہوا تو مولانا جامی کا وصال ہو چکا تھا، مگر ان کی ذات سے بڑی عقیدت رکھتا تھا، اپنی تزک میں ان کا ذکر کرتا، باعث برکت سمجھتا ہے، اس کا خیال ہے کہ وہ اپنے زمانہ میں علوم ظاہر و باطن میں اپنا نظیر نہ رکھتے

---

[1] تزک بابری ص ۲۲ و ۵۵، بابا قلی علی اور عذرائی ہروی بیگ کے ذکر کے لیے دیکھو تزک بابری ص ۲۱۶ و ۲۳۳،

تھے، اور جوش عقیدت میں ان کے مزار کی زیارت کو بھی گیا،

بابر شیخ الاسلام سیف الدین احمد سے بھی متاثر تھا، وہ ملا سعد الدین تفتازانی کی اولاد میں سے تھے، ترکستان سے آکر خراسان کے شیخ الاسلام ہوئے، ان کے بارے میں بابر لکھتا ہے کہ نہایت سمجھدار تھے، علم معقول و منقول سے خوب واقفیت رکھتے تھے، بڑے پرہیزگار اور متدین عالم تھے، شافعی تھے، مگر ہر مذہب کی رعایت کرتے تھے، ستر برس تک انھوں نے جماعت کی نماز ایک روز بھی ناغہ نہیں کی، بابر ملا شیخ حسن کے علم کلام کا بھی قائل تھا، اس کی رائے میں وہ حکمت، معقول اور علم کلام کے بڑے ماہر تھے، تھوڑے لفظوں میں بڑے بڑے مضامین کا بیان کرنا ان کے اختراعات میں سے تھا، ان کا ثانی کوئی نہ تھا، اجتہاد کے مرتبہ پر پہنچ گئے تھے، مگر اجتہاد نہ کرتے تھے، علم حدیث میں بابر میر جمال الدین محدث کا قدردان تھا، ان کے بارے میں وہ رقمطراز ہے کہ "خراسان میں علم حدیث کا جاننے والا ان جیسا کوئی نہ تھا" عربی ادب میں بابر میر عطاء اللہ مشہدی کا معترف تھا، جس نے علم قافیہ میں ایک فارسی رسالہ لکھا تھا، اس کا ایک رسالہ صنایع بدایع بھی تھا، جس میں شعر کے صنائع پر بحث ہے، بابر کو یہ رسالہ بہت پسند تھا، علم فقہ میں بابر قاضی اختیار کا قائل تھا، جنھوں نے فقہ میں ایک "عمدہ" رسالہ بھی تصنیف کیا تھا،

بابر نے اپنے ہم عصر شعراء سے بھی براہ راست یا غائبانہ مراسم رکھے، اور ان کے کلام کا مطالعہ عمیق نظروں سے کیا، ان شعراء پر اس نے جو نقد و تبصرہ کیا ہے، اس سے اس کی سخن سنجی اور سخن فہمی کے بلند ذوق کا اندازہ ہوگا، مثلاً علی شیر بیگ نوائی کے بارے میں لکھتا ہے :-

علی شیر بیگ بے نظیر آدمی تھا، ترکی زبان میں شعر کہا کرتا تھا اور ایسا کہتا تھا کہ دوسرا کیا کہے گا، اس نے چھ مثنویاں لکھی ۱ پنج تو خمسہ کے جواب میں ہیں اور ایک منطق الطیر کے وزن پر لسان الطیر لکھی ہے، غزلوں کے چار دیوان مدون کئے ہیں، ترکی کے کلام میں اس کا [illegible]

غرائب الصغر، نوادر الشباب، بدیع الوسط، فوائد الکبر ان کے علاوہ اور تصانیف بھی ہیں
جو ان سے کمتر درجہ کی ہیں، مولانا عبدالرحمن جامیؒ کے طرز پر ایک انشا بھی لکھی ہے، جو خطوط
جن کے نام لکھے تھے، وہ جمع کر لیے ہیں، ایک کتاب میزان الاوزان نام فن عروض میں لکھی
ہے اس میں گڑبڑ بہت کی ہے، رباعی کے چوبیس وزن میں سے چار وزن غلط لکھے ہیں،
بعض بحروں کے اوزان میں بھی غلطی کی ہے، جو شخص اس کو دیکھے گا جان جائے گا، ایک دیوان
فارسی میں بھی لکھا ہے، فارسی میں فانی تخلص ہے، اس کے بعض اشعار پست نہیں ہیں،
گرے ہوئے ہیں، فن موسیقی میں بھی اچھی چیزیں لکھی ہیں، عمدہ نقش اور پیشرو بنائے ہیں،
اہل فضل اور اہل ہنر کا قدردان و مربی علی شیر بیگ جیسا دوسرا آدمی پیدا ہونا دشوار ہے"
ایک اور شاعر شیخم بیگ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے :-

اس نے اپنا تخلص سہیلی رکھا تھا، اس لیے شیخ سہیل مشہور ہو گیا، اس قسم کا شعر کہتا تھا جس
میں ڈراونے الفاظ اور معانی ہوں، اس کے اشعار میں سے ایک شعر ہے:

شب غم گرد باد آہم ز جا برد گردوں را
فرو برد اژدہائے سیل اشکم ربع مسکوں را

کہتے ہیں کہ ایک دفعہ اس شعر کو مولانا عبدالرحمن جامی کے سامنے پڑھا، مولانا نے ہنس کر
فرمایا کہ صاحب! آپ شعر کہتے ہیں یا آدمی کو ڈراتے ہیں، اس نے اپنا دیوان بھی مرتب
کیا تھا، اور مثنویاں بھی لکھی ہیں،

اختصار و ایجاز اور جامعیت کے ساتھ بابر نے اور شعراء پر جو تنقیدیں کی ہیں ان کے نمونے
بھی ملاحظہ ہوں،

شاعروں میں ایک آصفی تھا، وزیر زادہ ہونے کی وجہ سے اس نے اپنا تخلص آصفی رکھا،

اس کے اشعار بامعنی اور رنگین ہیں، عشق و حال دونوں ہیں کورا تھا، اس کا دعویٰ یہ تھا کہ
وہ اپنا کلام کبھی جمع نہیں کرتا، شاید یہ دعویٰ بناوٹی ہو، کہتے ہیں کہ اس کا کلام انیسی اسفرائی
نے جمع کیا ہے، غزل کے علاوہ اور صنف میں شعر کم کہتا تھا، میں جس زمانہ میں خراسان گیا
ہوں اس زمانہ میں مجھ سے ملا تھا، ایک بنائی تھا ہری کا رہنے والا، اس کے باپ کا نام
استاد محمد بنا (معمار) تھا، اسی مناسبت سے اس نے اپنا یہ تخلص رکھا تھا، اس کی غزلوں
میں رنگ اور حال دونوں باتیں ہیں، اس نے دیوان مرتب کر لیا ہے، مثنویاں بھی کہی
ہیں، ایک مثنوی میوہ کے تلازمہ میں لکھی ہے، جس کی بحر تقارب ہے، لغو مثنوی ہے، ایک
مختصر مثنوی بحر خفیف میں ہے، ایک اس سے بڑی مثنوی ہے بحر خفیف ہی میں، اس مثنوی
کو آخر عمر میں پورا کیا ہے، .... ایک شاعر سیفی بخاری تھا .... ایک دیوان
تو اس نے معمولی طرز سے لکھا ہے اور دوسرا تمام اہل حرفت کے واسطے ہے، اس میں مثالیں
بہت باندھی ہیں، اس کی کوئی مثنوی نہیں ہے، اپنے اس قطعہ میں وہ کہتا ہے:

مثنوی گرچہ سنت شعراست   من غزل فرض عین می دانم
پنج بیتے کہ دل پذیر بود   بہتر از خمسین می دانم

ایک رسالہ عروض کا فارسی میں بھی لکھا ہے، اشعار اس کے کم ہیں، مگر ایک طرح وہ
پرگو ہے، کم تو اس سبب سے کہ کوئی کام کی بات نہیں لکھی، اور پرگو اس لحاظ سے کہ چھپتے
ہوئے فقرے، کھلے الفاظ اور اعراب کے ساتھ لکھے ہیں، .... ایک شاعر عبداللہ
مثنوی گو جام کا رہنے والا ملا کا بھانجا تھا، ہاتفی اس کا تخلص تھا، خمسہ کے مقابلہ میں اس نے
مثنویاں لکھی ہیں، ہفت پیکر کے جواب میں تیمور نامہ لکھا ہے، اس کی مثنویوں میں سے
لیلیٰ مجنوں بہت مشہور مثنوی ہے، گو جیسی شہرت ہے ویسی عمدہ نہیں ہے، ایک میر حسین معمائی

تھا، غالباً اس جیسا معما کسی نے نہ کہا ہو، اس کی عمر معما ہی کہنے میں گزری، عجیب فقیر مزاج، نامراد اور بے بدل آدمی تھا، ایک ملا محمد بدخشی تھا، اشکمش کا رہنے والا، جو داخل بدخشاں نہیں ہے، مگر تعجب ہے کہ تخلص بدخشی تھا، اس کے اشعار مذکورہ بالا شعراء کے اشعار کے برابر نہ تھے، فن معما میں اس نے رسالہ لکھا ہے، اس کا معما عمدہ نہیں ہے، البتہ خوش صحبت آدمی تھا، سمرقند میں مجھ سے ملا تھا، ایک یوسف بدیعی فرغانہ کا رہنے والا تھا، قصیدہ خاصہ کہتا تھا، ایک آہی تھا، غزل اچھی کہتا تھا، صاحب دیوان تھا، ایک محمد صالح تھا، اس کی غزلوں میں چاشنی ہوتی تھی، مگر بندش اس چاشنی کے برابر نہ ہوتی تھی، ترکی میں بھی شعر کہتا تھا، اور برا نہ کہتا تھا، آخر میں شیبانی خان کے پاس آگیا تھا، وہاں تھوڑی بہت قدر ہوگئی تھی، ترکی زبان میں شیبانی خان کے نام پر ایک مثنوی لکھی ہے، لیلیٰ مجنون وزن رمل مسدس میں جو وزن سبحہ ہے، یہ مثنوی سست اور گری ہوئی ہے........ ایک شاعر شاہ حسین کامی تھا، اس کے اشعار برے نہیں ہیں، غزل گو تھا، غالباً اس کا دیوان بھی ہو، ایک مثنوی بھی اس نے لکھی ہے، ایک ہلالی تھا، دیوان کے علاوہ اس کی ایک مثنوی بھی ہے، اگرچہ اس کے اور اشعار ایک انداز کے ہیں، مگر اس مثنوی کا مضمون اور بندش دونوں خراب ہیں، پچھلے شاعروں نے جو عشقیہ مثنویاں لکھی ہیں ان میں عاشق کو مرد اور معشوق کو عورت باندھا ہے، اس نے ایک فقیر کو عاشق بنایا ہے، اور بادشاہ کو معشوق، جو اشعار بادشاہ کے اقوال اور افعال کے لکھے ہیں، ان میں سراسر فحش ہے، اپنی مثنوی لکھنے کے لیے ایک بادشاہ کی نسبت ایسا لکھا ہے کہ فواحش کی نسبت بھی نہیں لکھا جاتا، اس کا حافظہ بہت قوی تھا، چالیس ہزار شعر یاد تھے، کہتے ہیں کہ اکثر خمستین کے اشعار یاد کر لیے تھے، علم عروض و قافیہ میں اس کی بڑی شہرت تھی، اس کے اشعار برے نہیں ہیں صاحب

دیوان بھی ہے"[۵۱]

تزک بابری | بابر نے اسی طرح اور دوسرے شعراء پر بھی اپنی وقیع رائے کا اظہار کیا ہے، جس کو ہم یہاں پر طوالت کی خاطر نقل کرنے سے گریز کرتے ہیں، اس کے علمی ذوق میں مذکورۂ بالا فضلا کی صحبت اور شعراء کے مطالعۂ کلام سے جو جلا ہوئی اسی کا نتیجہ اس کی **تزک بابری** ہے جس کا شمار آج بھی دنیا کے بہترین علمی اور تاریخی سرمایہ میں کیا جاتا ہے، اور ہر ملک کے ارباب کمال نے بڑے ذوق و شوق سے اپنی اپنی زبانوں میں اسکے ترجمے کئے ہیں، یہ کتاب بابر نے اپنی مادری زبان ترکی میں لکھی تھی اگو ترکی کسی زمانہ میں اعلیٰ قسم کی علمی زبان نہیں رہی لیکن بابر نے اپنی غیر معمولی ذہانت اور طباعی سے اس زبان میں بھی ایسا سلیس، لطیف اور شگفتہ طرز بیان اختیار کیا کہ اس کی کتاب ارباب علم و فن کے لیے جاذب توجہ ہو گئی اور اس کے ترجمے میں پڑھنے والے کو وہی لذت محسوس ہوتی ہے، جو ترکی جاننے والوں کو اصل کتاب میں ملتی ہوگی، ابوالفضل مؤلف اکبر نامہ بلاشبہہ دنیا کے اعلیٰ انشا پردازوں میں ہے، وہ تزک بابری کی فصاحت اور بلاغت کی تعریف ان الفاظ میں کرتا ہے،

"وواقعات خود را از ابتدائے سلطنت خود تا حالِ ارتحال از قرار واقع بعبارت فصیح و بلیغ نوشتہ اند،

پھر اس کتاب کی گوناگوں خوبیوں میں رطب اللسان ہوتا ہے،

دستور العملیست بجہت فرمانروایان عالم، و قانونیست در آموختن اندیشہای درست و فکرہای صحیح برائے تجربت پذیران و دانش آموزان روزگار، و آں دستور العمل دولت و اقبال را بموجب حکم جہاں مطاع شہنشاہی بتاریخ سی و چہار الٰہی و قتیکہ رایات عالیات

---

[۵۱] تزک بابری ص ۲۸۰، ۲۸۴، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۵، [۵۲] تزک بابری کے نام واقعات بابری اور بابر نامہ بھی ہیں،

از گلگشت بہارستان کشمیر و کابل مراجعت فرمودہ بود میرزا خان خانخانان بن بیرم خان بفارسی ترجمہ نمود تا فیض خاص الخاص آن بعموم تشنہ لبانِ رشحات سعادت فائز شود، و گنج پنہان او در نظر تہی دستانِ دانش آشکارا گردد،[1]

ممکن ہے کہ تزک بابری کی یہ مدح سرائی بابر کے پوتے کے ایک درباری مورخ کی محض خوشامد پر محمول کی جائے، مگر موجودہ دور کے یورپین مبصرین اور ناقدین نے اور بھی زیادہ تفصیل کے ساتھ اس کتاب کی تعریف و توصیف کی ہے، حالانکہ وہ مسلمانوں کے کسی علمی اور تاریخی کارنامہ کے لیے اچھے الفاظ استعمال کرنا پسند نہیں کرتے ہیں، ہنری ایلیٹ لکھتا ہے:۔

بابر کی تزک ان سوانحعمریوں میں ہے جو سب سے اچھی اور سب سے سچی کہی جا سکتی ہیں .....

..... یہ کسی طرح سے (expedition of Xenophon) سے کمتر درجہ کی نہیں (Commentaries of Caesar) سے کچھ ہی کم ہو سکتی ہے!

یہی انگریز اہل قلم آگے چل کر تحریر کرتا ہے۔

یہ کتاب نہ صرف تاریخی واقعات کے لیے اہم ہے، بلکہ اس میں بہت سی معلومات ایسی ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ شہنشاہ (یعنی بابر) کس قدر غیر معمولی دماغ کا آدمی تھا، اور اسکا مشاہدہ کتنا قوی تھا، موجودہ دور کے سیاحوں نے اعتراف کیا ہے کہ بابر نے کابل، فرغانہ، اور ہندوکش کے شمالی علاقوں سے متعلق جو بیانات قلمبند کیے ہیں وہ اپنی صداقت اور تفصیلات کے لحاظ سے آج بھی دلچسپی سے پڑھنے کے لائق ہیں، اور ان میں اضافہ نہیں کیا جا سکتا، ہندوستان کی جو تصویر اس نے کھینچی ہے وہ بہت زیادہ توجہ کے قابل ہے اس ملک میں ۱۵۲۵ء میں وہ فاتح کی حیثیت سے داخل ہوا، اس نے یہاں جو کچھ

---

[1] اکبر نامہ ج ۱ ص ۱۱۸

دیکھا اور پایا اس کو پچیس صفحوں میں تحریر کیا ہے، اس ملک کے نہ صرف حدود اربعہ، آبادی، آمدنی، ذرائع آمدنی وغیرہ کا صحیح صحیح حال لکھا ہے، بلکہ یہاں کے پھلوں، پھولوں، درختوں، پرندوں، چوپایوں، اور آبی جانوروں کے عادات وخصوصیات سے متعلق اتنے مفید معلومات فراہم کیے ہیں کہ موجودہ دور کے ماہرین نباتات وحیوانات بھی ان سے پورا فائدہ اٹھا سکتے ہیں، ان چیزوں کے متعلق اپنے مشاہدات کا ذکر کرتا ہے، اور پھر دوسروں سے جو کچھ سنا تھا اس کا بھی تجزیہ کرتا ہے، آخر میں ان چیزوں کی ترقی کے لیے اپنے ذاتی مشورے بھی پیش کرتا ہے،......[1]

سوانح بابر مولفہ ولیم ارسکن میں اس کتاب کی خوبیاں ان الفاظ میں بتائی گئی ہیں،

بابر کی تزک اپنی نوعیت کے لحاظ سے عجیب وغریب ہے، جن حالات میں اس نے یہ لکھی وہ اور تعجب خیز ہے، اس میں ایک تاتاری فرمانروا کی زندگی کی جزوی تفصیلات ہیں، اس کی رائے اور اس کے جذبات بالکل فطری طور پر نظر آتے ہیں، ان میں کوئی تصنع اور تکلف نہیں، ہر چیز صفائی اور سچائی سے لکھی گئی ہے، طرز تحریر سادہ اور مردانہ ہے، اسی کے ساتھ شگفتہ اور دلآویز بھی ہے، یہ ایک ایسے شخص کی تصنیف ہے جو غیر معمولی ذہانت اور مشاہدہ کی قوت رکھتا ہے، وہ اپنے ہموطنوں اور معاصروں کے خدوخال، عادات واطوار، افعال واعمال کی تصویر ایسی صفائی کے ساتھ کھینچتا ہے جیسے کوئی کچھ آئینے میں دیکھ رہا ہے، اس لحاظ سے یہ کتاب ایشیا کی تاریخی تالیفات میں اپنی مثال آپ ہے، ایشیا کے عام مورخین اکابر کے اعمال وحرکات کا ذکر تو پیشکردہ طریقہ پر کرتے ہیں، لیکن ان کے عادات واطوار کو نظرانداز کر دیتے ہیں، وہ اور دوسرے لوگوں کا ذکر مطلق نہیں کرتے

---

[1] تاریخ ہند، ہنری الیٹ ج ۴ ص ۲۲۰، ۲۱۸

ہیں لیکن بابر ہر فرد کی شکل وصورت، پوشاک، طور اور طریقے اس خوبی اور سچائی کے ساتھ
بیان کرتا ہے کہ ہم اپنے کو ان اشخاص کے درمیان کھڑا پاتے ہیں، اور ان کی تمام سیرت
نظروں کے سامنے آجاتی ہے۔"[1]

ایس۔ایم۔ اڈورڈس نے بابرنامہ کو St. Augustine کے Confession اور روسو کی Memoirs اور گبن اور نیوٹن کی کے ہم پلہ قرار دیا ہے۔
اس کا خیال ہے کہ یہ کتاب شروع سے آخر تک حق، صداقت اور راستبازی پر مشتمل ہے۔ اس عہد کے مشرقی اہل قلم زیادہ تر مرصع، مسجع اور پر تکلف عبارت لکھنے کے عادی تھے لیکن بابر نے اپنی سادہ فطرت کے لحاظ سے سادہ طرز تحریر بھی اختیار کیا۔ اس کا ذہنی کمال یہ ہے کہ وہ چند الفاظ میں کسی شخص کی سیرت کا مکمل نقشہ کھینچ دیتا ہے، ہرات کے سلطان حسین مرزا، پھر سلطان احمد مرزا، اور اپنے باپ کے درباری امرا کی جو قلمی تصویر پیش کی ہے وہ بہت ہی خوب اور قابل تحسین ہے۔[2]
ایک اور انگریز اہل قلم لکھتا ہے کہ بابرنامہ پڑھنے کے بعد غیر ارادی طور پر محسوس ہوتا ہے کہ بابر کا سینہ محبت، شفقت اور انس سے لبریز تھا، اس کی زندگی میں بڑے بڑے انقلابات ہوئے، اس نے عسرت میں بھی دن گذارے، اور شان وشوکت کے ساتھ شاہی تخت پر جلوہ افروز بھی ہوا، مگر اس کے طبعی ذوق میں تبدیلی کسی حال میں نہیں ہوئی، دربار کی پرشکوہ آرایش میں بھی اپنے بچپن کے ساتھیوں کو نہیں بھولا، ان میں سے بعض کو یاد کر کے اشکبار بھی ہوا، ان کی باتوں کا حوالہ اکثر دیا کرتا تھا، ان کے ساتھ بچپن میں جو کھیل کھیلتا تھا، یا جو پر لطف مجلسیں ہوتی تھیں، ان کو بار بار اپنی تحریروں میں دہراتا ہے، وہ اپنی ماں اور گھر کی عورتوں سے دور رہنے کے باوجود اپنی تزک

---

[1] Life of Baber by V. Erskine ص ۵۲۵
[2] Baber: Diarist and Despot by S. M. Edwardes ص ۱۳

ہیں ان کا ذکر اس طرح کرتا ہے جیسے وہ ان کے اردگرد بیٹھا ہوا[1]

تزک بابری کی مقبولیت اور اہمیت کی ایک بڑی دلیل یہ بھی ہے کہ تمام اہم زبانوں میں اسکے ترجمے ہوئے، اکبر کے حکم سے عبدالرحیم خاں خانخاناں نے اس کا فارسی میں ترجمہ کیا، ایک فرانسیسی اہل قلم M. pavet de Courteille نے اس کو فرانسیسی میں منتقل کیا، Mrs. Leyden اور Erskine دونوں نے مل کر اور مسز A. S. Beveridge نے اس کو انگریزی جامہ پہنایا، موخرالذکر نے اپنے ترجمہ میں اتنے مفید حواشی اور ضمیموں کا اضافہ کیا ہے کہ بہت کم کتابوں کو یہ خوبیاں میسر ہوئی ہونگی، روس کی اورینٹیل اکیڈمی نے روسی زبان میں اس کا ترجمہ کیا ہے، اردو قالب میں اس کو مرزا نصیرالدین حیدر گورگانی المتخلص بہ فانی نے تبدیل کیا،

بابر کی شاعری | بابر ایک اعلیٰ قسم کا ادیب ہونے کے ساتھ ترکی زبان کا ایک بلند پایہ شاعر بھی تھا، مرزا حیدر دوغلت مؤلف تاریخ رشیدی کا بیان ہے کہ میر علی شیر بیگ نوائی کے بعد ترکی شاعروں میں کوئی اور بابر کا مدمقابل اور ہمسر نہ تھا، فرشتہ رقمطراز ہے کہ

"در علم موسیقی و شعر و انشاء و املا نظیر نداشت"[2]

اکبرنامہ میں ہے:

"آں حضرت را در نظم و نثر پایۂ عالی بود، خصوصاً در نظم ترکی، و دیوان ترکی آں حضرت در نہایت فصاحت و عذوبت واقع شدہ، و مضامین تازہ در آں مندرج است"[3]

بابر کا ایک دیوان شاہی کتب خانہ رامپور میں موجود ہے، اس دیوان کے علاوہ اس نے

---

[1] الفنسٹن تاریخ ہندوستان ج ۲ ص ۱۱۵ – ۱۱۷

[2] تاریخ فرشتہ ج ۱ ص ۲۱۱ [3] اکبرنامہ ج ۱ ص ۱۱۸،

۹۲۸ھ میں ترکی زبان میں ایک مثنوی مبین بھی اپنے لڑکے کامران کے لیے لکھی جس میں مذہبی، فقہی اور اخلاقی مسائل پر دو ہزار اشعار ہیں، اسی لیے یہ درفقہ مبین اور فقہ بابری کے نام سے بھی موسوم ہے اس کی ایک شرح بھی شیخ زین نے لکھی تھی[۱]، بابر کی منظوم تالیفات میں ایک رسالہ والدیہ بھی ہے، یہ رسالہ اس کے استاد اور مرشد خواجہ عبید اللہ احراری کی تصنیف ہے، بابر نے ترکی میں اس کا منظوم ترجمہ کیا، جن حالات میں اس نے یہ رسالہ ہندوستان کے قیام کے زمانہ (۹۳۵ھ) میں ترجمہ کیا ہے وہ خود اس کی زبان سے سننے کے لائق ہیں

جمعہ کے دن تئیسویں تاریخ جسم میں ایسی حرارت معلوم ہوئی کہ جمعہ کی نماز مسجد میں مشکل سے پڑھی گئی، ظہر کے بعد احتیاطاً کتب خانہ میں گیا، بہت دیر تک پسینہ رہی، دوسرے دن ہفتہ کو بخار ہوا، کچھ جاڑا بھی چڑھا، سہ شنبہ ستائیسویں صفر کی رات کو دل میں آیا کہ خواجہ عبید کے رسالہ والدیہ کو نظم کروں، حضرت خواجہ کی روح سے ملتجی ہوا، اور دل میں دعا کی کہ یہ نظم آنحضرت کو مقبول ہو، اس کے قبول ہونے کی دلیل یہ ہے کہ جس طرح قصیدہ بردہ مقبول ہوا، اور اس کا کہنے والا مرض فالج سے اچھا ہو گیا، اسی طرح میں بھی تندرست ہو جاؤں، اسی نیت سے وزن رمل، مسدس مخبون و ضرب کبھی ابتر کبھی مخبون محذوف میں جس میں مولانا عبد الرحمٰن جامی کا سبحہ بھی ہے رسالہ نظم کرنا شروع کیا، اسی رات میں تیرہ شعر لکھ ڈالے، بطریق التزام ہر روز دس بیتوں سے کم نہ لکھیں، شاید کوئی دن ناغہ ہوا ہو، اگلے سال بھی اور کئی بار اور کبھی ایسا بخار کم سے کم چالیس دن تک رہا ہے، خدا کی عنایت اور حضرت خواجہ کی برکت سے جمعرات کے دن انتیسویں کو ذرا افاقہ ہو گیا، اور پھر صحت ہو گئی، ہفتہ کے دن ربیع الاول کی انتیسویں تاریخ نظم تمام ہو گئی، ایک دن باون شعر ہوئے[۲]

---

[۱] بابرنامہ مترجمہ مسز اے۔ ایس۔ بیوریج ص ۴۴۸، [۲] تزک بابری اردو ص ۳۳۶

بابر نے رسائل عروض کے نام سے ترکی شاعری کے عروض پر بھی ایک کتاب لکھی[1]، اسکا سنہ تالیف شاید ۹۳۳ھ ہے[2]

بابر نے اپنے تاثرات کا اظہار فارسی اشعار میں بھی کیا ہے، مگر ان کی تعداد بہت کم ہے پھر بھی جو کچھ ہیں ان کو اساتذۂ فن نے نگاہِ تحسین سے دیکھا ہے، ابو الفضل نے اکبر نامہ میں لکھا ہے کہ "ہمچنیں بزبان فارسی نیز اشعار دلپذیر دارند" (جلد اول ص ۱۱۸) تزک بابری اور دوسری کتابوں میں جو اس کے فارسی اشعار ملتے ہیں ان کو ہم ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں،

۹۱۵ھ میں بابر نے اپنے ہم جلیس خواجہ کلاں کو بجور کے قلعہ کی نگرانی کے لیے بھیجدیا، اسکی جدائی سے پریشان ہوا تو اس کے جانے کے دو ایک روز بعد یہ قطعہ لکھ کر اس کے پاس بھیجا،

قرار عہد بیارا این چنیں نبود مرا ۔۔۔ گزید ہجر و مرا کرد بے قرار آخر

بہ عشوہ ہائے زمانہ چہ چارہ سازد کس ۔۔۔ بجور کرد جدا یار را زیار آخر

قلعہ بجور کے نام کی رعایت سے آخر شعر میں لفظ بجور نے قطعہ کو پر لطف بنا دیا ہے،

پانی پت کی لڑائی کے موقع پر بابر غیر ملکی ماحول سے پریشان تھا اجنبی حریف کی اجنبی زبان سے اس کے ساتھی بھی کچھ بد دل تھے، گھبرا کر اس نے ایک شعر کہا

شدہ جمعے و بود جمعے پریشاں ۔۔۔ گرفتار قومے و قومے عجائب

بیانہ کے قلعہ کی تسخیر کے موقع پر بابر نے اس کے حاکم نظام خان کو وعدہ وعید کے فرمان بھیجے، اور اس فرمان پر فی البدیہہ یہ قطعہ بھی لکھ بھیجا جس میں بیانہ اور بیان کی رعایت لفظی ملاحظہ ہے

با ترک ستیزہ مکن اے میر بیانہ ۔۔۔ چالاکی و مردانگی ترک عیان است

گر زود نیائی و نصیحت نہ کنی گوش ۔۔۔ آنجا کہ عیان است چہ حاجت بہ بیان است

---

[1] طبقات اکبری ج ۲ ص ۲۷، [2] بابر نامہ ترجمہ مسز بیوریج ضمیمہ حاشیہ ص ۔۷۰ ۔ [3] ج ۲،

۹۳۴ھ میں بابر نے چندیری فتح کیا، تو اس فتح کی تاریخ کا مادہ "فتح دار الحرب" نکلا، بابر نے اسکو یوں موزوں کیا،

بود چندے مقام چندیری ۔۔۔ پر ز کفار و دار حربی ضرب
فتح کردم بحرب قلعۂ او ۔۔۔ گشت تاریخ فتح دار الحرب[1]

تزک بابری میں جا بجا ایسے فارسی اشعار ہیں جن پر گمان ہوتا ہے کہ وہ بابر ہی کے ہیں، مگر ان پر کامل وثوق نہیں، اس لیے ان کو یہاں نقل کرنے سے ہم گریز کرتے ہیں، تاریخ فرشتہ میں ہے کہ بابر نے کابل میں ایک مرغزار میں پتھر کا ایک حوض کھدوایا تھا، یہاں اپنے خوش طبع دوستوں کے ساتھ عیش و عشرت کی بزم منعقد کرتا تھا، اسی مناسبت سے ایک شعر لکھکر حوض پر کندہ کرا دیا تھا، وہ شعر یہ ہے:

نو روز و نو بہار مے و دلبرے خوش است
بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست[2]

یہ شعر آج بھی پر کیف مجلسوں میں پڑھا جاتا ہے، تاریخ فرشتہ میں بابر کا یہ شعر بھی منقول ہے:

باز اے ہمائے کہ بے طوطی خطت ۔۔۔ نزدیک شد کہ زاغ برد استخوان من

ابو الفضل کو بابر کے یہ دو مطلع بہت پسند تھے،

ہلاک میکندم فرقت تو دانستم (۱) وگرنہ رفتن ازیں شہر می توانستم
تا بزلفت سبب ہش دل بستم (۲) از پریشانی عالم رستم

اکبر نامہ میں بابر کی یہ رباعی بھی منقول ہے،

درویشاں را گرچہ نہ از خویشانیم ۔۔۔ لیک از دل و جاں معتقد ایشانیم

[1] تزک بابری اردو ترجمہ ص ۲۳۳، ۴۹۴، ۲۳۳، ۲۳۰ ، [2] فرشتہ ج ۱ ص ۲۱۱۔

دوراست گوی شاہی از درویشے   شاہیم ولے بندۂ درویشانیم[۱]

درویشوں سے بابر کی یہ عقیدت اس ذوق وتصوف کی بنا پر تھی جو اس نے اپنے مرشد حضرت خواجہ عبید اللہ کی صحبت میں حاصل کیا، چنانچہ شیخ کے وصال کے بعد شیخ کا تصور کرکے کہتا ہے :-

در ہوائے نفس گمرہ عمر ضایع کردہ ایم   پیش اہل اللہ ز افعال خود شرمندہ ایم

یک نظر با مخلصان خستہ دل فرما کہ ما   خواجگی را ماندہ ایم و خواجگی را بندہ ایم

حسب ذیل دو شعر میں بابر یا تو اپنے مرشد کی طرف سے مذکورہ بالا اشعار کا جواب دیتا ہے یا اپنے شیخ کو پھر مخاطب کرتا ہے،

اخلاص و عقیدۂ تو روشن شدہ است   حالات و طریقہ ات مبرہن شدہ است

جاہل چو نماند زود برخیز و بیا   دل خواہ تو ترتیب معین شدہ است

تذکرۂ مرآۃ الخیال (ص ۹۰) میں بابر کی یہ غزل منقول ہے

در دور ما زکہنہ سواران یکے ما است   واں کو دم از قبول نفس می زندنے است

ایں سلطنت کہ ماز گدایش یافتیم   دارا ندا شت ہرگز و کاؤس رکے است

وانی کمان ابرو ترکان سیہ چرا ست   کز گوشہاش دود دل خلق در پے است

دارد بزلف او دل زنار بند ما   سودائے کفر و کافری وہر چہ در وے است

بابر رسید نالۂ زارت بگوش یار   مجنوں وقوف یافت کہ لیلی دریں مے است

بابر نے اپنی ایک بزم ادب کی بہت ہی دلچسپ اور سبق آموز تصویر کھینچی ہے،

نماز سے پہلے یدہ سرا میں آئے، آفتاب نکلے لشکر والے سیر کرتے ہوئے آنے شروع

---

[۱] اکبر نامہ ج ۱ ص ۱۱۹، ۱۱۸،

ہوئے، یہ لوگ دور دراز سے زرق ارق میں ٹھہرے ہوئے تھے، مگر ہم کو نہ دکھائی دیے، جاں میں اکثر وہ لوگ تھے جو شعر کہتے تھے، جیسے شیخ ابو الوجید، شیخ زین ملا علی خاں، تردی بیگ اور خاکسار وغیرہ، اثنائے صحبت میں محمد صالح کا یہ شعر پڑھا گیا۔

محبوبی ہر عشوہ گرے را چہ کند کس ‏ ‏ جائیکہ تو باشی دگرے را چہ کند کس

فرمائش کی کہ اس زمین میں کچھ شعر کہو، شاعر اور موزوں طبع فکر کرنے لگے، ملا علی خاں سے بہت ہنسی کھلی ہوتی تھی، ہنسی سے میں نے فی البدیہہ یہ شعر کہا ؎

مانند تو مدہوش گرے را چہ کند کس ‏ ‏ نرگاؤ کسے مادہ خرے را چہ کند کس

پہلے اس سے جو کچھ اچھا برا کہتے یا ہزل نظم کرنے کا اتفاق ہوتا تھا تو لکھ لیا جاتا تھا، جب میں مبین کو نظم کرنے لگا تو دل میں آیا کہ جس زبان سے یہ پاک الفاظ نکلیں حیف ہے کہ اس سے بیہودہ لفظ بھی نکلیں، اور جس دل میں ایسے مقدس مضامین نکلیں، افسوس ہے کہ اس میں ایسے ناپاک خیال بھی پیدا ہوں، اسی دن سے ہزل کہنا ترک کر دیا تھا، اس شعر کے کہتے وقت اصلاً خیال نہ رہا، دو ایک روز کے بعد کبرام میں آکر مجھے جاڑے سے بخار چڑھا، کھانسی بھی ہو گئی، اور کھنکار میں خون آنے لگا، اب میں سمجھا کہ یہ تنبیہ کس طرف سے ہے، اور یہ تکلیف کیوں ہے، فَمَنْ نَّكَثَ فَاِنَّمَا يَنْكُثُ عَلٰى نَفْسِهٖ وَمَنْ اَوْفٰى بِمَا عٰهَدَ عَلَيْهِ فَيُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا .... میں نے بار دگر توبہ کی اور اس نالائق طرز سے دل ہٹا لیا، سچ یہ ہے کہ کسی گنہگار بندہ کے دل میں ایسے خیال کا پیدا ہونا ایک بڑی دولت ہے، جو خدا کی طرف سے عطا ہوتی ہے، جو بندہ اس طرح متنبہ ہو جائے وہ اس کو سعادت عظمیٰ سمجھے، (ص ۵۴، ۲۵۳)۔

خط بابری | بابر نے اپنی جودت طبع سے ایک خاص قسم کا خط اختراع کیا، جو شاید خط نسخ کی کہ

شکل تھی، اسی خط میں ایک کلام مجید لکھکر مکہ معظمہ بھیجا، منتخب التواریخ میں ہے:-

واز جملہ غرایب و اختراعات آن شاہ مغفرت پناہی خط بابریست کہ مصحفی بدان خط نوشتہ و بمکہ معظمہ فرستادہ[۱]

تزک بابری میں اس خط کا جابجا ذکر ضرور ہے، مگر کہیں اس کی تفصیل نہیں، بابر نے اس خط کو سنہ ۹۱۰ھ میں ایجاد کیا، مگر اس کا لکھنا آسان نہ تھا، اس لیے مقبول نہ ہوا، ملا بدایونی لکھتے ہیں کہ عہد اکبری میں یہ خط مفقود ہو چکا تھا، مگر خوشنویسی کے اساتذہ اس خط میں لکھنا کمال فن سمجھتے تھے، اکبر کے دور حکومت میں میر عبدالحیٔ مشہدی اس خط کا باکمال استاد تھا،

بابر کے دربار کے فضلاء و شعراء بابر نے جن ارباب علم سے بالواسطہ یا بلا واسطہ استفادہ کیا، ان کا ذکر گذشتہ صفحات میں آچکا ہے، ان کے علاوہ اس کے دربار میں ممتاز فضلاء و شعراء کی بھی ایک جماعت تھی، جو برابر اس کی معیت میں رہتی تھی، ان میں سے بعض کے مختصر حالات ہم یہاں پر درج کرتے ہیں،

شیخ زین الدین: صدارت کے عہدہ پر فائز تھے، معقولات و منقولات میں اچھی دستگاہ رکھتے تھے، ادیب بھی تھے اور شاعر بھی، واقعات بابری کا فارسی میں ترجمہ کیا تھا، بابر ان کی فارسی انشاء پردازی کا معترف تھا، اس نے جب رانا سانگا پر فتح پائی تو اس خوشی میں مسلمانوں سے محصول لینا معاف کر دیا، اس کے لیے شیخ زین ہی نے فرمان لکھا، جو تمام قلمرو میں بھیجا گیا، اس فتح پر بابر نے شیخ زین سے ایک فتحنامہ بھی لکھایا، اس سے بابر کی فوج کی کیفیت، ہندوؤں کے لشکر کی حالت، اور دونوں کی صف آرائی اور معرکہ آرائی کے طریقے مفصل طور سے معلوم ہوتے ہیں، بابر نے دونوں فرامین کو اپنی تزک میں شامل کر دیا ہے،[۲] شیخ زین نے بابر کی مثنوی مبین

---

[۱] منتخب التواریخ مؤلفہ عبدالقادر بدایونی جلد اول ص ۳۴۳، [۲] ایضاً جلد سوم ص ۲۷۳،

کی ایک شرح بھی لکھی، بابر کی فتح ہندوستان کے متعلق ایک تاریخ بھی قلمبند کی، وفائی تخلص رکھتے تھے، منتخب التواریخ میں ان کے اشعار درج ہیں، جن میں دو رباعیاں یہ ہیں،

آزمیدی بر قیبان و رمیدی از ما (۱) ماچہ کردیم وچہ دیدی چہ شنیدی از ما

بر حال بردن ما حاجت بیداد نبود می سپردیم اگر می طلبیدی از ما

غم گریباں گیر شد سر در گریباں چوں کشم (۲) شوق دامنگیر آمد پا بداماں چوں کشم

اے گریبانم ز شوقت پارہ دامن چاک چاک بے تو پا در دامن و سر در گریباں چوں کشم

بابر کی وفات سے تین سال پہلے ۹۳۴ھ میں بمقام اکبرآباد عالم جاودانی کو سدھارے، وہاں ایک مدرسہ قائم کیا تھا، اسی کے احاطہ میں دفن کیے گئے، ملا بدایونی لکھتے ہیں کہ

صاحب کمالات صوری و معنوی بود و در معما و تاریخ و در بدیہہ یافتن و شعر و سائر جزئیات نظم و نثر و انشا بے قرینۂ زمان خود بود[۱]۔

بابر کے دربار کے ممتاز فضلا میں مولانا بقائی بھی تھے، ایک مثنوی مخزن کی زمین میں لکھکر بابر کی خدمت میں پیش کی،

مولانا شہاب الدین علم و فضل، شعر گوئی خصوصاً معما گوئی میں بلند پایہ رکھتے تھے، کلام پاک اور حدیث پران کی نظر وسیع تھی، شاعر بھی تھے، تخلص حقیر تھا، شاعری کے کچھ نمونے منتخب التواریخ (مولفہ عبدالقادر بدایونی) کی جلد اول (ص ۳۴۲) میں ملیں گے، ۹۴۲ھ میں وفات پائی، میر آخوند نے "شہاب الثاقب" سے تاریخ وفات نکالی ہے،

شاعروں میں شیخ ابوالوجد فارغی، سلطان محمد کوسہ، سرخ و داعی، شیخ جمالی کنبہ مشہور تھے، اطبار میں میر ابوالبقا، مولانا یوسفی اور خواجہ نظام الدین علی خلیفہ اپنے علم کے لیے مشہور تھے[۲]

---

(۱) منتخب التواریخ ج ۱ ص ۳۴۱، ۳۴۲، نیز دیکھو صبح گلشن مولفہ نواب سید علی حسن خاں ص ۵۹۵ (۲) تزک بابری ج ۱ ص ۱۱۵

یہ تمام ارباب کمال بابر کی علم نوازی کا حال سنکر خراسان، ہرات اور دوسری جگہوں سے ہندوستان آئے تھے، بابر بھی ان کی پذیرائی اور سرپرستی پورے شاہانہ انداز سے کرتا تھا، ۹۳۵ھ میں گوالیار کی مہم میں سخت بیمار ہوگیا، بیماری سے شفا پائی تو ایک جشن عشرت منعقد کیا، اس جشن میں تمام ایلچی قزلباش، اوزبک اور ہندو بھی شریک ہوئے، بابر نے ان سب کو ترازو کے پلڑے بھر بھر کر چاندی اور سونا دیا، اس موقع پر بھی سادات اور علما، کو فراموش نہ کیا، اس جشن کا ذکر کرتے ہوئے فرشتہ لکھتا ہے:-

> دوسرے حقداروں اور سادات کو بھی اپنی بخشش سے فیض پہنچایا، اخوند میر مؤلف حبیب السیر اور مولانا شہاب الدین معمائی اور مرزا ابراہیم قانونی جو اپنے فن کے بے نظیر استاد تھے، اور ہرات سے ہندوستان میں تازہ وارد ہوئے تھے، اس جشن عشرت میں بادشاہ کی ملازمت سے سرفراز ہوکر شاہی نوازشوں سے مالامال کئے گئے، اور جملہ مقربوں میں داخل ہوئے، (ج ۱ ص ۲۱۰)

اخوند میر کا ذکر آگے آئے گا،

کتب خانہ بابر سفر اور حضر دونوں میں کتب خانہ ساتھ رکھتا تھا،[۱] ۹۳۰ھ میں بابر ہندوستان پر حملہ آور ہوا، تو لاہور کے پاس غازی خاں سے متصادم ہوا، غازی خاں کو شکست ہوئی، تو بابر اس کے قلعہ میں داخل ہوا، جہاں اس کو بے شمار دولت ملی، لیکن بابر کے لیے سب سے قیمتی سرمایہ غازی خاں کا کتب خانہ تھا، غازی خاں بڑا علم دوست تھا، جید عالم ہونے کے علاوہ شاعری کا بھی اعلی مذاق رکھتا تھا، اس نے ہر قسم کی عمدہ اور خوش خط لکھی ہوئی کتابیں اپنے کتب خانہ میں جمع کر رکھی تھیں، بابر نے ان کتابوں میں سے کچھ اپنے لیے مخصوص کر لیں، کچھ شہزادہ ہمایوں کو دیں اور کچھ شہزادہ کامران کے لیے کابل روانہ کیں،[۲]

[۱] تزک بابری اردو صفحہ ۳۰۳
[۲] تاریخ فرشتہ ج ۱ صفحہ [illegible]

ہمایوں

ہمایوں ۱۳؁ ۹ھ ماہ ذیقعدہ میں کابل میں پیدا ہوا، یہ وہ زمانہ تھا جب کہ بابر اپنی قوت واقتدار کی خاطر ایک مقام سے دوسرے مقام کو پریشان حال پھر رہا تھا، کبھی باپ کی متروکہ مملکت سے محروم ہوکر پہاڑوں کی برفانی چٹانوں پر اپنی جان بچانے کے لیے بھاگتا نظر آتا ہے، کبھی برف کاٹ کر فوج کے لیے راستہ بناتا ہوا دکھائی دیتا ہے، کبھی اپنی جودت جہانگیری سے کابل کا بادشاہ بن بیٹھتا ہے، تو کبھی عزیزوں اور دوستوں کی کج ادائیوں سے اسی شہر کی گلیوں میں برہنہ پا پھرتا دکھائی دیتا ہے،

ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں وہ اپنی اولاد کی تعلیم خاطر خواہ نہ دلا سکا ہوگا، پھر بھی یہ عجیب بات نظر آتی ہے، کہ اس کی تمام اولاد علم و ہنر سے مالامال تھی، جیسا کہ آگے ذکر آئیگا،

ہمایوں کی تعلیم و تربیت ہمایوں کی تعلیم و تربیت کے متعلق کوئی مستقل بیان موجود نہیں، اس کی پیدائش کے تھوڑے دنوں کے بعد تزک بابری کی تحریر کچھ عرصہ تک بند رہتی ہے، جو ہمایوں کی طفولیت اور تعلیم و تربیت کا زمانہ ہے، اس لیے بابر اس کے متعلق لکھنے سے قاصر رہا، تاریخوں سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ ہمایوں جب چار سال چار مہینہ اور چار روز کا ہوا تو رسم مکتب کی تقریب ادا کی گئی، اس کے اتالیق خواجہ کلاں اور شیخ زین الدین رہے، جو بابر کے درباری امرا میں سے تھے، اس کی تعلیم کے تفصیلی حالات کہیں نہیں ملتے مگر

بابر نامہ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ بابر کی تالیفات اس کی اولاد کے زیر مطالعہ رہیں، ذکر آچکا ہے کہ بابر نے اپنی مثنوی مبین کامران کی تعلیم کی غرض سے لکھی تھی، بہ ظاہر کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی ہے کہ ہمایوں کو بھی جو کامران سے صرف ایک یا دو سال عمر میں بڑا تھا، اس مثنوی کے ذریعہ سے مذہب و اخلاق کا درس نہ دیا گیا ہو، تمام مورخین اس پر متفق ہیں کہ مذہب و اخلاق میں ہمایوں کی تربیت اعلیٰ قسم کی ہوئی تھی، وہ صوم وصلوٰۃ کا سخت پابند تھا، کبھی وہ قسم نہ کھاتا اور نہ کبھی فحش لفظ زبان پر لاتا تھا، کسی سے بہت خشمگیں ہوتا تو صرف لفظ سفیہ کہہ دیتا، معمولی احکام شرعی پر اس سختی سے عمل کرتا کہ مسجد میں کبھی پہلے بایاں پاؤں اندر نہ رکھا، اور حسن ادب یہاں تک تھا کہ بے وضو خدائے عزوجل کا نام کبھی نہیں لیا،[۱] ممکن ہے کہ یہ مذہبی اور اخلاقی جلا باپ ہی کی تربیت اور اس کی تالیف کردہ مثنوی کے ذریعہ سے پیدا ہوئی ہو،

پادشاہ ہوکر ہمایوں نے جس علمی مذاق کا ثبوت دیا، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی تعلیم ویسی ہی ہوئی تھی جو ایک شہزادہ کے لیے ضروری ہوتی ہے، تمام معاصر مورخین اس کو ایک بلند پایہ شاعر اور علم ریاضی و ہیئت کا ماہر وعالم بتاتے ہیں،

ہمایوں کی سخن سنجی وسخن فہمی اس کے اعلیٰ علمی مذاق کا ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ اس کی تمام زندگی جنگ و جدل میں گذری، پھر بھی فرصت کے اوقات میں شعر وسخن کا مشغلہ جاری رکھا، گو اس کی مادری زبان ترکی تھی، مگر اس نے اشعار فارسی ہی میں موزوں کئے، اس کے ذوق شعر وشاعری کی کچھ مثالیں ملاحظہ ہوں۔

ہمایوں جب شیر خاں سے شکست کھا کر بے وفا بھائیوں کی مدد حاصل کرنے کے لیے لاہور پہنچا، تو مرزا کامران نے بہ ظاہر موافقت اور در پردہ مخالفت کی، شیر خان آگے بڑھتا چلا آرہا تھا

---

[۱] بدایونی ج ۱ ص ۴۶۸،

کامران نے اس کا مقابلہ کرنے کے بجائے خفیہ طور پر اس سے سازش کرلی، کہ شیر خاں پنجاب لیکر اسے کابل، قندھار، اور غزنی کا تنہا مالک چھوڑ دے، اور ظاہراً ہمایوں سے شیر خاں کے خلاف جنگ کرنے کی تدبیروں کے متعلق مشورے کرتا رہا، یہاں تک کہ شیر خاں بہت ہی قریب پہنچ گیا، اور ہمایوں کے پاس اپنا ایک قاصد بھیجا، مرزا کامران نے شیر شاہ کے قاصد کا پرجوش استقبال کیا، اور اس کی آمد میں بڑا جشن منایا، ہمایوں نے اس موقع پر ایک رباعی کہی،

در آئینہ گرچہ خود نمائی باشد پیوستہ ز خویشتن جدائی باشد

خود را بنمائی غیر دیدن عجب است ایں بوالعجبی کار خدائی باشد

اور اس کو مرزا کامران کے پاس بھیجدیا، گلبدن بیگم کا خیال ہے کہ ہمایوں نے کامران کے پاس یہ رباعی نہیں بھیجی، بلکہ قاصد کے ذریعہ سے شیر خان کے پاس ارسال کی، [1]

ہمایوں شیر خان سے ہزیمت اٹھانے کے بعد پریشان حال پھر رہا تھا، کہ اپنی پسماندہ فوج کے ساتھ جیسلمیر پہنچا، وہاں کے بیابان میں پانی کی کمی کی وجہ سے لشکری پیاس سے مرنے لگے، بمشکل ایک کنواں نظر آیا، مگر اس کنوئیں پر پانی کے لیے لشکریوں میں ایسا جھگڑا ہوا کہ بہت سے فوجی کنوئیں میں گر کر ہلاک ہو گئے، ہمایوں نے اسی وقت یہ شعر کہا

چناں ز دچاک ہا گردوں لباس دردمنداں را کہ نے دست آستیں می یابد و نے سر گریباں را [2]

ہمایوں ایسے موقعوں پر بہت متاثر ہو کر اشعار کہتا تھا، اور جب کبھی اپنے حال کے موافق کوئی شعر سنتا تو بے اختیار ہو جاتا تھا، جب ہندوستان کا تخت و تاج کھو کر شاہ طہماسپ کی دعوت پر ایران جا رہا تھا تو ہرات میں سلطان محمود مرزا نے اس کا استقبال کیا، اور خاص طور پر جشن نشاط مرتب کیا، صابر قاق نے جو خراسان کا مشہور گویا تھا ایک غزل گانا شروع کیا، جس کا مطلع یہ تھا،

---

[1] ہمایوں نامہ گلبدن بیگم ص ۴۴ [2] بدایوں ج ۱ ص ۴۳۹،

مبارک منزلے کان خانہ را ماہے چنین باشد   ہمایوں کشورے کان عرصہ را شاہے چنین باشد

جب وہ اس شعر پر پہنچا،

ز رنج و راحت گیتی مرنجاں دل مشو خرم   کہ آئین جہاں گاہے چناں گاہے چنین باشد

تو ہمایوں کے دل پر ایک سخت چوٹ لگی، اور اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل پڑے،[۱]

ہمایوں نے جب سنہ ۹۵۱ھ میں ایران کی طرف رخ کیا تو شاہ طہماسپ صفوی کو ایک رقعہ لکھا، جس میں یہ اشعار سپرد قلم کیے،

خسروا عمریست تا عنقای عالی ہمتم   قلۂ قاف قناعت را نشیمن کردہ است

روزگار سفلۂ گندم نمای جو فروش   طوطی طبع مرا قانع بارزن کردہ است[۲]

دشمنم شیر یست اما پشت برمن کردہ بود   این زماں از ضعف طالع رو بہ من کردہ است[۳]

التماس از شاہ آن دارم کہ با من آن کند[۴]   انچہ با سلمان علی در دشت ارزن کردہ است[۵]

اس کے ساتھ یہ رباعی بھی تھی

اے شاہ جہاں کہ نہ فلک پایۂ تست   در دست ولایت ہمہ سرمایۂ تست

شاہان جہاں جملہ ہمای طلبند   بنگر ہما چگونہ در سایۂ تست

شاہ ایران نے اس کے جواب میں یہ شعر لکھ بھیجا[۶]

ہمای اوج سعادت بدام ما افتد   اگر ترا گذرے بر مقام ما افتد

۱؎ مآثر رحیمی ج ۱ ص ۵۰۰، کلکتہ، اکبرنامہ ج ۱ ص ۲۹۴، بنگال ایشیاٹک سوسائٹی، ۲؎ روز روشن (مولفہ نواب صدیق حسن) میں یہ مصرع اس طرح درج ہے، این زمان از ناحفاظی رو بہ من کردہ است ۳؎ مخزن الغرائب میں ہے، دارم استدعا ز شاہنشہ کہ با من آن کند، ۴؎ مخزن الغرائب ا ر جن، بدایونی، ج ۱، ص ۴۵،

۶؎ اکبرنامہ ج ۱، ص ۲۰۵،

ملا بدایونی لکھتے ہیں کہ ہمایوں جب ایران پہنچا تو اس نے شاہ ایران کو ایک رباعی لکھ بھیجی، جس کا ایک شعر شاید شاہ ایران کے مذکورۂ بالا شعر کا جواب تھا،

شاہاں ہمہ سایۂ ہما می خواہند — بنگر کہ ہما آمدہ در سایۂ تو[1]

شاہ طہماسپ نے ہمایوں کا پرجوش خیر مقدم کیا اور بھائی بنا کر اپنے یہاں رکھا، مگر امیروں اور درباریوں کو یہ بات ناگوار گذری، اور رفتہ رفتہ شاہ کے کان بھر کے ہمایوں کو اس سے برگشتہ کر دیا، ہمایوں مصیبت کا مارا تھا، بیرم خاں کی صلاح کے موافق احتیاط کو مد نظر رکھا، اسی دوران میں شاہ طہماسپ کی بہن سلطانہ بیگم اور قاضی جہاں قزوینی اور حکیم نور الدین ایسے حاشیہ نشینوں نے باہم یک رائے ہو کر یہ کوشش شروع کی کہ شاہ کے دل سے غبار کدورت دور ہو جائے، چنانچہ ایک روز سلطانہ بیگم نے ہمایوں کی یہ رباعی پڑھ کر سنائی،

ہستیم ز جاں بندۂ اولاد علی — ہستیم ہمیشہ شاد بایاد علی

چوں سر ولایت ز علی ظاہر شد — کردیم ہمیشہ ورد خود نادِ علی

شاہ طہماسپ اس رباعی کو سن کر بے حد خوش ہوا، اور ہمایوں کی جانب سے اس کے دل کی کدورت جاتی رہی،[2]

اسی غریب الوطنی کے زمانہ میں ہمایوں نے تبریز کی سیر کی، عہد ماضی کے آثار قدیمہ اور سیر گاہیں دیکھیں، ان کو دیکھ کر دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ اس کی نظروں کے سامنے پھر گیا اور اس وقت یہ رباعی پڑھی،[3]

افسوس کہ سرمایہ یکسر بیروں شد — در دست اجل بسے جگرہا خوں شد

کس نامد ازاں جہاں کہ تا پرسم ازو — کاحوال مسافران عالم چوں شد

[1] بدایونی ج ۱ ص ۴۵۵، [2] فرشتہ ص ۲۱۵، [3] اکبر نامہ ص ۲۰۱،

ہمایوں کی قسمت نے جب ایک بار پھر ساتھ دیا تو وہ از سرِ نو فوج ترتیب دے کر کامران کے خلاف قندھار پر حملہ آور ہوا، اس وقت ہمایوں کا رفیق بیرم خان قلعہ قندھار کے محاصرہ میں ساتھ تھا، قلعہ قندھار بہت ہی مستحکم تھا، اس کی دیوار کا عرض سات گز تھا، اس کو تسخیر کرنا آسان نہ تھا، لیکن بیرم خاں کی سپہگری اور جوانمردی سے آخر میں یہ فتح ہوا، ہمایوں نے اس مسرت میں ایک نظم کہی اور بیرم خاں کے پاس بھیجدی، وہ نظم حسب ذیل ہے۔[۱]

باز فتحے ز غیب روئے نمود	کہ دلِ دوستاں ازاں بکشود
شکر اللہ کہ باز شادانیم	بہ رخ یار دوست خندانیم
دوستاں را بکام دل دیدیم	میوہ باغ فتح را چیدیم
روزِ نو روزِ بیرم است امروز	دل احباب بے غم است امروز
شاد باد ا ہمیشہ خاطر یار	غم نہ گردد بگرد دیار و دیار
ہمہ اسباب عیش آمادہ است	دل بفکر و جہالت افتادہ است
گوش خرم شود ز گفتارت	دیدہ روشن شود ز دیدارت
در حریم حضور شاد بہم	بنشینیم خرم و بے غم
بعد ازیں فکر کار ہند کنیم	عزم تسخیر ملک سند کنیم

ہمایوں نے اس مثنوی کے حاشیہ پر حسب ذیل رباعی بھی لکھی،

اے آنکہ انیس خاطر محزونی	چوں طبع لطیف خویشتن موزونی
بے یاد تو من نیم زمانے ہرگز	اما تو بیاد من ندانم چونی

بیرم خاں نے اس کے جواب میں یہ لکھ بھیجا،

---

[۱] خافی خاں حصہ اوّل ص ۱۲۵

اے آنکہ بذات سایۂ بیچونی | از ہرچہ ترا وصف کنم افزونی
چوں میدانی کہ بے تو چوں میگذرد | چوں می پرسی کہ در فراقم چونی[1]

بیرم خاں کے ایک خط کے جواب میں ہمایوں نے یہ رباعی لکھی تھی،

اے یار لطیف طبع پاکیزہ گہر | وی عمدہ اہل فضل و ارباب ہنر
بکشای نظر امید کز نور حضور | می آرمت از تیرگی ہجر بدر[2]

مقیم نامی ایک شخص کے متعلق اس نے حسب ذیل شعر کہا،

مقیم شد غم تو در دلم چہ چارہ کنم | عجب غنیمت اگر دل زسنگ خارہ کنم[3]

ہمایوں کی وفات کے دن جب قریب آئے تو ایک دن اس نے کہا کہ آج صبح کی نماز کے بعد عالم غیب نے یہ رباعی سنائی

یارب بکمال لطف خاصم گردان | واقف بحقائق خواصم گردان
از عقل جفا کار دل افگار شدم | دیوانہ خود خوان و خلاصم گردان

اور اس کو پڑھ کر رونے لگا، ان دنوں ہمیشہ وہ کہتا کہ عالم فانی سے بڑے موت آتی ہے
چنانچہ محل کے طاق پر شیخ آذری کا یہ مطلع نہایت خوشخط لکھا یا تھا،

شنیدہ ام کہ بریں طارم زراندود است | خطے کہ عاقبت کار جملہ محمود است[4]

ظاہر ہے کہ ہمایوں کے شعر و سخن کے ذوق کے سبب اس زمانہ کے شعرا شاہی جود و کرم سے ہمیشہ فیضیاب ہوتے رہے ہوں گے، بدایونی کا بیان ہے،

"شعراے بسیار نادرۂ روزگار از دامن او برخاستہ اند"[5]

ہمایوں ان شعرا کو اپنی علم پرور صحبتوں میں ہمیشہ شریک رکھتا، اور شعر و شاعری کی مجلسیں

---

[1] ماثر الامرا ج ۱، ص ۳۰۲ [2] ریاض الشعرا قلمی بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ [3] لطائف نامہ فخری ص ۳۱۲ شائع کردہ اورینٹل کالج، لاہور [4] اکبر نامہ ص ۳۶۳، ۳۶۲ [5] بدایونی ص ۴۶۹ ج ۱

برابر گرم رہتیں، ہمایوں کی نکتہ سنجی، دقت نظر اور معانی آفرینی کی جلا ان صحبتوں میں خوب ہوئی، جس کے باعث وہ اکثر اساتذہ کے کلام میں بلاتکلف اصلاحیں دیتا تھا، ایک بار ملا حیرتی نے اس کے سامنے یہ شعر پڑھا،

ہمچو پروانہ بشمعے سرو کار است مرا　　　پس اگر پیش روم بال و پرم می سوزد

ہمایوں نے دوسرے مصرعہ میں یہ اصلاح دی،

می روم پیش اگر بال و پرم می سوزد

ملا حیرتی اس اصلاح سے بہت محظوظ ہوئے[۱]

جاہی تیمان نے شاہ محمد خاں شاپوروالی کابل سے ناراض ہو کر اس کی ہجو کہی، ہمایوں کے سامنے وہ ہجو پڑھی گئی:۔

شاعر شاہ ہمایونم و خاک درگہ　　　می زنندگو کہ شاعرم طعنہ بمہ

خسرو شوم و ابیات خوشم غیل سپہ　　　دیدم از قحبہ زنی ظلم نہ حیرم و نہ گنہ

پارہ کاغذ اگر از ہذیاں گشتہ سیہ　　　سوئے ہجوش اگر اندیشہ شود در رہ بہ

غرض آنست کہ ایں خرصفتان ابلہ　　　عزت و حرمت ایں طائفہ دارند نگہ

وائے آنست کہ بخیل شعرا بستیزد　　　ہر کہ با ما بستیزد بہ بلا بستیزد

آخری مصرعہ کو سنکر ہمایوں نے فی البدیہہ کہا کہ اس کو اس طرح پڑھو،

ہر کہ با ما بستیزد بخدا بستیزد

ابوالفضل نے اکبر نامہ میں ہمایوں کی شاعری کے ذوق کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے

و توجہ عالی بہ شعر و شعرا نیز داشتند۔ و از انجا کہ طبع موزوں از خصائص فطرت سلیم است

---

[۱] مآثر رحیمی ص ۶۱۲ ج ۱، و اکبر نامہ ج ۱ ص ۲۲۱

در خلالِ اوقات و اردات قدسی را (چہ از حقیقت وچہ از مجاز) در سلک نظم می کشیدند و دیوان شعر آنحضرت در کتابخانہ عالی موجود است" (ج ۱ ص ۳۶۸)

ابوالفضل کو ہمایوں کی حسب ذیل رباعیاں پسند تھیں، اسی لیے اس نے اکبرنامہ میں ان کو نقل بھی کیا ہے،

اے دل مکن اضطراب در پیش رقیب (۱) حال دل خود مگوئے باہیچ طبیب
کاریکہ ترا باآں جفا کار افتاد بس قصہ مشکل است و بس امر عجیب

اے دل ز حضور یار فیروزی کن (۲) در خدمت او بصدق دلسوزی کن
ہر شب بخیال دوست خرم بنشیں ہر روز بوصل یار نوروزی کن

اے آنکہ جفای تو بعالم علم است (۳) روزیکہ ستم نہ بینم از تو ستم است
ہر غم کہ رسد از ستم چرخ بدل مارا چو غم عشق تو باشد چہ غم است

فرشتہ نے تاریخ فرشتہ میں ہمایوں کے دیوان سے اپنی پسند کی چند غزلوں کے اشعار نقل کئے ہیں، (ص ۲۳۳ ج ۱)

گذشت از دل سرگشتہ ناوک ستمش نماند بر من دلدادہ لذت المش
بقصد کشتن عشاق گر کند میلے عجب نباشد از اخلاق و شیوہ کرمش
کراست زہرہ قرب حریم حرمت او کہ جبرئیل امیں نیست محرم حرمش
اگر بپرسش عشاق می نہد قدمے ہزار جان گرامی فدائے ہر قدمش

ولہ

خوش آنکہ باخیال تو عمری نشستہ بودم در شوق سرو قدت از جائے جستہ بودم
علیم مکن کہ گفتم موئے ترا پریشاں در شرح جعد زلفت پیوستہ بستہ بودم

در شرح غنچہ او ہرگز نگفتہ حرفے ‌ ‌ ‌ لب را دراں حکایت پیوستہ بستہ بودم
عمدا کہ چوں ہمایوں در حال وصل غنچہ ‌ ‌ ‌ با دوست در حکایت از خویش رفتہ بودم

ولہ

داغ عشق تو بر جبین من ست ‌ ‌ ‌ خاتم لعل تو نگین من ست
تا نشستم چوں خاک بر در تو ‌ ‌ ‌ پشت بام فلک زمین من ست
ہر کجا شاہ و شہریاری بود ‌ ‌ ‌ ایں زماں بندۂ کمین من ست
خط مشکیں بصفحۂ گلفام ‌ ‌ ‌ آیت رحمت مبین من ست

ولہ

من اشک رواں چو گنج قاروں دارم ‌ ‌ ‌ گلگوں درون کیسہ ز افیوں دارم

مختلف دور کے تذکرہ نگاروں نے ہمایوں کی سخن گستری کی داد دی ہے، اور اس کے پسندیدہ اشعار سے اپنے تذکروں کے صفحات مزین کئے ہیں، مرزا علاء الدولہ قزوینی نے نفائس المآثر (۹۸۳ھ) میں ہمایوں کی حسب ذیل غزلیں اور ایک رباعی نقل کی ہے،

کار من با ہوشے افتادہ است (۱) درد و غم آتشے افتادہ است

خانہ ام روشن شد از روئے حبیب ‌ ‌ ‌ پرتوے زمہوشے افتادہ است
دل مرا سے جان بہر سو می کشد ‌ ‌ ‌ تا دلم با دلکشے افتادہ است
کام دل خواہم گرفتن ایں زماں ‌ ‌ ‌ چوں بدستم سرخوشے افتادہ است
عقل و ہوش از من مجوئید اے بتاں ‌ ‌ ‌ چوں ہمایوں بیہشے افتادہ است

وصف لعل تو بہ زبان منست (۲) آتشے در میان جان منست

هر که باشد بمجلس رندان — بے خود از نعره و فغان بنشست
آنچه در وصف حسن او گویند — جمله در شرح و در بیان بنشست

رباعی

اے آنکه زیاد تو دلم باشد شاد — بے یاد تو خاطرم دمے شاد مباد
روزیکه زیاد تو کنم صد فریاد — آیا ز من غمزده است آید یاد

سفینۂ خوشگو مولفہ بندرا بن میں یہ رباعی مرقوم ہے،

یارب که رضاے دل درویشان ده — این ریش دل شکسته را درمان ده
حدیثیست که گویم این مده یا این ده — چیزے که رضاے تو در آنست آن ده

ریاض الشعرا (۱۱۶۱ھ) میں علی قلی داغستانی نے منجملہ اور اشعار کے ایک رباعی یہ بھی لکھی ہے :-

انرو که فلک بقبضۂ قدرت اوست — داده است ترا دو چیز کان هر دو بدست
هم سیرت هم آنکه دوست دارد کس را — هم صورت آنکه ترا دارد دوست

روز روشن میں نواب صدیق حسن نے ہمایوں کی شاعری کا ذکر انہیں لفظوں میں کیا ہے۔ احمد علی سندیلوی مخزن الغرائب میں رقمطراز ہیں،

بادشاه بود ملکی ملکات و بجمیع فضائل و کمالات صوری و معنوی آراسته و در علوم هیات و نجوم و سائر علوم عربیه بے نظیر و مربی اهل فضل و کمال و مرجع اهل تقوی و صلاح و بشعر و شعرا مائل و خود شعر نیکو گفتے،

---

* History of persian Literature and Language at the Mughal court by M. Ghani.

مخزن الغرائب میں بہت سے اشعار منقول ہیں، ان میں سے دو شعر یہ ہیں،

دریا دلیم و دیدۂ ما معدن درست | کردست ما تہی است و چشم ما پر است

این نہ سرو است کہ در باغ قد افراختہ است | شمع سبزیست کہ پروانہ او فاختہ است

اوپر ذکر آچکا ہے کہ ہمایوں صاحب دیوان بھی تھا، یہ دیوان کتب خانوں میں گم رہا، مگر اب یہ امر باعث مسرت ہے کہ استاذی المحترم جناب سید حسن عسکری صاحب زاد لطفہٗ (پروفیسر تاریخ، پٹنہ کالج، پٹنہ) نے اپنی مساعی جمیلہ سے یہ دیوان اپنے وطن مالوف کھجوا (ضلع سارن) کے کتب خانہ سے ڈھونڈ نکالا ہے، اس پر استاذی المکرم جناب حافظ شمس الدین صاحب (شعبۂ فارسی، پٹنہ کالج) نے ایک سیر حاصل مقالہ لکھکر معاصر (۳۹ء) پٹنہ میں شائع کیا تھا، راقم الحروف کی نظر سے بھی یہ دیوان گذرا ہے، خیال تھا کہ جناب حافظ صاحب موصوف اس دیوان کو طبع کرا کے دلدادگانِ علم و ادب کو ممنون فرمائینگے مگر ابھی تک یہ زیور طباعت سے آراستہ نہ ہو سکا، اس میں سے بعض چیزیں ہم ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں،

ایک حمد ملاحظہ ہو:-

اے حسن تو دیباچہ مجموعۂ معنی | لامع شدہ از روے تو انوار تجلی

حاشا کہ جدا از تو توان زیست ولیکن | دارم بخیالے ز جمال تو تسلی

در مملکت حسن توئی شاہ ولایت | کردم بولاے تو کنون روے تولی

تا حسن تو در جلوہ گری گشت از آن شد | وامق پے عذرا شد و مجنون پے لیلی

حقانیت سے لبریز بہت سی رباعیاں ہیں، مثلاً

اے وادی لامکاں مکانت | دور ازل و ابد زمانت

اے ہستی بے نشان مطلق — شد ہستی بے نشان نشانت

اے آنکہ مقید زمان و زمنی — کس رانبود لائق ذاتت سخنی
جانے کہ بنی حق ثنای تو بگفت — کے شرح صفات تو کند ہمچو منی

اے خالق جملہ خلائق — تو مصدر کل و خلق مطلق

حالتے روی نمود از لاریب — کاندر آں نہ شہادتست نہ غیب

صوفیانہ رنگ کی بھی رباعیاں ہیں مثلاً

اے آنکہ در دخول بر خود بستی — با تو بہ وزہد عافیت بنشستی
ہرگز نکند فائدہ ایں طور ترا — از خود چو گذشتی بخدا پیوستی

مایم صفات حق مختار ودود — ظاہر شدہ از آئینۂ نور شہود
چوں یک شجریم در باغ وجود — ما فرع وجودیم و خدا اصل وجود

حمد و نعت سے ملے جلے مطالب کی بھی رباعی ملاحظہ ہو:

من ہیچ نیم ہیچ ملیدا رم نام — بر فضل تو نانیم شب و روز مدام
آنگاہ بحق حرمت مستر لام — بر بندہ ہمایوں برساں فیض تمام

کچھ خالص نعتیہ رباعیاں بھی ہیں، مثلاً

اے سرور کائنات در اصل وجود — حقا کہ توئی حبیب حی معبود
برخیز نما جمال عالم آرا — زیرا کہ توئی ز خلق عالم مقصود

سلطان سریر انبیائی تو — خورشید سپہر اولیائی تو
ہر دم ہمہ پیرو طریق تو اند — رہ شرح بخلق رہنمائی تو

پند و موعظت پر بھی رباعیاں ہیں، مثلاً

اے آنکہ طلبگار رہ حقیقی | درشیوۂ صدق و راستی صدیقی
زنہار کہ غیر حق نہ بینی ہرگز | چوں بینی تو کافر و زندیقی

خواہی کہ جہاں بطبع تو راست شود | آں چیز کہ خواستی ہماں خواست شود
باید کہ تو با طبع جہاں راست شوی | تا ہر چہ خدا خواستہ آں خواستہ شود

ہمایوں کی مزید ایک دو غزلوں کی سادگی اور خیالات کی برجستگی سے بھی ناظرین محظوظ ہوں،

حجابست از نور درپیش ما | ازاں گشتہ بیگانہ ایں خویش ما
تو شاہی وحسن و صد سلطنت | بلائیست بر جان درویش ما
ملاحت نمودی ز جاں سوختی | نمک ریختی تازہ بر ریش ما
وفا می کنی و جفا می کشیم | نباشد جز ایں شیوۂ کیش ما
ہمایوں بروئے تو چوں بنگرد | حجابست از نور درپیش ما

سراسر شادیٔ عالم بیک غم نمی ارزد | بزن دم عمر صد سالہ بیک ماتم نمی ارزد
غنیمت داں جوانی را کہ ایام خوشست اما | ولے با عالم پیری و پشت خم نمی ارزد
کو آں تخت سلیماں و کو آں احوال مونش | چہل خانہ زرقارون بیک جو ہم نمی ارزد
ہزودی جنت الماوی بنودی ایں ہمایوں را | کہ جنت ہم بسیر گرد اتی آدم نمی ارزد

دربار کے شعراء اوپر ذکر کیا جا چکا ہے کہ ہمایوں کے دامن دولت سے بہت سے شعراء منسلک تھے، ہم ان میں سے بعض ارباب کمال کا اجمالی ذکر کرتے ہیں،

جنوبی۔ مولانا جنوبی بدخشاں کے بہت ہی ممتاز اور بلند پایہ شاعر تھے، ہمایوں نے جب شہزادگی کے زمانہ میں اس جگہ کو تسخیر کیا، تو وہ ہمایوں سے وابستہ ہو گئے، بدخشاں کی

فتح پر ہمایوں کی خدمت میں ایک قصیدہ پیش کیا جس میں ذوالفقار شروانی اور سلمان ساؤجی کے قصائد کی طرح بہت سی صنعتوں کو ملحوظ رکھا، اس قصیدہ کی ترتیب یہ تھی :-

شہنشاہا رخ تو لالہ و نسریں لب تو جاں — ہمی بینم لب تو غنچۂ رنگیں شدہ خنداں
نمی گویم خط تو سبزہ و ریحاں خد تو گل — شود ظاہر قد تو فتنۂ دوراں دم جولاں

ملا عبدالقادر بدایونی کا بیان ہے کہ صنعت توشیح سے مصرعوں کے مجموعے سے یہ مطلع ہو جاتا ہے،

شہنشاہ دیں پادشاہ زماں — زبخت ہمایوں شدہ کامراں

اور اگر ہر مصرع کے خط کشیدہ الفاظ کو ترتیب دیا جائے تو یہ مطلع ہو جائے گا،

رخ تو لالہ و نسریں خط تو سبزہ و ریحاں — لب تو غنچۂ رنگیں قد تو فتنۂ دوراں

اور اگر صنعت عکس کے ساتھ یہ شعر پڑھا جائے تو مطلع کی تشکیل اس طرح ہو جائے گی،

خط تو سبزہ و ریحاں رخ تو لالہ و نسریں — قد تو فتنۂ دوراں لب تو غنچۂ رنگیں

اسی طرح قصیدہ میں معما، اظہار مضمر اور تاریخ گوئی کا بھی خیال رکھا گیا ہے۔

نادری۔ مولانا نادری سمرقند سے آگرہ آئے، ہمایوں کی قدر دانی سے ان کی عزت امارت میں بدل گئی، ملا عبدالقادر بدایونی کے قول کے مطابق وہ نہ صرف ایک بلند پایہ شاعر بلکہ جید علماء کامل فضلاء اور نوادر روزگار میں سے تھے، نظمیں، رباعیاں، اور قصائد کہنے میں مہارت تامہ رکھتے تھے، ہمایوں کی شان میں ایک قصیدہ کہا ہے جس میں اس کی شریعت نوازی، علم پروری اور ریاضی دانی کی داد دی ہے، اس کے کچھ اشعار یہ ہیں :-

المنۃ للہ کہ بجمعیت خاطر — باعیش نشستند حریفان مخاطر
خاقان معظم شہ جم قدر ہمایوں — کش ہست قوی دست دل از قدرت قادر

از دانش او دانش اصحاب بصیرت　　وز بینش او بینش ارباب بصائر

منہی چو حرام است در احکام شریعت　　اقبال نماید بمراعات اوامر

ہر نکتۂ حکمت کہ لب لعل تو فرمود　　مشہور جہاں شد چو حدیث متواتر

مبنی است کہ شرح کتب فن ریاضی است　　تصنیف متین تو از ایجاز دوایر

احصاے کمالات تو کردن نتوانم　　کاندر ہمہ فنہا شدہ کامل و ماہر

مولانا نادری کا انتقال ۹۶۶ھ میں ہوا، میر امانی کابلی نے اس مصرع سے تاریخ وفات نکالی،

گفتا خرد کہ رفت یکے از سخن وراں[۱]

فارغی۔ مولانا شیخ ابو الواجد فارغی بن شیخ وجیہ الدین ہرات کے رہنے والے تھے، شیخ زین الدین کے رشتہ دار تھے، دونوں سرزمین ہرات سے آکر ہندوستان کی طرف متوجہ ہوئے جہاں وہ بابر اور ہمایوں کے جود و کرم سے سیراب ہوئے، شیخ زین الدین کا ذکر بابر کے سلسلہ میں آچکا ہے، شیخ فارغی بہت ہی خوش طبع، شیریں زبان اور بذلہ سنج تھے، ہمایوں اور بیرم خان خانخانان کی شاہانہ اور فیاضانہ توجہ سے آسودہ زندگی بسر کرنے کے لائق ہو گئے تھے، مگر درویشانہ صفت کے حامل تھے، اس لیے شعر و شاعری میں وہی رنگ جھلکتا ہے،

رشتۂ جمعیت اے یاران ہمدم گسلید　　در پریشانی پریشا نیست از ہم گسلید

چو تیر خود کشتی از سینہ ام مگذار پیکاں را　　مراد ل دہ کہ تا مردانہ در راہت دہم جاں را

۹۴۰ھ میں بمقام آگرہ انتقال ہوا، اور شیخ زین الدین وفائی کے پہلو میں سپرد خاک ہوئے،

---

[۱] منتخب التواریخ ج ۱ ص ۴۷۵، [۲] ایضاً ص ۴۷۶ و صبح گلشن ص ۳۰۶ و ۳۰۵،

طاہر دکنی۔ شاہ طاہر خواندی دکنی عراق کے رہنے والے تھے، اپنے کو شاہ طہماسپ کا عزیز کہتے تھے، ہندوستان آکر ہمایوں کے دربار سے وابستہ ہوئے، علم نجوم کے بھی ماہر تھے، چنانچہ ہمایوں کے فلکیاتی ذوق کے مطابق انوری کے تتبع میں ایک قصیدہ کہا ہے، جس کے دو شعر یہ ہیں:-

حمل چہر چو آید بہ شبستان حمل	لالہ فانوس برافروزد و نرگس مشعل
کوہ از در دسر بہمن و دی آگنوں	شوید از ناصیہ اش ابر بہاری صندل

شاہ طاہر اہل بیت سے تعلق رکھتے تھے، ہمایوں کے دربار کے علماء سے مناظرہ میں کچھ تلخی پیدا ہو گئی تو اپنے چھوٹے بھائی شاہ جعفر کے پاس دکن چلے گئے، جہاں برہان نظام شاہ اول والی احمد نگر نے ان کی بڑی پذیرائی کی، اور سلطنت کے عہدہ پر مقرر کیا، برہان نظام شاہ نے شاہ طاہر سے متاثر ہو کر ان ہی کا مذہب اختیار کر لیا، شاہ طاہر کا شمار دکن کے برگزیدہ بزرگوں میں کیا جاتا ہے، ۹۵۲ھ میں ان کا انتقال ہوا، تاریخ وفات "تابع اہل بیت بودہ" سے نکلتی ہے، فن شعر و شاعری میں ان کا کمال بدرجہ اتم تک پہنچ گیا تھا، منقبت، قصائد، اور مثنوی کہنے میں اپنی شاعری کا جوہر دکھاتے تھے۔[1]

ایوب۔ خواجہ ایوب ماوراء النہر سے ہندوستان آیا، باپ کا نام خواجہ ابوالبرکا فراقی تھا، جو فضیلت اور علمی پایہ کے لحاظ سے اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے، وہ سلمان ساوجی کی تقلید میں قصائد کہتے تھے، بابر کے زمانہ میں ہندوستان آئے، اور اس کے خوان کرم سے متمتع رہے، ہمایوں نے بھی ان کی قدردانی کی اور ان کے لڑکے خواجہ ایوب کو ندیم خاص بنایا، خواجہ ایوب میں فن شاعری کے تمام کمالات موجود تھے، مگر وہ اوصاف حمیدۂ

---

[1] منتخب التواریخ ج ا ص ۴۸۳۔

حاصل نہ تھا، ہمایوں نے اس کی طبیعت کی کجروی کے سدباب کے لیے شاہی بیگمات میں سے ایک کو اس کے حبالۂ عقد میں بھی دیا، مگر طبیعت اصلاح کی طرف مائل نہ ہوئی، ہمایوں نے بالآخر حج کعبہ کے لیے روانہ کیا، مگر اس سعادت سے بھی وہ محروم رہا، اور راستہ سے لوٹ کر سلطان بہادر گجراتی کا وظیفہ خوار ہوگیا، جس نے اس کی مزاج داری بھی کی، شاعری میں تخلص کبھی ایوبی اور کبھی فراقی کرتا تھا، ایک غزل کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں،

اے شاخ گل کہ ہمچو سہی قد کشیدۂ	بر گرد لب خطی ز زمرد کشیدۂ
قدرت برآمدہ چو الف مد ظلمہ	وز ابروان فراز الف مد کشیدۂ
بر حرف دیگراں زدۂ قرعۂ قبول	بر حرف عاشقاں قلم رد کشیدۂ
تشویش میکشی مکش اے نقشبند چین	نابد چو چشم و زلفش اگر صد کشیدۂ
از دولت وصال فراقی طمع مبر	جور و جفاے یار چو بے حد کشیدۂ

کاہی۔ قاسم کاہی عرف میاں کالے، کابل سے ہمایوں کے عہد میں ہندوستان آیا، مختلف علوم و فنون مثلاً تفسیر، کلام، تصوف، ہیئت، موسیقی اور شاعری میں بڑی دستگاہ رکھتا تھا، ہمایوں کی نظر میں بڑی محبوبیت حاصل کی تھی، چنانچہ اس نے ہمایوں کی شان میں بہت سے قصائد اور قطعات کہے ہیں، ایک قصیدہ میں ہمایوں کے ذوق ہیئت کی بھی ترجمانی کی ہے، فن شاعری میں معما اور تاریخ گوئی میں بڑی مہارت حاصل کی تھی، وہ اپنے عہد کے شعراء میں اسلیے ممتاز تھا کہ اس کی شاعری میں سادگی کے ساتھ بڑی موسیقی تھی، ہمایوں کی وفات شیر شاہی قلعہ کے اندر زینے سے گر کر ہوئی تو اس نے یہ قطعہ کہکر تاریخ نکالی،

ہمایوں بادشاہ آں آفتابی	کہ فیض شامل او عام افتاد
بناے دولتش چوں یافت رفعت	اساس عمرش اندر انجام افتاد

چو خورشید جہانتاب از بلندی — بیاباں در نماز شام افتاد
جہاں تاریک شد در چشم مردم — خلل در کار خاص و عام افتاد
پے تاریخ او کاہی رقم زد — ہمایوں پادشاہ از بام افتاد

یہ قطعہ بہت مقبول ہوا، اکبری دور میں کاہی فتنۂ دین الٰہی سے ملوث ہو گیا تھا، اس لیے ملا عبد القادر بدایونی اس کے مذہبی عقائد کو مطلق پسند نہ کرتے تھے، اور اپنی منتخب التواریخ (جلد ۳ ص ۱۷۵) میں اس کے لیے سخت الفاظ استعمال کیے ہیں پھر بھی وہ معترف ہیں کہ شعر و سخن کی وادی میں اس کا کوئی شریک نہ تھا، اور رقمطراز ہیں کہ اس کی دو غزلیں اہل سلوک، اور بزم ملوک میں بڑی مقبول تھیں، ان دونوں غزلوں کا مطلع یہ ہے:-

مرغ تا بر فرق مجنون پر زدن انگیز کرد — آتش سودائے لیلیٰ بر سر او تیز کرد
چوں ز عکس عارضش آئینہ پر گل شود — گرد راں آئینہ طوطی بنگرد بلبل شود

اس کا دیوان عام طور سے پسند کیا جاتا تھا، بوستاں کے جواب میں ایک مثنوی گل افشاں بھی لکھی۔[۱]

امان اللہ - شیخ امان اللہ پانی پتی عالم بھی تھے، صوفی بھی اور شاعر بھی، ہمایوں کے دربار کے ممتاز شعراء میں ان کا شمار ہوتا تھا، تاریخ گوئی میں کمال حاصل تھا۔[۲]

جلالی - مولانا جلالی ہندی، فارسی اور ہندی دونوں میں اشعار کہتے تھے۔[۳]

میر ویسی - ہمایوں کے درباری امراء میں سے تھا، سخن سنج بھی تھا۔ اور شعراء کا سرپرست بھی، اس کے دولتکدہ پر شعر و سخن کی مجلسیں برابر منعقد ہوتی تھیں۔[۴]

حیدر - حیدر تونیائی شعر و شاعری کے علاوہ نغمہ و موسیقی کے لیے بھی مشہور تھا۔[۵]

۱؎ منتخب التواریخ جلد سوم ص ۱۷۵، ۲؎ ایضاً، ۳؎ ایضاً، ۴؎ ایضاً، ۵؎ منتخب التواریخ جلد اول ص ۴۸۰۔

ضمیری۔ مولانا ضمیری بلگرامی بھی دربار کے ممتاز شاعر تھے، مثنوی اور قصائد لکھنے میں بڑی شہرت حاصل کی تھی،

موجی۔ قاسم خاں بدخشی المتخلص بہ موجی ہمایوں کے امراء میں سے تھا، یوسف زلیخا کے تتبع میں ایک مثنوی لکھی جس میں چھ ہزار اشعار تھے[۱]

فضلاء | ہمایوں کے دربار کے فضلاء کی تعداد بھی شعراء سے کم نہیں، وہ ان سے برابر اختلاط رکھتا تھا، طبقات اکبری میں ہے:۔

در صحبت آں مقتدائے جہاں ہمہ وقت فضلاء و علماء و اکابر بودند و ہمہ اندر دل شب تا بصبح بصحبت می گذشت، و نہایت آداب در مجلس آنحضرت مرعی می بود، ہمہ وقت بحث علمی مذکور مجلس بہشت آئین می گشت، ارباب فضل و ہنر را در عہدش رونق تمام پدید آمد (ج ۲ ص ۸۴، ۸۵)

ہم اختصار کے ساتھ ان ارباب علم کا ذکر کر کے ان کی یاد کو تازہ کرتے ہیں، اس صف میں سب سے پہلے غیاث الدین محمد المعروف بہ خواندامیر پر نظر پڑتی ہے، یہ روضۃ الصفا کے مصنف میر خواند کا نواسہ تھا، باپ خواجہ ہمام الدین محمد بدخشاں کے والی سلطان محمود کا وزیر تھا، خواندامیر ہرات میں پیدا ہوا، جو اس وقت علوم و فنون کا گہوارہ بنا ہوا تھا، اسی مدینۃ العلم میں خواندامیر نے ہوش سنبھالا، ہرات کے سلطان غازی حسین بن منصور کا دربار شعراء اور علماء کا مرجع تھا، اس کے وزیر میر علی شیر کی علم نوازی اور معارف پروری سے یہ دربار اور بھی جگمگا اٹھا تھا، خواندامیر کی علمی صلاحیت و لیاقت کی شہرت سنکر میر علی شیر نے اس کو دربار کے زمرۂ فضلاء میں شریک ہونے کی دعوت دی، جس کو اس نے قبول کیا، یہاں رہ کر اس نے فن تاریخ نویسی کا گہرا مطالعہ کیا، اور اپنے علمی شغل بھی جاری رکھے، میر علی شیر کی علمی صحبتوں میں اس کی ذہنی جلا اچھی طرح ہوئی، اور اس شہریار علم

---

[۱] منتخب التواریخ ج ۳ ص ۳۲۵،

کی ہمت افزائی سے اس نے اپنی پہلی کتاب مآثر الملوک لکھی، جس میں ملوک و اولیاء کے اقوال، پند و نصائح کے علاوہ خلفائے بنی امیہ و بنو عباس کے ساتھ ساتھ طاہریوں، سامانیوں اور غزنویوں کی تاریخ بھی ہے، میر علی شیر کے نام سے اس نے اپنی ایک دوسری کتاب خلاصۃ الاخبار فی بیان احوال الاخیار معنون کی جو روضۃ الصفا کی تلخیص ہے، میر علی شیر کی سوانح حیات بھی مکارم الاخلاق کے نام سے لکھی، سلطان حسین کے ایک دوسرے وزیر خواجہ کمال الدین محمود کے نام سے دستور الوزراء معنون کی، اس میں آغاز اسلام سے لیکر ۹۱۰ھ تک کے ممتاز وزراء اور سلاطین کے حالات ہیں، یہ کتاب ۹۱۵ھ میں تیار ہوئی، اسی زمانہ میں خواند امیر نے اخبار الاخیار، جواہر الاخبار اور غرائب الاسرار قلمبند کیں، جن میں شاید صوفیانہ مسائل پر مباحث اور اولیائے عظام کے کوائف ہیں، روضۃ الصفا کی تکمیل کے لیے خواند امیر نے اس کی ساتویں جلد ۹۲۹ھ میں ختم کی جس کی اہمیت آج بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی ہے، اسی سال اس نے فن انشاء پر نامۂ نامی تحریر کی، سیاسی انقلابات سے ہرات جب ایران کے حکمراں شاہ اسمٰعیل کے زیر نگیں ہو گیا، تو خواند امیر اس علم دوست بادشاہ کے متوسلین میں سے ہو گیا، خواند امیر اس بادشاہ کے الطاف و اکرام کا معترف ہے، وہ کچھ دنوں جرجان اور غرجستان کے والی مرزا محمد زمان کی فیاضیوں اور زرپاشیوں سے بھی سیراب ہوتا رہا، شاہ اسمٰعیل صفوی کے وزیر کریم الدین حبیب اللہ کی سرپرستی میں اس نے حبیب السیر فی اخبار افراد البشر تین جلدوں میں ترتیب دی جو ابتدائے عالم سے ۹۳۰ھ تک تاریخی واقعات پر مشتمل ہے، اور اب تک اہم تاریخوں میں شمار کی جاتی ہے، اس کتاب کے ختم ہونے سے پہلے حبیب اللہ کا انتقال ہو گیا جس کے بعد خواند امیر کے دن اچھے نہیں رہے، اسی لیے ۹۳۳ھ میں وہ ہرات سے قندھار چلا آیا، قندھار سے آگرہ ۹۳۵ھ میں بابر کے پاس پہنچا، بابر اس کی علمی شہرت سے واقف ہو چکا تھا، اس لیے بڑی گرمجوشی اور عقیدت سے اس کا استقبال کیا، اور اپنا ندیم خاص

بنایا، وہ بنگال کی مہم پر گیا، تو خواند امیر بھی اس کی معیت میں تھا، بابر کی وفات کے بعد ہمایوں نے
بھی اس سے وہی عقیدت قائم رکھی، اور اس سے عزت و احترام سے پیش آتا تھا، تاریخ عالم
پر جو اس کو قدرت حاصل تھی، اس سے متاثر ہو کر ہمایوں نے اس کو امیر مورخ کا خطاب دیا،
خواند امیر کو بھی ہمایوں سے گہرا لگاؤ اور اخلاص پیدا ہو گیا تھا جس کا اظہار اس نے مختلف قصائد
قطعات اور مثنوی میں بھی کیا ہے، ان قصائد سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک بلند پایہ شاعر
بھی تھا، ہمایوں کی فرمایش پر اس نے **قانون ہمایونی** لکھی جس میں ہمایوں کے مبدعات
اور "اختراعات" کا ذکر کیا ہے، یہ کتاب ہمایوں کے دور کے تمدن اور مصنوعات سے واقفیت
حاصل کرنے کے لیے بہت مفید سمجھی جاتی ہے، اس کے کچھ حصے ابو الفضل نے اپنی تاریخ اکبر نامہ
میں بھی نقل کئے ہیں، (دیکھو جلد اول ص ۳۵۹ - ۶۰) یہ کتاب بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ
سے شائع ہو گئی ہے، شروع میں جناب محمد ہدایت حسین صاحب کا پر از معلومات مقدمہ ہے،
خواند امیر سنہ ۹۴۱ھ میں ہمایوں کے ساتھ بہادر شاہ والی گجرات کے خلاف مہم میں بھی شریک ہوا،
وہاں کی آب و ہوا اس کو موافق نہیں آئی، علیل ہو کر دہلی واپس آیا تو سنہ ۹۴۲ھ میں داعی اجل
کو لبیک کہا، اور خواجہ شیخ نظام الدین اولیاءؒ کی درگاہ میں سپرد خاک کیا گیا، اس کے ایک
لڑکے سید عبد اللہ خاں کی تربیت اکبر نے کی، اور اس کی شاہانہ نوازشوں سے وہ منصب ہفت
صدی سے بھی سرفراز ہوا،

یوسف بن محمد ہروی ہرات سے آکر اکبر کے دربار سے منسلک ہوا، طبیب بھی تھا اور شاعر
بھی، ایک قصیدہ بعنوان قصیدہ فی حفظ صحت لکھکر بابر کی علالت کے زمانہ میں سنہ ۹۳۶ھ میں
پیش کیا، بابر کی وفات کے بعد ہمایوں نے اس کی سرپرستی کی، چنانچہ یوسف نے طب میں ایک
کتاب ریاض الادویہ سنہ ۹۴۱ھ میں ہمایوں کے لیے تحریر کی، فن طب میں یوسف کی تین اور تالیفات

ہیں جن کے نام جامع الفوائد اور فوائد الاخیار ہیں، فن انشا پر ایک تصنیف بدایع الانشا بھی اسی کے نام سے منسوب کی جاتی ہے[۱]۔

محمد بن اشرف الحسینی الرستمداری بابر اور ہمایوں دونوں کے ساتھ وابستہ رہا، بابر کو ہندوستان کی تسخیر کے سلسلے میں جتنے جواہرات ملے ان کے اقسام پر محمد نے ایک کتاب جواہر نامۂ ہمایونی لکھی، اس میں جواہرات سے متعلق مفید معلومات اور مباحث ہیں[۲]۔

ہمایوں کے عہد میں، اور شاید اسی علم دوست بادشاہ کے لیے مولانا محمد بن علی بن محمد السکن القاضی السمرقندی نے ایک ضخیم کتاب جواہر العلوم ہمایونی لکھی، یہ مختلف علوم و فنون کی قاموس ہے، جو ایک ہزار چھ سو اٹھائیس صفحے پر مشتمل ہے[۳]۔

جوہر۔ ہمایوں کا آفتابچی تھا، خلوت اور جلوت میں برابر بادشاہ کے ساتھ رہتا تھا، کچھ دنوں کے لیے ہیبت پور کا محاصل اور پھر سرکار پنجاب و ملتان کا خزانچی بھی مقرر ہوا، ہمایوں کی وفات کے بعد ۹۹۵ھ میں تذکرۃ الواقعات لکھنی شروع کی جس میں ہمایونی عہد کے سیاسی واقعات ہیں، یہ کتاب تصنع اور تکلف سے پاک ہے، اس لیے ایک مفید تاریخی لٹریچر سمجھا جاتا ہے، میجر چارلس اسٹوارٹ نے اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے،

ہمایوں کے ایک دوسرے ہم جلیس بایزید نے ۹۹۹ھ میں اکبر کی فرمایش سے تاریخ ہمایوں لکھی، جس میں سیاسی حالات کے علاوہ ہمایوں کے عہد کے فضلاء و شعراء کا بھی ذکر ہے۔ میری نظر سے یہ کتاب نہیں گزری، (دیکھو مخطوطات فارسی انڈیا آفس لائبریری ۹۵ جلد اول)

---

[۱] برٹش میوزیم مخطوطات فارسی ص ۴۸۵ و ۵۲۹، [۲] ایضاً ص ۹۶ و ۹۵، [۳] اس کتاب کے کچھ اقتباسات کے لیے مغل دربار میں فارسی ادب از عبدالغنی دیکھو،

ہمایوں اور علم ہیئت ہمایوں علم ہیئت و نجوم سے خاص شغف رکھتا تھا، اور اس فن میں بہت اچھی استعداد بہم پہنچائی تھی، بدایونی لکھتا ہے،

"در علوم نجوم و ہیئت و سائر علوم غریبہ بے نظیر"[1]

اکبر نامہ میں ہے:-

"توجہ اقدس باصطرلاب و کرہ و سائر آلات رصدی درجۂ کمال داشت"[2]

طبقات اکبری جلد دوم (ص ۱۰۴) کا مصنف رقمطراز ہے:-

"و در علم نجوم و ریاضی بے بدل بود"

ہمایوں نے ہیئت کا فن علامہ الیاس اردبیلی سے سیکھا تھا، جو ہیئت کے تمام فنون اور رصدبندی میں ماہر تھے، وہ ہمایوں کو اس قدر عزیز تھے کہ ان سے کسی حال میں جدا ہونا گوارا نہ کرتا تھا، چنانچہ جب تخت و تاج کھو کر ہندوستان سے دور عراق و ایران میں غریب الوطن پھر رہا تھا تو اس مصیبت اور پریشان حالی میں بھی علامۂ موصوف سے ہیئت و نجوم کا درس لیتا تھا، اس سفر میں شیخ ابوالقاسم جرجانی بھی ساتھ تھے، یہ دونوں عالم ہمایوں کو قطب شیرازی کی کتاب درۃ التاج کا سبق دینے میں مشغول رہتے، اکبر نامہ میں ہے:-

"و از ہمیں حدود مولانا نورالدین محمد ترخان را بجہت طلب شیخ ابوالقاسم جرجانی و مولانا الیاس اردبیلی کہ بفضائل صوری و کمالات معنوی آراستگی داشتند، فرستادند و در کابل آمدہ بشرف ملازمت مشرف شدند و از آمدن ایں دو عزیز بسیار منبسط و منشرح گشتند و مذاکرہ کتاب درۃ التاج درمیان آوردند"[3]

آوارۂ غربت ہونے کے باوجود اس فن سے ہمایوں کی دلچسپی برابر قائم رہی، اور جب کبھی وہ

---

[1] منتخب التواریخ بدایونی ج ا ص ۴۶۷، [2] اکبر نامہ ص ۲۲۰، [3] اکبر نامہ ص ۲۲۱،

کسی نئے شہر میں داخل ہوتا تھا ہیئت اور نجوم کے آلات تلاش کرتا تھا، اکبر نامہ میں ایک دلچسپ لطیفہ لکھا ہے، کہ جب وہ تبریز پہنچا تو اپنے ملازم بیگ محمد آختہ بیگی کو کہا کہ یہاں کوئی کرہ تلاش کرو، فارسی میں کرہ گھوڑے کے بچھڑے کو کہتے ہیں، خوش فہم نوکر نے آقا کے اس حکم کی تعمیل اس طرح کی کہ چند بچھڑے لے کر خدمت شاہی میں حاضر ہوا، بادشاہ اس غول بیابانی کو دیکھ کر ہنس پڑا[۱]

ہمایوں کی مہارت فن کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ وہ علماء کی طرح ہیئت وریاضی کا درس دیتا تھا، نورالدین ترخاں نوری سفیدونی نے جو ریاضی، نجوم اور حکمت کے ممتاز عالم تھے، ہمایوں ہی سے درس حاصل کیا تھا، مآثر الامراء میں مولانا مذکور کے حال میں ہے،

مولانا بفضل وکمال وشجاعت وسخاوت اتصاف داشت وبہ ہیئت وہندسہ و اصطرلاب شوق مند بود........ وصحبتش باجنت آشیانی (ہمایوں) کوک گشتہ، واز جملہ ندیمان ومجلس نشینان بزم ہمایونی گردید........ گاہے بادشاہ از و استفادہ علوم می کرد، وگاہے او از علم ریاضی خصوص اصطرلاب از جناب ہمایونی کہ دریں فن مہارت تمام داشت استفاضہ می نمود،[۲]

ہمایوں نہ صرف خود ان علوم میں مہارت حاصل کرتا رہا، بلکہ ملک کے نجومیوں کی واقفیت میں بھی اضافہ کرنے کی کوشش میں لگا رہا، اس نے کئی جگہ رصد خانے بنانے کا ارادہ کیا، اور بہت سے آلات رصد ترتیب دیئے[۳]، سلطان سلیمان خان کے ترکی امیر البحر کو جو علم ہیئت کا بہت بڑا عالم تھا، کئی مہینے اپنے دربار میں روک رکھا تاکہ وہ چاند اور سورج کے گرہنوں کا حساب تیار کرے، اور ہندوستان کے نجومیوں کو آفتاب کی گردش اور خط استوا کے نکات پڑھنے میں مدد دے، ترکی امیر البحر کئی مہینے کام میں مصروف رہا اور نجومی مشاہدات ختم کیے،[۴]

---

۱ اکبر نامہ ص ۲۲۲ ۲ مآثر الامراء ج ۳ ص ۳۷۷ ۳ اکبر نامہ ص ۴۹۰ ۴ ترجمہ مرآۃ الممالک پروفیسر ... باب ششم، بحوالہ معارف ج ۲۲ ص ۵۸

ہمایوں کو اس فن میں اس قدر انہماک تھا کہ اس نے اپنی عزیز جان تک اسی فن کی خدمت میں گنوا دی، پرانی دہلی میں قلعہ کے اندر شیر شاہ نے شیر منڈل کے نام سے ایک ہشت پہلو عمارت بنوائی تھی، ہمایوں نے اس عمارت کی برجی کو بلندی کے سبب سے رصدگاہ بنا دیا تھا، ایک شام کو ستارۂ زہرہ کے طلوع ہونے کا گمان کیا جا رہا تھا، بادشاہ ریاضی دانوں کی ایک جماعت کے ساتھ اسی برجی میں بیٹھ کر مباحث میں مصروف تھا، اور زہرہ کے طلوع ہونے کا انتظار کر رہا تھا کہ مغرب کی اذان ہوئی، بادشاہ اذان سنکر اٹھنا چاہتا تھا کہ زینہ سے پھسل کر گرا، اور سخت زخمی ہوا، اور پھر اس زخم سے جانبر نہ ہو سکا،[۱]

بادشاہ کو جو ریاضیات و فلکیات سے جو انس تھا اس کے اثر سے ملک میں بھی علم ہیئت کا ذوق پیدا ہوا اور ملک میں عام طور پر آلات فلکی بننے لگے، کرے اور اصطرلاب جو عموماً مدارس میں آج نظر آتے ہیں، ان کا ابتدائی رواج دینے والا ہمایوں ہی تھا، اس نے خود ایک خاص قسم کا اصطرلاب ایجاد کیا تھا، جو "اصطرلاب ہمایونی" کے نام سے مشہور ہے، چنانچہ اس کے عہد کے اکثر اصطرلاب اور کرات اب تک مختلف مقامات میں محفوظ ہیں،[۲]

ہمایوں کا سپہ سالار بیرم خان خانخاناں فارسی و ترکی کا ایک اچھا شاعر اور صاحب دیوان تھا،[۳] اس نے ہمایوں کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا، اس میں اصطرلاب سے تشبیب کی ہے، جو ہمایوں کے فلکیاتی ذوق کا بین ثبوت ہے، کہتا ہے:-

آں چرخ چیست کامدہ بر محورش مدار　　　آں مدرکہ میانہ شہابش کند گذار

۱ے اکبرنامہ ص ۳۴۰، ۲ے دیکھو مضمون "لاہور کا ایک فلکی آلات ساز" از مولانا سید سلیمان ندوی، معارف جلد ۳۳ نمبر ۲ ص ۸۸، ۳ے بیرم خاں نے نظیری سمرقندی سے شاہنامہ کے طرز پر ایک مثنوی شاہنامہ ہمایونی لکھانے کی کوشش کی مگر وہ مکمل نہ ہو سکی،

باآنکہ می کشد رہ و خور برا بر ہی | آمد بجاں زحلقہ بگوشان شہریار
تا در بچشم کو کبۂ آفتاب را | چوں ہجۂ لوای شہنشاہ نامدار
پیوستہ آسمان و زمین زیر حکم او ست | ہمچو نگین خاتم شاہ جم اقتدار
برکف نہادہ خوان زری پر ز اشرفی | تا بر قدوم اشرف شاہاں کند نثار
شاہ بلند قدر ہمایوں کہ از شرف | بر درگہش سپہر نہد روے افتقار[1]

ہمایوں کے تمام خانگی، ملکی اور سیاسی کاموں میں ہیئت اور نجوم کے اصول کا لحاظ رکھا جاتا تھا، ہمایوں نامہ میں گلبدن بیگم لکھتی ہے کہ جب ہمایوں کی شادی حمیدہ بانو سے قرار پائی تو ہمایوں نے خود اصطرلاب اٹھا کر ستاروں کی گردش معلوم کر کے تاریخ مقرر کی،[2] اکبر جب امرکوٹ کے صحرا میں پیدا ہوا تو ہمایوں نے دریافت کیا تو پتہ چلا کہ ماہتاب برج اسد میں ثابت ہے، اس نے اسی وقت پیشنگوئی کی کہ اکبر صاحب اقبال اور دراز عمر ہوگا،[3] جو مستقبل میں بحقیقت ثابت ہوئی،

ہمایوں اپنے فلکیاتی ذوق کے سبب سعد اور نحس کا اس قدر قائل تھا کہ وہ ملک کے تمام کاموں کو اسی اصول کے ذریعہ سے انجام دینے کی کوشش کرتا تھا، جس زمانہ میں کابل کا انتظام اس کے سپرد تھا، اس نے ایک روز ان تین آدمیوں کے نام فال لیے جو ایک مقررہ دن اس کو راہ میں ملے، ان تین آدمیوں کے نام مراد خواجہ، سعادت خواجہ اور دولت خواجہ تھے، ہمایوں نے اپنی سلطنت کی اساس انہی ناموں پر رکھی، ممالک محروسہ اور ملازموں کو تین حصوں میں تقسیم کیا، دولت، سعادت، مراد، کل سپاہیوں کا نام اہل دولت رکھا، کیونکہ انہی کی مساعدت پر دولت و اقبال کا انحصار ہے، حکما، و علما، و مشائخ اور شعراء کو اہل سعادت کہا، کیونکہ ان کے

---

[1] بدایونی ج ۳ ص۱۹۱، [2] ہمایوں نامہ از گلبدن بیگم ص۵۳ [3] ایضاً ص۵۵

ذریعہ سے سعادت ابدی حاصل ہوتی ہے، بقیہ لوگوں کو اہل مراد سے موسوم کیا،

اسی فلکیاتی اصول پر ہفتہ کے دنوں کو بھی ان جماعتوں سے منسوب کیا، روز شنبہ و پنجشنبہ کو اہل سعادت سے متعلق کیا، ان دونوں دنوں میں وہ علم و عبادت کے ناظموں کے ساتھ وقت گذارتا تھا، اہل سعادت کے ساتھ ان دنوں کے مخصوص کرنے کی یہ وجہ تھی کہ شنبہ زحل کے ساتھ منسوب ہے، اور زحل مشائخ کا قدیم مربی سمجھا جاتا ہے، پنجشنبہ مشتری سے متعلق ہے، وہ علما، کا ستارہ ہے، یکشنبہ و سہ شنبہ اہل دولت سے متعلق تھے، ان میں امور سلطنت انجام پاتے تھے، یہ دن اس لیے مقرر کیے گئے تھے کہ یکشنبہ آفتاب سے متعلق ہے، اس کی تربیت کے پرتو سے سلطنت و فرمانروائی ہوتی ہے، سہ شنبہ متعلق ہے مریخ سے اور مریخ سپاہی کا مربی ہے، ہمایوں نے جمعہ کا مبارک دن اپنے لیے مخصوص کر رکھا تھا، بقیہ دو دن اہل مراد کے لیے وقف تھے،

ہمایوں نے دو خرگاہ بنائے تھے، جن کی ساخت خالص ہیئت کے اصول پر تھی، ایک خرگاہ کو آسمان کے برجوں کی طرح بارہ حصوں میں تقسیم کیا تھا، اور ہر برج میں ایک پنجرہ آویزاں تھا، جس کے سوراخوں سے "کواکب دولت" کے انوار چمکتے تھے، دوسرا خرگاہ یونانی ہیئت کے نو ون آسمانوں کی پوری نقل تھی، ہر آسمان میں جو ستارے ہیں ان کے نمونے اس میں بنے تھے،

ہمایوں کی سب سے دلچسپ نجومی اختراع بساط نشاط تھی، اس بساط میں فلکی دوائر و کرات عناصر بنائے تھے، پہلا دائرہ جو فلک اطلس سے منسوب تھا سفید تھا، دوسرا کبود، تیسرا زحل کی مناسبت سے سیاہ، چوتھا مشتری کے لحاظ سے صندلی، پانچواں مریخ کے تعلق سے سرخ، چھٹا نیر اعظم یعنی آفتاب کی مناسبت سے زریں، ساتواں زہرہ کے سبب سے سبز، آٹھواں عطارد کے لحاظ سے سوسنی، نواں ماہتاب کے تعلق سے سفید، ماہتاب کے دائرہ کے بعد آگ اور ہوا کے کرے بالترتیب

بنے ہوئے تھے، اس کے بعد کرۂ خاک و آب تھا، کرۂ خاک میں ساتوں اقلیموں کے نقشے بنے ہوئے تھے، ہر دائرہ مختلف قسم کی جماعت کے لیے مخصوص تھا، مثلاً اہل ہندی کو دائرہ زحل میں اور سادات و علماء کو دائرۂ مشتری میں بیٹھنے کا حکم تھا، ہمایوں نے اپنی ذات کے لیے دائرہ زریں اختیار کیا تھا، اسی طرح نجوم کے قاعدہ سے ہر روز کے ستارہ کا جو رنگ ہوتا اس دن وہی رنگ پورے دربار کا ہوتا تھا، مثلاً یکشنبہ کو آفتاب کے رنگ کے لحاظ سے زرد لباس اور دوشنبہ کو ماہتاب کے رنگ کی مناسبت سے سبز لباس پہنا جاتا۔[۱]

ہمایوں اور علم ریاضی نجوم و ہیئت کے لیے علم ریاضی ایک لازمی چیز ہے، اس لیے ہمایوں اس علم میں بھی بڑی اچھی استعداد رکھتا تھا، اس کے عہد کے تمام ممتاز ریاضی دان اس کے حضور میں حاضر رہتے، اکبر نامہ میں ہے:-

"در اقسام خاصہ ریاضی در زمان خود نظیر و سہیم نہ داشتند۔"

ایک دوسری جگہ ہے:-

"در اقسام علوم ریاضی آنحضرت را پایۂ بلند بود و ہموارہ با ارباب حکمت صحبت می داشتند و متبادان علم ریاضی به پایۂ سریر والا کامیاب سعادت بودند۔"[۲]

فرشتہ لکھتا ہے:-

"در علم ریاضی علم مہارت می فرو شت، مدار صحبتش با علماء و فضلاء بودہ، ہمہ وقت در مجلس او مسائل علمی مذکور می شد۔"[۳]

ہمایوں اور کتبخانہ کا ذوق ظاہر ہے کہ ہمایوں نے اپنے علمی ذوق کے سبب کتابوں کا ذخیرہ جمع

---

[۱] ان تفصیلات کیلئے دیکھو قانون ہمایونی (بنگال ایشیاٹک سوسائٹی) اور ایلیٹ جلد پنجم ص ۱۲۰، ۱۱۶)

[۲] اکبر نامہ ص ۳۰۶، ۳۰۴، [۳] فرشتہ جلد اول مقالہ دوم ص ۲۱۳

کیا ہوگا، چنانچہ جب وہ ہندوستان کے تخت و تاج کا از سر نو مالک ہوا، اور اس کو کچھ اطمینان نصیب ہوا تو دہلی کے شیر شاہی قلعہ میں شیر منڈل کے نام سے جو سہ منزلہ عمارت بنی ہوئی تھی اس کی تیسری منزل پر اس نے اپنا کتب خانہ قائم کیا، یہ اپنی بلندی کے سبب سے کسی قدر رصد خانہ کا کام بھی دیتی تھی، یہاں بیٹھکر اہل علم سے اکثر علمی مباحثہ کرتا تھا، شاہی کتبخانہ کا مہتمم نظام المعروف بہ بازبہادر تھا،[1]

کتابوں سے ہمایوں کا شوق اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ میدان جنگ میں بھی ایک چھوٹا سا کتبخانہ اپنے ساتھ رکھتا، چنانچہ جب وہ کھمبایت کا محاصرہ کر رہا تھا تو اس کے ساتھ منجملہ اور کتابوں کے تاریخ تیمور کا وہ نسخہ بھی تھا جس کو بہزاد نے اپنے کمال فن سے مصور کیا تھا، اس محاصرہ میں ایک جنگلی قبیلہ نے شاہی خیمہ پر شبخون مارا تو لوٹ کے مال میں یہ نادر نسخہ بھی جاتا رہا، لیکن پھر فوراً ہی واپس مل گیا،[2]

جب ہمایوں بے تخت و تاج عراق، ایران اور افغانستان میں پھر رہا تھا تو اس وقت بھی چیدہ چیدہ کتابیں اس کے ساتھ تھیں، اور اس کے کتب خانہ کا مہتمم اس کے ہمرکاب تھا،[3]

ہمایوں اور تعلیمی ادارے | ہمایوں کا زمانہ حکومت زیادہ تر طوائف الملوکی اور پریشان حالی میں گذرا، اس لیے اس کو عام طور پر تعلیمی مدارس اور ادارے قائم کرنے کا موقع نہیں ملا، پھر بھی دہلی میں اس نے ایک مدرسہ قائم کیا، جس کے ایک مدرس شیخ حسین تھے،[4] پھر اسی عہد میں شیخ زین الدین خوافی جو نظم و نثر کے بہت بڑے عالم تھے، آگرہ میں اپنا ذاتی مدرسہ قائم کیا،[5]

---

[1] تزک جہانگیری، [2] اکبر نامہ ج ۱ ص ۱۴۶، [3] اکبر نامہ دفتر اول، [4] آئین اکبری، [5] منتخب التواریخ بدایونی ص ۴۷۱،

ہمایوں کی زندگی جس طرح آوارہ گردی اور پریشان حالی میں گذری وہ سب کو معلوم ہے شہزادہ اکبر کو چند سال بھی اپنے بزرگ باپ کے ساتھ چین سے رہنا نصیب نہیں ہوا، اور اکثر ظالم چچا کے پنجہ میں گرفتار رہا، اور ابھی تیرہ ہی برس کا تھا کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا، اور سلطنت کا بار عظیم اس کے کندھوں پر رکھ دیا گیا، اس حالت میں اس کی تعلیم کہاں تک ہو سکتی، تاہم ہمایوں کی علم دوستی کا تقاضا یہ تھا کہ وہ اپنے لڑکے کی تعلیم سے غافل نہ رہے، چنانچہ ان ہنگامہ پرور واقعات کے ہوتے ہوئے بھی وہ اکبر کی تعلیم کی سخت نگرانی رکھتا تھا، وہ جب ۴ سال ۴ مہینے اور ۴ روز کا ہوا، تو اس نے مکتب کی رسم ادا کی،

ابوالفضل رسم مکتب کی تقریب کا ذکر ان لفظوں میں کرتا ہے:۔

"در ہفتم شوال ایں سال کہ از عمر ابد پیوند حضرت شاہنشاہی چہار سال و چہار ماہ و چہار روز شدہ بود، بآئین رسم و عادت آن آموختہ درسگاہ الٰہی و رموز دان لبستان ربانی را در مکتب بشری در آوردند و ملازادہ ملا عصام الدین ابراہیم را باین خدمت گرامی شرف اختصاص بخشیدند، اگرچہ در نظر ظاہر بینان بآموزش فرستادند، اما دیدہ دوربینان بارگاہ ظہور آن حضرت را بپایۂ والاے آموزگاری بردند، از غرائب آنکہ حضرت جہانبانی کہ از علوم آسمانی آگاہ بودند، و بدقائق نجوم می رسیدند، باتفاق ستارہ شماران باریک بین

واسطرلاب دانانِ وقت شناس ساعتے خاص برائے افتتاح تعلیم آن حضرت تعیین فرموده بودند که دماو دار و اعمار بہم نتوانند رسید، چون ساعت مختار رسید آن مؤدب بآداب الٰہی بہ لباس بازی در آمده در پرده احتجاب مختفی شدند، و بآن همه توجه و اہتمام بادشاہی ہرچند تکاپوے فرمودند پے بآن حضرت نبردند، و آگاه دلان روشن ضمیر ازین سر بدیع دریافتند که مقصود ازین آنست که آن خداوند خرد والا که مخصوص بہ تعلیم ایزدی ست بعلوم رسمی روزگار مشوب و منسوب نشود تا در ہنگام ظہور این خدیو نکتہ شناس بر زمانیان ظاہر شود که دانشوری این پادشاه دانشوران از قسم موہبتے ست، نہ از جنس مکتسبی و با وجود این معنی بر ضمیر اقدس آنحضرت نقوش حرفی و علوم رسمی چہ از انچہ رقم زده قلم اہل فنون شده و چہ از ان نکات اسرار که از مبدء فیاض بے توسط تعلیم و تعلّم بر باطن انور رفائع گشتہ جلوه ظہور دارد، و لہٰذا ارباب حکمیات و اصحاب ریاضت و صاحبان علوم ظاہری و دانایان صنائع کلی و جزوی چون در بساط حضور اقدس میرسند، از شناسائی خود سر خجالت بگریبان تامل فرو برده، حیران می مانند، القصہ چون چندگاه پیش آن افادات انتساب بخواندنی زبون تراز ناخواندن اشتغال داشتند اہل ظاہر بعدم کوشش آخون حمل کرده در تغیر آن اہتمام نمودند، و آن بیچاره را معزول ساختہ خدمت او را بمولانا بایزید مقرر ساختند و ندانستند که کارفرمایان ابداع اہتمام دارند که ضمیر الہام آن نور پرور ایزدی محل انعکاس نقوش مداوی و مورد انطباع سواد علوم ظاہری نگردد،"[1]

ملا عصام الدین ابراہیم اور مولانا بایزید کے علاوہ اکبر کے استادوں میں مولانا پیر محمد خان

---

[1] اکبرنامہ ج ۱ ص ۲۷۱ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی، یہ طویل اقتباس اس لیے بھی درج کیا گیا ہے کہ اکبرنامہ کے طرز انشا کا نمونہ پیش نظر ہے۔ آگے چل کر اس کتاب کی خصوصیات کا ذکر آئے گا۔

نقیب خاں، مولانا عبد القادر، بیرم خان، اور مولانا پیر عبد اللطیف قزوینی کے نام بھی لیے جاتے ہیں، میر عبد اللطیف قزوینی اکبر کو دیوان حافظ پڑھایا کرتے تھے[1]

اب سوال یہ ہے کہ ہمایوں کی کوشش اور ان مختلف استادوں کی تعلیم کہاں تک بار آور ہوئی، اکبر کے خوشامدی مورخین تو اس کو امی محض بتاتے ہیں، چنانچہ ابھی آپ دیکھ چکے کہ ابو الفضل اسکو امی بتاکر اس کی تشریح یوں کرتا ہے کہ پروردگار کو ثابت کرنا تھا کہ یہ برگزیدۂ الٰہی علوم ظاہری کی تحصیل کے بغیر ہمارے نا متناہی فیوض کا منبع ہے، پھر لکھتا ہے کہ اس میں حکمتِ الٰہی یہ تھی کہ اہل عالم پر یہ روشن ہو جائے کہ اکبر کی تمام عقل و دانش خداداد یعنی الہامی ہے، کسبی بندہ سے حاصل کی ہوئی نہیں ابو الفضل کی یہ ساری توجیہ ظاہر اس لیے ہے کہ وہ اکبر کو پیغمبروں کی صف میں لاکر کھڑا کرنا چاہتا ہے،

لیکن اس کو کون مان سکتا ہے، کہ ہمایوں کی اتنی توجہ اور استادوں کی اتنی کوشش کے باوجود اکبر لکھنا پڑھنا کچھ جانتا ہی نہ تھا، حالانکہ اس کے لیے یکے بعد دیگرے کئی استاد مقرر ہوئے، جہاں ایک استاد کی غفلت معلوم ہوئی، وہ فوراً علیحدہ کر دیا گیا، اور دوسرا مقرر ہوا، اس کے باوجود وہ نوشت و خواند سے اتنا نابلد رہا، کہ اپنا نام تک بھی اپنے ہاتھ سے لکھ نہیں سکتا تھا، ابو الفضل آئین اکبری میں "آئین آموزش" کے عنوان سے یہ لکھتا ہے کہ گیتی خداوند کے کہنے سے "حرف آموزی و تعلیم" کا ایک طریقہ نکالا گیا ہے جس سے بچے برسوں کی تعلیم مہینوں میں حاصل کر لیتے ہیں، جو شخص "آئین آموزش" کے اتنے دقیق نکتہ کو اس آسانی سے حل کر لیتا ہے، اس کے متعلق یہ کیونکر کوئی مان سکتا ہے کہ وہ حرف شناسی سے محروم تھا،

---

[1] منتخب التواریخ، بدایونی، ج ۳، ص ۹۰، [2] رائل ایشیاٹک سوسائٹی میں ظفر نامہ کا ایک قدیم قلمی نسخہ ہے، اسکے سرورق پر اکبر کے دست خاص کا لکھا ہوا لفظ "فرور دین" موجود ہے، اس کے نیچے جہانگیر کے قلم کی لکھی ہوئی یہ تصدیق ہے کہ یہ لفظ عرش آشیانی کا لکھا ہوا ہے، اور پھر اس کے نیچے شاہجہان کی تحریر ہے، (جامعہ بابت ماہ جنوری ۱۹۲۶ء)

بہرحال اکبر کے امی محض ہونے کا دعوی شک وشبہ سے خالی نہیں، لیکن یہ بات تعریف کے قابل ہے کہ اس کم سوادی اور علمی کم مایگی کے باوجود اس کے دل میں علوم وفنون کا شوق اور ان کی قدردانی کا جوش اتنا تھا کہ جو کسی عالم بادشاہ کو بھی نہیں ہوا، اس کے ذاتی شوق کا یہ عالم تھا کہ فارسی کی مشہور کتابوں میں سے شاید ہی کوئی کتاب ہو جو اس کے سامنے پڑھی نہ گئی ہو، اخلاق ناصری، کیمیائے سعادت، قابوسنامہ، مکتوبات شرف منیری، گلستاں، حدیقہ، مثنوی معنوی، جام جم، بوستاں، شاہنامہ، خمسۂ شیخ نظامی، خسرو اور مولانا جامی کے کلیات، خاقانی اور انوری کے دیوان اور ہر قوم کی تاریخیں اس کے سامنے بلاناغہ پڑھی جاتی تھیں، پڑھنے والے ہر روز جہاں ختم کرتے تھے، وہاں اکبر اپنے ہاتھ سے نشان (شاید صفحہ یا تاریخ کا) بنا دیتا تھا[1]، اور جب کتاب ختم ہو جاتی، تو پڑھنے والے کو جیب خاص سے انعام دیتا، اسی وسیع مطالعہ کا نتیجہ تھا، کہ کوئی تاریخی سرگذشت یا فقہی مسئلہ یا علم وفن اور فلسفہ وحکمت کا نکتہ ایسا نہ تھا جو اس کے علم میں نہ ہو، اور جس پر وہ خود بحث اور گفتگو نہ کر سکتا ہو، دیوان حافظ اور مثنوی مولانا روم کے بہت سے اشعار اس کو یاد تھے[2]، اس کے علمی مذاق کے متعلق جہانگیر تزک جہانگیری میں لکھتا ہے :-

"وبدقائق نظم ونثر چناں می رسیدند کہ مافوقے برآں متصور نبود" (ص ۱۵ نولکشور پریس)،

اکبر کا علمی و ادبی ذوق اس قدر بلند ہو گیا تھا کہ وہ خود اشعار بھی کہنے لگا تھا، ابوالفضل لکھتا ہے

وطبع الہام پذیر آنحضرت بگفتن نظم ہندی وفارسی بغایت موافق افتادہ در دقائق تخیلات شعری نکتہ سنجی وموشگافی می فرمایند،[3]

تاریخ فرشتہ میں ہے

اگرچہ خط سواد کامل نہ داشت، اما گاہے شعر گفتے و در علم تاریخ وقوفے تمام داشت

---

[1] آئین اکبری ص ۱۱۷، [2] اکبرنامہ ج ۱ ص ۲۷۱، [3] ایضاً، بنگال ایشیاٹک سوسائٹی،

وقصص ہند نیکو می دانست[1]

ابوالفضل نے اکبر کے اشعار میں حسب ذیل بیت کو خاص طور سے پسند کیا ہے ،

نیست از زنجیر جنون در گردن مجنون را | عشق دست دوستی در گردنش انگندہ است

ریاض الشعراء (مؤلفہ علی قلی والہ داغستانی) میں بھی اکبر کے کچھ اشعار منقول ہیں، عبد اللہ خاں

اوزبک والی توران کو ایک موقع پر اس نے حسب ذیل مستزاد رباعی لکھ بھیجی :۔

عمرم ہمہ در فراق و ہجران بگذشت | با درد و الم

این عمر گرانمایہ چہ ارزان بگذشت | در رنج و ستم

عمری کہ بشد صرف سمرقند و ہری | با عیش و طرب

افسوس کہ در آگرہ و بیران بگذشت | با غصہ و غم

اکبر کی ایک منظوم خط و کتابت کی بھی مثال ملاحظہ ہو، علی قلی خان جس کو خان زمان کا خطاب

ملا تھا، ہمایوں کے ممتاز امراء میں سے تھا، جو نپور کا حاکم بنا کر بھیجا گیا، اکبر کے عہد میں اس نے علم بغاوت

بلند کیا، اس بغاوت کو فرو کرنے کے لیے اکبر خود مہم میں شریک ہوا، خان زمان علم پرور ہونے کے

علاوہ خود بھی شاعر تھا، سلطان تخلص کرتا تھا (مآثر الامراء ج ا ص ۶۳۰) اس نے سخت لب و لہجہ میں

اکبر کے پاس یہ اشعار لکھ بھیجے ،

اے سد سکندر زمانہ در تو | یاجوج بود سپاہی لشکر تو

در دور تو آثار قیامت پیداست | دجال تو ئی خواجہ امینا خر تو

اکبر نے اپنے حریف کو اسی انداز اور درشتی سے جواب دیا

اے خان زمان کہ پر بود لشکر تو | شد دولت من باعث کر و فر تو

---

[1] تاریخ فرشتہ

کمترز ہاشمم ز تیر د جاں امروز | فردا من اگر جدا نسازم سر تو

خان زماں نے پھر لکھ بھیجا،

تا ہست اثر خالصہ در کشور تو | مشکل کہ من جنگ کند لشکر تو

بگذر ز زر و سیم کہ تا نوکر تو | از سر گذرد برائے سیم و زر تو

اکبر کا جواب تھا :-

با آنکہ بود خاک درم افسر تو | امروز مین فردا نیاید سر تو

از دولت من ہست ترا سیم و زری | وز نہ و زر زر است قدرت لشکر تو

خان زماں شاہی فوج کے مقابلہ کی تاب نہ لاسکا، بالآخر اس نے سپر ڈال دی، اور معذرت پیش کی،

اے شاہ زمان منم کمین نوکر تو | وز ترس نبی تو ام آمدہ بر در تو

از دور تو قصد کشتن من داری | نزدیک چپاں تو ام آمد بر تو

اکبر نے خان زماں کو معاف کر دیا، اور لکھا،

گفتی تو چو بدا ستی خدا یا در تو | صد رحمت حق بر پدر و مادر تو

تغیر مدہ تو سکہ و خطبۂ من | تا من نکنم آرزوے کشور تو[1]

تذکرۂ روز روشن میں اکبر کا ذکر شعراء کے زمرہ میں کیا گیا ہے، اور اس میں اس کے حسب ذیل اشعار منقول ہیں[2]

شبنم نگو کہ بر ورق گل فتادہ است | کاں قطرہ ہا ز دیدۂ بلبل فتادہ است

گر یہ کردم ز غمت موجب خوشحالی شد | ریختم خون دل از دیدہ و دلم خالی شد

---

[1] ریاض الشعراء قلمی نسخہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی۔ [2] تذکرہ روز روشن مولفہ نواب صدیق حسن ص ۶۲،

قطعہ

دوشینہ بکوئے می فروشان | پیمانۂ مے بزر خریدم
اکنون ز خمار سر گرانم | زر دادم و درد سر خریدم

رُباعی

از بار گنہ خمیدہ پشتم چکنم | نے راہ بمسجد نہ کنشتم چکنم
نے وصف کافر نہ مسلمان چاکم | نے لائق دوزخ نہ بہشتم چکنم

ایضاً

من یاد دلم کہ خون شد از دوری او | من یار غمم ز دست مہجوری او
در آئینہ چرخ نہ قوس قزح است | عکسی است نمایان شد از جوری او

محمد حسین آزاد دربار اکبری میں مذکورۂ بالا اشعار میں سے دو بحر شعر، قطعہ اور دوسری رباعی کے علاوہ حسب ذیل دو شعر اور نقل کرتے ہیں:

من بنگ[1] نمی خورم مے آریدی | من چنگ نمی زنم نے آرید
حاجی بسوئے کعبہ رود از برائے حج | یارب بود کہ کعبہ بیاید بسوئے ما

ان اشعار کو نقل کرتے ہوئے محمد حسین آزاد لکھتے ہیں کہ

"اشعار جو اس کے (یعنی اکبر کے) نام پر کتابوں میں لکھے ہیں، اسی کے ہیں، کیونکہ اگر وہ ملک شاعری میں شہرت چاہتا تو شاعر ہزاروں تھے، جادیں کی جادیں تیار کر دیتے لیکن جب یہی چند شعر اس کے نام پر لکھے ہیں تو اپنی ہی طبیعت کی امنگ ہے، جو کبھی کبھی موقع پر ٹپک پڑی ہے، شاید لفظ یا لفظوں میں کسی نے اصلاح بھی کر دی ہو۔"[2]

---

[1] ایک جگہ من بنگ کے بجائے من قہوہ لکھی ہے۔ [2] دربار اکبری از محمد حسین آزاد ص (۱۲۱)

اکبر نے بارہا اساتذہ کے اشعار پر نکتہ چینیاں بھی کیں، اور نقادان فن نے اس کی تنقید کی داد بھی دی،[۵] ایک بار محفل نغمہ و سرود میں اس کے سامنے فغانی کا یہ شعر پڑھا گیا

مسیحا یار و خضر ش ہمرکاب و ہمعنان عیسے   فغانی آفتاب من بدین اعزاز می آید

اکبر نے دوسرے مصرعہ میں برجستہ اصلاح دی،

فغانی شہسوار من بدین اعزاز می آید

ایک موقع پر ملا طالب صفاہانی کی حسب ذیل رباعی پڑھی گئی جس میں حکیم ابوالفتح گیلانی کی موت پر افسوس، اور اس کے بھائی حکیم ہمام کی آمد پر خوشی کا اظہار کیا گیا تھا،

همدو برادرم کہ دمساز آمد   او شد بہ سفر دین ز سفر باز آمد
او رفت بدنبالہ او عمر برفت   وین آمد و عمر رفتہ ام باز آمد

اکبر نے اس رباعی کو سنا تو کہا کہ دنبالہ کے لفظ سے شعر میں گرانی پیدا ہو گئی ہے، اس لیے یہ مصرعہ اس طرح پڑھا جائے تو بہتر ہے،

او رفت و در نقش مرا عمر برفت

اکبر کو علم و فن سے جو خاص طبعی مناسبت تھی، اس کا اندازہ ان صحبتوں سے بھی ہوتا ہے، جو اس کے دربار کا ایک ضروری جزو تھیں، اور جس میں ہر فن کے ارباب کمال جمع ہو کر مختلف مسائل پر بحث و تحقیق کرتے تھے، اور ان میں اکبر خود برابر کا حصہ لیتا تھا، خوش قسمتی سے اس کے دربار میں ایسے ارباب کمال جمع ہو گئے تھے جو کسی ایک عہد میں کم نظر آتے ہیں، عام طور پر لوگ اکبری عہد کی عظمت صرف سیاسی حیثیت سے جانتے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ دور علمی حیثیت سے بھی کم درخشان نہیں، یوں تو ہندوستان کی مغل حکومت کی تاریخ میں علم پروری اور علم و ادب نوازی اس حکومت کی بنیاد کے ساتھ ہی نظر آتی ہے، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ علوم و فنون کا عظیم الشان قصر اس کم سواد

فرمانروا کے عہد میں تکمیل کو پہنچا، آیندہ سطروں میں ہم ان تراجم اور تالیفات کا ذکر کرتے ہیں جو اکبر کی سرپرستی میں ظہور میں آئیں، اور جن کی وجہ سے اس کا عہد سلطنت علمی حیثیت سے جگمگا اٹھا تھا

تراجم | **مہابھارت**، سنہ ۹۹۰ھ میں اکبر کی خواہش ہوئی کہ مہابھارت کا فارسی ترجمہ ہو، اس کام کے لیے پہلے ہندو پنڈتوں کو جمع کیا، جنھوں نے مہابھارت کے نفس موضوع کی تشریح کی، اس کے بعد ترجمہ کا کام نقیب خان کے سپرد کیا، اور اکبر نے خود کئی متواتر راتوں میں نقیب خان کو ترجمہ کی نوعیت کو سمجھایا، ملا عبدالقادر بدایونی بھی جو زبان سنسکرت کے ایک جید عالم تھے، اس کام پر مامور ہوئے، ملا عبدالقادر مہابھارت کو "مزخرفات لاطائل" بتاتے ہیں، اس لیے بطیب خاطر اس کام کو انجام دینا نہیں چاہتے تھے، لیکن شاہی حکم کی نافرمانی بھی نہیں کر سکتے تھے، چار مہینوں کی کوششوں کے بعد دو باب (ہژدہ فن) کا ترجمہ کر سکے، بقیہ حصوں کو ملا شیری، نقیب خان اور حاجی سلطان تھانیسری[1] نے ختم کیا، شیخ فیضی نے ترجمہ کی زبان کو سلیس اور فصیح بنانے کی کوشش کی، لیکن وہ دو باب سے آگے نہ بڑھ سکا، حاجی سلطان تھانیسری نے اپنے ترجمہ پر نظر ثانی کرنا شروع کیا، اس کام میں مشغول ہی تھا کہ بعض اسباب کی بنا پر اس کو دارالسلطنت چھوڑنا اور بھکر جانا پڑا، ملا عبدالقادر بدایونی کا بیان ہے کہ حاجی سلطان تھانیسری جب یہ ترجمہ کر رہا تھا تو کسی نے پوچھا کہ کیا لکھ رہے ہو تو جواب دیا کہ "حرف دہ ہزار سالہ را بزبان حال موافق می سازم" یعنی ہزاروں سال کی پرانی بات کو آج کی بات بنا رہا ہوں، (جلد سوم ص ۱۱۹) ملا شیری مہابھارت کے بارہ میں کہتے تھے کہ یہ افسانہ ایک خواب ہے جو کسی نے بخار کی حالت میں دیکھا تھا، (بدایونی ج ۲ ص ۲۴۹) اکبر نے مہابھارت کے ترجمہ کا نام رزم نامہ رکھا، اور تمام معرکوں کی تصویریں بنا کر اس میں شامل

---

[1] ملا بدایونی حاجی سلطان تھانیسری کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "علوم تقلیدیہ را خوب ورزیدہ" آخر وقت میں وہ تھانیسر اور کرنال کا کروڑی مقرر ہوا تھا۔

کیں، ابوالفضل نے اس پر دو جز کا خطبہ لکھا ہے[1] جس کے آخر میں سنہ ۹۹ھ درج ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ کتاب پانچ سال کی مدت میں ترجمہ ہوئی، یہ ترجمہ اب تک متفرق کتبخانوں میں پایا جاتا ہے[2]۔

۲- **رامائن**۔ سنہ ۹۹۵ھ میں عبدالقادر بدایونی نے شاہی حکم کے بموجب رامائن کا ترجمہ کرنا شروع کیا، اور سنہ ۹۹۹ھ میں تمام کیا، ترجمہ ایک سو بیس جز پر مشتمل تھا، کتاب کے تتمہ پر مندرجۂ ذیل شعر لکھکر بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا،

ما قصہ نوشتیم بسلطان کہ رساند　　　جان سوختہ کردیم بہ جانانکہ رساند

اکبر بہت محظوظ ہوا، اور اس نے خواہش ظاہر کی کہ ملا بدایونی اس کتاب کے آغاز میں کوئی فاضلانہ مقدمہ بھی تحریر کر دیں، لیکن ملا صاحب نے کفر والحاد کی کتاب پر کچھ لکھنے سے اغماض کیا[3]، اس کتاب کے نسخے مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں، (انڈیا آفس لائبریری نمبر ۱۹۷۳، بوڈلین لائبریری نمبر ۱۳۱۵)

۳- **سنگھاسن بتیسی**۔ سنہ ۹۸۲ھ (۷۵-۱۵۷۴ء) میں ملا عبدالقادر بدایونی نے سنسکرت کی مشہور کتاب سنھاسن دواترنسیتی کا فارسی ترجمہ کیا، اس کتاب میں ہندوؤں کے مشہور راجہ بکرماجیت (مالوہ) کے متعلق بتیس قصے ہیں، اکبر کا حکم پاکر بدایونی نے ایک برہمن کی مدد سے ان قصوں کی فارسی جامہ پہنانا شروع کیا، اور اختتام پر کتاب کا تاریخی نام خرد افزا رکھا، اکبر اس کتاب کو بہت پسند کرتا تھا[4]، (بوڈلین لائبریری، کتاب نمبر ۱۳۲۴)

۴- **حیوٰۃ الحیوان**۔ دمیری کی شہرۂ آفاق کتاب حیوٰۃ الحیوان کو شیخ مبارک نے فارسی

---

[1] بدایونی جلد دوم ص ۳۲۱ - ۳۱۹　[2] فہرست مخطوطات انڈیا آفس و برٹش میوزیم کتب نمبر ۴ - ۵۶۳۸، بوڈلین لائبریری کتب نمبر ۱۳۰۶-۱۳۰۷، [3] بدایونی ج ۲ ص ۳۶۶　[4] ایضاً ص ۱۸۴،

میں ترجمہ کیا، اکبر کو نقیب خان پڑھ کر سناتا، اور معنی سمجھاتا جاتا تھا، اس مشکل کو رفع کرنے کے لیے اکبر نے اس کے فارسی ترجمہ کا حکم دیا، جو شیخ مبارک کے ذریعہ سے ۹۸۳ھ میں تمام ہوا، [۵۱]

۵۔ **اتھربن**۔ اکبر ہندوؤں کے علوم و فنون سے خاص شغف رکھتا تھا، چنانچہ ان کے مذہب کے معلومات حاصل کرنے کی غرض سے ان کی مقدس کتابوں کو زبان فارسی میں لانا چاہتا تھا، اتھربن کا فارسی ترجمہ اسی خیال سے اس نے کرایا، اول اول یہ کام ملا عبدالقادر بدایونی کے ذمہ کیا گیا، ایک نومسلم برہمن بھاون ان کو مطلب سمجھاتا جاتا تھا، اور وہ فارسی میں لکھتے جاتے تھے، لیکن اس کی عبارت بہت ہی مغلق تھی، اس لیے وہ یہ کام انجام دینے سے قاصر رہے، چنانچہ فیضی سے فرمایش کی گئی، پھر شیخ ابراہیم سرہندی کے ذمہ یہ خدمت سپرد ہوئی، گو شیخ ابراہیم نے یہ خدمت انجام دی، مگر ترجمہ اکبر کے خاطر خواہ نہیں ہوا، [۵۲]

۶۔ **انجیل**۔ نصرانی مبلغین کو شاہی دربار میں کافی رسوخ حاصل ہو گیا تھا، اکبر نے ان سے دین مسیحی کی جزئیات اور تفصیلات سے واقفیت حاصل کی، اور شہزادہ مراد کو اس کی تعلیم بھی دلائی، اسی سلسلہ میں انجیل کے فارسی ترجمہ کی بھی فرمایش کی، اس کام کے لیے ابوالفضل کو مامور کیا، جس نے ۹۸۶ھ میں اس کو انجام دیا، [۵۳] انہی اسباب پر بعض خوش فہم پادریوں کا خیال ہے کہ اکبر نے دین مسیحی قبول کر لیا تھا،

۷۔ **تزک بابری**۔ بابر نے اپنے خیالات اور واقعات ترکی میں قلمبند کیے تھے، اور تزک بابری نام رکھا تھا، اکبر کی فرمایش سے خان خانان عبدالرحیم نے اس کا فارسی ترجمہ ۹۹۵ھ میں کیا، جس کی زبان نہایت سادہ، شستہ اور صاف ہے،

۸۔ **لیلاوتی**۔ فن ریاضی کی ایک مشہور کتاب ہے، اس کا ترجمہ فیضی نے کیا،

---

[۵۱] بدایونی جلد دوم ص ۲۰۲، [۵۲] ایضاً ص ۲۱۲، [۵۳] ایضاً ص ۲۶۰

۹۔ تاجک۔ علوم نجوم میں ایک معتبر تصنیف ہے، مکمل خان گجراتی نے اس کو فارسی کا قالب پہنایا،

۱۰۔ ہربنس۔ کرشن جی کی زندگی کے حالات ہیں، مولانا شیری نے اس کا فارسی ترجمہ کیا،

۱۱۔ معجم البلدان۔ شہاب الدین عبد اللہ یاقوت بن عبد اللہ حموی رومی بغدادی (متوفی ۶۲۶ھ) کی شہرۂ آفاق کتاب معجم البلدان کا فارسی ترجمہ ملا احمد ٹھٹھ، قاسم بیگ، شیخ منور اور دوسرے فضلائے روزگار نے مل کر کیا،

۱۲۔ تاریخ کشمیر۔ راج ترنگنی مصنفہ کلہانا، سلطان زین العابدین والی کشمیر کے زمانہ میں بزبان سنسکرت لکھی گئی، اکبر نے کشمیر کے سفر میں اس کتاب کو دیکھا، اس کی خواہش ہوئی کہ اس کا فارسی ترجمہ ہو، چنانچہ مولانا شاہ محمد شاہ آبادی نے اس کام کو انجام دیا، ابوالفضل کا بیان ہے کہ اس میں کشمیر کے متعلق چار ہزار برس کا حال لکھا ہے[۵۱]، اس کتاب کا فارسی ترجمہ چھپ گیا ہے[۵۲]، اس ترجمہ کا انتخاب ملا عبدالقادر بدایونی نے بھی سلیس زبان میں کیا، جو شاہی کتبخانہ میں داخل ہوا[۵۳]،

۱۳۔ کلیلہ دمنہ۔ قصہ کے طور پر حکمت عملی کی ایک مشہور سنسکرت کتاب ہے، ملا حسین واعظ نے اس کا فارسی ترجمہ کیا تھا، لیکن سخت الفاظ و استعارات سے یہ ترجمہ اس قدر پیچیدہ اور مشکل ہو گیا تھا، کہ اس کا سمجھنا آسان نہ تھا، اکبر نے ابوالفضل کو حکم دیا کہ اصل سنسکرت کو سامنے رکھکر ایسی عبارت میں ترجمہ کیا جائے کہ اس کے پند و نصائح آسانی سے سمجھ میں آئیں، ۹۹۶ھ میں ابوالفضل نے اس کام کو انجام دیا، کتاب کا نام عیار دانش رکھا گیا[۵۴]، کتاب کے اختتام پر ابوالفضل نے ایک خاتمہ لکھا ہے، جس میں بعض نادر معانی اور نکات بیان کئے گئے ہیں، (انڈیا آفس لائبریری، کتب نمبر ۷۷۶ - ۷۷۷، بوڈلین لائبریری نمبر ۴۰۴ - ۴۳۸)

---

[۵۱] آئین اکبری ص ۷۶، [۵۲] انڈیا آفس کیٹلاگ ص ۲۰۱، [۵۳] بدایونی جلد دوم ص ۳۷۴، [۵۴] آئین اکبری ص ۷۷،

۱۴- **نل دمن**۔ یہ عشق و محبت کا ایک جگر گداز قصہ ہے سنہ ۱۰۰۳ھ میں ملک الشعرا فیضی نے خسرو کی لیلیٰ مجنوں کی بحر میں اس کو نظم کیا، اس میں چار ہزار دو سو اشعار ہیں، اور قابل تعجب یہ امر ہے کہ صرف پانچ مہینے کی مدت میں یہ عظیم الشان کارنامہ انجام پذیر ہوا، اس کے کمال و خوبی کی داد ملا عبدالقادر جو فیضی کو ہمیشہ سخت الفاظ سے یاد کرتے ہیں، اس طرح دیتے ہیں:

"و الحق مثنوی ست کہ دریں سی صد سال مثل آن بعد از میر خسرو شاید در ہند کسی دیگر نہ گفتہ باشد"[1]

۱۵- **جامع رشیدی**۔ سنہ ۹۹۳ھ میں عبدالقادر بدایونی نے عربی کی ضخیم کتاب جامع رشیدی کا فارسی ترجمہ کیا، جو خزانہ عامرہ میں داخل ہوا،[2]

۱۶- **بحر الاسمار**۔ ہندی افسانہ کی ایک کتاب تھی، سلطان زین العابدین نے اس کا تھوڑا سا ترجمہ کرایا تھا، نامکمل تھی، ابو الفضل کی فرمایش سے ملا عبدالقادر نے اس کام کو اپنے [illegible] لیا، چنانچہ ۵ مہینے میں ترجمہ کا کام ختم کیا، جو ساٹھ جزء میں تھا، اکبر نے خوش ہو کر دس ہزار ٹنکہ اور ایک گھوڑا انعام میں دیا،[3]

۱۷- اکبر نے شہرزوری کی عربی تالیف تاریخ الحکما، کا بھی فارسی ترجمہ مقصود علی تبریزی سے شہزادہ سلیم کی تعلیم کے لیے کرایا، اس کا نام نزہتہ الارواح و نزہتہ الافراح رکھا گیا،

اکبر نے نہ صرف سنسکرت کی کتابیں فارسی میں منتقل کرائیں بلکہ عربی و فارسی کی کتابوں کو سنسکرت کا قالب پہنایا، چنانچہ زیچ مرزائی کا ترجمہ سنسکرت میں ہوا، اس کے ترجمہ میں میر فتح اللہ شیرازی، ابو الفضل، کشن جوتشی، گنگادھر، مہیش مہانند شریک تھے،[4]

تصنیفات | **تاریخ الفی** اکبر چاہتا تھا کہ اسلامی عہد کے ابتدائی دور سے اس کے زمانہ تک کی

---

[1] بدایونی ج ۲ ص ۳۹۶ [2] ایضاً ص ۳۴۳ [3] عبدالقادر بدایونی ج ۲ ص ۱۰۴ [4] آئین اکبری، ص ۷۱،

کوئی مفصل اور مکمل تاریخ ہو، اس کی خواہش کے مطابق نقیب خان، شاہ فتح اللہ، حکیم ہمام، حکیم علی، حاجی ابراہیم سرہندی، نظام الدین احمد، عبد القادر بدایونی، مولانا احمد ٹھٹھوی، جعفر بیگ اور آصف خان نے ملکر اس کام کو انجام دیا، یہ کتاب چار جلدوں میں ختم ہوئی، ملا عبد القادر بدایونی تین جلدوں کا تذکرہ کرتے ہیں، مگر انڈیا آفس لائبریری میں اس کی چار جلدیں موجود ہیں[1]۔ تیسری جلد میں سنہ ۹۹۷ھ تک کی تاریخ ہے، اور سنہ ۱۰۰۰ھ میں ختم کی گئی، پروفیسر ڈاؤسن کا خیال ہے کہ ان چاروں جلدوں کے علاوہ دو اور جلدیں ہونی چاہئیں، اس کتاب کی تدوین اور ترتیب میں مختلف اہل علم نے حصہ لیا، اس کا ذکر ملا عبد القادر بدایونی اس طرح کرتے ہیں:-

> اسی سال یہ حکم ہوا کہ ہجرت سے چونکہ ہزار سال پورے ہو گئے، اور لوگ ہر جگہ ہجری تاریخ لکھتے ہیں، اب مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک ایسی تاریخ مرتب کی جائے جو ان تمام سلاطین کے حالات پر حاوی ہو، جو ابتدا سے اب تک اسلام میں گذرے ہیں، جس کے دوسرے معنے یہ تھے کہ ایسی تاریخ لکھوائی جائے جو دوسری تمام تاریخوں کی ناسخ ہو، اس تاریخ کا بادشاہ نے الفی نام رکھا اور یہ بھی حکم دیا کہ سنہ کے ذکر میں ہجرت کے بجائے رحلت لکھیں، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے روز وفات سے آج تک کے واقعات کے لکھنے کے لیے سات آدمیوں کو حکم ہوا، پہلے سال کے واقعات کو نقیب خان لکھیں، اور دوسرے کو شاہ فتح اللہ، اور تیسرے کو حکیم ہمام، چوتھے کو حکیم علی، پانچویں کو حاجی ابراہیم سرہندی، چھٹے کو مرزا نظام الدین احمد اور ساتویں کو فقیر قلمبند کرے، اسی طرح ۳۵ سال کی تاریخ مرتب ہو گئی، ایک رات کو ساتویں سال کے متعلق جب کہ فقیر خلیفہ ثانی کے حالات لکھ رہا تھا اور قصر الامارۃ کی بنا و انہدام

---

[1] انڈیا آفس کیٹلاگ ص ۱۰م۔ [2] المنتخب التواریخ ج ۲ ص ۱۵۶،

ام کلثوم بنت امیر المومنین علی رضی اللہ عنہا کے نکاح کے معاملہ، اور پانچوں وقت کی نماز کی تعیین، اور شہر نصیبین کی فتح، اور بڑے بڑے مرغ کے مانند بچھوؤں کے معاملے تک پہنچا تو سخت مباحثہ ہوا، مرزا جعفر آصف خان ثالث کی بری طرح ڈگی، برخلاف شیخ ابوالفضل اور غازی خان بدخشی نے صحیح توجیہات کیں اور جب فقیر سے پوچھا کہ ان واقعات کو کیونکر لکھا تو میں نے کہا کہ جو کچھ کتابوں میں دیکھا، لکھ دیا، میں خود ان واقعات کا موجد نہیں ہوں، اسی وقت کتاب روضۃ الاحباب اور سیر کی دوسری کتابوں کو خزانہ سے طلب کر کے نقیب خان کو حکم دیا کہ ان واقعات کی تحقیق کریں، اس نے واقعہ کے مطابق صحیح نقل کر دیا اور مجھکو ان بے محل اعتراضات سے خدا کے فضل سے رہائی ہوئی، ۳۶ سال کے متعلق حکم ہوا کہ اب ملا احمد ٹھٹھہ تنہا تاریخ الفی لکھیں اور یہ حکم حکیم ابوالفتح کی سفارش سے ہوا، اور انھوں نے تعصب کی وجہ سے اپنے اعتقاد کے مطابق جو کچھ چاہا لکھ دیا، جیسا کہ ظاہر ہے چنگیز خان کے زمانہ تک کے تمام واقعات کو دو جلدوں میں تمام کیا، یہانتک کہ مرزا فولاد برلاس نے ایک رات اس کو بادشاہ کے طلب کرنے کے بہانہ سے گھر سے نکالا اور لاہور کی گلی میں اس غلو کی وجہ سے جو وہ مذہب میں رکھتا تھا، اور اس تکلیف کی وجہ سے جو اس کو اس سے ہوئی تھی، قتل کر دیا اور خود اس کے قصاص میں قتل ہوا، بقیہ احوال کو حکم کے موافق آصف خان نے نوسو ستانوے سال ۹۹۷ تک لکھا اور سنہ ایکہزار میں فقیر کو لاہور میں حکم دیا کہ اس تاریخ کو ابتدا سے مقابلہ اور تصحیح کروں، اور وہ سنہ جو آگے پیچھے لکھے گئے ہیں ان کو مرتب کروں، ایک سال تک اس خدمت میں مشغول رہ کر پہلی دو جلدوں کا مقابلہ کیا، اور تیسری جلد کو آصف خان کے حوالہ کیا،[۵]

۲

ابوالفضل نے آغاز کتاب میں ایک مقدمہ لکھا[۵۱] اس تالیف کی خوبی کو ایک انگریز مورخ اس طرح بیان کرتا ہے:-

"مولفین اس تالیف کی تیاری میں تمام بہترین ذرائع تصرف میں لائے ہیں کیونکہ عربی اور فارسی کی ان تمام مشہور اور مستند تاریخوں کے حوالے جن سے آج موجودہ یورپین اہل علم فیض حاصل کر رہے ہیں، اس تالیف میں مذکور ہیں، انھوں نے بڑی دقت نظر کے ساتھ مستند مواد کا انتخاب کیا ہے، اور ان خرافات کو جو اکثر کتابوں میں پائے جاتے ہیں، نظر انداز کر دیا ہے۔[۵۲]"

اکبرنامہ۔ تیموریوں کے دربار میں تاریخ نویسی اور واقعہ نگاری کا ایک باضابطہ محکمہ قائم تھا، اکبرنامہ اور آئین اکبری اس سلسلہ کی پہلی کڑی ہیں، اکبرنامہ ابوالفضل کی محنت و کاوش اور انشا کا شاہکار ہے، یہ دو جلدوں پر مشتمل ہے، پہلی جلد میں بابر و ہمایوں کے حالات ہیں، دوسری جلد میں اکبری حکومت کے مفصل واقعات ہیں، آئین اکبری کو اس کی تیسری جلد سمجھنا چاہیے، اکبرنامہ کے استناد کو بعض مورخین اس لیے مشکوک نظروں سے دیکھتے ہیں کہ یہ اکبر کے ایک درباری مورخ کی نگارش و تحریر ہے، جس میں حد سے زیادہ خوشامد کا پہلو ملحوظ رکھا گیا ہے،

الفنسٹن لکھتا ہے کہ

"اکبرنامہ کی سند یورپ میں وقعت کی نظر سے دیکھی نہیں جاتی .... کیونکہ ابوالفضل گو وہ ایک وسیع النظر اور غیر معمولی ذہن کا آدمی ہے پھر بھی وہ ایک وفادار درباری ہے جو اپنے آقا کی نیکیوں کو ہمیشہ اچھالتا ہے، اس کی برائیوں سے چشم پوشی کرتا ہے،

[۵۱] آئین اکبری ص ۷، [۵۲] ایلیٹ ج ۵ ص ۱۵۶، انڈیا آفس کیٹلاگ نمبر ۱۱۸ - ۱۱۰

اور اس کے اور اس کے ہوا خواہوں کے رتبہ کو ہمیشہ بڑھانے کی کوشش کرتا ہے،
اس کے سنہ و تاریخ اور واقعات کے عمومی بیانات قابل قدر ہیں لیکن اس کتاب
کو پڑھتے وقت اس کی علانیہ طرفداری سے اپنے کو اتنا محفوظ رکھنا نہیں پڑتا، جتنا کہ
وہ اپنے ممدوحین کی مدح سرائی کر کے ناظرین کی ہمدردی خواہ مخواہ حاصل کرنا چاہتا
ہے، اور پھر بعض موقع پر بے جا اور غیر ایماندارانہ طریقہ پر ایک قصہ کہکر کسی سے بدظن کر دیتا
ہے، حالانکہ وہ شخص بالکل معصوم اور قابل معافی ہوتا ہے، اس کے بیانات گنجلک، غیر موثر
عامیانہ خیالات اور دعائیہ فقروں سے بریز، اور عموماً اپنے ممدوح کی مدح سرائی پر ختم
ہوتے ہیں، وہ اکثر واقعات کو نظر انداز کر دیتا ہے، یا اپنے مخصوص انداز سے غلط پیرایہ
میں بیان کر جاتا ہے، اور تعریف و توصیف، فتح و کامرانی کے واقعات کا تذکرہ اس
غلو سے کرتا ہے کہ ناظرین نہ صرف کتاب سے بلکہ ممدوح سے بھی مکدر خاطر ہو جاتے ہیں،
اس بے معنی تعریف و توصیف کے ڈھیر میں اکبر کے حقیقی اوصاف گم ہو جاتے ہیں،
اور پھر دوسرے مورخوں سے اس کے افعال کی نوعیت کا، اس کی مشکلات اور ان
ذرائع کا جن سے وہ ان مشکلات کو حل کرتا ہے، اصلی حال معلوم ہوتا ہے، کتاب کا
خوشامدانہ انداز (جسے ایسے آدمی نے لکھا، جو اکبر کی طبیعت سے خوب اچھی طرح واقف
تھا، اور پھر اس کے معائنہ کے لیے پیش کیا) اس (اکبر) کی نخوت و کبریائی کا پتہ دیتا ہے
جو حقیقتہً اس کی پسندیدہ سیرت کا تنہا داغ ہے"

مگر اس کا جواب ایک دوسرا یورپین مورخ اس طرح دیتا ہے:-

"ابوالفضل پر یورپین مصنفین خوشامد پسندی کا الزام عائد کرتے ہیں، ساتھ ہی ساتھ
یہ بھی کہ اس نے قصداً بعض واقعات کو چھپایا ہے، جس سے اس کے آقا کی شہرت کو کافی

نقصان پہنچا ہے، مگر اکبرنامہ کا مطالعہ کیا جائے تو الزام بالکل بے بنیاد معلوم ہوتا ہے،
اگر اس کی تصنیفات کا ہم مشرق کی دوسری تاریخوں سے مقابلہ کریں، تو پتہ چلے گا کہ وہ
تعریف کرتا ہے لیکن کم، اور خاص انداز کمال سے جو کوئی دوسرا ہندوستانی مورخ
نہیں کر سکتا ہے، ملکی مورخوں میں سے کوئی اس پر خوشامد کا الزام عائد نہیں کرتا، اور اگر
ہم یہ ذہن نشین کر لیں کہ مشرق کی تمام کتابیں حکمراں کی رائے سے متفق اور متبع ہونا
ضروری قرار دیتی ہیں، خواہ وہ اچھی ہو یا بری، تو پھر ابوالفضل قابل معافی ہے، وہ
اس لیے تعریف کرتا ہے کہ اس نے حقیقتہً ایک سچا ہیرو پا لیا ہے۔"[۵۱]

اسی بات کو محمد حسین آزاد اپنے مخصوص انداز میں اس طرح لکھتے ہیں:۔

"جن لوگوں کے دماغوں میں نئی روشنی سے اجالا ہو گیا ہے۔ وہ اس کی تصنیفات
پڑھ کر یہ لکھتے ہیں، کہ ابوالفضل ایشیائی انشا پردازوں میں سب سے بڑا مبالغہ پرداز مصنف
تھا، اس نے اکبرنامہ اور آئین اکبری کے لکھنے میں فارسی کی پرانی لیاقت کو تازہ کیا ہے،
اس نے خوش بیانی اور بادہ سرائی کے پردہ میں اکبر کی خوبیاں دکھائی ہیں، اور عیب
اس طرح چھپائے ہیں کہ جن کے پڑھنے سے ممدوح اور مادح دونوں سے نفرت ہوتی
ہے، اور دونوں کی ذہانت و متانت پر بٹہ لگتا ہے۔ البتہ بڑا علامہ، عاقل، دانا، مدبر تھا، اور
دنیا کے کاموں کے لیے جیسی عقل کی ضرورت ہے، وہ اس میں ضرور تھی، آزاد کہتا ہے کہ
جو کچھ الفاظ و عبارت کے پڑھنے والوں نے کہا یہ بھی ہے، لیکن وہ مجبور تھا، کیونکہ فارسی کا
ڈھنگ جو صدیوں سے یہی چلا آتا تھا، اس کی ایجادوں نے بہت اصلاح کی ہے، اور
خرابیوں کو سنبھالا ہے، باوجود اس کے جو زبان کے ماہر ہیں، اور موزونِ سخن کے تاڑنے والے

۵۱۔ بلاخ مین تمہید آئین اکبری۔

ہیں، اور کلام کے انداز اور ادا اون کو جانتے اور پہچانتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ جو کچھ کہا اور جس پیرایہ میں کہا، کوئی بات اٹھا نہیں رکھی، اصل حقیقت کو لکھ دیا ہے، اور انشا پردازی کا آئینہ اوپر رکھدیا ہے، کہ اسی کا کام تھا، یہی اسی کا کام تھا کہ سب کچھ کہدیا، اور جن سے نہ کہنا تھا وہ کچھ بھی نہ سمجھے اور ابتک بھی نہیں سمجھتے، خوشامد کی بات ہم نہیں مانتے، ہر زبان کی تاریخیں موجود ہیں، کونسا مورخ ہے کہ خوشامد، شاہ اور حمایت قوم سے پاک ہو، وہ اپنے آقا کا ایک نمک حلال وفادار نوکر تھا، اسی کے انصاف سے اس کے خاندان کی عزت وآبرو بچی، اسی کی قدردانی سے رکن سلطنت ہوگیا، اسی کی پرورش سے تصنیفات ہیں، اور انھوں نے بلکہ خود اس نے صدہا سال عمر پائی، خوشامد کیا چیز ہے؟ اس کا دل تو عبادت کرتا ہوگا، اور جان لوٹ لوٹ کر خاک راہ ہوئی جاتی ہوگی، اس نے بہت سا ادب ظاہر کیا، شکریہ ادا کیا، لوگوں نے خوشامد نام رکھا۔"[1]

مؤلف مآثر الامراء ابوالفضل کے انشا، اور اکبرنامہ کے متعلق لکھتا ہے :-

تمام چیزوں سے قطع نظر کرکے شیخ نے فن انشا میں عجیب سحر نگاری سے کام لیا ہے، باوجودیکہ وہ انشا پردازی کے تمام مصنوعی تکلفات سے پاک ہے، باایں ہمہ مفرد الفاظ کی نشست، ان کی متانت، حسن ترکیب وغیرہ کا ایک ایسا حصہ اس میں آگیا ہے کہ دوسرے لوگ بمشکل اس کی تقلید کرسکتے ہیں، اور تاریخ اکبری سے اسکی شہادت مل سکتی ہے چونکہ اس نے یہ التزام کرلیا ہے کہ (اس میں زیادہ تر فارسی کے الفاظ آئیں) اس لیے لوگوں کا بیان ہے کہ شیخ نے خمسۂ نظامی کی نثر کردی ہے، اس فن میں اس کی مہارت کا کمال یہ ہے کہ ہمت سے مطالب کو جو بداہتہً باطل تھے، بادشاہ کی مداحی کے لیے بظاہر چند ایسی تمہیدوں کے ساتھ بیان کیا ہے کہ جبتک غور نہ کیا جائے اصل مقصد معلوم نہیں ہو سکتا۔

[1] دربار اکبری، مطبع رفاہ عام لاہور، ص ۵۰۰۔

آئین اکبری - اکبرنامہ ہی کے مختلف حصے ہیں، اس کی خوبیاں جتنی بھی زیادہ بیان کرنے کی کوشش کی جائے گی، پھر بھی قلم قاصر رہے گا، ابوالفضل نے اسکو جس محنت کاوش، امعان نظر اور دیانتداری سے لکھا ہے وہ ہر زبان کے لیے ایک قابل فخر علمی کارنامہ ہو سکتا ہے، اس کو تیموری دور کے ملکی، حربی، صنعتی، زراعتی، اقتصادی، معاشرتی، تمدنی، خانگی، علمی اور مذہبی حالات و واقعات کا آئینہ سمجھنا چاہیے، اگر یہ کتاب نہ لکھی جاتی تو شاہان مغلیہ کے عہد زرین کے مختلف پہلوؤں کی تصویریں اتنی واضح اور روشن نظر نہ آتیں، جتنی کہ آج نظر آ رہی ہیں، اور اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ ہندوستان میں جب برطانوی نظام حکومت قائم ہوا تو اس سلسلہ میں یہ کتاب بے حد معاون ہوئی،

ان تاریخوں کے علاوہ نثر و نظم کی بہت سی کتابیں اکبر کی فرمایش پر لکھی گئیں، ملک الشعراء ابوالفیض فیضی فیاضی نے نظامی کے خمسہ کی زمین میں پانچ مثنویاں لکھیں، خسرو شیریں کے مقابل میں سلیمان و بلقیس اور لیلی مجنون کے طرز پر نل دمن لکھی، ان دونوں میں علیحدہ علیحدہ چار ہزار اشعار تھے، ہفت پیکر کے وزن پر ہفت کشور اور سکندر نامہ کے جواب میں اکبرنامہ لکھی، جو پانچ ہزار شعروں پر مشتمل تھیں، مخزن اسرار کے مقابلہ میں مرکز ادوار لکھی جس میں تین ہزار ابیات تھیں[1]،

فیضی نے کلام مجید کی ایک بے نقط تفسیر سواطع الالہام بھی لکھی جس کے صلہ میں اکبر نے دس ہزار روپئے دیے، اس نے اخلاقیات پر ایک بے نقط کتاب موارد الکلام بھی تالیف کی تھی[2]،

ارباب کمال | اس جماعت میں سب سے پہلے ہماری نظر ابوالفیض فیضی فیاضی پر پڑتی ہے جو شیخ مبارک کا خلف اکبر تھا، اس کے قلم و زبان کی شہرت نے بیس برس کی عمر میں اسے اکبر کے دربار تک

---

[1] مآثر الامراء ج ۲ ص ۵۸۶ [2] ایضاً ص ۵۸۵،

پہنچا دیا، جہاں وہ چہار صدی منصب پر فائز ہوا، اور جب تیس برس کا ہوا تو ملک الشعراء کے معزز خطاب سے سرفراز کیا گیا، عربی، فارسی اور سنسکرت کا جید عالم تھا، اس نے ایک سے ایک کتابیں مختلف زبانوں میں تالیف کیں، اس کی متعدد تصانیف کا ذکر اوپر آچکا ہے، اس کا علمی شغف اس قدر بڑھا تھا کہ جب وہ مرا تو اپنے کتب خانہ میں ۴۳۰۰ کتابیں چھوڑیں جو شاہی کتب خانہ میں داخل کر لی گئیں، شاعری میں یکتائے روزگار تھا، پہلے فیضی پھر فیاضی تخلص کرتا تھا، چنانچہ خود کہتا ہے:

زیں پیش کہ سکہ ام سخن بود
فیضی رقم نگین من بود

اکنون کہ شدم بعشق مرتاض
فیاضیم از محیط فیاض

فیضی کے قصائد، غزلیں، اور مثنویاں فارسی کی بہترین نظموں میں شمار کی جاتی ہیں، اس کے کل کلام کی تعداد ۵۰ ہزار کے لگ بھگ ہے، اس کے مجموعہ کا نام طباشیر الصبح ہے، فن طب سے بھی دلچسپی رکھتا تھا، بوعلی سینا کی کتاب القانون کو پڑھانے میں بڑی شہرت حاصل کی تھی، اکبر کا محبوب ترین دوست تھا، اس کو ہمیشہ پاس رکھتا تھا، اور اس کی ہمہ گیر قابلیت سے برابر فیضیاب ہوتا رہتا تھا، اکبر کے لڑکوں کی تعلیم اسی کے ذمہ تھی، شہزادہ دانیال کو تھوڑے ہی دنوں میں ضروری مراتب سکھا دیئے تھے، دانیال نے برج بھاکا اسی سے سیکھی، ۲۶ھ جلوس میں اکبر نے اظہار عقیدت کے لیے شہزادہ دانیال کو اجمیر بھیجا تو فیضی کو بھی اس کے ساتھ متعین کیا، ۹۹۱ھ میں آگرہ کالپی اور کالنجر کی صدارت اس کو تفویض کی گئی، ۹۹۳ھ میں جب یوسف زئی پٹھانوں کے خلاف اکبر نے فوجیں بھیجیں تو فیضی بھی اس مہم پر مامور کیا گیا، ۹۹۶ھ میں اکبر نے ملک الشعراء کا خطاب عطا کیا، ۹۹۷ھ میں اکبر کشمیر گیا تو فیضی بھی اس کی معیت میں تھا، شاہی جلو میں کشمیر کی حسین وادیوں کو دیکھ کر مست ہو گیا، اور ایک قصیدہ کہا جس کا مطلع یہ تھا،

ہزار قافلہ شوق می کند شبگیر		کہ بار عیش گشاید بہ خطۂ کشمیر

۹۹۹ھ میں اکبر نے خاندیس کے فرمانرواکے پاس سفیر بنا کر بھیجا، وہاں سے احمد نگر برہان نظام شاہ کے پاس سفیر ہی کی حیثیت سے پہنچا، یہاں سے اکبر کے پاس جو عرضداشت لکھکر بھیجی، وہ مختلف قسم کے معلومات سے پر تھی، اس کو سیاسی کاموں سے زیادہ دلچسپی نہ تھی، وہ اکبر کے قریب رہ کر علمی مشاغل میں زندگی بسر کرنا زیادہ پسند کرتا تھا، شروع سے اخیر تک اکبر کے ساتھ اس کو خاص قلبی لگاؤ تھا، شاہ عباس صفوی نے اکبر کے پاس قیمتی تحائف لے کر اپنے ایک ایلچی کو بھیجا، تو مؤخر الذکر نے ایک مکتوب پڑھا جس کے سرورق پر یہ رباعی تھی،

زنگی بسپاہ وخیل ولشکر نازد		رومی بسنان وتیغ وخنجر نازد

اکبر بہ خزینۂ پر از زر نازد		عباس بہ ذوالفقار حیدر نازد

جب یہ رباعی پڑھی گئی تو دربار کا ہر شخص چونک اٹھا، اکبر نے فیضی کی طرف دیکھا، فیضی اپنے محبوب شاہی آقا کی سبکی برداشت نہ کرسکا اور فی البدیہہ یہ رباعی لکھکر پڑھی

فردوس بہ سلسبیل وکوثر نازد		دریا بہ گہر فلک بہ اختر نازد

عباس بہ ذوالفقار حیدر نازد		کونین بہ ذات پاک اکبر نازد

اس کو سنکر دربار میں مسرت وافتخار کی ایک لہر دوڑ گئی،[۱] فیضی نے ۱۰۰۴ھ میں وفات پائی، جب بستر مرگ پر تھا تو ایک رات اکبر کو خبر ہوئی کہ وہ عالم نزع میں ہے آدھی رات گذر چکی تھی، مگر اکبر اپنے محبوب دوست کے گھر پر اسی وقت شاہی حکیم لیکر پہنچا، اضطراب میں فیضی کا سر پکڑ کر بولا، "شیخ جیو، بولو، حکیم علی کو ساتھ لایا ہوں، بولتے کیوں

---

[۱] بیاض مرزا اسد بیگ ترکمان بحوالہ ہسٹری پرشین لٹریچر اینڈ لینگویج از عبد الغنی جلد سوم ص ۴۶،

نہیں ہوا مگر فیضی کی زبان بند ہو چکی تھی، اکبر نے پھر جھنجھوڑا لیکن اس مرتبہ روح قفسِ عنصری سے پرواز کر چکی تھی، غایت اضطراب اور صدمہ میں اکبر نے سر سے دستار اتار کر زمین پر پھینک دی۔[۱]

فیضی کی لیاقت، قابلیت، دقتِ نظر اور جودتِ طبع کے تمام اہلِ قلم معترف ہیں، ملا عبدالقادر بدایونی اس کو عقیدے کے لحاظ سے بہت ہی سخت اور برے الفاظ سے یاد کرتے ہیں، مگر جہاں اس کی علمی لیاقت کا ذکر آتا ہے اس کی خوبیوں کی دل کھول کر داد دیتے ہیں، اس کی مثنوی نل دمن کے بارے میں لکھتے ہیں کہ اس قسم کی کتاب تین سو سال کے اندر نہیں لکھی گئی، ایک جگہ اس کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"در فنون جزئیہ از شعر و معما و عروض و قافیہ و تاریخ و لغت و طب و انشا، عدیل در روزگار نداشت۔"[۲]

مصنف ماثر الامرا، اس کی قابلیت کے متعلق یوں رقمطراز ہیں:۔

"بدقت طبع و جودت ذہن از جمیع علوم بخشی وافر برداشتہ، در حکمت و عربیت بیشتر تتبع نمودہ و پزشکی و دانش فراپیش گرفتہ رنجوران تہی دست را چارہ می کرد۔"[۳]

موجودہ دور کے ارباب کمال بھی اس کے کمال کے معترف ہیں۔ مولانا شبلی لکھتے ہیں:

"فارسی شاعری نے چھ سو برس کی وسیع مدت میں ہندوستان میں صرف دو[۲] شخص پیدا کئے، جن کو اہل زبان کو بھی چار و ناچار ماننا پڑا، خسرو اور فیضی، مرزا صائب فیضی کی طرح پر غزل کہتے ہیں اور مقطع میں کہتے ہیں"

ایں آں غزل کہ فیضی شیریں کلام گفت — در دیدہ ام خلیدہ و در دل نشستہ

"... فیضی کی خصوصیات میں سب سے بڑھکر جوشِ بیان ہے، جس کا وہ موجد بھی ہے"

۱؎ بدایونی جلد اول ص۳۳۵ و ماثر الامرا جلد ۳ ص۵۸۴ شعر العجم جلد سوم، ۲؎ بدایونی جلد ۳ ص۲۹۹، ۳؎ ماثر الامرا، ص۵۸۵

اور خاتم بھی، جوش بیان خواجہ حافظ میں بھی ہے، اور اعلیٰ درجہ پر ہے لیکن رندانہ مضامین اور دنیا کی بے ثباتی کے ساتھ مخصوص ہے، فیضی کے ہاں فخریہ، عشقیہ، فلسفیانہ ہر قسم کے مضامین میں وہی جوش پایا جاتا ہے، جوش بیان اس کے ذاتی حالات کا خاص اثر ہے جو کسی اور کو نصیب نہیں ہو سکتا تھا۔"[۱]

محمد حسین آزاد گوہر افشاں ہیں:۔

"انشاپردازی فیضی کے قلم کو سجدہ کرتی ہے، اس کے لطیف استعارے، رنگین تشبیہیں، بلند مضامین، نازک خیالات، فصیح زبان، لفظوں کی عمدہ تراشیں، دلکش ترکیبیں، اور اسے مطالب کے انداز دیکھنے کے قابل ہیں۔"[۲]

فیضی کے بعد یکایک اس کے چھوٹے بھائی علامی فہامی شیخ ابوالفضل پر نظر پڑتی ہے۔ ابوالفضل نے ۱۵ سال کی عمر میں تمام علوم و فنون کی تعلیم پاکر فراغت حاصل کر لی تھی، ۱۷ سال کی عمر میں آیۃ الکرسی کی تفسیر لکھکر اکبر کی خدمت میں گذرانی، فیضی شاہی بارگاہ سے منسلک ہو چکا تھا، اس کے ذریعہ ابوالفضل کی لیاقت اور ذہانت اکبر کے کانوں تک پہنچ چکی تھی، چنانچہ تخت نشینی کے نویں سال ابوالفضل شاہی ملازمت میں داخل ہو گیا، پھر تو شاہی جود و کرم کی بارش اتنی ہوئی کہ وہ چار ہزاری منصب پر فائز ہوا، اور وزارت عظمیٰ پر مامور کیا گیا، وہ ایک کامیاب سیاست داں، بیدار مغز مدبر اور ہوشیار سپہ سالار ہونے کے علاوہ ایک بے مثل ادیب، مورخ اور شاعر تھا، اور علامی کے ممتاز لقب سے ہمیشہ یاد کیا جاتا تھا، اس کی قابلیت اور لیاقت ہر جگہ اور ہر زمانہ میں تسلیم کی گئی ہے۔ مآثر الامراء لکھتا ہے کہ

---

[۱] شعر العجم حصہ سوم ص۴۲، [۲] دربار اکبری ص۳۲،

"بجودت طبع و رسائی فہم و علو فطرت و طلاقت لسان در کمتر زمانے یگانہ دہر ہمتائی وقت گردید"[51]

اردو کا سب سے بڑا انشا پرداز جو فارسی کا بھی مسلم الثبوت استاد تھا لکھتا ہے کہ

"شیخ کی انشا پردازی اور مطلب نگاری کی تعریف نہیں ہو سکتی، یہ نعمت خداداد ہے کہ خدا کے ہاں سے اپنے ساتھ لایا تھا، ہر ایک مطلب کو اس خوبصورتی سے ادا کرتا ہے کہ سمجھنے والا دیکھتا رہ جاتا ہے، بڑے بڑے انشا پردازوں کو دیکھو جہاں عبارت میں لطف اور کلام میں زور پیدا کرنا چاہتے ہیں تو بہار سے رنگ لیتے ہیں اور حسن و جمال سے خوبی مانگ کر کلام کو رنگین و نمکین کرتے ہیں، یہ قادر الکلام اپنے پاک خیالات اور سادہ الفاظ میں اصلی مطلب کو اس طرح ادا کرتا ہے کہ ہزار رنگینیاں ان پر قربان ہوتی ہیں، اس کے سادگی کے باغ میں رنگ آمیزی کا مصنوعی قلم لگائے تو ہاتھ قلم ہو جائیں، وہ انشا پردازی کا خدا ہے، اپنے لطف خیالات سے جیسی مخلوق چاہتا ہے الفاظ کے قالب میں ڈھال دیتا ہے، لطف یہ ہے کہ جس عالم میں لکھتا ہے نیا ڈھنگ ہے اور جتنا لکھتا جاتا ہے عبارت کا زور بڑھتا اور چڑھتا چلا جاتا ہے، ممکن نہیں کہ طبیعت میں تھکن معلوم ہو"[52]

ایک انگریز مورخ اس کے انشاء کے متعلق اپنی رائے یوں ظاہر کرتا ہے:-

"ابوالفضل کے طرز انشا پر کسی قسم کی رائے پیش کرنا بے سود ہے، عبداللہ شاہ بخارا کہا کرتا تھا کہ "وہ اکبر کے تیروں سے اتنا نہیں ڈرتا جتنا کہ ابوالفضل کے قلم سے ڈرتا ہے" ہندوستان میں ہر جگہ وہ ایک زبردست منشی تسلیم کیا گیا ہے،

---

[51] ماثر الامرا حصہ دوم صفحہ ۶۰۹۔ [52] دربار اکبری صفحہ ۲۹۳۔

اس کے مکتوبات تمام مدارس میں پڑھائے جاتے ہیں، اگرچہ ایک مبتدی ان کو پڑھنے میں مشکلوں اور پیچیدگیوں سے گھبرا جاتا ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ انشاء کے مکمل نمونے ہیں، ابوالفضل کی کتابوں سے لطف اٹھانے کے لیے نہ صرف فارسی زبان پر کافی عبور بلکہ خود ابوالفضل کے طرز انشا پر کافی مہارت حاصل کرنے کی ضرورت ہے اس کا طرز بے مثل ہے اور گو اس کی تحریر ہر جگہ پڑھی جاتی ہے لیکن اس کا اتباع نہ کیا گیا ہے، اور نہ کیا جا سکتا ہے[۵]"

ابوالفضل کے مختلف تراجم اور تاریخی شاہکار اکبر نامہ اور آئین اکبری کا ذکر آچکا ہے انکے علاوہ انشائے ابوالفضل کشکول، اور جامع اللغات بھی اس کی علمی یادگاریں ہیں، انشائے ابوالفضل اس کے خطوط کا مجموعہ ہے، یہ مجموعہ ابتک مختلف مدرسوں میں فارسی کے درس میں شامل ہے کشکول میں ابوالفضل کے انتخاب کردہ نثر و نظم کے وہ نمونے ہیں جو اس نے یادداشت کے طور پر وقتاً فوقتاً لکھ لیے تھے، جامع اللغات میں وہ الفاظ مع معانی کے درج ہیں، جو ابوالفضل نے شاید طالب علمی کے زمانہ میں لکھے تھے،

ابوالفضل شہزادہ سلیم کے اشارے سے بندھیل کھنڈ کے ایک زمیندار برسنگھ کے ہاتھوں سنہ ۱۰۱۱ھ میں قتل ہوا، جب اس حادثہ کی خبر شاہی دربار میں پہنچی تو کسی کی ہمت نہیں پڑتی تھی کہ اس سانحہ کی خبر اکبر تک پہنچائے، آخرکار ابوالفضل کا وکیل سیاہ لباس پہنکر دست بستہ اکبر کے حضور میں آیا، چغتائی خاندان کے جب کسی شہزادہ کے انتقال کی خبر آتی تو اس کا وکیل باپ تک اسی طرح خبر پہنچاتا تھا، ابوالفضل کے وکیل کو جب اکبر نے دیکھا تو متحیر ہو گیا، خبر جانکاہ سنکر فرط غم سے نڈھال ہو گیا اور بولا

"اگر شاہزادہ را داعیہ پادشاہی بود مرا کشتے و شیخ را نگاہ داشتے"

---

۵ بابائے سخن، مقدمہ آئین اکبری،

اور پھر یہ شعر پڑھا :-

شیخ ما از شوق بے حد چوں سوئے ما آمدہ   ز اشتیاق پائے بوسی بے سر و پا آمدہ[1]

فیضی اور ابوالفضل کے سلسلہ میں ان کے باپ شیخ مبارک ناگوری کا ذکر بھی ضروری ہے، یہ خاندان ناگور (نزد اجمیر) کا رہنے والا تھا، شیخ مبارک ناگوری نے گجرات میں خطیب ابوالفضل اور مولانا عماد طارمی سے علوم و فنون حاصل کیے، تحصیل تعلیم کے بعد علوم دینیہ کا درس دینے کے لیے آگرہ میں قیام کیا، ملا عبدالقادر بدایونی کا بیان ہے کہ شیخ ناگوری کی ابتدائی زندگی ریاضت، مجاہدہ، صلاح تقویٰ، توکل، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی پابندی کے لیے مشہور تھی، استغنا کا یہ حال تھا کہ بادشاہوں کے دربار میں جانے سے ہمیشہ پرہیز کیا، اور زیادہ تر اوقات ریاضت یا علمی مشاغل میں بسر کیے، شاطبی شروع سے آخر تک یاد تھی، کلام پاک کو دس قرأت کے ساتھ حفظ کیا، کلام پاک کی ایک تفسیر چار جلدوں میں منبع نفائس العیون کے نام سے لکھی، ملا عبدالقادر بدایونی نے شیخ ناگوری سے آگرہ میں کئی سال تک تعلیم حاصل کی، وہ رقمطراز ہیں کہ

"ملائے باین ہمہ جامعیت بنظر نیامدہ"

مگر جیسا کہ ملا صاحب کا بیان ہے کہ شیخ مبارک عمر کے آخری حصہ میں حب دنیا و حب جاہ کی خاطر جب اکبر کے دربار سے وابستہ ہوئے تو صراط مستقیم سے ہٹ کر محضر نامہ ترتیب دیا جس کے بعد دین الٰہی کا فتنہ اٹھ کھڑا ہوا۔[2]

دربار اکبری کے علم و ادب کے گلدستہ کا گل سرسبد عبدالرحیم خانخانان بن بیرم خان تھا، یہ صاحب قلم اور صاحب سیف دونوں تھا،

---

[1] مآثر الامرا، جلد دوم ص ۶۱۷ ، [2] منتخب التواریخ جلد دوم ص ۷۵ - ۱۰۳ ،

بیرم خان کے تعلقات شاہی دربار سے آخر میں خواہ کیسے ہی ہو گئے ہوں، لیکن یہ ایک ناقابل انکار حقیقت تھی کہ وہ ہندوستان میں تیموری سلطنت کے بانیوں میں سے تھا، اس نے اکبر کی دستگیری اور پشت پناہی اُس وقت کی جب وہ مشکلوں میں گھر کر بے پناہ ہو رہا تھا، احسان شناس اکبر نے بیرم خان کے مرنے کے بعد اس کے لڑکے عبد الرحیم کو اپنی تربیت خاص میں لیا، اور اس کی پرورش اور تعلیم اپنی نگرانی میں کی، جب سن شعور کو پہنچا تو خان مرزا کے خطاب سے سرفراز کیا، تھوڑے دنوں میں وہ سپہ سالار بنکر خانخاناں ہوا[۱]، ہم کو اس وقت اس کی شجاعت، تدبر، فتوحات اور جنگی معرکوں سے کسی قسم کی بحث نہیں، بلکہ ہم کو اس کے تبحر علمی، کمال انشا پردازی، علم دوستی اور ادب پروری پر کچھ روشنی ڈالنا ہے،

علمی حیثیت سے خانخاناں کا درجہ نہایت ہی ممتاز اور بلند تھا، دنیا کی اکثر مروج زبانوں پر مہارت تامہ رکھتا تھا، فارسی اس کی مادری زبان تھی، اس کی فارسی نثر اپنی سادگی، شستگی اور برجستگی کے لحاظ سے اب بھی بہت مقبول ہے، تزک بابری کا فارسی ترجمہ جو اس کے قلم کا رہین منت ہے، اب تک انشا کے لحاظ سے بے مثل چیز سمجھی جاتی ہے، اور ارباب ذوق اس کو بڑی دلچسپی کے ساتھ پڑھتے ہیں، اس نے اپنے فارسی کلام کا ایک مجموعہ بھی مرتب کیا تھا، مگر وہ اب نایاب ہے، مآثر رحیمی میں جس کو خانخاناں کی زندگی میں عبد الباقی نہاوندی نے لکھا ہے، اس کے فارسی کلام کے کثرت سے نمونے درج ہیں،

خانخاناں کی سخن سنجی اس کمال کو پہنچی ہوئی تھی کہ اپنے مشہور ہمعصر شعرا نظیری، عرفی، شکیبی، اور انیسی کے مقابلہ میں غزلیں کہتا اور بعض اوقات سب میں ممتاز رہتا تھا، اس کے

۱؎ تفصیل کے لیے دیکھو مآثر الامرا حصہ دوم صفحہ ۶۹۳،

دربار میں برابر مشاعرے منعقد ہوا کرتے تھے، ایک بار طرح تھی، چند است پند است، فرزند است
تمام شعرائے اکبری نے اس زمین پر اپنا اپنا اشہب قلم دوڑایا، مگر میدان خانخاناں کے ہاتھ
رہا، حتیٰ کہ نظیری بھی اس کے کلام کی صفائی، شستگی، دلآویزی اور سوز و گداز میں اس سے بازی
لے جا سکا۔[۱] ہمارے ناظرین بھی اس غزل سے لطف اٹھائیں۔

شمار شوق ندانستہ ام کہ تا چند ست — جز این قدر کہ دلم سخت آرزومند ست
بہ کیش صدق و صفا حرف عہد بیکار ست — نگاہ اہل محبت تمام سوگند ست
نہ دام دانم و نہ دانہ این قدر دانم — کہ پائے تا سرش ہر چہ ہست در بند ست
مرا فروخت محبت و لے ندانستم — کہ مشتری چہ کس ست و بہائے من چند ست
ادائے حق محبت عنایتے ست ز دوست — وگرنہ خاطر عاشق بہیچ خرسند ست
از آن خوشم بہ سخنہائے دلکش تو رحیم — کہ اندکے بہ ادا ہائے عشق مانند ست

خانخاناں عربی میں بھی اعلیٰ لیاقت رکھتا تھا، نہایت دقیق، مغلق اور مشکل عربی عبارت کے معنی نہایت
آسانی سے بیان کر دیتا تھا، ایک بار شریف مکہ نے اکبر کو خط لکھا، عبارت اس قدر مشکل تھی کہ
ابوالفضل اور فتح اللہ شیرازی کو مفہوم سمجھنے کے لیے لغت کی ضرورت ہوئی، خانخاناں نے
اسے فوراً لیا، خط کی عبارت پڑھتا اور برجستہ ترجمہ کرتا جاتا تھا، جس کی داد تمام اہل دربار
نے دی۔[۲]

ترکی خانخاناں کی مادری زبان سمجھنا چاہیے، اس زبان میں اس کی لیاقت مسلّم
تھی، ہندی زبان کا پرگو شاعر تھا، اور سب سے زیادہ اسی زبان میں شاعری کی، ماثر رحیمی
میں ہے:۔

---

[۱] شعر العجم جلد سوم ص۱۵ [۲] ماثر رحیمی، جلد دوم ص۵۹۰

"در زبان ہندی ید بیضا نمودہ اند، چنداں اشعار متین و ابیات دلنشین کہ ایشان را آن زبان دارند ہیچ یک از فحول شعراے آن زبان را نیست، دست از ثبت نمودن آنہا باز داشتہ باشعاری کہ بزبان فارسی فرمودہ اند اکتفا نمودہ و تجمل و انعام و احسانے کہ بشعراے فارسی نمودہ برابر آن بہندی زبانان نمودہ باشند، و چنداں اشعار کہ آن جماعہ در مدح ایشان گفتہ اند فارسی گویان عشر عشیر نگفتہ اند"[۵۱]

یہی مصنف ایک جگہ لکھتا ہے کہ اکبر کو سلاطین یورپ سے برابر مراسلت کرنی ہوتی تھی، اس لیے خانخاناں کو یورپین زبانوں کے سیکھنے کا حکم دیا، جن کو اس نے سیکھا، مگر یہ معلوم نہ ہو سکا کہ کن کن زبانوں سے اس نے واقفیت حاصل کی تھی، بہرحال وہ بہت سی زبانوں پر مہارت رکھتا تھا، مآثر الامراء میں ہے:-

"خانخاناں در قابلیت و استعداد یکتاے روزگار بود، و او عربی و فارسی و ترکی و ہندی روان داشت، شعر خوب می فہمید و می گفت، رحیم تخلص می کرد، گویند کہ با کثر زبانہا کہ در عالم رائج است حرف می زد"[۵۲]

خانخاناں نے اپنے علمی ذوق کے نشو و نما کے لیے ایک بے نظیر کتبخانہ قائم کیا تھا، جس میں زمانہ کے مشہور شعراء نے اپنے دیوان خود لکھکر داخل کئے تھے، دربار اکبری کے اکثر باکمال اسی دار الحکمت کے تربیت یافتہ تھے، عرفی، شکیبی، حیاتی، ظہوری، ملک قمی، نظیری، محتشم کاشی، رسمی، نوعی شیرازی، ثنائی خراسانی، کفوی اور معزی وغیرہ جیسے بلند پایہ شعراء اس کی زرپاشیوں سے ہمیشہ فیضیاب ہوا کرتے تھے، اس کی علم پروری اور فیاضی کا یہ حال تھا کہ ایک دفعہ نوعی شیرازی

---

[۵۱] مآثر رحیمی ج ۳ ص ۵۶۳، ہندی میں اس کی تصانیف کے نام حسب ذیل ہیں: (۱) دوہاولی (۲) نگر شوبھا (۳) بروے نایکا بھید (۴) بروے (۵) شرنگار سورٹھا (۶) مدناشٹک (۷) رحیم کاویہ (۸) کھیٹ کوتک (۹) پنچادھیائی رسالہ ہندستانی جنوری ۱۹۳۱ء الٰہ آباد

[۵۲] مآثر الامراء ج ۲ ص ۴۰۹

کو سونے میں تلوا دیا[1]۔ نظیری نے ایک بار کہا کہ اس نے ایک لاکھ روپیہ کا ڈھیر نہیں دیکھا ہے، خانخانان نے ایک لاکھ روپیہ کا ڈھیر جمع کر کے دکھایا، پھر وہ ڈھیر اسکے گھر بھجوا دیا[2]۔ کہا جاتا ہے کہ ایک ہندی شاعر گنگ کوی کو اس نے ایک بار چھتیس لاکھ روپے انعام میں دیے، اس کی یہ غیر معمولی فیاضی باپ سے بھی وراثت میں ملی تھی، خانخانان بیرم خان کو ہاشمی قندھاری کی ایک غزل بہت پسند آگئی[3] تو اس نے ہاشمی کو ایک لاکھ ٹنکہ دے کر یہ غزل اپنی طرف منسوب کر لی،

خانخانان عبدالرحیم ہی کی طرح اکبری دربار کے ایک دوسرے عظیم المرتبت امیر حکیم ابوالفتح گیلانی نے بقول مولانا شبلی نعمانی مرحوم شاعری کی ایک اکیڈمی (بیت العلما) قائم کر رکھی تھی، اکبر کے مزاج میں حکیم ابوالفتح گیلانی کو وہی دخل تھا، جو جعفر برمکی کو ہارون رشید کے مزاج میں تھا، حکیم ابوالفتح نے آقا کی تقلید میں اپنے یہاں بھی علم و فن کی بزم اسی شاہانہ انداز میں گرم رکھی، اور اسی کی بدولت شعرا نے ایران میں بڑی ترقی کی، مولانا شبلی شعر العجم میں ابوالفتح کے مجموعۂ مکاتیب چہار باغ سے ایک خط نقل کرتے ہیں جو اس نے خانخاناں کو لکھا تھا،

قصائد کہ یاران آن جا گفتہ بودند، بشعراے این جا فرسودہ شد، بنام نامی شما ہم بہ اتمام می رسد، بہ ملازمت فرستادہ خواہد شد، ملا عرفی، و ملا حیاتی بسیار ترقی کردہ[اند]

---

[1] خزانۂ عامرہ تذکرہ نویسی، [2] مآثر الامرا، حصہ دوم ص، [3] بیاض (قلمی نسخہ، دار المصنفین)، وہ غزل ملاحظہ ہو:

من کیستم عنان دل از دست دادۂ	در دست دل بہ غم از پا فتادۂ
دیوانہ وار در کمر کوہ گشتۂ	بے اختیار سر بہ بیابان نہادۂ
گاہے چو شمع ز آتش دل در گرفتۂ	گہ چون فتیلہ با دل آتش فتادۂ
بیرم ز فکر اندک و بسیار فارغیم	ہر گز نہ گفتہ ایم کمی یا زیادۂ

مآثر رحیمی کے مولف کا بیان ہے کہ اس زمانہ میں اکثر شعرا خصوصاً خواجہ حسین ثنائی خراسانی، مرزا قلی میلی، فیضی، عرفی شیرازی، حیاتی گیلانی، مرزا نور الدین محمد قراری وغیرہ نے ابوالفتح گیلانی ہی کے یہاں تربیت پائی، اور یہ حکیم ہی کی تعلیم و تربیت کا اثر تھا، کہ ان شعرا نے واقعہ گوئی، معاملہ بندی، خیال بندی، مضمون آفرینی، صنعت ایہام، استعارات، تشبیہات، فلسفیانہ خیالات اور نئی نئی ترکیبوں میں طرح طرح کی جدت پیدا کی، جو اس زمانہ کی شاعری کی نمایاں خصوصیت ہے[۱]، حکیم ابوالفتح کی کچھ تصانیف بھی تھیں، فلسفہ و حکمت میں فتاحی اور قیاسیہ اور انشا میں چار باغ اس کی طرف منسوب ہے،

ان ارباب کمال میں ملا عبد القادر بدایونی کا درجہ علمی حیثیت سے کم ممتاز نہیں تھا، ملا صاحب ۹۸۱ھ میں شاہی دربار میں ملازم ہوئے[۲] عربی، فارسی، سنسکرت، تفسیر اور تاریخ کے جلیل القدر عالم تھے، اس لیے تصنیف، تالیف اور ترجمے کے کام پر مامور ہوئے، علاوہ تنخواہ کے وقتاً فوقتاً انعامات و اکرامات سے مالا مال ہوتے رہے، آواز بڑی شیریں اور دلکش پائی تھی، اس لیے شروع میں شاہی امام بھی مقرر ہوئے، ان کے مختلف تراجم اور تاریخ الفی کا ذکر اوپر آچکا ہے، ان کے علاوہ اور بھی تالیفات ہیں، نجات الرشید[۳]، کتاب الاحادیث[۴] اور منتخب التواریخ،

ملا صاحب کی تمام تصانیف میں منتخب التواریخ نے بڑی شہرت حاصل کی ہے، یہ تین حصوں میں منقسم ہے، پہلے حصہ میں اکبر کے قبل سلاطین ہند کے واقعات ہیں، دوسرے میں اکبر کے حالات ہیں، تیسرے میں علما، فقرا، اور شعرا، کا ذکر ہے، الیٹ اس تاریخ

---

[۱] مآثر رحیمی ج ۳ ص ۲۸۳، و شعر العجم حصہ ۳ ص ۱۲، [۲] بدایونی ج ۲ ص ۱۷۳، [۳] ایضاً ص ۳۲۴، اس کا ایک نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کلکتہ میں موجود ہے [۴] ایضاً ج ۱ ص ۱،

کے بارے میں لکھتا ہے :-

"یہ ان چند کتابوں میں ہے جن کا ترجمہ بہت مفید ثابت ہوگا، لیکن اس کیلئے فارسی زبان میں کافی مہارت حاصل کرنے کی ضرورت ہے، اور ساتھ ہی ساتھ ہمعصر تاریخ سے کامل واقفیت بھی چاہیے کیونکہ مصنف نہ صرف نامانوس الفاظ استعمال کرتا ہے بلکہ مذہبی مناظرے، تعریف و توصیف، ہجو و ذم، ذاتی اور خاندانی تاریخوں کی تفصیلات تو اس طرح بیان کرنے لگتا ہے کہ واقعات کا تسلسل قائم نہیں رہتا، اور پھر سلسلۂ تاریخ قائم کرنے میں کافی دقت ہوتی ہے لیکن ہمیں اس کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہی غیر متعلقات اس کی تصنیف کے دلچسپ حصے ہیں، بہت کم ایسے واقعہ نگار ہیں، جو بدایونی کی طرح اپنے جذبات کا اظہار کرنا چاہتے ہیں، خصوصاً جو شاہی کانوں کو ناگوار ہوں یا جو اپنی غلطیوں اور لغزشوں کو اس وضاحت اور بے توجہی کے ساتھ آشکارا کردیتے ہوں"[1]

محمد حسین آزاد نے ملا صاحب سے اس لیے خوش نظر نہیں آتے ہیں کہ وہ ان کے ممدوحین کو اچھے الفاظ سے نہیں یاد کرتے ہیں، اس کتاب کی سب سے "بڑی خوبی" یہ بتائی ہے کہ ملا صاحب نے اس تاریخ میں غیر کی یا اپنی کوئی بات چھپائی نہیں۔[2]

اس کتاب کی صاف گوئی اور حق پسندی کے سبب جہانگیر نے اپنے زمانہ میں اس کی اشاعت بند کردی تھی، بات یہ تھی کہ ملا صاحب بڑے راسخ العقیدہ مسلمان تھے جس بات کو خلاف شرع و مذہب سمجھ لیتے تھے، پھر اس کے دیکھنے کے روادار نہ تھے، اکبر کے مذہبی خیالات کو نہایت شرح و بسط سے بیان کیا ہے، اور جو لوگ اکبر کے خیالات میں ان تبدیلیوں کے باعث ہوئے تھے، ان کو کاذب، ملحد، کافر، ملعون، بے دین، زندیق، بدبخت کے الفاظ سے

---

[1] ایلیٹ ج ۵ ص ۴۸۴ ۔ [2] دربار اکبری ص ۴۴۱۔

یاد کرتے، اور ان تمام خیالات کو اسلام کی اہانت اور مسلمانوں کی ذلت بلکہ جان و مال کے نقصانات کا سبب قرار دیتے ہیں، اسی لیے فیضی اور ابوالفضل کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے ہیں، مگر باوجود ان کے سخت عقائد کے ان کے علمی تبحر کو سب تسلیم کرتے تھے، عظیم الشان علمی کاموں کے لیے شاہی دربار سے ہمیشہ ملک الشعرا فیضی یا علامہ ابوالفضل یا ملا عبدالقادر منتخب کیے جاتے تھے، اکثر تینوں یا ملا صاحب ان دونوں میں سے کسی ایک کے ساتھ مل کر علمی کارنامے انجام دیتے تھے، فیضی ملا صاحب کی قابلیت کا بہت معترف تھا، کچھ دنوں اکبر نے ملا صاحب کی طرف سے بے التفاتی برتی تھی، اس پر فیضی نے بارگاہ شاہی میں ایک عریضہ لکھا، جس میں اکبر سے خطا پوشی اور عطا پاشی کی درخواست کی، پہلے ملا عبدالقادر کی لیاقت وقابلیت کا ذکر اس طرح کرتا ہے :-

"شکستہ نوازا، ملا عبدالقادر اہلیت تمام دارد وعلوم رسمی انچہ ملایان ہندوستان می خوانند خوانده پیش خدمت ابوی کسب فضیلت کرده وقریب بسی وہفت سال میشود کہ بنده او را می دانم وبا فضیلت علمی طبع نظم وسلیقہ انشاے عربی وفارسی وچیزے از نجوم ہندی وحساب یاد داشت بہمہ دانی ووقوف در نغمۂ ولایت وہندی خبرے از شطرنج صغیر وکبیر دارد ومشق بین بقدری کرده باوجود بہره مند بودن از ہمہ فضائل بہ بے طمعی وقناعت وکم تردد نمودن وراستی ودرستی وادب ونامرادی وشائستگی وگذشتگی وبے تعینی وترک اکثر رسوم تقلید ودرستی اخلاص وعقیدت بدرگاہ بادشاہی موصوف است۔"

پھر اس کی سفارش ان الفاظ میں کرتا ہے :-

چوں درگاه راستان است دریں وقت کہ بے طاقتی زور آورده بنده خود را

حاضر پایۂ سریر والا و التماس احوال او بعرض رسانید اگرچہ دریں وقت بعرض نمی رسانید
نوعی از نار راستی و بے حقیقتی بود حق سبحانہ بندہائے درگاہ را در سایہ فلک پایۂ حضرت
پادشاہ براہ راستی و حق گذاری و حقیقت شناسی قدم ثابت کرامت فرماید و آں حضرت
را بر کل عالم و عالمیاں سایہ گستر و شکستہ پرور و عطا پاش و خطا پوش بہزاران ہزار
دولت و اقبال و عظمت و جلال دیرگاہ دارد بعزت پاکاں درگاہ الٰہی و روشن دلان
سحر خیز صبح گاہی آمین آمین[1]"

بعد کے اہل علم نے بھی ملا صاحب کی تعریف بجا طور پر کی ہے، بختاور خاں عالمگیری
مراۃ العالم میں لکھتا ہے:۔

"ملا عبد القادر بدایونی جامع معقول و منقول بود و باقضیات علمی طبع نظم و سلیقہ
انشائے عربی و فارسی و نجوم و حساب و وقوف در نغمہ ولایتی و ہندی بمرتبہ کمال داشت
و قادری تخلص بود[2]"

علم و ہنر کے آسمان کا ایک دوسرا درخشندہ ستارہ خواجہ نظام الدین احمد تھا،
خواجہ نظام دربار اکبری کے پنجہزاری امرا میں تھا، جو اس عہد کی بڑی معراج تھی، گجرات
میں بخشی کے عہدہ پر مامور تھا، صاحب ثروت و عزت ہونے کے ساتھ صاحب قلم بھی تھا،
۱۰۰۲ھ میں طبقات اکبری لکھی جس نے اس کو حیات جاوداں بخشی، یہ کتاب ہندوستان
کے اسلامی عہد کی بہت ہی جامع تاریخ ہے، مصنف نے اپنی معلومات ان تمام مستند ماخذوں
سے حاصل کئے ہیں، جو اس وقت ممکن صورت سے دستیاب ہو سکتے تھے، کتاب کے آغاز
میں اپنے ماخذوں کے جو نام گنائے ہیں ان کی تعداد تئیس ہے، اسی لیے یہ کتاب ہمیشہ

---

[1] بدایونی جلد ۳ ص ۵-۴۰۴ [2] منتخب اللباب خافی خان جلد ۱ ص ۲۴۲،

مستند تاریخوں میں شمار کی گئی ہے، ملا عبد القادر بدایونی نے اپنی تاریخ منتخب التواریخ اسی کی مدد سے تیار کی، تاریخ سلاطین افغانان کے مصنف نے تو بعض بعض حصے خصوصاً ہمایوں کے حالات لفظ بلفظ اسی سے نقل کر لیے ہیں، فرشتہ نے اس کو ایک مکمل تاریخ بتایا ہے اور اس سے بہت زیادہ فائدہ اٹھایا ہے، مآثر الامرا میں ہے،

چونکہ مصنف نے واقعات کی تنقیح میں باریک بینی، جزئیات کے استقصا، اور معلومات کے جمع کرنے میں پوری کوشش کی ہے، اور میر معصوم بھکری وغیرہ جیسے اہل کمال اس تالیف میں شریک تھے، اس لیے وہ نہایت معتبر ہے، اور وہ پہلی تاریخ ہے جو ہندوستان کے تمام اسلامی بادشاہوں کے حالات کی جامع ہے، اور تاریخ فرشتہ کے مصنف اور دوسرے تتبع کرنے والوں کا جنھوں نے اونچی حالات کا اضافہ کیا ہے، مرغوب ماخذ یہی کتاب ہے[1]

منتخب اللباب حصہ اول میں ہے،

نظام الدین ہروی محمد اکبر بادشاہ کا بخشی تھا، اس نے ایک تاریخ لکھی جس میں صوبہ دکن کے اکیس بادشاہوں کے حالات تھے، اس کا نام تاریخ نظامی رکھا، اس میں ۱۰۰۳ھ تک اکبر بادشاہ کا ذکر کیا ہے، اکثر سلاطین دکن کے حالات میں اس کا بیان اعتماد کے لائق نہیں ہے، محمد قاسم فرشتہ کے علاوہ جس مورخ نے بھی سلاطین دکن کا حال لکھا ہے، اس کا بیان قابل اعتبار نہیں، لیکن چونکہ نظام الدین نے اکبر بادشاہ کی خدمت میں عمر صرف کر دی تھی، اس لیے اس بادشاہ کی سلطنت کے حالات میں وہ قابل وثوق ہے[2]

یورپین مورخین میں یہ کتاب بہت مقبول ہے، ارسکن کا خیال ہے کہ اس زمانہ کا بہترین

---

[1] مآثر الامرا جلد اول ص ۲۶۳ [2] خافی حصہ اول ص ۲۳۷

مورخ نظام الدین تھا، کرنل لیس کو افسوس ہے کہ اس کتاب کو اتنی مقبولیت نہیں ہوئی جتنی چاہیے تھی، الیٹ لکھتا ہے کہ یہ ہندوستان کی بہت ہی مشہور کتاب ہے، جو جدید طرز پر لکھی گئی ہے[۱]

خواجہ نظام الدین کا انتقال ہوا تو ملا عبد القادر بدایونی نے اس طرح ماتم کیا جو ان کی مقبولیت کی دلیل ہے،

وہ تپ محرقہ میں ۴۵ سال کی عمر میں جان بحق ہوا، اور نام نیک کے سوا اپنے ساتھ کچھ نہیں لے گیا، دوست واحباب نے جو اس کے حسن و اخلاق کو دیکھ کر بڑی ہی امیدیں رکھتے تھے، اشک حسرت بہائے اور سینے پر نا امیدی کے پتھر رکھے، اس حقیر کو بھی اس سے بڑا دینی اخلاص تھا، اور کوئی دنیاوی غرض وابستہ نہ تھی، مجبوراً صبر و تحمل کے سوا کوئی چارہ کار نہیں پایا، اور یہی پرہیزگاروں کا شیوہ ہے، مگر اس واقعہ کو سب سے بڑی مصیبت سمجھ کر اس سے پوری عبرت حاصل کی، اور پھر کسی انسان سے محبت نہیں کی، اور گمنامی کے گوشہ میں بیٹھ رہا،[۲]

بدایونی نے وفات کی تاریخ کہی، ع گوہرِ بے بہا ز دنیا رفت،[۳]

فضلاء: اکبر کے دربار کے فضلاء کی فہرست اتنی طویل ہے، کہ اگر ہم ان کو تفصیل سے بیان کرنا شروع کریں تو ایک علیحدہ کتاب کی ضرورت ہوگی، ملا عبد القادر بدایونی نے اس عہد کے مشائخ، فضلاء، اطباء اور شعراء کا ذکر ایک مستقل جلد میں کیا ہے، جو ۳۹۰ صفحوں پر مشتمل ہے، ہم ان میں سے بعض ارباب علم واصحاب فن کو ناظرین سے روشناس کر کے ان کی تشنگی بجھانے کی کوشش کریں گے،

۱؎ الیٹ ج ۵ ص۱۸۱، ۲؎ بدایونی ج ۲ ص۳۹۶، ۳؎ ایضاً

میر فتح اللہ شیرازی۔ کبھی میر، کبھی امیر، اور کبھی شاہ ان کے نام کا جز تھا، شیراز سے بیجاپور آئے، اور ابراہیم عادل شاہ کے لڑکے علی عادل شاہ کے معلم مقرر ہوئے، ان کے فضل و کمال کی شہرت پورے ہندوستان میں گونجی، فیضی دکن پہنچا تو ان سے ملا، اور اسی کی وساطت سے اکبر کے دربار سے متوسل ہوئے، بیجاپور سے اکبر کے دار السلطنت کے قریب پہونچے، تو اکبر نے خانخاناں عبدالرحیم اور ابو الفتح گیلانی کو ان کے استقبال کے لیے بھیجا، اور خود ان سے بڑی عزت و تکریم کے ساتھ پیش آیا، صدارت کے منصب پر سرفراز کر کے پرگنہ بسا ور، بید ا ور محلی جاگیریں عطا کئے، ترقی کر کے سہ ہزاری منصب پر بھی فائز ہوئے، تفسیر، کلام، حدیث، حکمت، ہیئت، ہندسہ، نجوم، رمل اور حساب میں ان کی علم دانی کا پایہ بہت بلند تھا، اپنے نجوم و رمل کے کمالات سے اکبر کے زائچہ کی تصحیح کی، اکبر کی فرمایش سے ایک نئے سنہ کی داغ ڈالی جس کا نام سنہ الٰہی اکبر شاہی قرار پایا، ۹۹۳ھ میں امین الملک بنائے گئے، اور راجہ ٹوڈرمل کے ساتھ امور سلطنت کے انصرام میں مصروف ہوئے، دفتر مال و دیوانی کی بہت سی اصطلاحات ان ہی کی وجہ سے رائج ہوئیں، اسی سال اکبر نے ان کو عضد الدولہ کے خطاب سے سرفراز کر کے خان اعظم کے ساتھ دکن بھیجا، تاکہ اس صوبہ کو سلطنت تیموریہ کے زیر نگیں کرنے میں معاون ہوں، یہ مہم ناکام رہی، اکبر جب ۹۹۳ھ میں کشمیر پر حملہ آور ہوا تو شاہ فتح اللہ بھی اس کی معیت میں تھے، اور یہ برابر مجلس مشورت میں شریک ہوتے تھے، ۹۹۷ھ میں اکبر کابل سے کشمیر جا رہا تھا، تو شاہ صاحب بھی شاہی جلو میں تھے، راستے میں یکایک تپ محرقہ میں مبتلا ہوئے، اور جان جان آفریں کے سپرد کر دی، اکبر ان کی موت سے غیر معمولی طور پر متاثر ہوا اور بار بار کہتا تھا کہ

"میر وکیل و حکیم و طبیب و منجم ما بود۔"

فیضی نے ان کی موت پر ایک غمناک مرثیہ کہا جس میں ۱۰۴ اشعار تھے، وہ اپنے زمانہ کے بہت بڑے انجنیر اور موجد بھی تھے، ایک ایسی چکی بنائی تھی جو خود بخود ہوا سے حرکت کرتی تھی، ایک آئینہ بھی ایجاد کیا تھا جو نزدیک اور دور کے عجیب وغریب تماشے دکھاتا تھا، ایک قلعہ شکن توپ بنائی تھی جو چوڑیوں کی طرح الگ الگ ہو جاتی تھی، ایک ایسی بندوق بھی تیار کی تھی جو ایک ہی بار بارہ گولیاں چلاتی تھی، معاصر اہل علم ان کے علمی پایہ کے معترف تھے، طبقات اکبری میں نظام الدین احمد لکھتا ہے :-

امیر فتح اللہ (بآن کہ درجمیع علوم عقلی ونقلی در ایران و ہندیل در ربع مسکون قرین خود ندانستند) از نیرنجات وطلسمات ماہر بود،

ان کے نام سے یہ تصانیف منسوب ہیں (۱) تفسیر منہاج الصادقین فی الزام المخالفین (۲) خلاصۃ المنہج (۳) اقبال نامۂ اکبری (۴) حالات کشمیر (۵) زیج جدید، تاریخ الفی کی تدوین میں بھی شریک رہے، جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے[۱]

مولانا عبداللہ سلطانپوری، سلطان پور مضافات لاہور کے رہنے والے تھے، اپنے عہد کے جید علماء میں سے تھے، عربی، اصول، فقہ، تاریخ اور علوم منقولات میں اعلیٰ دستگاہ رکھتے تھے، ان کی تصانیف میں عصمۃ انبیاء، شرح شمائل النبی صلی اللہ علیہ وسلم، شرح ملا مشہور تھیں، تیموریوں سے پہلے سلاطین افغانان بھی ان کے بڑے قدردان تھے، شیر شاہ نے ان کو صدر الاسلام کا خطاب بخشا تھا، سلیم شاہ نے اپنے تخت پر ساتھ بٹھا کر ان کی خدمت میں بیس ہزار روپے کی ایک مروارید کی تسبیح پیش کی تھی، ہمایوں نے از راہ قدردانی ان کو مخدوم الملک

---

[۱] تفصیل کے لیے دیکھو اکبرنامہ ج ا صـ۳۱ و ج ۳ ص ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۹۱، منتخب التواریخ ج ۲ ص ۳۰۷- ۳۱۵-۳۱۶-۳۱۸، مآثر الامراء ج ۱ ص ۱۰۴-۱۰۱ و معارف نمبر ۵ ج ۱۴،

اور شیخ الاسلام کے القاب عطا کئے تھے، وہ اہل سنت والجماعت میں سے تھے، اور بہرحال میں شریعت کی پابندی کا لحاظ رکھتے تھے، بیرم خاں نے ایک لاکھ روپے سالانہ تنخواہ مقرر کی تھی، اکبر کے زمانہ میں شاہی دیوان خانہ کے وکیل تھے، اور جب ۹۹۰ھ میں ان کا انتقال ہوا تو ان کے ذاتی خزانہ سے تین کرور روپے نکلے، [۱] اکبر کی حمایت میں جو محضر نامہ ترتیب دیا گیا تھا، اس پر طوعاً وکرہاً انھوں نے بھی اپنا دستخط ثبت کیا تھا، محضر نامہ کی تدوین کے بعد ان کے اور اکبر کے تعلقات اچھے نہیں رہے،

مولانا میر سید محمد میر عدل۔ امروہہ کے رہنے والے تھے، علم حدیث میں مولانا میر سید رفیع الدین کے شاگرد تھے، اپنے علم کے ساتھ ساتھ زہد و تقویٰ کے لیے بھی مشہور ہوئے، اکبر نے اپنے دربار سے منسلک کرکے ان کو میر عدل کے عہدہ پر مامور کیا، اور جب تک وہ اس عہدہ پر رہے ملک سے خیانت اور الحاد کا انسداد کرتے رہے، ۹۸۴ھ میں بھکر کی حکومت ان کو تفویض کی گئی، ۹۸۵ھ میں جوار رحمت حق سے پیوست ہوئے، [۲]

شیخ عبد النبی۔ حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہی کے پوتے اور حضرت شیخ احمد کے لڑکے تھے، مکہ معظمہ اور مدینہ طیبہ میں علم حدیث کی تعلیم حاصل کی، ہندوستان واپس آئے تو اپنے تقویٰ طہارت، نزاہت اور عبادت کے لیے مشہور ہوئے، اکبر نے متاثر ہوکر ان کو عہدۂ صدارت پر فائز کیا، ملا عبد القادر بدایونی کا بیان ہے کہ کسی سلطنت میں منصب صدارت کو وہ اہمیت حاصل نہیں ہوئی جتنی کہ شیخ عبد النبی کے زمانہ میں ہوئی،

"چوں بمنصب صدارت رسید جہان جہان زمین مدد معاش و وظائف و اوقاف بخلائق بخشید، چنانچہ در زمان ہیچ پادشاہی ایں چنیں صدری باستقلال نگشتہ و عشر عشیر

---

[۱] بدایونی ج ۳ ص ۷۱، ۱۰۰، ماثر الامراء ج ۲ ص ۵۱۴، ۵۱۲، تذکرہ علمائے ہند ص ۱۰۳ [۲] ایضاً ص ۱۴۱ و ۷۶،

این او قاشے کہ او واد نداده"

اکبر کو شیخ عبدالنبی سے اتنی عقیدت تھی کہ وہ ان کی جوتیاں سیدھی کرتا تھا، ان کے گھر جاکر ان سے حدیث پڑھتا تھا، اور ان کے فیض صحبت سے اس کی مذہبی خود رفتگی یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ مسجد میں خود اذان دیتا، اور ثواب کی خاطر مسجد میں جھاڑو بھی دیتا تھا، ایک دفعہ اس نے سالگرہ کی تقریب میں کپڑوں پر زعفران کا رنگ چھڑکا، شیخ عبدالنبی نے دیکھا تو اس قدر برہم ہوئے کہ سر دربار لکڑی اٹھا کر ماری، اکبر کو ناگوار ہوا، محل میں جاکر ماں سے شکایت کی کہ شیخ خلوت میں منع کرتے تو کوئی ہرج نہ تھا، دربار میں ذلیل کرنا مناسب نہ تھا، مریم مکانی نے کہا "بیٹا دل پر میل نہ لانا، یہ نجات اخروی کا باعث ہے، قیامت تک چرچا رہے گا کہ ایک مفلوک الحال ملا نے بادشاہ کے ساتھ یہ حرکت کی، اور سعادتمند بادشاہ نے اس کو برداشت کیا"[1] مگر بعض مقربان بارگاہ نے اکبر کو شیخ کی مذہبی سختی کے خلاف ابھارا تو اس کی یہ عقیدت کدورت میں تبدیل ہوگئی، جب محضر نامہ کا فتنہ اٹھا تو شیخ عبدالنبی نے بجبر و اکراہ اس پر دستخط کیا، اکبر کی ناگواری اور بھی بڑھی، اور اس نے شیخ کو حج بیت اللہ کے لیے جانے پر مجبور کیا، اور خواہش کی کہ وہ وہاں سے واپس نہ آئیں، مگر شیخ کچھ دنوں کے بعد حج سے واپس آگئے، جس سے اکبر کی کدورت میں اور بھی اضافہ ہوگیا، اکبر نے ان کو قید کر دیا اور وہ قید خانہ ہی میں سنہ ۹۹۱ھ میں عالم بقا کو سدھارے، ان کی ایک تالیف وظائف النبی صلعم کا قلمی نسخہ دار المصنفین (اعظم گڈھ) میں ہے، سماع کے انکار میں بھی ایک رسالہ لکھا، امام قفال مروزی شافعی نے امام ابوحنیفہ کے خلاف جو طنز کیا ہے اس کے رد میں بھی ایک رسالہ تحریر کیا،[2]

مشہور شیعی عالم قاضی نور اللہ شوستری (مؤلف مجالس المومنین) بھی دربار سے

---

[1] مآثر الامرا جلد دوم ص۵۶۰، [2] منتخب التواریخ جلد دوم، ص ۸۲ - ۸۹ و تذکرہ علمائے ہند ص ۱۳۴،

وابستہ تھے، وہ اپنے علم، حلم، نیک نفسی، زہد، تقویٰ، اور جودوستانہ فہم کے لیے مشہور تھے، اکبر نے ان کو لاہور کا قاضی مقرر کیا، جہاں ان کی دیانت اور عدل پروری کا ہر شخص معترف تھا،

شاہی دربار کے بہت سے اطبا ایسے بھی تھے جو نہ صرف اپنے فن میں ید طولیٰ رکھتے تھے بلکہ مختلف علوم پر بھی ان کو بڑی دستگاہ حاصل تھی، حکیم ابوالفتح گیلانی کا ذکر پہلے آچکا ہے، حکیم الملک شمس الدین اپنے زمانہ کا جالینوس تھا، علم منقولات میں بھی اس کی لیاقت مسلم الثبوت تھی، حکیم عین الملک شیرازی علم کحل کا بڑا ماہر تھا، شعروشاعری سے بھی اسکو دلچسپی تھی، تخلص دوائی رکھتا تھا، حکیم مصری کو علم عروض وتکسیر و قوفی میں بڑی مہارت تھی، کبھی کبھی شعر بھی کہتا تھا، حکیم علی گیلانی حکیم الملک کا بھانجہ تھا، اپنے خالو شاہ فتح اللہ شیرازی سے طب کی تعلیم پائی، اور شیخ عبدالنبی سے علوم منقولات حاصل کئے، جہانگیر اس کی عربی دانی کا بہت معترف تھا، اس نے قانون کی ایک شرح بھی لکھی، حکیم ہمام حکیم ابوالفتح گیلانی کا بھائی تھا، اس کا اصل نام ہمایوں تھا، اکبر کے دربار سے وابستہ ہوا تو ہمایوں کے نام کے احترام کی خاطر نہایت خاکساری میں اپنے کو ہمایوں قلی کہنے لگا، مگر اکبر نے اس کا نام ہمام رکھا، جس کے معنی بلند مرتبہ سردار کے ہیں، اکبر اس کو بہت عزیز رکھتا تھا، اور گو شش صدی منصبدار رہا لیکن دربار کا بہت ہی بااثر درباری اور مورخ امیر تھا، تاریخ الفی کی تدوین میں حکیم علی اور حکیم ہمام بھی شریک تھے، وہ توران شاہی سفیر بنا کر بھیجا گیا، وفات کے بعد بہت بڑی دولت چھوڑی، حکیم احمد ٹھٹھوی، حکیم لطف اللہ گیلانی، حکیم مظفر اردستانی، شیخ بینا، اور حکیم مسیح الملک شیرازی بھی ذی علم فضلا میں شمار کئے جاتے تھے، (دیکھو منتخب التواریخ جلد ۳ ص ۱۶۰-۱۷۰ اور طبقات اکبری جلد ۲ ص ۲۱۵-۲۱۶)

ہم طوالت کے خیال سے تمام علما وفضلا کا ذکر کرنے سے قاصر ہیں، ابوالفضل نے آئین اکبری میں دانش اندوزان جاوید دولت کے عنوان سے ان کی پانچ

قسمیں کی ہیں،

(۱) **خداوند تلقین** ۔ جس میں شیخ مبارک ناگوری، شیخ نظام نارنولی، شیخ ادہن امن اللہ، میاں وجیہ الدین، شیخ رکن الدین، شیخ عبد العزیز، شیخ اللہدیہ، شیخ عبد الغفور وغیرہ تھے،

(۲) **خداوند باطن**، شیخ رکن الدین محمود کانگر، شیخ امان اللہ، خواجہ یحییٰ الشہید، شیخ موسیٰ، شیخ علاء الدین مجذوب، شیخ سلیم چشتی، شیخ محمد غوث گوالیاری وغیرہ،

(۳) **دانندۂ معقول ومنقول**، میر شیخ اللہ شیرازی، میر مرتضیٰ، مولانا سعید ترکستانی، حافظ تاشکندی، مولانا شاہ محمد، مولانا علاء الدین حکیم مصری، مولانا صادق وغیرہ،

(۴) **شناسای عقلی کلام**، مولانا پیر محمد، مولانا عبد الباقی، مرزا مفلس، مولانا محمد، مولانا نور الدین ترخان وغیرہ،

(۵) **پزشکان**، حکیم مصری، حکیم الملک، حکیم ابو الفتح گیلانی، حکیم علی گیلانی، حکیم ارسطو، حکیم مسیح الملک، حکیم لطف اللہ، حکیم ہمام، حکیم شفائی، شیخ بینا وغیرہ،

خوانای نقلی مقال، میاں حاتم، مولانا عبد القادر، مخدوم الملک، میر عبد اللطیف، میر نور اللہ، شیخ عبد النبی صدر جہاں، شیخ منو وغیرہ،

ان کے علاوہ اس عہد میں بہت سے اور صلحا و علما بھی تھے، مثلاً شیخ عبد الحق دہلوی، حاجی ابراہیم محدث، شیخ جلال الدین تھانیسری، شیخ نظام الدین امیٹھوی، شیخ داؤد جھنی وال وغیرہ جن کے فیوض و برکات سے عوام و خواص متمتع ہوتے رہے، مگر پھر بھی علمائے سو کی فتنہ سامانیوں سے اس دور میں ضلالت و گمراہی اتنی بڑھی کہ افق اسلام پر حضرت امام ربانی مجدد الف ثانیؒ کا ظہور ہوا اور اس مجدد اعظم نے ہندوستان کے ظلمت کدہ کی تیرگی و تاریکی کو اسلام کی ضیا پاشی سے ایک بار پھر منور کر دیا۔

شعراء | اکبر کی فیاضیاں اور زرپاشیاں سنکر ہر جگہ سے شعراء ہندوستان میں امنڈ آئے تھے، ملا بدایونی نے اس عہد کے ایک سو چھ شعراء کے حالات لکھے ہیں، اور ان کے کلام کے نمونے درج کئے ہیں، ابوالفضل نے آئین اکبری میں ستر اور خواجہ نظام الدین احمد نے طبقات اکبری میں کاشی ایسے شعراء کا ذکر کیا ہے جنھوں نے دربار میں پہنچکر تقرب حاصل کیا، اکبر نہ صرف ان پر سیم وزر کی بارش کرتا، بلکہ ان کی ہمت افزائی اور ان کے ذوق سخن کے معیار کو بلند کرنے کی خاطر ملک الشعراء کا خاص عہدہ قائم کیا، جس پر سب سے پہلے غزالی مشہدی مامور ہوا، غزالی عراق سے ہندوستان آیا، تو اکبر کے درباری امیر خان زمان حاکم جونپور نے ایک ہزار روپے زاد راہ بھیج کر اس کو اپنے دربار میں بلایا، یہاں ایک مثنوی نقش بدیع لکھکر خان زمان کی خدمت میں پیش کی، جس میں ایک ہزار شعر تھے، سخن سنج اور سخن فہم خان زمان کو یہ مثنوی اس قدر پسند آئی کہ فی شعر ایک اشرفی انعام دیا[1]، خان زمان کی وفات کے بعد غزالی اکبر کے دربار سے منسلک ہوگیا، ابوالفضل نے اس کے شاعرانہ کمال کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے:-

"بہ بلند فہمی وشیوا زبانی طراز یکتائی داشت واز دلآویز گفتار صوفی بہرہ مند"

(آئین اکبری ص۱۸۱)

ان ہی شاعرانہ اوصاف کی بنا پر اس کو ملک الشعراء کا خطاب دیا گیا، بہت ہی پرگو شاعر تھا کئی دیوان اور کئی مثنویاں مثلاً مشہد انوار، مرآۃ الصفات، نقش بدیع، اور قدرت آثار لکھیں، ملا بدایونی اسکی شاعری کے بہت زیادہ مداح نہیں، مگر اس کی شاعری کی کمیت و کیفیت کے معترف ہیں، لکھتے ہیں:-

---

[1] خزانہ عامرہ قلمی نسخہ بحوالہ شعرالعجم حصہ سوم ص۱۰

"اگرچہ سخن او رتبۂ عالی چنداں ندارد اما در کمیت وکیفیت اشعار او زیادہ از ہمہ اقرانست بزبان تصوف مناسبت تمام دارد" (جلد سوم ص۱)

۹۸۰ھ میں احمد آباد میں وفات پائی، اور سلاطین و مشائخ کے مقبرہ میں دفن ہوا، اس کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں، مراۃ الصفاۃ اکبر کی ستائش میں لکھی گئی، اس میں کہتا ہے۔

"تاج دِہ تارک رو ئین تنان | سر شکن گبر قوی گردنان
شاہ فلک مسند خورشید رخش | ملک ستانندہ و اقلیم بخش
گر بکشد تیغ جہان سوز را | قطع کند سلک شب و روز را
ور نخورد مہرے از جام او | تیغ شود موے بر اندام او
سوے فلک گر فگند چشم کین | آب شود چرخ در دود زمین
رائے وی از عقل جوان پیر تر | بخت وی از صبح جہانگیر تر
ابر حیا کانِ کرم بحر جود | تازہ گل گلشن چرخ کبود

مولانا شبلی نے شعر العجم حصہ سوم (ص۱۶) میں غزالی کی مثنوی نقش بدیع کے حسب ذیل اشعار کی داد دی ہے،

خاک دل آن روز کہ می بیختند | شبنمے از عشق برو ریختند
دل کہ بہ آن رشحۂ غم اندود شد | بود کبابے کہ نمک سود شد
بے اثر مہر چہ آب و چہ گل | بے نمک عشق چہ سنگ و چہ دل
ذوق جنون از سر دیوانہ پرس | لذت سوز از دل پروانہ پرس

غزالی کے بعد **ابو الفیض فیضی** ملک الشعراء ہوا، جس کا ذکر ہم گذشتہ صفحات میں کر چکے ہیں، فیضی کی خوش بیانی، جدت طبع اور فلسفیانہ خیالات پر مولانا شبلی مرحوم کا ایک بے مثل تبصرہ شعر العجم حصہ سوم میں ملے گا، اس تبصرہ کی موجودگی میں فیضی کی شاعری پر مزید

روشنی ڈالنے کی کوشش کرنا تحصیل حاصل ہے، پھر بھی ہم یہاں پر فیضی کے کچھ مدحیہ اشعار نقل کیے بغیر نہیں رہ سکتے، جس سے اس کی شاعری کی شوکت و عظمت کے ساتھ ساتھ اکبر کی ذات سے اس کی ... و شیفتگی کا بھی اندازہ ہو گا،

شاہنشاہا! خسرو پژوہا! | دریا گہرا! فلک شکوہا!
بزمے است، جہان بہ عیش پیوست | دور تو شراب و آسمان مست
امروز بہ این نوائے چو شہد | من یار بدم تو خسرو عہد
زین جامہ کہ کردہ ام فلک سائے | پیش تو نشادہ ام بیک پائے
این نامہ کہ عشق برزبان برد | طغرائے ترا بہ آسمان برد
این چار ہزار گوہر ناب | کا نگیختہ آم بہ آتشین آب
بپذیر کہ آب گوہر تست | از بہر نثار افسر تست
پیمانۂ من اگر شد پر | دریا کنمت نثار در در
گر عشق چنین بود دماپاک | مہتاب برون ترا دم از خاک
بگداخت آبگینۂ دل | آئینۂ دہم بہ دست محفل
آنم کہ بہ سحر کاری ژرف | از شعلہ تراشش کردہ ام حرف
بانگ قلمم درین شب تار | بس معنی خفتہ کرد بیدار
صبح بہ فیض بادشاہی | من بودم و باد صبح گاہی

مثنوی نل دمن لکھتے وقت اکبر کی شان میں کہتا ہے :-

اے پایۂ فرازے ہفت اورنگ | میزان عدالتت گران سنگ
فیض تو بہ روزگار مفتوح | چون بادہ بہ چشم و نغمہ با روح

صد باغ طرب بہ بزمگاہت — صد خم کدہ بادہ در نگاہت

اے از تو جہان سکون گرفتہ — با تیغ تو فتنہ خون گرفتہ

رحمت کہ گل ظفر دماندہ — از خار ترا انگبین فشاندہ

ہر جا غرور کج کلاہے — سر کردۂ فتنۂ شد سیاہے

تیغ تو کلہ ربودہ سر ہم — این زہرہ تراست وین جگر ہم

آفاق بشام گاہ دیجور — از بہجۂ رائیت بہ دو نور

آنرا کہ نشاط جاودانی ست — بیداری شب حیات آنی ست

فیضی کی علم دوستی بھی مشہور تھی، وہ اہل علم کے ساتھ غیر معمولی فیاضیاں کرتا تھا، حیدر معمائی نے اس کی تفسیر کی تاریخ قُلْ هُوَ اللّٰهُ سے نکالی، تو اس نے دس ہزار روپے انعام میں دیے، محمد جمال الدین عرفی شیرازی ہندوستان آیا، تو فیضی ہی کا مہمان ہوا، فیضی نے اس کی پوری قدر دانی کی، اور اس کی ضروریات کی کفالت کرتا رہا، مگر وہ اپنی نخوت پرستی کے سبب فیضی سے الگ ہو کر اکبر کے دوسرے جلیل القدر امیر حکیم ابو الفتح گیلانی کے دربار سے وابستہ ہو گیا، اس کی وفات کے بعد عبد الرحیم خانخاناں کے دربار کے ارباب کمال میں داخل ہوا، اپنے غرور، پندار اور خود ستائی میں اکبر کے دربار سے بے نیاز رہنا چاہتا تھا، پھر بھی اکبر اس کی طرف ملتفت ہوا، اور عرفی نے اس کی شان میں کئی قصیدے کہے، پہلے قصیدہ میں اپنی جولانی طبع اس طرح دکھائی ہے:-

اے دل معنی سرشت رازدان آفتاب — تا ابد بر خوان دولت میہمان آفتاب

بر کمال دولت ہر کس کہ بیند بنگرد — از شراب تربیت رطل گران آفتاب

دولت جمشید ہمدستی کند با دولتت — گر تواند سایہ بودن ہم عنان آفتاب

کاروان سالار شاہان آفتاب آمد ولی — چون تو نامد یوسفی در کاروان آفتاب

رہبر سرکش رام شد در زیر ران دولتت — چون سمند آسمان در زیر ران آفتاب

طوطی نطقم چو در مدحت شکرخائی کند — آب گردم از ذوق گردد در دہان آفتاب

تا لوای دولتت انگشت زد از اوج عرش — اہل معنی را نشد معلوم شان آفتاب

ہمچو شمعی کان برافروزند از شمع دگر — از یکی نور است جان شاہ و جان آفتاب

فیض می یابد ز تربیت چون نتابد گر ازل — گوہرت را پرورش داد است کان آفتاب

سجدہ گاہ ہفت اقلیم است مسندگاہ تو — قبلۂ ہفت آسمان است آستان آفتاب

ہر کجا آماج گاہی طلعتت آمادہ کرد — می جہد تیر سعادت از کمان آفتاب

گر بجای آفتاب آرام گہ می داشتی — جای اکبر شاہ بودی آشیان آفتاب

وصف شاہ از ما کسی چون من کجا لایق شود — ہر چہ کردم نقل کردم از زبان آفتاب

گر پس از قرنی بود سعدین را با ہم قران — چون بود ہر صبح دم با شہ قران آفتاب

مدح خورشید و ثنای شہ کند عرفی مدام — کز مریدان شہ است و عاشقان آفتاب

وقت دولت باد سر لایزال آسمان — نور حشمت باد حسن جاودان آفتاب

بر سر شہ سایہ افگن چون شود بال ہما — چون بہ خفاش گردد سایہ بان آفتاب

گر بدان غایت که شہ بشناسدش باد (خفت) ثنا — از مسیحا ہم مجو نام و نشان آفتاب

آسمان داند کہ چون شاہ جہان ہرگز نبود — قدردان آفتاب اندر زمان آفتاب[۱]

اکبر کے دربار میں کسی کو خودستائی کی جرات اور ہمت نہیں ہو سکتی تھی، مگر خوددار عرفی ایک قصیدہ میں اکبر کو مخاطب کر کے کہتا ہے:۔

---

[۱] اس قصیدہ کے بعض اشعار اختصار کی خاطر حذف کر دیے گئے ہیں۔

شہا بہ بزم تو چون این قصیدہ برخوانم | کہ ملک نظم ز فیضش گرفتہ است نظام
سرو بجایزہ باجیب پر گہر گردوں | بدو شیم افگند این جامہ زمرد فام

اکبر ۹۹۷ھ میں کشمیر گیا، تو عرفی بھی ہم رکاب تھا، کشمیر پر اس نے ایک قصیدہ کہا جس میں اکبر کو مخاطب کر کے لکھتا ہے:-

حکم تو آتش آورد بکشمیر و گرنہ | کے از سر آن خاک بخاک دگر آید
می آید و می سوزد از این رشک کہ کشمیر | چوں یافتہ کہ آید بکجا بر اثر آید

اکبر نے ایک موقع پر اس کو ایک گھوڑا بھی انعام میں دیا تھا، لیکن اس سے خوش ہونے کے بجائے اپنی رعونت میں اس نے گھوڑے کی ہجو لکھی، اکبری دور میں زور کلام، شوکت الفاظ جدت استعارات و تشبیہات، نازک خیالی، مضمون آفرینی، فلسفیانہ خیالات اور نئی نئی تمہیدوں کے لحاظ سے عرفی کا کوئی مقابل نہ تھا، اس نے اپنے شاعرانہ کمال پر کبر و نخوت کا جو اظہار کیا تو یہ بے جا نہ تھا، اور اس کی اس افتاد طبع سے خود شاعری بھی معنوی حیثیت سے بلند مقام پر پہنچ رہی تھی،

محمد حسین نظیری نیشاپوری ہندوستان پہنچا تو عبدالرحیم خانخاناں کے دربار میں ملازم ہوا، اور اسی کی وساطت سے اکبر کے شاہانہ دربار میں رسائی حاصل کی پہلی بار جب اکبری دربار میں پہنچا تو جہانگیر کے بیٹے شہزادہ خسرو کی ولادت کا جشن تھا، نظیری نے اس موقع پر ایک قصیدہ پیش کیا جس سے اکبر کی توجہ اس کی طرف ہوئی، لیکن حاسدوں نے اس کو تقرب حاصل کرنے نہیں دیا، پھر بھی اس نے اکبر کی مدح میں اور بھی قصیدے لکھے جو مقبول ہوئے، اسکی سخن وری اور سخن گستری کی داد جہانگیر اور شہزادہ مراد کے دربار میں زیادہ دی گئی جیسا کہ آگے معلوم ہوگا،

ان اکابر شعراء کے علاوہ دربار کے بعض اور سخن گویوں کا بھی اجمالی ذکر ضروری ہے تاکہ اکبر

نے ان کی جس طرح قدردانی، عزت افزائی اور سرپرستی کی اس کا اندازہ ہو جائے، کہیں کہیں ہم ان شعراء کے کلام کے نمونے بھی ناظرین کے تفنن طبع کے لیے پیش کرتے جائیں گے، ان سے اس دور کے شعر و شاعری کے عام رجحانات کا پتہ چلے گا،

خواجہ حسین مروی - حضرت شیخ رکن الدولہ سمنانیؒ کی اولاد میں سے تھے، معقولات کی تعلیم مولانا عصام الدین اور ملا حنفی سے پائی، حدیث میں خاتم العلماء والمحدثین شیخ ابن حجر کی شاگردی کا شرف حاصل کیا، ہمایوں ان کے علم و فضل کا قدردان تھا، اس لیے اس کے ندیم خاص بھی رہے، اپنی فصاحت، بلاغت، لطافت اور ظرافت کے لیے مشہور تھے، ان کی شاعری میں سلاست صنایع اور بدایع کا پہلو غالب رہتا تھا، شہزادہ سلیم کی ولادت کے موقع پر ایک قصیدہ کہا جس کے پہلے مصرع سے اکبر کی تاریخ جلوس اور دوسرے سے سلیم کی تاریخ ولادت نکلتی تھی، قصیدہ کا مطلع یہ تھا:-

للہ الحمد از پے جاہ و جلال شہریار گوہرے آمد از محیط عدل در کنار

اکبر نے اس قصیدہ پر دو لاکھ ٹنکے انعام دیے،[1] اکبر کی فرمایش پر سنگھاسن بتیسی کا ترجمہ شروع کیا، مگر اس کی تکمیل نہ کر سکے، شیخ فیضی نے ان سے تعلیم و تربیت حاصل کی تھی،

کلام نمونہ یہ ہے،

گوئیم مگر ز اہل وفائیم نہ ایم واندر صفت صدق و صفائیم نہ ایم

آراستہ ظاہریم و باطن نہ چنان افسوس کہ آنچہ می نمائیم نہ ایم

ثنائی مشہدی، نام خواجہ حسین، باپ کا نام غیاث الدین علی تھا، ایران میں اپنے کلام کی رنگینی اور پرکاری کے لیے مشہور تھا، وہاں ایک مدت تک سلطان ابراہیم مرزا کی

---

[1] طبقات اکبری ج ۲ ص ۳۱۶ .

ثنا خوانی کی، ہندوستان میں آنے سے پہلے یہاں اس کا کلام ہر مجلس میں تبرک کے طور پر پڑھا جاتا تھا، ہندوستان آیا تو اکبر نے اس کی بڑی پذیرائی کی اور آخر عمر تک اس کے خسروانہ مراحم سے مستفید ہوتا رہا، تمام تذکرہ نگار اس کے شاعرانہ کمال کے معترف ہیں، میخانہ کا مولف اس کو "عندلیب گلستان نکتہ سرائی" کہتا ہے، اور اس کی شاعری کو رنگ و بوسے رنگین اور معطر بتاتا ہے منتخب التواریخ (ص۲۰۸) میں ہے:-

شاعر طبیعت است، و در ہمہ اقسام سخن غیر از توحید و موعظت و نصائح حکیم و تنگ گاسی

طرفہ دارد"

خواجہ نظام الدین احمد طبقات اکبری میں لکھتا ہے:-

دیوان شعر و کتاب مثنوی دارد، و اقسام شعر را خوب و استادانہ می گفت، و از

شعرائے وقت امتیاز داشت" (جلد سوم ص۴۸۹)،

میخانہ (ص۱۶۶) میں مثنوی کا نام سکندر نامہ مرقوم ہے، اس میں اور منتخب التواریخ جلد سوم میں ثنائی کا ایک ساقی نامہ بھی منقول ہے، خانخانان عبدالرحیم کی شان میں بڑے لمبے لمبے قصائد کہے تھے، جو مآثر رحیمی جلد سوم میں ملیں گے، قصیدہ گوئی کو اس کی شاعری سے بھی بڑی ترقی ہوئی، اس کی ایک رباعی ملاحظہ ہو،

ترک ستم چو کلہ گوشہ یغما شکند	نقد دو بہار د از طرہ و دریا شکند
ہر گز تندی خوی تو بخاطر نرسد	کہ نہ بر عارض دل رنگ تمنا شکند

اس کے کچھ اور کلام سے بھی لطف لیجیے، (آئین اکبری ص۱۸۱)،

قاصد شوق دگر قطرہ زنان می آید	کہ بدل شوق کسے از پئے جان می آید
شرط عشق ست کہ ہم باز بدل بسپارند	سخن دوست کہ از دل بزبان می آید

در حوصلۂ نہ فلک از عشق نگنجید   ہر ذرہ کہ از خاک ثنائی بہ ہوا رفت

میلی ہروی ۔ مولانا شبلیؒ شعر العجم حصہ پنجم (ص۲۲) میں عرفات اوحدی کے حوالہ سے تحریر فرماتے ہیں کہ قزلباشی امرا میں سے تھا، نہایت خوش رو اور خوش مزاج تھا، مدت تک مشہد اقدس میں سلطان ابراہیم مرزا کے دربار میں رہا، پھر ہندوستان آیا، یہاں حسین ثنائی، غزالی، وحشی وغیرہ سے معرکے رہے، مشہور ہے کہ اکبر کے دربار میں غزالی سے مناظرہ ہوا، غزالی نے حکمت عملی سے اس کو مغلوب کیا، اس کا اس کو استقدر صدمہ ہوا کہ اسی وقت تپ چڑھ آئی، اور بالآخر بیمار رہ کر مرگیا، مگر منتخب التواریخ حصہ سوم (ص۲۲۹) میں میلی ہروی کا ذکر ان الفاظ میں ہے،

"مرزا قلی نام، صاحب دیوان اور صاحب پندار ہے، اس کا سلیقۂ شاعری ایسا تھا کہ اگر وہ اب تک زندہ رہتا تو بہت سے تمام شعرا کے دل میں شعر گوئی کا سودا سرد پڑ جاتا، اس کے زمانہ سے اس وقت تک کے شعرا میں سے اس کا کوئی مد مقابل نہ تھا، برسوں نورنگ خان کی خدمت میں رہا، اور اس کی مدح میں بڑے بڑے قصائد کہے، کہتے ہیں کہ بدگمانی کی بنا پر نورنگ خان کے حکم سے اس کے پیالہ میں کوئی زہریلی چیز ڈال دی گئی کہ اس دنیا سے چل بسا، اس کی وفات مالوہ میں ہوئی"

طبقات اکبری جلد سوم (ص۴۹۶) میں ہے:-

"مرزا قلی میلی نورنگ خاں کی خدمت میں برسوں رہا، نورنگ خان اس عالی شان دودمان (یعنی خاندان تیموری) کے امرا میں سے ہے، مرزا قلی غزل اور قصیدہ کا ایک دیوان رکھتا ہے"

آئین اکبری اور منتخب التواریخ میں میلی قلی کے بہت سے اشعار درج ہیں، جن میں سے

کچھ یہ ہیں :-

دانستہ کہ مہر تو با جان نمی رود   کز خاک کشتگان گذری سرگران ہنوز

نہ آشنا و نہ بیگانہ نمی دانم   کہ اختلاط چنین را کسی چہ نام کند

بیقرار است دل اندر بدن کشتۂ عشق   دیگر از یار ندانم چہ تمنا دارد

امتحان نام نہد دل ستمی کز تو کشد   خویش را چند باین حیلہ شکیبا دارد

میرم و بر زندگانم رحم می آید کہ تو   خوبان بے داد ہا داری کہ با ما کردۂ

نوری - ملا نور الدین محمد ترخان نوری سفیدون (توابع سرہند) کے رہنے والے تھے، ہمایوں کے سلسلہ میں ان کا ذکر آچکا ہے، ہندسہ، ریاضی، نجوم و حکمت میں ان کا علم مشہور تھا، جود و سخا اور بذلہ سنجی میں ضرب المثل تھے، اکبر نے ان کی عزت و قدردانی باپ ہی کی طرح کی، اور ان کو خان کا بھی خطاب عطا کیا، چنانچہ اس خطاب پر اظہار تشکر کے ساتھ لطیف پیرایہ میں شکوہ بھی کرتے ہیں۔

ز روے مکرمت و ز راہ احسان   بہ ترخان داد خانی شاہ عادل

ازین خانی ہمین نا یست بردی   ازین نام شگرف او را چہ حاصل

ز ترخانی ہم او را شکوہ ہست   بہ نزد خسرو دانائے کامل

کہ غیر از خان خشکی می نماند   ز ترخانی ز تری گرد و چو زایل

مگر بعض سیاسی اسباب کی بنا پر کچھ دنوں معتوب بھی رہے، آخر عمر میں ہمایوں کے مقبرہ کی تولیت ان کے سپرد تھی، شاعر بھی تھے اور اپنا ایک دیوان بھی ترتیب دیا تھا، یہ شعر ان ہی کا ہے :-

دل تنگ دور از دان لب خندان نشستہ ام   مانند غنچہ سر بگریبان نشستہ ام

توسنی - نام منوہر تھا، سانبر کے راجہ لون کرن کا لڑکا تھا، اکبر نے اس کو مرزا منوہر کا خطاب دیا تھا، مگر وہ اپنے کو محمد منوہر لکھتا تھا، اس کی شاعری میں متانت و سنجیدگی تھی، اس کا ایک شعر ملاحظہ ہو:-

شیخ مستغنی بدین و برہمن مغرور کفر — مست حسن دوست را با کفر و ایمان کار نیست

تشبیہی کاشی - کئی بار وطن سے ہندوستان آیا، اور ابوالفضل کے توسل سے اکبر کے دربار میں حاضر ہوا، اور قصیدہ بھی پیش کیا، ملا بدایونی کی رائے کے مطابق ملحد تھا۔

تقی الدین ششتری - علوم عقلیات و نقلیات میں کامل دستگاہ رکھتا تھا، اکبر کے حکم سے شاہنامہ کو منثور کرنے کی کوشش کی، مگر یہ سعی لاحاصل تھی، اسی لیے ملا بدایونی اس قسم کی کوشش کے بارے میں لکھتے ہیں "قماش ابریشمی را پلاس میکند، و پیسان را می سازد" یعنی مخمل کو ٹاٹ بنا رہا ہے، اور سونے کو روئی، اس کی سخن سنجی کا نمونہ یہ ہے:-

گر دست ندہدم کہ بروبت نظر کنم — باری دہان بیاد لبت پر شکر کنم

با آنکہ ہیچ سبزہ بجا کم نشاندہ — دستے و دلی کجا ست کہ خاکے بسر کنم

ثنائی خان، ہروی - اکبر کے قدیم درباری امراء میں سے تھا، دین الٰہی کی تشکیل میں معاون ہوا، اس کی حمایت میں کچھ رسالے بھی لکھے، شعر گوئی سے بھی کچھ ذوق رکھتا تھا، مگر آخر عمر میں اس سے توبہ کر لی تھی۔ ذرہ و خورشید کے عنوان سے ایک مثنوی بھی لکھی تھی۔

جدائی سید علی نام، اکبر کے دربار کا مصور تھا، اکبر کے حکم سے قصۂ امیر حمزہ کی ۱۶ جلدوں کو مصور کیا، اور نادر الملک کے خطاب سے سرفراز ہوا، ہمایوں بھی اس کا قدردان تھا، ہمایوں شاہی بھی کہلاتا تھا، (طبقات اکبری حصہ سوم ص ۴۹۵)، ملا بدایونی اس کو ہندوستان کا مانی لکھتے ہیں، شاعر بھی تھا، [illegible] ایک دیوان بھی ترتیب دیا تھا، کچھ اشعار یہ ہیں:-

صبح دم خار دم از سہد می گل می زد — ناخنی در دل صد پارہ بلبل می زد

حسن بتان کعبہ ایست عشق بیابان او — سرزنش ناکسان خار مغیلان او

نیم بسمل صیدم و افتادہ دور از کوی دوست — میروم افتان و خیزان تا بہ بینم روی دوست

جعفر بیگ قزوینی۔ عمدۂ بخشی پر مامور تھا، اکبر نے آصف خان کے خطاب سے عزت بخشی، اسکی بذلہ سنجی مشہور تھی،

رسید و مضطربم کرد و آن قدر ننشست — کہ آشنا سے دل خود کنم تسلی را

شہر گنجایش غمہا سے دل ما چو نداشت — آفرید ند برا سے دل ما صحرا را

حیاتی گیلانی۔ عراق و خراسان میں قسمت آزمائی کرنے کے بعد ہندوستان آیا تو پہلے حکیم ابو الفتح گیلانی کے دربار سے وابستہ ہوا، اور اسی کی وساطت سے اکبر کے دربار میں پہنچا، اکبر نے اس کی بڑی پذیرائی کی، منصب، ابوقہ اور جاگیر عطا کی، مآثر رحیمی کے مصنف کا بیان ہے کہ

"در چندان قرب و منزلت اورا در ملازمت آن بادشاہ ہم رسید کہ مزیدی بر آن متصور نبود"

عبد الرحیم خانخانان دکن کی مہم پر روانہ ہوا تو اس کے ساتھ حیاتی بھی گیا، خانخانان نے اس کی بڑی قدردانی کی، اور اسی کی سفارش پر حیاتی کو اکبر نے منصب ہزاری بخشا، خانخانان بزم اور رزم دونوں میں اسکو ساتھ رکھتا تھا، حیاتی نے جذبۂ تشکر میں اس کی شان میں لمبے لمبے قصیدے کہے، حیاتی جہانگیر کے دربار سے بھی وابستہ رہا، مآثر رحیمی کا مولف اس کی علمی اور شاعرانہ صلاحیت بھرپور اوصاف کا بہت مداح ہے، لکھتا ہے،

ہر لفظی از منظوماتش جوہر فردی از صحائف منظوم، ظاہر آفتاب معانی۔ و ہر حرفی از منشور آتش چو دم عیسوی شگفتن حیات باقی۔ رشحات اقلامش از صفا رشک قطرات سحاب"

ونظم کلامش در پاکیزگی غیرت گوہر سیراب، و جامع فنون کمالات و حیثیات کسبی و وہبی آ
و آداب نیکو ذاتی و خوش صحبتی و شگفتہ روئی و قاعدہ دانی دستورالعمل ارباب این فن است
وجود شریفش در ہر مکان و زمان باعث تفریح قلب و سرور اکابر و اعیان، و جمعیت و
خوشحالی و مستعدان است۔" (جلد سوم ص۳۹)،

ملا بدایونی کی مدح و تعریف میں یہ غلو نہیں، وہ رقمطراز ہیں۔

از یاران دردمند۔ در اقسام شعر مستثنیٰ، صاحب دیوان است، و اورا با سخنان اکثر
سرپیست اگرچہ از مادہ علمی عاریست، اما جد و جہد و فہمی درست دارد و منصف است"

کلام کا [illegible]

یہ ہر سخن کہ کنی خویش را نگہبان باش | زگفتنی کہ دلی نشگفد پشیمان باش
چہ بال مرغ کہ گر شغل روزگار این است | ز مور ہم قدمے وام کن گریزان باش
این سبزہ در این صحرا بوی ز جنون دارد | دیوانگی و مستی امروز شگون دارد

خنجر بیگ۔ اکبر کے دربار کے چغتائی امرا میں سے تھا، سپہگری، موسیقی، خوش خطی، معمّا گوئی اور علم نجوم و ہیئت میں یگانۂ روزگار سمجھا جاتا تھا، تین ہزار ابیات کی ایک مثنوی لکھی جس میں اکبر کی مدح کرکے اپنے ذاتی فضائل بیان کئے ہیں، ملا بدایونی کا بیان ہے کہ اس مثنوی کے صلہ میں اکبر نے اس کو بہت سی نوازشوں سے سرفراز کیا، مثنوی کے کچھ اشعار منتخب التواریخ جلد (ص ۲۲۴ — ۲۲۶) میں ملیں گے، اس نے اپنا ایک دیوان بھی ترتیب دیا تھا،

میر دوری۔ نام سلطان بایزید تھا، بدایونی کا بیان ہے کہ اس نے خط نستعلیق لکھنے میں ایسی مہارت پیدا کی تھی کہ ہندوستان میں اس کا کوئی مدمقابل نہ تھا، اسی لیے اکبر نے کاتب الملک کا خطاب عطا کرکے نوازا، شعر گوئی سے بھی دلچسپی رکھتا تھا،

گہ درورون جانے گہ دردل حزینی	از شوخی گہ داری یکجا نمی نشینی

میر حیدر رفیعی، یہ کاشان سے گجرات آیا، اور وہاں سے لاہور پہنچکر شاہی ملازمت میں داخل ہوا، ملا بدایونی اور ابوالفضل کا بیان ہے کہ معما اور تاریخ گوئی میں عدیم المثال تھا، آخر عمر میں وطن واپس چلا گیا، ایک دیوان چھوڑا، اس کی ایک رباعی یہ ہے :-

زاہد نکند گنہ کہ قہاری تو	ما غرق گنا ہیم کہ غفاری تو
او قہاریت خواند و ما غفارت	یارب بکدام نام خوش داری تو

روغنی۔ یہ اپنی ہرزہ سرائی و ہزل گوئی کے لیے مشہور تھا، اس کے دیوان میں تین ہزار اشعار تھے،

زین خان کوکہ۔ اکبر کا رضاعی بھائی، اور اس کے دربار کا (۱) دو ہزاری (طبقات اکبری کے مطابق پنجہزاری) امیر اور شہزادہ سلیم کا خسر تھا، موسیقی خصوصاً ہندی راگ کا بڑا شیدائی تھا، کبھی کبھی اشعار بھی موزون کر لیتا تھا، اس کا ایک شعر ملاحظہ ہو،

ز رام من نمی رہد این چرخ کج خرام	تار شتہ مراد بسوزن در آورم

وفائی اصفہانی اسی کی سرپرستی میں رہا،

سرمدی اصفہانی۔ نام محمد شریف، کچھ دنوں چوکی نویس رہا، پھر شریف آملی کے ساتھ بنگالہ میں کسی خدمت پر مامور کیا گیا، ملا بدایونی کا بیان ہے کہ پہلے فیضی تخلص کرتا تھا، فیضی نے اکبر سے اس کی شکایت کی، تو پھر سرمدی تخلص رکھا، آئین اکبری میں ابوالفضل نے اس کے بہت سے منتخب اشعار لکھے ہیں، جن میں سے بعض یہ ہیں۔

ز گرمی خوئی عصیان چنانچو ورکریم	بہ پشت گرمی رحمت چہ جرعہا داریم
بہ گلشنے من دل با دل شوق افشاندیم	کہ رشک از آمدن و رفتن صبا داریم

بغیر وصل ہزار آرزوست عاشق را ہنوز ما بہوائے بخت کارہا داریم

سیدی۔ نام سید شاہ، گرم سیر کے سادات میں سے تھا، شیخ اسلام چشتی سے شرف بیعت حاصل کیا، کچھ دنوں دربارِ شاہی سے بھی منسلک رہا، آخر عمر میں قلیچ محمد خان کابل کے پاس جاکر ملازم ہوا، خوش طبع اور خوشگو شاعر تھا۔

اول سرگرمیٔ عشقت و دل در اضطراب ہمچو طفلی کو تپد ہنگام بیداری ز خواب

ملا شیری۔ پنجاب کے شیخ زادگان میں سے تھے، ابوالفضل کا بیان ہے کہ شعر و شاعری میں اکبر ہی کی توجہ سے ان کو درک حاصل ہوا،

بنظر گیتی خداوند دامنِ سخن بر دست او کشودند"

ماثرِ رحیمی کے مؤلف کا بیان ہے:۔

"بکمال حیثیات آراستہ و پیراستہ است، و طبعش خالی از منافی و خنگی نیست، و اشعار او در ہندوستان مشہور است" (ص ۱۱۱)

ملا بدایونی ملا شیری کے شاعرانہ کمالات کے بہت مداح ہیں، اور لکھتے ہیں کہ ان کو شعر کہنے پر بڑی قدرت حاصل تھی، زمانہ کے آلام و مصائب کی تصویر ان سے بہتر کسی اور شاعر نے نہیں کھینچی، ایک رات میں تیس تیس غزل کہنے کا دعویٰ کرتے تھے، قصیدہ اور قطعہ گوئی میں اپنے تمام معاصرین میں ممتاز تھے، اور ان کی فصاحت کے مقابلہ میں دوسروں کی فصاحت ماند پڑ گئی تھی۔ (جلد سوم ص ۲۴۹)، طبقات اکبری (جلد دوم ص ۴۹۱) میں ہے کہ آفتاب پر ایک مثنوی شمع جہاں افروز کے نام سے لکھی تھی جس میں ایک ہزار اشعار تھے، پہلے ذکر آچکا ہے کہ اکبر نے مہابھارت اور ہربنس کے ترجمے کے لیے ان کو مامور کیا تھا، ان کے اشعار کے بہت سے نمونے منتخب التواریخ جلد سوم اور ماثر رحیمی جلد سوم میں ملیں گے، ایک قصیدہ میں کہتے ہیں:۔

اے جہان در قبضۂ حکمت بضرب تیغ و تیر   تاجدار تخت و بخت از فیل و اسپ آفاق گیر

تاج و تخت و تیغ و تیرت مہر و ماہ و برق و شہاب   در شمار فیل و اسپت گشتہ عاجز صد دبیر

اکبر کی شان میں ایک قصیدہ جواب و سوال کے طرز پر کہا تھا جس کے کچھ اشعار یہ ہیں:۔

گفتم اے دل چہ اوضاع جہان گشت بدل   گفت خاموش کہ در مغز فلک رفتہ خلل

گفتم از چاہ امید آب تمنا نہ رسد   گفت کوتہ بود ۔ ی رسن طول امل

گفتم از بخت بہ تفصیل شکایت دارم   گفت با پایۂ شہنشاہ بگوے مجمل

گفتمش اکبر جم قدر سلیمان دانش   گفت خاقان بلند اختر خورشید محل

گفتم آن ذات نبی را بہ تعظیم ثانی   گفت آن خلق خدا را بہ تفضل اول

گفتم اصل و نسبش لازم تاج است و سریر   گفت لطف و کرمش حامی ملکت و ملل

باباطالب اصفہانی ۔ طبیعت میں درویشی تھی، اس لیے پہلے قلندر رہتے، پھر اکبر کے دربار سے منسلک ہوگئے، اکبر نے تبت ایلچی بنا کر بھیجا، واپس ہوئے تو وہاں کے حالات ایک رسالہ میں قلمبند کیے، جس کو شیخ ابوالفضل نے اکبر نامہ میں شامل کر لیا، ادب و انشا کے ساتھ شعر گوئی میں بھی بڑا سلیقہ رکھتے تھے، جہانگیر کے زمانہ میں گجرات کے صدر مقرر ہوئے، انکی ایک رباعی یہ ہے:۔

زہرم بفراق خود چشانی کہ چہ شد   خون ریزی و آستین فشانی کہ چہ شد

اے غافل از انکہ تیغ ہجر تو چہ کرد   خاکم بفشار تا بدانی کہ چہ شد

غنائی ۔ سید محمد نجفی الہ آباد میں کسی عہدہ پر تھا، اپنی ہجو گوئی، بے باکی اور درشتیٔ طبع کی وجہ سے شاہی دربار سے معتوب رہا، مگر ارباب فن اس کی عربی اور فارسی شاعری کے مداح تھے،

میر عزیز اللہ قزوینی ۔ طبقات اکبری سے معلوم ہوتا ہے کہ تخلص عزیزی تھا، احساب سیاق کا ماہر تھا، سنبھل کے ضبط و نسق کے لیے مامور ہوا،[1] جہاں بعض امور کی بنا پر شاہی التفات

[1] طبقات اکبری ج ۲ ص ۱۱۵ میں ہے، "رتھا دیوان سنبھل سرکار بود"

سے محروم ہوگیا، ایک دیوان، منظومہ الو شہر آشوب، گل و مل، و بہ القناعت رسالہ منظوم اور

صحیفہ العشاق کا مولف تھا، (طبقات اکبری جلد سوم ص۵۱۱)، کلام کا نمونہ یہ ہے :-

نیست ہر سوی مژگان دیدہ نمناک را | بر کنار افگند موج اشک من خاشاک را

تن سیمین نہ شد او را از خاک پیرہن پیدا | سمن در باغ خوبی شد ز برگ یاسمن پیدا

چنیں کافتادہ در راہ غم و محنت چو خاشاکم | نسیم لطف و احسانت اگر بردارد از خاکم

مرزا عزیز کوکہ۔ اتکہ خان کا لڑکا اور اکبر کا رضاعی بھائی تھا، اکبر اس کو بہت محبوب رکھتا تھا، اس کے مختلف سیاسی اور حربی کارناموں کی وجہ سے اس کو پنجہزاری اور خان اعظم کا خطاب عطا کیا، جب کبھی اس سے اختلاف ہوتا تو اکبر اس سے درگزر کرتا، اور کہتا کہ میرے اور عزیز کے درمیان دودھ کی ایک نہر بہتی ہے، اس کے علم و ہنر سے تمام معاصرین متاثر تھے،

ملا بدایونی لکھتے ہیں :-

"بہ انواع و فضائل و ہنر موصوف است و بفہم عالی و ادراک بلند او کسے دیگر از امرا نشان نمی دہند"

طبقات اکبری جلد دوم (ص۳۴۵) میں ہے :

"بجودت فہم و جودت طبع و قوت در علم تاریخ عدیل ندارد"

تزک جہانگیری میں جہانگیر رقمطراز ہے،

"در علم سیر و فن تاریخ استحضار تمام داشت و در تاریخ و تقریر بے نظیر بود، و در عبارت نویسی ید طولیٰ داشت، و در بذلہ گوئی بے مثل بود و شعر ہموار می گفت"

یہ لکھ کر جہانگیر نے اس کی حسب ذیل رباعی پیش کی ہے

عشق آمد و از جنون پریشانم کرد | [illegible]

ازا و ز بند وین و دانش گشتم تا سلسلۂ زلف کسے بند م کرد

مولانا شبلی نے شعر العجم حصہ سوم (ص۱۰) میں اس کی نکتہ سنجی کی داد دی ہے اور اس کے حسب ذیل مطلع کو پسند کیا ہے،

گشت بیمار دل از رنج و غم تنہائی اے طبیب دل بیمار چہ می فرمائی

خانخانان عبدالرحیم اور حکیم ابوالفتح گیلانی کے بعد اس کے دربار کی علمی محفل آرائی مشہور تھی، نقیبی سبزواری، جعفر ہروی، اور مدامی بدخشی خان اعظم ہی کی سرکار سے وابستہ تھے، حیدری نے بھی اس کے خوانِ کرم کی زلہ ربائی کی، اس کو نقاشی میں بھی بڑی مہارت تھی، آگرہ میں ایک باغ جہاں آرا کے نام سے تیار کیا، اور وہاں نقش و نگار کے ساتھ اپنی حسب ذیل رباعی لکھوائی۔

یا رب بصفائے دل ارباب تمیز کان نزد تو ہست خوبتر از ہمہ چیز

چون گشت بتوفیق تو این خانہ تمام از راہ کرم فرست مہمان عزیز[۱]

عنایت اللہ شیرازی۔ شاہی کتب خانہ کا کتابدار تھا، اس کی خوشنویسی پر اکبر نے اس کو مکتوب خانی خطاب سے سرفراز کیا[۲]، اپنی خوش طبعی کی بنا پر کبھی کبھی طبع آزمائی کر لیتا تھا، اس کی ایک رباعی یہ ہے :-

تا کاکل و زلف نیکوان خم بخم است تا شیوۂ رفتار بتان چم بچم است

تا ناوک غمزہ در کمان ستم است مرگ من و زندگی من دم بدم است

غباری۔ قاسم علی نام، غباری تخلص، بقال تھا، اکبر نے اس کو اپنا خلیفہ بنایا، اور خان کا خطاب عطا کیا،

---

[۱] خان اعظم کے حالات کی تفصیل کے لیے دیکھو مآثر الامرا، جلد اول ص ۶۷۵-۶۹۳ و بدایونی ج ۳ ص۲۸۳

[۲] ریاض الشعرا، قلمی نسخہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی۔

فشانی: نام مولانا علی احمد، مولانا حسین نقشی دہلوی مہرکن کے فرزند تھے، ہیئت و طبیعیات کے عالم تھے، خطاطی اور مہرکنی کی وجہ سے بڑی شہرت حاصل کی، شہزادہ سلیم کے استاد بھی رہے، دربار میں بڑا عروج و رسوخ حاصل کیا، اور گو یک صدی کے منصبدار تھے، مگر ملا بدایونی کا بیان ہے کہ کسی امیر سے کمتر نہ تھے، اکبر نے گجرات تسخیر کر کے سکہ جاری کیا تو انھوں نے شاہی سکہ بنایا اور یہ تاریخ گذرانی :-

خسروا سکۂ گجرات بنام تو زدند ۔۔۔ ملک را سایۂ عدل تو تبارک بادا

اے خوش آن دم کہ چو تاریخ وی از من پرسی ۔۔۔ گو بگو ، سکۂ گجرات مبارک بادا

ملا بدایونی ان کے علم و فضل کے بہت ہی معترف تھے، اسی لیے ان کی مثنویات، قصائد، اور رقعات کے نمونے منتخب التواریخ میں نقل کیے ہیں (دیکھو جلد سوم ص ۱۴۹ تا ۳۶۰)۔

نامی - میر محمد معصوم خان نامی بھکر وطن، آبا و اجداد ترمذ سے آئے، محمد معصوم خان طبقات اکبری کے مولف خواجہ نظام الدین احمد اور گجرات کے صوبہ دار شہاب خان کی وساطت سے شاہی دربار میں پہنچا، اکبر اس کو بہت عزیز رکھنے لگا، رفتہ رفتہ وہ ہزاری منصبدار بھی ہوا، ایران کا سفیر بنا کر بھیجا گیا، وہاں سے تبریز گیا، جہاں حکیم شفائی، محمد رضا فکری اور تقی اوحدی کی صحبت میں شعر و شاعری کا شغل جاری رکھا، وہاں سے واپس ہوا تو جہانگیر نے بھکر میں امین کے عہدہ پر مامور کیا، اپنی دیانت، امانت، شجاعت، سخاوت، زہد اور تقوی کی وجہ سے بڑی عزت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا، علمی حیثیت سے وہ کثیر الاشتغال تھا، طب میں ایک رسالہ مفردات معصومی قلمبند کیا، ایک ضخیم تاریخ سندھ لکھی جو تاریخ معصومی کے نام سے مشہور رہی، آج بھی یہ تاریخ اپنے معلومات کے لحاظ سے مفید سمجھی جاتی ہے، میر محمد معصوم نامی کو شعر و سخن سے بھی دلچسپی تھی، اور ہمیشہ ایک سنگ تراش ساتھ رکھتا تھا، جو جا بجا اسکے اشعار پتھروں پر کندہ کر دیتا تھا، دیوان کے علاوہ خمسہ کے طرز پر پانچ مثنویاں، معدن الافکار، حسن و ناز، پری صورت ، اور دو اور لکھیں، ایک طویل قصیدہ

منقبت اور بہت سی رباعیاں ملا بدایونی نے منتخب التواریخ جلد سوم (ص ۲۷ - ۳۶۷) میں نقل کی ہیں،

دو رباعیاں ملاحظہ ہوں :-

یک حصۂ عمر من بنادانی رفت   یک حصہ از آن چنانکہ می دانی رفت

یک حصہ بہیودہ بیکار گذشت   یک حصہ بافسوس و پشیمانی رفت

تا کے دل از این و آن پر از کینہ کنی   تا چند بزر سینہ چو گنجینہ کنی

کاری نبود کہ تیرہ سازی دل را   آن کار بود کہ دل چو آئینہ کنی

غزنوی۔ میر محمد نام، خان کلان خطاب، اکبر کے دربار کا جلیل القدر امیر پنجہزاری منصبدار تھا، اس کی مجلس میں شعر و شاعری کا شغل برابر جاری رہتا تھا، سنبھل کی حکومت کے زمانہ میں ایک بار شیخ سعدی کا یہ مطلع اس کے سامنے پڑھا گیا،

دلے کہ عاشق و صابر بود مگر سنگ است   ز عشق تا بصبوری ہزار فرسنگ است

غزنوی نے فوراً کہا۔

دمے کہ چہرۂ ساقی ز بادہ گلرنگ است   بنوش بادہ بر آواز نے کہ دل تنگ است

اسی کے دربار کے ایک شاعر جمال خان بدایونی نے بھی ایک مطلع کہا

ترا رخ از مے عشرت مدام گل رنگ است   مرا ز فکر دہانت چو غنچہ دل تنگ است

فارسی اور ترکی کا ایک دیوان بھی چھوڑا، مآثر الامرا جلد سوم (ص ۲۱۶) میں اس کے حسب ذیل دو شعر منقول ہیں،

در جوانی حاصل عمرم بنادانی گذشت   آنچہ باقی بود آن ہم در پشیمانی گذشت

کس آشنا بجز مردم چشم ندید   جز آہ سحر ہم نفسے نیست مرا

ہمدمی۔ نام [illegible] بیگ اکبر کا امیر ان کے کوکہ ہمدم بیگ کا لڑکا تھا، مرزا برخوردار بھی

کہلاتا تھا، ہمدمی تخلص اور خان عالم خطاب تھا، مرزا کامراں ہمایوں سے شکست کھاکر حجاز کے سفر پر روانہ ہوتو ہمدمی ہمایوں کی خدمت میں حاضر ہوا، اور پہلے یہ بیت پڑھی۔

کلاہ گوشہ درویش بر فلک ساید — کہ سایہ ہمچو تو شاہی فگند بر سر او

اور اسی کے بعد یہ شعر بھی زبان پر لایا،

بر جانم از تو ہر چہ رسد جائے منت است — گر ناوک جفاست وگر خنجر ستم

یہ سنکر ہمایوں بہت متاثر ہوا اور اس کو بڑی نوازشوں کے ساتھ اپنے ساتھ اپنے دربار میں رکھا، اکبر نے بھی شاہانہ لطف وکرم سے نوازا، اور سہ ہزاری منصب اور خان عالم کا خطاب عنایت کیا، اکبر کے ساتھ حصار پٹنہ کی تسخیر میں بڑی جانبازی دکھائی، عبدالرحیم خانخاناں کے ساتھ بنگالہ کی مہم میں بھی ساتھ رہا، اور ۹۸۲ھ میں اوڑیسہ کی لشکرکشی کے سلسلہ میں مارا گیا[1] شعروشاعری سے بھی دلچسپی رکھتا تھا، اکبر کو آصفی کا یہ مطلع پسند تھا،

قاتل من چشم می بندد دم بسمل مرا — تا بماند حسرت دیدار او در دل مرا

اکبر نے ہمدمی کو اسی مطلع پر ایک مطلع کہنے کی فرمایش کی تو اس نے کہا۔

آمد و بگذشت از دل تیر آن قاتل مرا — ماند تا روز قیامت داغ او در دل مرا

فیضی کا بھی ایک مطلع اسی قافیہ و ردیف میں ہے۔

پا بسر دو بگذر اے قاتل دم بسمل مرا — تا بایں تقریب پابوسی شود حاصل مرا

ہمدمی کا ایک قطعہ ہے۔

اے کہ کردی بہر رنگ ریش سفید — یک بیک می کنی ز بہر نمود
بز بیان دادۂ جدائی را — ریش کندن کنوں ندارد سود

---

[1] مآثر الامراء ج ۱ ص ۶۳۵ - ۶۳۲، و منتخب التواریخ ج ۳ ص ۲۸۶ - ۲۸۵،

اشکی۔ میر اشکی قمی ابن سید علی محتسب ، ہندوستان آیا ، تو اکبر کے دربار میں ملازم ہوا ، ریاض الشعراء کے مولف کا بیان ہے کہ یہاں غزالی مشہدی وغیرہ سے اس کے شاعرانہ معرکے ہوتے تھے ، وفات سے کچھ دنوں پہلے اپنا دیوان نادر الملک جدائی کو دیا ، جس نے اسکے کچھ اشعار اپنی طرف منسوب کر لیے ، ریاض الشعراء میں ہے کہ غزالی نے اس پر ایک ہجو بھی کہی تھی ، ملا بدایونی نے اس کے کلام کے کچھ نمونے دیے ہیں ۔

از بسکہ سنگ بر سر زدیے تو سینہ چاکی — آں سنگ در کف او گرد ید مشت خاکی

بسے سنگ از غمت بر سر من لی تنگ خواہم زد — اگر دستم رود از کار سر بر سنگ خواہم زد

اگر خواہم کہ در راہ تو از سنگ بلا افتم — ز ہر سو بر من آید سنگ و گلزار زیبا افتم

موخر الذکر شعر لکھکر ملا بدایونی کہتے ہیں کہ مضمون سنگ پر اس سے بہتر شعر کہنا مشکل ہے[1]

فکری خراسانی ۔ نام سید محمد ، اکبر کا قصیدہ خوان بھی رہا ، رباعی کہنے میں شہرت حاصل کی ، اس لیے میر رباعی کے نام سے مشہور ہوا ، اس کے اشعار میں بلند افکار ہوتے تھے ، اسکی ایک رباعی ہے ۔

زان بت ہمہ غم نصیب ما خواہد بود — بیداد و ستم نصیب ما خواہد بود

تا عمر بود از ان قد و زلف و دہاں — پیوستہ الم نقیب ما خواہد بود

فیضی تربتی ۔ اکبری دور کا بلند پایہ شاعر تسلیم کیا گیا ہے ، ملک الشعراء ابو الفیض فیضی نے اس کے شاعرانہ کمالات کی تعریف میں ایک قطعہ بھی کہا ہے ، اکبر کی شان میں فیضی تربتی نے متعدد قصائد کہے ۔ ریاض الشعراء میں اس کی بہت سی رباعیاں منقول ہیں ، ایک دو ہم بھی ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں ۔

---

[1] طبقات اکبری جلد سوم ص ۴۹۴

اے قبلۂ جان کعبۂ من کوئے تو باشد محراب می سازم خم ابروے تو باشد

گر جانب مسجد گذرم و ز طرف دیر ہر جا کہ روم روئے دلم سوئے تو باشد

زاہد تو ز مستی منگر نیستی ما صرف رہ نیستی شدہ ہستی ما

ما مست محبتیم و تو مست غرور فرقست ز مستی تو مستی ما

سید فسونی یزدی - محمود بیگ نام[مطلب] ظاہری، معنوی اور علمی حیثیت سے یگانۂ روزگار سمجھا جاتا تھا، شعر و شاعری کے علاوہ فن سیاق، نجوم و ہیئت، حساب اور تاریخ سے بھی اسکو واقفیت تھی، ریاض الشعراء میں ہے کہ اکبر کے علاوہ جہانگیر اور شاہ جہاں کے دربار سے بھی منسلک رہا، جہانگیر نے اس کو افضل خان کا خطاب بھی عطا کیا تھا، اس کے بعض اشعار یہ ہیں

خواب راحت شد از ان دیدہ کہ دیدن دا/نشست رفت آسایش از ان دل کہ طپیدن دا

خبردار آن زمان خواہی شدن از شور پنہانم کہ آتش سر برون آورد و پا شد از گریبانم

فنائی ہروی - چغتائی نسل سے تھا، اکبر نے اس کو بھی خان کے خطاب سے نوازا تھا، طبقات اکبری (جلد سوم ص ۵۱۶) میں ہے کہ تمام عمر اکبر کی بارگاہ میں رہا، ملا بدایونی (جلد سوم ص ۲۶۹) رقمطراز ہیں کہ اس کا حسب ذیل مطلع ان کو اسقدر پسند آیا کہ اس کو پچاس سال تک یاد رکھا،

نگویم بہر تشریف قدومت خانہ دارم غریبم خاکسارم گوشۂ ویرانہ دارم

فنائی کا ایک مطلع یہ بھی ہے

تا گل روی تو از بادہ گلفام شگفت بادہ از عکس گل روے تو در جام شگفت

فیروزہ کابلی - مرزا محمد حکیم کے یہاں تربیت پائی، آئین اکبری میں ہے کہ اکبر نے اس کو منصب دو ہزاری عطا کیا، موسیقی اور شاعری سے بھی ذوق رکھتا تھا، متقدمین اور متا/تاخرین

له آئین اکبری میں ہے "از نامور نیکمیان، اختر نیکو برشمرد"

کے شعرو ں کی غزلوں پر غزلیں لکھنے کا بھی دعویدار تھا، ملا بدایونی (جلد سوم ص۲۱۲) لکھتے ہیں کہ اسکی علمی استعداد تو اچھی نہ تھی، مگر شعر فہمی کی صلاحیت اچھی رکھتا تھا، اور اس کی شاعری کے جو نمونے پیش کیے ہیں ان میں سے دو شعر یہ ہیں۔

غیر منظور نظر ساختہ یعنی چہ   بندہ را از نظر انداختہ یعنی چہ

کس ندیدم بدور تو بایں حسن و جمال   قیمت حسن برانداختہ یعنی چہ

حیدری تبریزی ۔ تین بار عراق سے ہندوستان آیا، پہلی بار قاسم خان نیشاپوری کے دربار سے وابستہ رہا، مگر ہندوستان اس کو پسند نہ آیا، اس لیے اس کی ہجو بھی لکھی، اور وطن واپس چلا گیا، دوسری بار ہندوستان آیا تو خان اعظم مرزا کوکہ کے خوانِ کرم کی خوشہ چینی کی، اس کی شان میں ایک قصیدہ کہا جس کا مطلع یہ تھا

نزد اہل سخن چون کنم بیان سخن   اگر مدد نکند روح صاحبان سخن

خان اعظم نے اس کے صلہ میں دو ہزار روپے، خلعت اور گھوڑا عطا کیا، شمس الدین محمد اتکہ خان کے وسیلہ سے شاہی دربار میں بھی حاضر ہوا، ایک قصیدہ میں اکبر کے ہاتھی کی تعریف اس طرح کی

نبود پشت ہا ے ریگ روان   فیلہا یش کہ در صف ہیجاست

کز پے غرق کردن اعدا   ہر طرف موجہای بحر بلاست

ملا بدایونی (جلد سوم ص۲۱۸) رقمطراز ہیں کہ اکبر نے اس قصیدہ پر خلعت اور اسپ اور کچھ روپے عنایت کئے، مگر شاہی خزانہ سے ملنے میں دیر ہوئی، تو یہ قطعہ لکھ کر اکبر کی خدمت میں پیش کیا،

شکلے دارم شہا خواہم کنم پیش تو عرض   وانکہ زین مشکل مرا حصار اغ خسترید و شفا

سیم و زر انعام کردی لیک از خازن مرا ۔۔۔ ہم گرفتن مشکل و ہم ناگرفتن مشکل ست

خزانۂ عامرہ (مولفہ آزاد بلگرامی) میں ہے کہ اکبر نے حیدری کو انعام حسب ذیل قصیدہ پر عطا کیا تھا، اور اس کے نہ ملنے پر مذکورہ بالا قطعہ لکھا،

اما چو روزگار مددگار من نبود ۔۔۔ زان شاخ گل بیاہی ولم خاتم خلید

نشنید شاہ عقدہ کشا مصرعی زمن ۔۔۔ بکشود فصل آرزو من از بن کلید

بودم زآب دیدۂ غرق بحر غم ۔۔۔ کز عیب این ترانہ بگوش دلم رسید

حافظ وظیفہ تو دعا گفتن است وبس ۔۔۔ در بند آن مباش کہ نشنید یا شنید

تیسری بار حیدری ہندوستان آیا تو خانخاناں کے دربار میں شغل سخن کو جاری رکھا، مگر پھر وطن کی طرف مراجعت کی، اور وہیں ۱۰۰۲ھ میں وفات پائی، اس کے دیوان میں چودہ ہزار اشعار تھے، ایک مثنوی لسان الغیب بھی لکھی جس میں اپنے استاد لسانی کی مدح کی تھی،

(بدایونی جلد سوم ص ۱۸۲، و نیز انگریزی ترجمہ)

حلیمی ۔ مرزا جانی بیگ ارغون حلیمی ٹھٹھ کا حاکم تھا، اپنی فراست و دانائی کے لیے مشہور تھا، اکبر نے اس کو سہ ہزاری و پانصدی کا منصب عطا کیا، شعر و شاعری میں حلیمی تخلص کرتا تھا، ماثر الامرا جلد سوم (ص ۳۱۳) میں اس کے یہ دو شعر مرقوم ہیں:

خوش آن وقتے کہ عشق عمخوارم بود ۔۔۔ آہ شب و گریۂ سحر کارم بود

بدگردی چرخ بین کہ با من نگذاشت ۔۔۔ کالائے غمی کہ زیب بازارم بود

میر مرتضیٰ سبزواری ۔ فوجی عہدہ دار تھا، دکن کے اکثر علاقہ کو اس نے فتح کیا، آخر عمر میں شاہی دربار میں رہنے لگا تھا، جہانگیر کے زمانہ میں وفات پائی، ریاض الشعراء اور مخزن الغرا میں اس کا یہ شعر منقول ہے:

اے از رخ تو مارا صد عیش و کامرانی — در عیش و کامرانی صد سال زندہ مانی

اسد بیگ قزوینی۔ ہندوستان آیا تو اکبر کے وزیر اعظم ابوالفضل کے دربار میں سترہ سال تک ملازم رہا، اس لیے اسد شیخ ابوالفضلی کہلایا، ابوالفضل کے قتل کے بعد اکبر نے اس کو اپنے دربار میں داخل کر لیا، شہزادہ دانیال کی نسبت کے سلسلہ میں اکبر نے اس کو دائی بیجاپور کے پاس بھیجا، وہاں سے واپسی کے بعد اس کو شاہی حاجب بنایا گیا، منصب اور ستر ہزار روپے کا وظیفہ بھی عطا کیا گیا، اکبر کی وفات سے پہلے دکن میں بعض خدمات کو انجام دینے کے لیے سفیر کی حیثیت سے مامور ہوا، مگر وہاں پہنچنے بھی نہ پایا تھا کہ اس کو اکبر کی وفات کی خبر ملی، دارالسلطنت واپس آیا تو جہانگیر کے دربار میں اس کی پذیرائی نہ ہوئی، ابوالفضل کے قتل کے سلسلہ میں جہانگیر اس سے ناراض تھا، مگر رفتہ رفتہ یہ ناراضگی دور ہو گئی، اور مقبول بارگاہ ہوا تو جہانگیر نے اس کو پشیرو خاں کا خطاب عطا کیا، سخن سنجی و سخن فہمی کے ساتھ اپنی طبیعت کی لطافت اور شگفتگی کے لیے ہر مجلس میں پسند کیا جاتا تھا۔ اس کے کلام کا رنگ یہ ہے:

ز صبحدم نفسی پیشتر شدم بیدار — لب پیالہ گرفتم ببوسہ چون لب یار

خون مرا مریز کہ ترسم خجل شوی — چون ساقی کہ ریختہ باشد شراب را

خون مرا بریز و شراب مرا مریز — یک قطرہ زین شراب بصد خون برابر است

ہر کہ خیال آن گل خودروی می کنم — دل می کند خیال کہ گل بوی می کنم

وقایع اسد بیگ کے نام سے اپنے کچھ ذاتی کوائف اور اس عہد کے کچھ تاریخی حالات خصوصاً ابوالفضل کے قتل کی تفصیلات لکھی ہیں، جس کے اقتباسات الیٹ جلد ششم میں درج ہیں،[۱]

دربار اکبری کے ارباب سخن کی تعداد اتنی کثیر ہے کہ ان کو ان صفحات پر آسانی سے سمیٹا نہیں جا سکتا

---

[۱] نیز دیکھو میخانہ ص ۵۹۳ و ریاض الشعراء

ہوتا جارہا ہے، اس لیے ہم بقیہ شعراء کے صرف نام لکھنے پر اکتفا کرتے ہیں ان میں بھی ہم ان ہی کے نام درج کرتے ہیں، جو شاہی ملازموں کے زمرہ میں داخل تھے،

ملا قیدی شیرازی، قاسم ارسلان، یادگار حالتی، طرفی ساوجی، مشفقی بخاری، ملا صبوحی کابلی، حیفی ساوجی، خواجہ ہجری، تویدی، نارغی، وقوعی خسروی، نیازی سمرقندی، میر حزنی، مظہر کشمیری، بہرام سقا، محمد صالح دیوانہ، شریف سرمدی، غازی اسیری وغیرہ وغیرہ ان کے کلام کے نمونے طبقات اکبری جلد سوم میں ملیں گے،

بہت سے ایسے شعراء بھی تھے جنکا دربار سے براہ راست تعلق تو نہ تھا، مگر اپنے قصائد بھیجکر اکبر کے ابر کرم سے سیراب ہوتے رہتے تھے، ان میں ظہوری ترشیزی اور ملک قمی بھی تھے،

ہندی فضلاء | اکبر کو ہندوؤں کے علوم و فنون سے جو شغف تھا وہ ظاہر ہے، کہا جاتا ہے کہ وہ ہندی شاعری میں طبع آزمائی بھی کرتا تھا، اور رائے تخلص رکھتا تھا، ہندو فضلاء کی ایک کثیر جماعت بھی دربار شاہی سے منسلک تھی، ابوالفضل نے "دانش اندوزان جاوید دولت" کے سلسلہ میں خدیو نشاتین کی فہرست میں حسب ذیل ہندوؤں کے نام لکھے ہیں۔

مادھو سرستی، مدھسودن، نارائن آسرم، ہرجی سود، داموددر بھٹ، رام تیرتھ، نرسنگ، پرم اندر، آدیت،

"خداوند باطن" کی فہرست میں یہ نام ہیں،

رام بھدر، جدروپ

شناسائے عقلی کلام کے عنوان سے مندرجۂ ذیل نام گنائے ہیں:

نارائن، مادھو بھٹ، سری بھٹ، بشن ناتھ، رام کشن، بلبھدر مصر، باسدیو مصر،

باین بھٹ، بدیا تواس، گوبردھن ناتھ، گوپی ناتھ، کشن پنڈت، بھٹاچارج، بھاگیرت بھٹاچارج
کاشی ناتھ بھٹاچارج، مہادیو، بھیم ناتھ، نرائن، سیوجی۔[۱]

کتب خانہ اکبر کے علمی ذوق کے سبب جو کتب خانہ قائم ہوا، وہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے بے مثل تھا، قلعہ آگرہ میں مثمن برج کے بغل میں جو لمبا کمرہ ہے، وہیں شاہی کتب خانہ تھا، ہمایوں کے کتب خانہ کی جتنی کتابیں تھیں وہ وراثت میں ملیں، اس کے علاوہ مختلف مقامات اور اشخاص سے وقتاً فوقتاً دستیاب ہوتی رہیں، اہل قلم جو کتابیں لکھتے ان کا ایک نسخہ خزانہ عامرہ میں ضرور بھیجتے، اکبر کے درباری مصنفوں کی تصنیفات، تالیفات، و تراجم خود [illegible] اکثر دیکھتے تھے [illegible] ان کے کئی کئی نسخے شاہی کتب خانہ میں رہتے، پھر اکبر کو فتوحات کے سلسلہ میں جتنی کتابیں دستیاب ہوتیں ان کو خزانہ عامرہ میں داخل کر لیتا، فتح گجرات کے زمانہ میں اعتماد خان گجراتی سے بہت سی نفیس اور نادر کتابیں حاصل ہوئیں، ان میں سے بعض تو شاہی کتب خانہ میں داخل کر لی گئیں اور بعض اہل ذوق کو دے دی گئیں، ملا عبد القادر بدایونی کو اس تقسیم میں انوار المشکوٰۃ کا نسخہ ملا،[۲] فیضی کے انتقال کے بعد اس کی تمام کتابیں شاہی کتب خانہ میں منتقل کر دی گئیں [illegible] کی کل تعداد [illegible] تھی، جو اکثر مصنفوں کے ہاتھ کی یا ان کے عہد کی لکھی ہوئی تھیں، ان کتابوں کا مجموعہ تین حصوں میں منقسم تھا، پہلے میں نظم، طب، نجوم اور موسیقی کی کتابیں اور دوسرے میں حکمت، تصوف، ہیئت، ہندسہ کی اور تیسرے میں تفسیر، حدیث اور فقہ کی تھیں،[۳] خیال کیا جاتا ہے کہ اکبر کے کتب خانہ میں ۲۴ ہزار کتابیں تھیں، جو زیادہ تر [illegible] کی لکھی ہوئی تھیں، ماثر الامراء جلد دوم (ص ۶۱۱) میں ہے کہ ایک روز شہزادہ سلیم ابو الفضل کے گھر گیا تو چالیس کاتبوں کو کلام پاک اور تفسیر نقل کرتے ہوئے دیکھا، ظاہر ہے کہ شاہی کتب خانہ کے لیے اور بھی زیادہ کاتب اور خوشنویس مقرر

---

[۱] آئین اکبری [۲] بدایونی جلد دوم ص ۲ [۳] ایضاً ص ۳

ہوں گے، خوشنویسوں کے علاوہ مقابلہ نویس، مصحح، نقاش، جدول ساز، جلد ساز اور مصور بھی[1]

اکبر خاص طور سے بعض کتابوں کو مصور کراتا تھا، ان میں تصویریں اور شبیہیں بنواتا مرقعے تیار کراتا ... کتابوں کی لوح و جدول مطلا کراتا تھا، قصۂ امیر حمزہ کی بارہ جلدیں اس کی فرمایش سے مصور کی گئی تھیں، اور اس میں استادان سحر پرداز نے ..۱۴ تصویریں بنائیں اسی طرح چنگیز نامہ، ظفرنامہ، اقبال نامہ، رزم نامہ (مہابھارت) رامائن، نل دمن، کلیلہ دمنہ، اور عیار دانش، نقش و نگار سے آراستہ ہوئیں[1]

یہاں پر بے محل نہ ہوگا اگر دربار اکبری کے ان خطاطوں اور خوشنویسوں کا تذکرہ کیا جائے جنھوں نے شاہی کتب خانہ کی زینت اپنے کمال فن سے بڑھائی اور جن کی قدر دانی اکبر نے جاگیر منصب اور خطابات دے کر کی،

(۱) ملا محمد حسین کشمیری، نستعلیق کے استاد تھے، اکبر نے زریں قلم کا خطاب دیا تھا، ابوالفضل ان کو جادو رقم لکھتا ہے[2]

(۲) خواجہ عبدالصمد شیریں رقم، خواجہ نظام الملک وزیر شاہ شجاع شیرازی کے بیٹے تھے، ہمایوں کے دربار میں خوشنویس تھے، نستعلیق کے استاد اور مصور تھے، اپنے فن کی مہارت کے لحاظ سے شیریں قلم کہلاتے تھے، اکبر کے عہد میں چار صدی منصب عطا ہوا، اور فتح پور سیکری کی ٹکسال کے افسر اعلیٰ مقرر ہوئے، خشخاش کے دانے پر سورۂ اخلاص لکھی تھی[3]

(۳) میر معصوم قندھاری اکبری دور کے مشہور خطاط ہیں، فتح پور سیکری کی اکثر عمارات پر ان کے کتبے کندہ ہیں،

(۴) حسین بن احمد چشتی، یہ بھی اس دور کے عربی کے باکمال خطاط تھے، فتح پور سیکری

---

[1] آئین اکبری ص۸۰ [2] ایضاً ص۱۱۴ و تذکرہ خوشنویسان ص۸۵ [3] ایضاً ص۸۵ و مآثرالامراء، ج ۲

کے بلند دروازے کے پیش طاق کی محراب کے اوپر ابھرے ہوئے حروف میں جو عربی کتبہ ہے وہ انہی کے کمال کا نمونہ ہے،

خط نستعلیق کے دوسرے باکمال اساتذہ مولانا میر علی ہروی، مولانا جعفر تبریزی، مولانا اظہر مولانا محمد اوبہی، مولانا سلطان علی مشہدی، میر حسین کلنگی، مولانا عبدالرحیم، میر عبداللہ نظامی وغیرہ تھے، خط تعلیق کے ماہروں میں مولانا عبدالحئی، منشی ابوسعید مرزا، مولانا ابراہیم استرابادی، منشی محمد جمال الدین قزوینی وغیرہ تھے، اکبر کا میر منشی اشرف خاں اس خط کے لکھنے میں ید طولیٰ رکھتا تھا،[۱]

ان خوشنویسوں کے علاوہ بہت سے ایسے خطاط تھے جو دوسرے رسم الخط مثلاً ثلث، توقیع، محقق، ریحان، رقاع اور غبار کے لکھنے میں بہت مشاق تھے (دیکھو آئین اکبری ص؟)

مدارس — اکبر نے علم کی نشر و اشاعت کے لیے متعدد مدارس قائم کئے، آگرہ میں ایک مدرسہ قائم کیا جس میں تعلیم و تعلم کے لیے چلپی بیگ نام ایک عالم کو شیراز سے بلایا، (اکبر نامہ دفتر اول) فتحپور سیکری میں پہاڑی کے اوپر ایک بہت بڑا مدرسہ قائم کیا جس کے مقابلہ میں کوئی سیاح کسی دوسرے مدرسہ کا نام نہیں بتا سکتا تھا،[۲] ان تعلیم گاہوں کے علاوہ بہت سے ایسے بھی مدارس تھے جن کو امراء اور دوسرے لوگوں نے قائم کئے، مثلاً دہلی میں ماہم بیگم کا مدرسہ جو خیر المنازل کے نام سے موسوم تھا، ابوالفضل کا مدرسہ جو فتح پور سیکری میں قائم تھا، پھر عبدالرحیم خانخاناں کے مختلف مدارس تھے، ان کے ماسوا بہت سے معلمین اور علماء اپنے اپنے مقامات پر علوم و فنون کی ترقی اور افراد قوم کی تعلیم و تربیت میں مصروف تھے، اور ان کی اعانت شاہی دربار سے برابر ہوتی رہتی تھی، تاریخ بدایونی میں ان مدرسین کی تفصیلات درج ہیں، ہم طوالت

---

[۱] آئین اکبری ص؟، [۲] آئین اکبری، ذکر دار الخلافہ صوبہ آگرہ،

کے خیال سے نظر انداز کرتے ہیں،

مگر جو چیز اس سلسلہ میں قابل غور ہے وہ یہ ہے کہ اکبر نے بچوں کی تعلیم کے لیے بعض ایسے طریقے ایجاد کیے تھے جو آج ابتدائی تعلیم کے جدید طریقوں کے بالکل مشابہ تھے۔ فارسی حروف بچوں کے ذہن نشین کرانا آسان نہیں، خصوصاً ہندو بچوں کے لیے تو اور بھی دشوار تھا، کیونکہ ان کی تمام تحریریں بائیں سے داہنے جانب لکھی جاتی ہیں، چنانچہ حروف آموزی کے طریقہ کو سہل بنانے کے لیے اکبر نے ہدایت دی کہ پہلے استاد بچوں کو مفرد حروف پہچنوا دے، پھر اعراب اور مرکب حروف، پھر چھوٹے چھوٹے جملے، اس کے بعد اشعار اور طویل عبارتیں، یہ طریقۂ تعلیم کامیاب ثابت ہوا اور لڑکے جو برسوں میں سیکھتے وہ مہینوں میں حاصل کر لیتے، آئین اکبری کی عبارت ہے:

بفرمودۂ گیتی خداوند حروف ابتث (ا ب ت ث) را بہ نویسند و دیگرگون پیکر را بدانسان نگارند نخست بصورت و نام آشنا گردند و دو روز بیش نکشد کہ از نقوش حروف پیوستہ آگہی برگیرد، و چوں ہفتہ بدیں دریافت تنومندی یابد و لختی نظم و نثر آشنا رود و نیایش ایزدی و اندرز گزاری جدا نگاشتہ در آموزند، و کوشش رود کہ ہر ایک را خود بشناسد و اندکے استاد دستگیری کند و چندے ہر روز یک مصرع یا یک بیت بانجام رساند، در کمتر زمانے سواد خوانی روشنی پذیرد و آموزگار ہر روزہ از پنج چیز آگہی برجوید شناسائی حروف، الفاظ، مصرع، بیت، پیشین خواندہ بدیں روش آنچہ بسالہا آموختنی بماہے بروز کشید و جہانے بشگفت در آمد،[1]

ابو الفضل نے ان مختلف علوم و فنون کی فہرست بھی دی ہے، جو اس زمانہ میں پڑھائے جاتے تھے، اور وہ حسب ذیل ہیں، اخلاق، حساب، سیاق، فلاحت، مساحت، ہندسہ، نجوم، رمل، تدبیر منزل، سیاست مدن، طب، منطق، طبعی، ریاضی، الٰہی، تاریخ، بیاکرن، بیدانت، پاتنجل، یہ گویا اعلیٰ تعلیم کا نصاب تھا،[2]

۱؎ آئین اکبری ص ۱۴۳
۲؎ ایضاً ص ۵۳

۴ سال ۔ ۴ ماہ ۴ روز

جہانگیر

جہانگیر دعاؤں سے پیدا ہوا، حوصلوں اور تمناؤں میں پلا اور ناز و نیاز کے ساتھ بڑھا، ہوش سنبھالا تو اپنے کو علم و کمال کے گہوارہ میں پایا، جب چار سال چار مہینے اور چار روز کا ہوا، تو علم پرور باپ نے اس کے رسم مکتب کی تقریب انجام دی[۱]، اور ملک الشعراء فیضی اور مولانا میر کلاں ہروی محدث کو اس کی تعلیم کے لیے مامور کیا، قطب الدین خان آتکہ، اور عبدالرحیم خانخاناں اس کے اتالیق مقرر ہوئے، مولانا علی احمد نشانی بھی اس کے استادوں میں تھے، یہ ہیئت، طبیعیات، املاء انشا اور خطاطی میں اپنی نظیر آپ تھے[۲]، جہانگیر نے چہل حدیث سید صدر جہاں سے پڑھی[۳]، ایسے استادوں اور اتالیقوں کے فیض تعلیم کا جو خوشگوار نتیجہ ہونا چاہیے تھا وہ ہوا، وہ علم و سخن کے آسمان پر ماہتاب بن کر چمکا،

عبدالرحیم خانخاناں سے اس نے ترکی زبان سیکھی، وہ خود لکھتا ہے کہ "باوجودیکہ میں نے ہندوستان میں پرورش پائی ہے، لیکن ترکی زبان کے بولنے اور لکھنے سے عاری نہیں ہوں"، تزک بابری کے آخر میں کچھ اجزا ترکی زبان میں لکھ کر اضافہ کئے ہیں،

فارسی زبان کا وہ ایک بے مثل انشا پرداز تسلیم کیا جاتا ہے، اس کا علمی شاہکار خود اس کی تزک ہے، جو سادگی، صفائی، بے تکلفی، بے ساختگی اور قادر الکلامی کے لحاظ سے بے بدل ہے، مولانا شبلی کی رائے ہے "اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ واقعات کو ایسے بے تکلف

۱؎ طبقات اکبری جلد دوم ص ۲۶۱ ۔ ۲؎ بدایونی جلد سوم ص ۱۴۳ ۔ ۳؎ مآثر الکرام جلد دوم ص ۹۶ ۔

برجستہ اور دلآویز طریقہ سے ادا کرتا ہے، کہ بڑے بڑے انشا پرداز نہیں کر سکتے'' وہ جب کسی جنگ کی ہنگامہ آرائیوں کی تصویر کھینچتا ہے تو ہم میدان کارزار میں کھڑے نظر آتے ہیں، جب کسی جشن کی چہل پہل یا شبستان عیش کا نقشہ کھینچتا ہے تو آنکھوں کے سامنے اس کی ساری رنگینیاں اور سرمستیاں آ جاتی ہیں، جب وہ کسی علمی مسئلہ پر بحث کرتا ہے تو اس کے ہر پہلو کو نمایاں کر دیتا ہے، جب وہ کسی مقام کا ذکر کرتا ہے تو ایک محقق جغرافیہ داں کی طرح اس کے سارے معلومات فراہم کر دیتا ہے، جب ایک شہر کی تاریخ اور وہاں کے لوگوں کے رسوم و عادات کو تحریر کرتا ہے، تو ایک مورخ کی شان میں نظر آتا ہے، وہ جب پھولوں، پھلوں، پرندوں اور جانوروں کی جزوی تفصیلات کو بیان کرتا ہے، تو نہ صرف زبان کا لطف قائم رکھتا ہے بلکہ نباتات اور حیوانات کے ماہر ہونے کا ثبوت بھی دیتا ہے، یہاں چند مثالیں ملاحظہ ہوں،

سنہ ۱۶۱۲ء میں عثمان خان افغانی نے بنگالہ میں بغاوت کا علم بلند کیا، اس کے استیصال کے لیے جہانگیر نے شاہی لشکر بھیجا، اس جنگ کی جو قلمی تصویر اس نے کھینچی ہے، وہ یہ ہے:

در کنار نالہ کہ زمین آن تمام چہلہ و دلدل بود، جائے جنگ قرار داد، روز یکشنبہ ۹ محرم شجاعت خاں ساعت جنگ اختیار نمودہ افواج قاہرہ را مقرر ساخت کہ ہر یک بجا و مقام خود رفتہ آمادۂ جنگ باشد۔ عثمان در آن روز قرار جنگ با خود نہ دادہ بود، چون شنید کہ لشکر ہائے پادشاہی مستعد گشتہ آمدہ اند، ناچار او ہم سوار شدہ بہ کنار نالہ آمد، و سوار و پیادۂ خود را در برابر افواج منصورہ باز داشت، چون ہنگامۂ جنگ گرم گشت و فوج بہ فوج رو بروئے خود متوجہ گردید، در ین مرتبہ اول آن جاہل خیرہ سر فیل ستہ جنگی خود را پیش انداختہ بہ فوج ہراول ایلچی تاد، بعد از زد و خورد بسیار از سرداران ہراول سید عظم بارہہ و شیخ اچھے با برہہ شہادت ہمی رسند، سردار برانغار افتخار خان ہم در ستیز آویزہ تقصیر

نہ کردہ جان خود را نثار می نماید، و جمعی کہ با او بودند، آنقدر تلاش می کنند کہ پارہ پارہ می شوند، ہمچنان گروہ جیرا قمار کشور خان داد مردی و مردانگی دادہ خود را فدائے کار صاحب می سازد، با آنکہ تیرہ بختان نیز بسیاری زخمی و کشتہ شدہ بودند، آن مدبر حساب لشکریان را از روے دانستگی و فہمیدگی بخاطر می آورد و مشخص خود می سازد کہ سرداران ہراول و جیرا قمار و جیرا قمار کشتہ شدند، ہمین قول ماندہ از کشتہ شدن و زخمی گشتن جمعیت خود پروا نکردہ در ہمان گرمی بر قول می تازد و درین جانب پسر و برادران و خویشان شجاعت خان و دیگر بندہ ہا ماہ بران گرامان گرفتہ بر مثال شیران و پلنگان بہ پنجہ و دندان تلاش می کردند، چنانچہ بعضے درجۂ شہادت یافتند، و جمعی کہ زندہ ماندند زخمہاے منکر داشتند، درین وقت فیل مستی گجپت نام کہ فیل اول او بودہ بر شجاعت خان می دواند شجاعت خان دست بر برچھ بردہ بر فیل میزند، آنطور فیل مستی را از برچھ چہ پروا است، دست بہ شمشیر بردہ و شمشیر پے درپے می زند، از ان ہم چہ محابا بعد از ان جمدھر کشیدہ و جمدھر می رساند، با آن ہم برنمی گردد و شجاعت خان را با اسپ زیر می کند، بمجرد از اسپ جدا شدن، جہانگیر شاہ گفتہ بر می جہد و جلودار او شمشیر و دستی بر دو سنہاے فیل رسانیدہ و چون فیل بزانو در می آید، اتفاقاً جلودار فیلبان را از بالاے فیل زیر می کشد، و ہمان جمدھر کہ در دست داشت، درین پیادگی بنوعے بر خرطوم و پیشانی فیل می زند، کہ فیل از الم آن فریاد زنان بر می گردد، و چون زخمہا بسیار داشت بہ فوج خود رسیدہ می افتد و اسپ شجاعت خان سالم بر می خیزد و در حینیکہ سوار می شد، آن مخذولان فیل بر علمدار او می دوانند و علم او را با اسپ زیر می کنند واز آنجا شجاعت خان نعرۂ مردانہ کشیدہ علمدار را خبر می سازد و می گوید کہ مردانہ باش من زندہ ام و دریاے علم درین وقت تنگ ہرکس از بندہ ہاے درگاہ حاضر بودند، دست بہ تیر و جمدھر و شمشیر بردہ

بر فیل می دوند، و شجاعت خان هم خود را رسانیده، به علمدار نهیب می دهد، که بر خیز و اسپ
دیگر بجهت علمدار حاضر ساخته، او را سوار می سازد و علمدار علم را برافراخته بجای خود می ایستد
در اثنای این گیرودار تفنگی بر پیشانی آن مقهور می رسد که زننده آن را هرچند تفحص کردند، ظاهر نشد
بمجرد رسیدن، این تفنگ از آن گرمی باز آمده می داند که ازین زخم جان بری نیست، تا
دو پهر باوجود چنین زخمی منکر مردم خود را به جنگ ترغیب می نمود، معرکه قتال و جدال گرم بود
بعد از آن غنیم رو گردانید، و افواج قاهره سر در پی آنها می نهند، و زده زده آن مخذولان
را در محلی که دایره کرده بودند، در می آورند، آن مخذولان به تیر و تفنگ مردم را نگاه داشته
نمی گذارند که مردم پادشاهی بجا و مقام آنها در رانیده چون ولی برادر عثمان و ممریز پسر او
و دیگر خویشان و نزدیکان او بر زخم عثمان مطلع می شوند بخاطر می گذرانند که ازین زخم خود
او را خلاصی میسر نیست، اگر ما همچنین شکسته و ریخته به قلعه خود رویم یک کس زنده نخواهد رسید،
صلاح درین است که امشب که درهمین جا که دایره کرده ایم باشیم و آخر شب فرصت جسته، خود را به
قلعه خود رسانیم دو پهر از شب گذشته عثمان بجهنم واصل می گردد...... الخ[1]

وہ عیش و نشاط کی بزم کی تصویر بھی اسی جوش و خروش کے ساتھ کھینچتا ہے، تخت نشینی
کے بعد پہلے نوروز کے جشن کا مرقع اس طرح سج کر تیار کرتا ہے،

شب سہ شنبہ یازدہم ذیقعدہ سنہ ۱۰۱۴ ہزار و چہار دہ صبح کہ محل فیضان نور است حضرت
نیر اعظم از برج حوت بخانہ شرف و خوش حالی خود کہ برج حمل باشد، انتقال فرمود چون این
نوروز از جلوس ہمایون بود، فرمودم کہ ایوانہای دولتخانہ خاص و عام بدستور زمان
والد بزرگوارم در اقمشہ نفیسہ گرفتہ، آیینہ در غایت زیب و زینت بستند، و اندرون

[1] تزک جہانگیری صفحہ ۴-۱۳۰، نولکشور پریس۔

نوروز تا نوزدہم، درجۂ حمل کہ روز شرف است خلائق داد عیش و کامرانی دادند، اہل ساز و نغمہ از ہر طائفہ و ہر جماعت جمع بودند، لولیان رقاص و دلبران ہند کہ بہ کرشمہ دل از فرشتہ می ربودند، ہنگامۂ مجلس را گرم داشتند، فرمودم کہ ہر کس از کیفیات و مغیرات، آنچہ می خواستہ باشند بخورد، منع و مانعی نباشد۔"

ساقی بنور بادہ بر افروز جام ما — مطرب بگو کہ کار جہان شد بکام ما[1]"

تخت نشینی کے بارہویں سال شعبان کی چودہویں تاریخ کو نورجہاں نے ایک مجلس جشن ترتیب دی، اس کا حال جہانگیر اس طرح لکھتا ہے:-

"آخر ہائے روز پنجشنبہ بست و ششم موافق چہاردہم شہر شعبان کہ شب برات بود، در یکے از منازل و عمارات محل نورجہاں بیگم کہ درمیان تالابہائے کلان واقع است، مجلس جشن نمودم، و امرا و مقربان را دریں مجلس کہ ترتیب دادہ بیگم بود طلب داشتہ حکم کردم کہ بردم پیالہ از اقسام کیفیات بہ مقتضائے خواہش ہر کس بدہند بسیارے پیالہ اختیار نمودند، فرمودم کہ ہر کس کہ پیالہ بخورد بہ مثل منصب و حالت خود نشیند، و اقسام کبابہا و میوہ ہائے لطیف گزک مقرر شد کہ در پیش ہر کس بنہند، عجب مجلسے منعقد گشت، در آغاز شام بر اطراف تال و عمارات فانوسہا و چراغہا روشن ساختہ، چراغانے بہم دست داد، کہ تا ایں رسم را معمول ساختہ اند، شاید در ہیچ جا مثل ایں چراغانے نشدہ باشد، جمیع چراغہا و فانوسہا عکس در آب انداختہ بنوعے بہ نظر می آمد، کہ گویا تمام صحن ایں تالاب یک میدان آتش است، بسیار شگفتہ مجلسے گذشت و پیالہ خواران زیادہ از حوصلہ طاقت پیالہ تناول نمودند۔"

[1] تزک جہانگیری، ص ۲۳۳۔

دل افروز بزمے شد آراستہ	بخوبی بدانسان کہ دل خواستہ
فگندند درپیش ایں سبز کاخ	بساطے چو میدان ہمت فراخ
زمیں نکہت بزم می رفت دور	فلک نافہ مشک بود از بخور
شدہ جلوہ گر تا زنیان باغ	رخ افروختہ ہر یکے چون چراغ[51]

وہ دقیق فلسفیانہ اور مذہبی مسائل کو اس سادگی، اختصار اور حسن وخوبی سے لکھتا ہے کہ دوسرے اہل قلم شاید صفحے کے صفحے سیاہ کرنے کے بعد بھی وہی کامیابی حاصل نہیں کر سکتے، وہ ہندو پنڈتوں کو بتانا چاہتا ہے کہ حق تعالی کی ذات مقدس تجسم و چون وچگونگی سے منزہ ہے، تو لکھتا ہے :-

روزے از پنڈتان کہ عبارت از دانایان ہنود است پرسیدم کہ اگر بنائے دین شما بر فرود آمدن ذات مقدس حق تعالی است در دہ پیکر مختلف بطریق حلول آن خود بزد ارباب عقل مردود است و این مفسدہ لازم دارد، کہ واجب تعالی کہ مبرا از جمیع تعینات ست صاحب طول و عرض و عمق بودہ باشد، و اگر مراد ظہور نور الہی است درین اجسام آن خود در ہمہ موجودات مساوی است، در این دہ پیکر مخصوص نیست و اگر مراد اثبات صفتے از صفات الہی ست، درین صورت ہم تخصیص درست نیست زیراکہ در ہر دین و آئین صاحبان معجزات و کرامات ہستند کہ از دیگر مردمان زمان خود بدانش و فراست ممتاز بودہ اند، بعد از گفت و شنود بسیار و رد و بدل بے شمار بخدائی خدائے منزہ از جسم و چون و چگون معترف گشتند و گفتند کہ چون اندیشہ ما در ادراک ذات مجرد ناقص است بے وسیلہ صورتے راہ بمعرفت او نمی بریم و این دہ پیکر را وسیلہ شناخت و معرفت خود ساختہ ایم ، پس گفتم کہ این

[51] تزک جہانگیری ص ۱۹۱ ، نولکشور پریس،

این پیکرہائے شما را وسیلۂ مقصود و بہ معبود توانند بود"[۵]

وہ جب پھولوں کا ذکر کرنے لگتا ہے تو نباتات کے طالب العلم اپنی واقفیت میں نئی معلومات کا بیش قیمت اضافہ کر سکتے ہیں، آگرہ کے شاہی باغ گل افشاں کے پھولوں کا ذکر اس طرح کرتا ہے:

اول گل چنپہ گلی ست در نہایت خوشبوئے و لطافت بہیات گل زعفران لیکن رنگ چنپہ زرد مائل بسفیدی ست، درخت آن در غایت موزونی ست و کلان و پربرگ و شاخ و سایہ دار می شود، ایام گل یک درخت باغے را معطر دارد، و از آن گذشتہ گل کیوڑہ است کہ ہیئت و اندام غیر مکرر است، بوئے او در تندی و تیزی بہ درجہ ایست، کہ از بوئے مشک ہیچ کمی ندارد، دیگر رائے بیل کہ در بو از عالم یاسمین سفید است، غایتاً برگہایش دو سہ طبقہ بر روئے ہم واقع شدہ، دیگر گل مولسری است، کہ درخت آن نیز بسیار خوش اندام و موزون و سایہ دار است، و بوئے گل آن در نہایت ملایمت، دیگر گل سیوتی کہ از عالم گل کیوڑہ است، غایتاً کیوڑہ خاردار است، و سیوتی خار ندارد، رنگ آن بزردی مائل است و کیوڑہ سفید رنگ است، از این گلہا و از گل چنبیلی کہ یاسمن سفید ولایت است، روغن ہا خوشبوئی سازند،[۶]

جانوروں کی تصویر جب وہ کھینچتا ہے، تو وہ اتنی صاف اور واضح ہوتی ہے کہ علم الحیوانات کے ماہرین اس سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں، ۱۰۲۱ھ میں مقرب خان کھمبائت سے ایک عجیب و غریب جانور ساتھ لایا، اس کا بیان جہانگیر جس طرح کرتا ہے، وہ انشا پردازی، اور لطافت بیان کا اعلیٰ نمونہ ہے، ملاحظہ ہو:

یکے از جانوران در جثہ از طاؤس مادہ کلان تر، و از نر قدرے خوردتر گاہے کہ در مستی جلوہ نماید، دم خود را و دیگر پرہا را طاؤس آسا پریشان می سازد، و برقص در می آید، سر و گردن و زیر حلقوم او ہر ساعت برنگے ظاہر می گردد، وقتیکہ در مستی ست سرخ سرخ است، گویا کہ تمام ل

۶ توزک جہانگیری ص ۱۵۱ نولکشور، ۵ دیکھئے ص ۱۴۳

بہ مرجان مرصع ساختہ اند، و بعد زمانے ہمیں جا ساکن می شود، و بہ طریق بیضہ بہ نظر در می آید،
بوقلموں آسا ہر زمان بہ رنگے دیگر دیدہ می شود، و دو پارچہ گوشتے کہ بر سر دارد، بتاج خروس
مشابہ است، غریب این است کہ در ہنگام مستی پارچہ گوشت مذکور بطریق خرطوم از بالاے
سر او تا یک وجب می آویزد و باز کہ آن را بالا می کشد، چوں شاخ کرگدن بر سر او مقدار دو
وانگشت نمایاں می گردد، اطراف چشم او ہمیشہ فیروزہ گون ست۔[1]

جہانگیر جب کسی جگہ کے کیف پرور اور خمار رنگین مناظر سے متاثر ہوتا تھا، تو اپنے کیفیات و
جذبات کو اسی انداز سے تحریر میں لاتا تھا، کشمیر کو دیکھا تو اپنے کیف و مستی کا اظہار اس طرح کرتا ہے:

کشمیر باغے است ہمیشہ بہار یا قلعہ ایست آہنیں حصار، پادشاہاں را گلشنے است عشرت
افزا و درویشاں را خلوت کدۂ دلکشا، چمنہاے خوش و آبشارہاے دلکش از شرح و بیان افزوں،
آبہاے رواں و چشمہ سارہاے از حساب و شمار بیروں، چندانکہ نظر کار کند سبزہ است و آب
رواں، گل سرخ و بنفشہ و نرگس خود رو صحرا صحرا، انواع گلہا و اقسام ریاحین از آں بیشتر است
کہ بشمار در آید، در بہار جاں نگار کوہ و دشت از اقسام شگوفہ مالا مال، در و دیوار و صحن و بام
خانہا از مشعل لالہ بزم افروز، و جگہاے سطح و سر بہ گلہاے میرو تا چہ گوید،

شدہ جلوہ گر تا ز نیسان باغ — رخ آراستہ ہر یکے چوں چراغ
شدہ مشک بو غنچہ در زیر پوست — چوں تعویذ مشکیں بباز وے دوست
غزل خوانی بلبل صبح خیز — تمناے مے خوارگان کردہ تیز
بہر چشمہ منقار ربط آب گیر — چو مقراض زریں بقطع حریر
بساط گل و سبزہ گلشن شدہ — چراغ گل از باد روشن شدہ

[1] تزک جہانگیری بحوالہ مقالات شبلی تنقیدی جلد چہارم ص ۱۰۴ - ۱۰۵

بنفشہ سر زلف را خم زدہ گرہ در دل غنچہ محکم زدہ[1]

جب وہ سوگوار اور مغموم ہوتا ہے، تو نہایت دردناک پیرایہ میں اپنے غم کا اظہار کرتا ہے
خسرو کی ماں اس کی باغیانہ اور ناشایستہ حرکتوں سے عاجز آکر افیون کھا لیتی ہے، اس کی موت پر
جہانگیر جس طرح ماتم کرتا ہے وہ ملاحظہ ہو:-

از خوبی ہا و نیکذاتی ہاے او چہ می نویسم عقلے بکمال داشت، و اخلاص او بمن در درجہ
بود کہ ہزار پسر و برادر را قربان یک موے من می کرد، مکرر بہ خسرو مقدمات نوشتہ و اورا
دلالت بہ اخلاص و محبت من می کرد، چون دید کہ ہیچ فائدہ ندارد ...... از غیرتے کہ لازمہ طبیعت
راجپوتانی است، خاطر بر مرگ خود قرار دادہ ...... روز بست و ششم ذی الحجہ ۱۰۱۳ھ افیون بسیار
در عین سوزش دماغ خوردہ در اندک زمانے درگذشت ...... از فوت او بنا بر تعلقے کہ داشتم
ایامے برمن گذشت کہ از حیات و زندگانی خود ہیچ گونہ لذتے نداشتم چہار شبانہ روز کہ سی و دو پہر
باشد از غایت کلفت و اندوہ چیزے از ماکول و مشروب دار و طبیعت نگشت، چون این قصہ بہ
والد بزرگوارم رسید دلاسا نامہ مرحمت بدین مرید فدوی صادر گشت و خلعت
و دستار مبارک کہ از سر برداشتہ بودند، ہمایون طور بستہ بجہت من فرستادند، این عنایت
آبے بر آتش سوز و گداز من زدہ اضطراب و اضطرار مرا فی الجملہ قرارے و آرامی بخشید[2]

جہانگیر کی یہ قادر الکلامی صرف نثر ہی تک محدود نہیں تھی، بلکہ نکتہ سنج واقع ہونے کے ساتھ
وہ شعر و شاعری کا بھی اعلیٰ ذوق رکھتا تھا، بقول مولانا شبلی "سلسلۂ تیموریہ میں یوں تو ہر فرمانروا سخن فہم و
ادا شناس گذرا ہے لیکن جہانگیر اس فن میں اچھا درک رکھتا تھا، وہ فطرۃً محبت کیش تھا، اور ازل سے درد مند
دل لے کر آیا تھا، اس کا اثر اگرچہ اس نے آئین و نظام سلطنت میں چنداں نمایاں نہ ہونے دیا، یہاں تک کہ

---

[1] تزک جہانگیری ص ۲۲۰ ، [2] ص ۵۲ ، ایضاً ص ۲۰۷

تزک میں نور جہان کا جہان جہان ذکر آیا مطلق نہیں معلوم ہوتا کہ یہ نام اس کی زبان سے لذت لے کر نکلتا ہے، تاہم عشق اس کا خمیر تھا، اور چونکہ فیضی کا شاگرد رشید تھا، اس لیے شعر و شاعری کا نکتہ دان اس سے بڑھ کر کون ہو سکتا تھا۔" (شعرالعجم حصہ سوم ص۱۹۵)

وہ خود شاعر تھا، چنانچہ مندرجۂ ذیل اس کی ایک غزل ہے، جو سلاست اور رنگینی بیان کے لحاظ سے خوب ہے،

من چون کنم که تیر غمت بر جگر رسد — تا چشم نارسیده دگر بر دگر رسد
مستانه می خرامی و دست تو عالمی — اسپند می کنم که مبادا نظر رسد
در وصل دوست مستم و در هجر بیقرار — داد از چنین غمی که مرا سر بسر رسد
مدهوش گشته ام که بپویم ره وصال — فریاد ازان زمان که مرا این خبر رسد
وقت نیاز و عجز جهانگیر هر سحر — امید آنکه شعلهٔ نور و اثر رسد[1]

مصنف مخزن الغرائب نے جہانگیر کے جو چند اشعار نقل کئے ہیں، وہ یہ ہیں:

مانا که به برگ گل نوشتیم — شاید که صبا بدو رساند

رباعی

هر کس بضمیر خود صفا خواهد داد — آئینهٔ خویش را جلا خواهد داد
هر چه که شکسته بود و بشکن گیر — بشنو که همین کار سر خدا خواهد داد

رباعی

ای آنکه غم زمانه پا کت خورده — اندوه دل و سود سر ناکت خورده
مانند قطرهاست باران زمین — جا گرم نکرده که خاکت خورده[2]

---

[1] تزک جہانگیری ص... [2] مخزن الغرائب قلمی نسخہ ...

وہ اکثر اساتذہ کے مقابلہ میں شعر کہتا، ایک بار امیر الامرا کا یہ شعر اس کے سامنے پڑھا گیا،

یک ذرہ مسیح از سر باکشتگان عشق ۔۔۔ یک زندہ کردن تو بصد خون برابر است

جہانگیر نے فوراً یہ شعر موزون کیا،

از من عتاب و رنج کریم بے تو یک نفس ۔۔۔ یک دل شکستن تو بصد خون برابر است

مولانا علی احمد نشانی نے بھی اس پر ایک شعر کہا، جو جہانگیر کو بہت پسند آیا،

اے محتسب ز گریۂ پیر مغان بترس ۔۔۔ یک خم شکستن تو بصد خون برابر است[2]

ایک دفعہ عبد الرحیم خان خانان نے مولانا جامی کی ایک غزل پر غزل لکھی جس کا ایک مصرع یہ ہے

ہر یک گل زحمت صد خار می باید کشید

جہانگیر کو یہ مصرع پسند آیا اس نے فی البدیہہ مطلع کہا،

ساغرے بر رخ گلزار می باید کشید ۔۔۔ ابر بسیار است مے بسیار می باید کشید[1]

ماوراء النہر کے درویش صفت بزرگ خواجہ ہاشم سے جہانگیر خاص عقیدت رکھتا تھا،
ایک بار خواجہ مذکور کے یہاں اس نے ایک ہزار مہر جہانگیری اور اسی کے ساتھ اپنی کہی ہوئی
مندرجۂ ذیل رباعی بھیجی،

اے آنکہ مرا مہر تو بیش از بیش است ۔۔۔ از دولت یاد بود تا اے درویش است

چندانکہ ز مہر دوات و لم شاد نشود ۔۔۔ شادیم ز آنکہ لطف از حد بیش است

اسی کے ساتھ جہانگیر نے دربار میں فرمایش کی کہ اسی مضمون کی اور رباعیاں کہہ کر طبع آزمائی کیجائے
حکیم مسیح الزمان[3] نے ایک رباعی کہی، جو جہانگیر کو بہت پسند آئی، وہ رباعی یہ تھی:-

---

۱ تزک جہانگیری ص ۱۱۲ ۲ اقبال نامہ جہانگیر و تزک جہانگیری ص ۲۳۵ ۳ نام ضیاء الدین کاشان سے ہندوستان آیا، علم طب کا ماہر تھا، اس لیے جہانگیر نے مسیح الزمان کا خطاب دیا، شاعر بھی تھا تذکرہ نصرآبادی میں اسکے بہت سے اشعار منقول ہیں ص ۴۳

دایم اگرچہ شغلِ شاہی در پیش ہر لحظہ کنیم یاد درویشاں پیش
گر شاد شود ز ما دلِ یک درویش آں را شمریم حاصلِ شاہی خویش

جہانگیر نے خوش ہو کر حکیم مذکور کو ایک ہزار مہر انعام میں دیا۔[1]

سنہ ۶ جلوس شاہی میں جہانگیر موضع سمونگر شکار کے لیے گیا۔ اسی شکارگاہ میں ایک رات اس نے یہ شعر کہا:-

بود بر آسماں تا مہر را نور مبادا عکس او از چتر شہ دور

اور قصہ خوانوں کو تاکید کی کہ سلام و صلوٰۃ بھیجتے وقت یہ شعر بھی پڑھا جائے۔[2]

ایک شکارگاہ میں جہانگیر کے تیر نے ایک کالے ہرن کا شکار کیا وہ گرا تو غایت خوشی میں جہانگیر چلا اٹھا،

چیتہ پادشاہ زد کالہ

طالب آملی بھی ساتھ تھا، اس نے برجستہ کہا

گشت صحرا ز خون پر از لالہ

جہانگیر نے مسرور ہو کر پانچ ہزار روپے انعام طالب کو دیے۔ (تذکرہ سرخوش قلمی نسخہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی)،

ایک بار جہانگیر نے پانی پینے کو مانگا، مٹی کے کوزہ میں پانی لایا گیا، کوزہ بہت ہی نازک پانی لانے والے کے ہاتھ میں جنبش ہوئی تو کوزہ ٹوٹ گیا، جہانگیر نے اپنے ہم صحبت نواب قاسم خان یعنی نور جہاں کی حقیقی بہن منیجہ بیگم کے شوہر کی طرف دیکھ کر فوراً کہا

کاسہ نازک بود و آب آرام نتوانست کرد

قاسم خاں نے بھی فی البدیہہ عرض کیا،

---

[1] تزک جہانگیری ص ۱۰۱ [2] ایضاً ص ۱۰۱

دید حالم را و چشمش ضبط اشک خود نکرد   کاسہ نازک بود و آب آرام نتوانست کرد[۱]

سنہ ۱۲ جلوس میں سید عبد اللہ خان بارہہ شاہزادہ خرم کی یہ عرضداشت لے کر بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا کہ عادل خان، عنبر اور دکن کے تمام سرکشوں نے اطاعت اختیار کرلی ہے، جہانگیر یہ مژدہ سنکر نہایت خوش ہوا، اور شادیانے کے نقارے بجوائے، سید عبد اللہ خان کو سیف خان کا خطاب دیا، شہزادہ خرم کے لیے ایک لعل بے بہا بھجوایا، اور عادل خان کے نام فرمان جاری کیا، جس میں اپنا یہ شعر لکھ بھیجا،

شدی از التماس شاہ خرم   بفرزندی ما مشہور عالم[۲]

اس کے دوسرے سال عادل خان نے جہانگیر کی ایک تصویر کی درخواست کی، جہانگیر نے ایک لعل گراں بہا و لعل خاصہ کے ساتھ اس کو اپنی تصویر عنایت کی، اور اس پر یہ رباعی دست خاص سے لکھ دی،

اے سوئے تو دائم نظر رحمت ما   آسودہ نشین بسایۂ دولت ما

سوئے تو شبیہ خویش کردیم روان   تا معنی ما ببینی از صورت ما[۳]

سنہ ۱۴ جلوس میں جہانگیر کلانور میں مقیم تھا کہ خان عالم جو شاہ عباس کے پاس ایران قاصد بنا کر بھیجا گیا تھا، واپس آیا، جہانگیر اس کے ساتھ بہت ہی لطف و عنایت کے ساتھ پیش آتا تھا، جب اس کے نزدیک آنے کی خبر ہوئی تو اس نے اسے مندرجہ ذیل مطلع لکھ کر عطر جہانگیری کے ساتھ بھیجا،

بسویت فرستادہ ام بوئے خویش   کہ آرام تر زود تر سوئے خویش[۴]

جہانگیر کے شاعرانہ ذوق کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ وہ اپنے سکوں پر بھی اس کا اظہار

[۱] مرآۃ الخیال ص۳۱، [۲] تزک جہانگیری ص۱۹۵ [۳] ایضاً ص۲۴۲، [۴] ایضاً ص۲۸۵

چاہتا تھا، چنانچہ سو تولے، پچاس تولے، بیس تولے، اور دس تولے کی مہروں پر یہ بیت لکھی ہوئی تھی،

بخط نور بر زر کلک تقدیر رقم زد شاہ نور الدین جہانگیر

ان مصرعوں کے درمیان کی جگہ چھوڑ کر کلمہ اور دوسری طرف یہ بیت جس سے تاریخ بھی نکلتی ہے، منقش تھی،

شد چو خورزین سکہ نورانی جہاں آفتاب مملکت تاریخ آن

ایک دوسرے سکہ پر یہ شعر تھا،

روے زر را ساخت نورانی بہ رنگ مہر و ماہ شاہ نور الدین جہانگیر ابن اکبر بادشاہ

جب نور جہاں کا اقتدار ہوا تو سکہ پر یہ شعر ثبت کیا،

بحکم شاہ جہانگیر یافت صد زیور بنام نور جہان بادشاہ بیگم زر

جہانگیر کی سخن فہم اور ذوق شناس طبیعت کبھی یہ گوارا نہیں کرتی تھی، کہ اس کے سامنے شاعری میں کسی قسم کی بد مذاقی کی جائے، ایک دفعہ ایک شاعر نے جہانگیر کی مدح میں قصیدہ لکھکر پیش کیا، مطلع کا پہلا مصرع یہ تھا،

اے تاج دولت بر سرت از ابتدا تا انتہا

جہانگیر نے کہا عروض بھی جانتے ہو؟ شاعر نے کہا حضور نہیں، جہانگیر نے کہا اچھا ہوا، ورنہ تمھارے قتل کا حکم ہوتا، پھر مصرع کی تقطیع کرکے بتایا، کہ دوسرا رکن یوں آتا ہے "لت برسر" اور یہ سخت بے ادبی ہے،

مولانا شبلی تذکرۂ سرخوش سے شعر العجم حصہ سوم میں ایک اور واقعہ نقل کرتے ہیں کہ اس زمانہ میں تقی تخلص کا ایک شاعر تھا، جو قوم کا کلال تھا، کلالوں کی قوم شاہی دربار میں دربانی اور چاؤشی کے لیے مخصوص تھی، تقی نے نور جہاں بیگم کے توسل سے جہانگیر کے دربار میں شاعری

کی تقریب سے رسائی پیدا کرنی چاہی، جہانگیر نے کہا کہ ان لوگوں کا کام چاوشی اور سواری کا اہتمام ہے، ان کو شاعری سے کیا مناسبت لیکن نورجہاں کی خاطر عزیز تھی، اجازت دی، حسی نے یہ شعر پڑھا۔

حسی بگریہ سر ے وا دا ئے نصیحت گر   کنارہ گیر کہ امروز روز طوفان است

جہانگیر نے کہا دیکھا دہی اپنے پیشہ کی رعایت، دوسرے موقع پر پھر نورجہاں بیگم نے تقریب کی، حسی نے مطلع پڑھا:

من حی روم و برق زنان شعلۂ آہم   اے ہم نفسان دور شوید از سر راہم

جہانگیر نے ہنس کر کہا وہ اثر کہاں جا سکتا ہے۔[۵]

یہاں پر بے موقع نہ ہوگا کہ اگر ہم ان اشعار کا ذکر کریں جن کو جہانگیر نے خاص طور پر پسند کیا اور ان پر اپنی رائے ظاہر کی، تاکہ ناظرین کو اس کا صحیح مذاق معلوم ہو، مولانا شبلی لکھتے ہیں، کہ جہانگیر کا ذوق شاعری اس قدر صحیح تھا، جس قدر ایک بڑے نقاد فن کا ہو سکتا ہے، جس شاعر کی نسبت اس نے جو کچھ لکھ دیا ہے، اس سے بڑھ کر اس کے متعلق کہا نہیں جا سکتا،

ستلہ جلوس میں مانڈو (فتح پور) کے ایک تال کے قریب قرولش ہوا تو وہاں ایک ستون پر ایک رباعی لکھی ہوئی دیکھی، اس کے بارے میں لکھتا ہے:

درمیان تال نشیمنے از سنگ واقع است بر یکے از ستون ہا رباعی شخصے ثبت نمودہ بود

بنظر در آمد و مرا از جا در آورد، الحق از شعرہائے خوب است" رباعی

یاران موافق ہمہ از دست شدند   در دست اجل یگان یگان پست شدند

بودند تنک شراب در مجلس عمر   یک لحظہ ز ما پیشتر ک مست شدند

اس کے بعد فوراً ہی لکھتا ہے:

---

[۵] تذکرہ سرخوش در ذکر حسی، و شعر العجم حصہ سوم ص۹۰

دریں وقت رباعی دیگر ہم ازیں عالم شنیدہ شد، چون بسیار خوب گفتہ آن را نیز نوشتم"

رباعی

افسوس کہ اہل خرد و ہوش شدند — از خاطر ہمدمان فراموش شدند
آنانکہ بصد زبان سخن می گفتند — آیا چہ شنیدند کہ خاموش شدند[۵]

ایک بار سلطان قوام کے بیٹے حسینی کی ایک رباعی اس کے سامنے پڑھی گئی جو اس کو پسند آگئی ہو، اس نے تزک میں [illegible] نقل کیا ہے۔

کردے کہ تو از طرف دامان ریزد — آب از رخ سرمہ سلیمان ریزد
گر خاک درت بامتحان بفشارند — از دے عرق جبین شاہان ریزد

اس رباعی کو نقل کرکے وہ لکھتا ہے:۔

"معتمد خان دریں وقت رباعی خواند، مرا بغایت خوش آمد، در بیاض خود نوشتم۔"

رباعی

زہرم بفراق خود چشانی کہ چہ شد — خون ریزی و آستین فشانی کہ چہ شد
اے غافل از آنکہ تیغ ہجر تو چہ کرد — خاکم بفشار تا بدانی کہ چہ شد[۲]

یہ رباعی بابا طالب اصفہانی کی تھی۔

سلطان سنجر کے ملک الشعراء معزی کا ایک قصیدہ جو اس نے سلطان کی مدح میں لکھا تھا، اس کے سامنے پڑھا گیا جس کا مطلع یہ ہے:

اے آسمان سحر حکم روان تو — کیوان پیر بندۂ بخت جوان تو

اس مطلع کو سنکر وہ بہت محظوظ ہوا، اور اس قصیدہ کی تعریف تزک میں کرتا ہے، کہ

۱؎ تزک جہانگیری صفحہ ۳۶، نولکشور پریس ۲؎ ایضاً صفحہ ۲۶۹،

"بغایت سلیس وہموار گفتہ"

سعیدائے زرگر باشی نے اس قصیدہ کے تتبع میں ایک قصیدہ کہکر جہانگیر کی خدمت میں پیش کیا، جسکو اس نے پسند کیا، اس کی تعریف کرتے ہوئے مندرجہ ذیل اشعار تزک میں نقل کئے ہیں:[۱]

اے نہ فلک نمونہ از آستانِ تو — دورانِ پیر گشتہ جوان در زمانِ تو

بخشد دل تو فیض دگر چو سبب چو مہر — جانہا ہمہ فدائے دل مہربانِ تو

از باغ قدرت است فلک یک ترنج سبز — انداختہ بروئے ہوا باغبانِ تو

یارب چہ گوہری تو کہ افروخت در ازل — جانہائے قدسیان ہمہ از نور جانِ تو

بادا جہان بکام تو اے پادشاہ عہد — در سایۂ تو خرم شاہ جہانِ تو

اے سایۂ خدا ز تو پر نور شد جہان — بادا ہمیشہ نور خدا سائبانِ تو

ایک بار ایک ہندو شاعر نے جہانگیر کے سامنے ایک اچھوتے مضمون کی نظم پڑھی جس کا حاصل یہ تھا، کہ اگر آفتاب کے کوئی بیٹا ہوتا، تو کبھی رات نہ ہوتی، کیونکہ جب آفتاب چھپ جاتا، تو اس کا بیٹا اس کے بجائے عالم افروزی کرتا، خدا کا شکر ہے کہ آپکے والد کو خدا نے ایسا بیٹا دیا، کہ لوگوں نے ان کے انتقال کا غم نہ کیا، آفتاب کو رشک ہے کہ آپ کے طالع کی روشنی اور عدالت کے دور سلطنت میں کہیں رات نہیں، جہانگیر اس اچھوتے خیال کو سنکر بہت محظوظ ہوا، اور ایک ہاتھی انعام میں دیا، وہ لکھتا ہے:-

"این تازگی مضمون از شعرائے ہند کم بگوش رسیدہ، بہ جلدوی این مدح فیلے بادرحمت کردم"

جہانگیر کے حکم سے ان اشعار کا فارسی میں ترجمہ بھی کیا گیا، جو حسب ذیل ہیں:-

گر پسر داشتی جہان افروز — شب نہ گشتی ہمیشہ بودی روز

---

[۱] تزک جہانگیری ص۲۴۲، نولکشور پریس

زانکہ چون او نہفتہ افسر زر ـــــ بہ نمودی کلاہ گوشہ پسر

شکر کز بعد آن چنان پدرے ـــــ جانشین گشت این چنین پسرے

کز شنفاء گشتن آن شاہ ـــــ کس بہ ماتم نہ کرد جامہ سیاہ[۱]

جہانگیر کو طالب آملی کے مندرجۂ ذیل اشعار بہت مرغوب تھے،

زغارت چمنت بر بہار منتہا است ـــــ کہ گل بدست تو از شاخ تازہ ترماند

لب از گفتن چنان بستم کہ گوئے ـــــ دہان بر چہرہ زخمی بود و بہ شد

عشق در اول و آخر ہمہ ذوق است و سماع ـــــ این تب لیست کہ ہم پختہ و ہم خام خوش است

گر من بجائے جوہر آئینہ بودمے ـــــ رونما ترا بتو کے می نمودمے

دو لب دارم یکے در می پرستے ـــــ یکے در عذر خواہی ہائے مستے

جہانگیر کے اس انتخاب پر مولانا شبلی لکھتے ہیں، کہ "خود طالب اس سے اچھا انتخاب نہیں کرسکتا تھا۔"[۲]

ایران سے ملا محمد **صوفی** ماژندرانی ہندوستان آئے تو اپنے زہد، تقویٰ اور صوفیانہ ذوق کے ساتھ ساتھ شعر گوئی کے لیے بھی مشہور ہوئے۔ بتخانہ کے نام سے ایک بیاض ترتیب دی تھی جس میں ساٹھ ہزار اشعار تھے۔ ان کا ساقی نامہ بہت ذوق شوق سے پڑھا جاتا ہے جس کا ایک شعر یہ ہے:-

نمی ماند این بادہ اصلا بآب ـــــ تو گوئی کہ حل کردہ اند آفتاب

جہانگیر کو بھی ان سے ملنے کا شوق ہوا، وہ احمد آباد میں سکونت پذیر ہو گئے تھے، شاہی حکم کے بموجب سیف خان صوبہ دار گجرات نے جو خود بھی ملا صوفی کا معتقد تھا، ان کو دار السلطنت

۱۔ تزک جہانگیری ص ۹۵ ۲۔ شعر العجم حصہ سوم ص ۔ و تزک جہانگیری ص ۲۸۹

روانہ کیا، مگر راستہ ہی میں مالک حقیقی سے جا ملے، وفات کے وقت یہ رباعی کہی:

اے شاہ نہ تخت و نہ نگین می ماند   از بہر تو یک دو گز زمین می ماند

صندوق خود و کاسۂ درویشان را   خالی کن و پر کن کہ ہمین می ماند

جہانگیر نے یہ رباعی سنی تو اس پر رقت طاری ہو گئی (مآثر الامرا، جلد سوم ص۱۵۴)

جہانگیر کی خلوت و جلوت میں ساتھ رہنے والے بھی اس کے علمی ذوق سے متاثر ہوئے، ہم اس کے شہزادوں اور نور جہاں بیگم کی علم پروری کا ذکر آیندہ صفحات میں کریں گے، اس کے خسر یعنی نور جہاں کے باپ اعتماد الدولہ کو بھی ادب و انشاء سے ذوق تھا، مآثر الامرا جلد اول (ص۱۲۹) میں ہے:

"اعتماد الدولہ اگرچہ شعر نمی گفت اما تتبع شعر متقدمین بسیار کردہ، در انشا ید طولی داشت و شکستہ را متین و آبداری نوشت، و خوش محاورۂ رنگین صحبت شگفتہ او بود، و یا ندبسندگی و معاملہ فہمی نیک اندیش کار روا بود"

اس کے یہاں بھی شعر و شاعری کی مجلس گرم ہوا کرتی تھی، شعراء اس کے دربار میں قصیدے کہتے، اور انعام پاتے، حکیم عارف ایگی نے جس کا ذکر آگے آئے گا، اس کی شان میں حسب ذیل قصیدہ دلآویز انداز میں کہا تھا:

عارف نیاز بند از ان زلف تا بہ پیچ   تا بر تو نگذرد ہمہ ہر روز گار پیچ

بستان نو بہار جوانی بیست می   یعنی بموج بادہ بگیر از خمار پیچ

در حلقہ پیچ دارد زلف تو ہمچنانکہ   ہنگام خشم در گرہ چشم مار پیچ

آن اعتماد دولت کز راست بینی اش   از موج خشم جدا نشود از جو بیار پیچ

تا در زمانہ پیچ نماند بعہد تو   زان موج آبگیر کشد بر کنار پیچ[۱]

[۱] میخانہ ص۲۶

جہانگیر کہا کرتا تھا کہ اعتماد الدولہ کی صحبت ہزار مفرح یاقوتی سے بہتر ہوتی ہے، اعتماد الدولہ کے عالم نزع میں جہانگیر نور جہان کے ساتھ اس کے بستر مرگ کے پاس پہنچا تو نور جہان نے باپ سے جہانگیر کی طرف اشارہ کرکے پوچھا کہ آپ ان کو پہچانتے ہیں اعتماد الدولہ نے اسی حالت میں انوری کا یہ شعر پڑھا:

آنکہ نابیناے مادرزاد اگر حاضر شود — در جبین عالم آرایش بہ بیند بہترے

جہانگیر کا ہمزلف یعنی نور جہان کی سگی بہن منیجہ بیگم کا شوہر نواب قاسم خان بھی شاعر تھا، اس کا ذکر نور جہان کے سلسلہ میں بھی آئے گا، اسکی ایک غزل ہے،

می پرستم مردم چشم جائے آب آید برون — گر بگرید بلبل از چشمش گلاب آید برون

یک رہ اندر چشم من آید خیال او بخواب — کے ز ذوق آن دگر از چشم خواب آید برون

بسکہ میل ہمزبانی با تو دارد ہر کسے — گر ز شکل آئینہ پرسی جواب آید برون

ز اشتیاق ہم نشینی ہاے گوش دلکشت — بعد ازین ہمچون صدف از حباب آید برون

بسکہ قاسم پیش از مہر علی موسی رضا — سینہ اش گر بشگافی آفتاب آید برون

(ماثر جہانگیری ۱۹۸)

جہانگیر کا ندیم خاص محمد شریف تھا، جس کو اس نے معتمد خان کا خطاب دیا تھا، چنانچہ وہ خود کہتا ہے، (ماثرالامراء جلد سوم ص۴۳۱)

بدور شاہ جہانگیر خانی ارزان شد — شریفہ یا نوی مارفت و معتمد خان شد

جہانگیر کی تزک لکھنے میں بھی معاون رہا، تزک میں سترہویں جلوس کا کچھ حصہ، اٹھارہویں اور پھر انیسویں جلوس کا کچھ حصہ اسی کا نوشتہ ہے،

جہانگیر کے ایک دوسرے ندیم مرزا محمد ہادی نے تزک کا تکملہ لکھا، اور شروع میں دیباچہ بھی تحریر کیا، معتمد خان نے اقبال نامۂ جہانگیری کے نام سے تیموریوں کی تاریخ تین جلدوں میں لکھی

پہلی جلد میں تیمور سے ہمایوں تک کے حالات تھے، دوسری اکبری عہد کے واقعات پر مشتمل تھی، تیسری میں جہانگیر کے دور کی سیاسی تاریخ ہے، پہلی دو جلدیں مفقود ہیں، لیکن تیسری جلد بنگال ایشیاٹک سوسائٹی سے شائع ہوگئی ہے،

جہانگیر کے امراء میں بہت ہی قابل، بڑا علم دوست، دریا دل اور مشہور شعراء کا ہم پلہ مرزا غازی خان تھا، جو مرزا جانی بیگ حلیمی کا لڑکا تھا، اس کو فرزند کا خطاب اور ہفت ہزاری منصب عطا کرکے قندھار کا حاکم بنایا تھا، اور ٹھٹھ اور ملتان جاگیر میں دیے تھے، اس کے یہاں ارباب کمال کا اجتماع رہتا تھا، ملا مرشد بروجردی، ملا اسد قصہ خوان، طالب آملی اور میر نعمت اللہ وصلی نے اسی کے یہاں تربیت پائی، میخانہ میں ہے:

جوان خوشخوئی خوش روی کریمی بودہ، واکثر پاس خاطر ارباب معنی می داشتہ وبا آن

جماعت بے تکلفانہ سلوک می کردہ، مروتش بمرتبہ خوب وسخاوتش بحدی مطلوب بودہ،

مولانا شبلی کہتے ہیں کہ ایران سے جو اہل کمال ہندوستان کا رخ کرتے تھے، ان کی پہلی منزل اسی کا آستانہ ہوتا تھا، چنانچہ ماثرالامراء میں ہے کہ فغفوری گیلانی قندھار پہنچا تو غازی خان اس کے ساتھ بہت ہی لطف و کرم سے پیش آیا، مگر فغفوری کو بعض باتیں ناگوار ہوئیں، اس لیے لاہور کی طرف اٹھ کھڑا ہوا، غازی خان نے معذرت لکھ بھیجی، لیکن فغفوری نے قبول نہیں کیا،

غازی خان خود بھی بہت ہی بلند پایہ شاعر تھا، قندھار میں ایک شاعر وقاری تخلص رکھتا تھا، غازی خان نے اس تخلص کو ہزار روپے خلعت اور ایک گھوڑا دیکر خرید لیا، عالم شباب یعنی پچیس سال کی عمر میں اس کی وفات ہوئی، پھر بھی پانچ ہزار اشعار کا ایک دیوان چھوڑا، میخانہ میں اس کا ایک طویل ساقی نامہ منقول ہے، اسی سے مولانا شبلی نے اس کی بعض غزلوں کے حسب ذیل اشعار منتخب کیے ہیں:

در عہد تو مارا ہمہ با غیر خطاب است   سر پنجۂ مژگان و گریبان عتاب است

گریہ ام گر سبب خندۂ او شد چہ عجب   ابر ہر چند کہ گرید رخ گلشن خندد

کجاست یک دو سہ ہمدم کہ ہمچو موسیقار   نشستہ پہلوی ہم یہ کشیم آوازے

مولانا مرشد بروجردی نے اس کی شان میں بہت سے قصیدے کہے ہیں، ایک قصیدہ کے صلہ میں اس نے مولانا کو مرشد خان کا خطاب دیا، طالب آملی کا بھی ممدوح رہا، طالب کی مداحی تو عاشقی کی حد تک پہنچ گئی تھی،

جہانگیر کے ایک دوسرے جلیل القدر امیر سپہ سالار مہابت خان نے بھی اپنے یہاں علمی مجالس سجائیں، شیخ حکیم رکنا کاشی، آقا صفاہانی، اسد بیگ قزوینی، مولانا حیدر خصالی اور مولانا مرشد بروجردی اُس کی فیاضیوں سے مستفید ہوئے[۱]، وہ خود بھی شاعر تھا، سوسنی تخلص کرتا تھا، اس کا حسب ذیل شعر ندرت خیال کے لحاظ سے خوب ہے،

ننگ و ظلم بود کہ بہشت آرزو کند   دوزخ نصیب من بود و آرزو مباد[۲]

آصف خان مرزا قوام الدین جعفر بیگ بھی دربار کا ایک ممتاز اہل علم تھا، اکبر کے بائیسویں سال جلوس میں عراق سے ہندوستان آیا، اور اپنے چچا مرزا غیاث الدین علی آصف خان بخشی کی وساطت سے شاہی دربار میں روشناس ہوا، رفتہ رفتہ ترقی کر کے جہانگیر کے عہد میں پنجہزاری منصب اور عہدۂ وکالت پر مامور ہوا، اس نے بہت سے حربی کارنامے بھی انجام دیے، اس کے ذاتی اوصاف اور علمی ذوق کے بارے میں مآثر الامراء کا مؤلف لکھتا ہے:

یکتا ے روزگار تھا، ہر فن میں یگانہ اور ہر ہنر میں کامل، اس کے فہم کی تیزی

---

[۱] تفصیل کے لیے دیکھو میخانہ مؤلفہ ملا عبدالنبی ص ۷۲۵، ۴۴۳، ۴۴۰، ۵۰۰، ۵۵۵، آثر الکرام حصہ دوم ص ۹۵، مآثر الامراء جلد سوم ص ۴۸۵، ۴۹۳، شعر العجم حصہ سوم ص ۱۰، مخزن الغرائب ذکر حیدر خصالی [۲] مآثر الامراء جلد ۳ ص ۴۰۹،

اور فطرت کی بلندی کی بڑی شہرت تھی، وہ خود کہا کرتا کہ جس چیز کو میں فوراً نہ سمجھوں وہ بے معنی ہے، ایک نگاہ سے تمام سطروں کو پڑھ لیتا تھا، اس کو ملکی و مالی معاملات میں بھی غیر معمولی مہارت تھی، اس کا ظاہر اور باطن آراستہ تھا، شعر و انشا میں کمال اور پختگی حاصل تھی (ج ۲ ص ۱۱۲)

جعفری تخلص کرتا تھا، اور اپنی سخن دری کی شہ زوری میں نظامی گنجوی کے تتبع میں ایک مثنوی خسرو شیریں لکھی، جس کے بارہ میں مرزا محمد طاہر نصرآبادی اپنے تذکرہ میں رقمطراز ہے:

بعد از شیخ نظامی خسرو شیریں را کسے بہ از و نگفتہ" (ص ۵۳)

مآثر الامرا، جلد اول (ص ۱۱۲) میں بھی ہے:

"باعتقاد جمعے بعد از شیخ نظامی گنجہ مثنوی خسرو شیریں بہ از و کسے نگفتہ"

اس مثنوی کے بہت سے اقتباسات تذکرہ نصرآبادی میں منقول ہیں،

امرائے جہانگیری میں عبدالرحیم خانخاناں کی شعر و سخن کی شمع سب سے زیادہ روشن رہی، پہلے کہا جا چکا ہے کہ اس کا دربار شعراء کا ایک دار الحکمت تھا، جہانگیری دور میں اس نے بیس سال تک اس روایت کو قائم رکھا،

شعراء کی سرپرستی | جہانگیر کی شہزادگی کے زمانہ ہی سے شعراء اس کے یہاں ملازم تھے، اس کی مجلس شعر و شاعری سے ہمیشہ گرم رہتی تھی، ایک بہت ہی کمسن شاعر جس کی عمر تیرہ سال سے زیادہ نہ تھی، شہزادہ سلیم کے دربار میں اپنی سخن گستری کی داد لیتا تھا، شہزادہ سلیم ہی نے اس کا تخلص طفلی رکھا تھا، شہزادہ کی شان میں اس نے کئی قصائد کہے، ایک مدح کے کچھ اشعار یہ ہیں:

ایا شہے کہ جہان را زبہر نان جسلل	بہ دور معدلتت فتنہ پاسبان آمد
امید لطف تو ہست آنچنانکہ عاصی را	گناہ از آتش دوزخ نگاہبان آمد
تو آنکہ مرکب عزم ترا بروز وغا	ظفر علم کش و اقبال ہم عنان آمد

رسانند نامۂ اقبال وش مرغ شرف کہ صیت شہپرش از اوج لامکان آمد

نوشتہ کاتب قدرت عبارتی کان را امید ترجمہ و شوق ترجمان آمد

ملا بدایونی نے اس کمسن بچے کی شعرگوئی پر بڑی حیرت کا اظہار کیا ہے[۵۱]

میر حیدر رفیعی معمائی کا لڑکا محمد ہاشم سنجر اکبری دور کا ایک ممتاز شاعر تھا، اس کے بارے میں میخانہ کا مؤلف رقمطراز ہے:

بعد از عرفی در استعارہ کردن کسے بہ از مرتکب این شیوہ نشدہ[۵۲]

سنجر نے بھی شہزادہ سلیم کے دربار میں باریابی حاصل کر کے اس کی ثنا خوانی کی، اس کے ایک قصیدہ کے چند اشعار یہ ہیں:

ہمیشہ لطف تو بر دشمنان شود مصروف مدام جور تو بر دوستان بود جاری

زمانہ چند دل آزردن از تو آموزد یکے ز شاہ بیاموز رسم دلداری

منت حلال کنم لیک بر نمی تابد زمان شاہ سلیم این ہمہ ستمگاری[۵۳]

عرفی جب ہندوستان پہنچا تو شہزادہ سلیم نے بھی اس کے کلام کی شان و شوکت، استعارات کی طرفگی، بندش کی چستی، مضامین کی نازک خیالی، خیالات کی رفعت اور فقروں کے دروبست کی بڑی شہرت سنی، چنانچہ اس نے عرفی کو اپنے دربار میں بلا کر قصیدہ کہنے کی فرمائش کی، عرفی کی خودستائی اور خودبینی مشہور تھی، مگر اس دعوت پر اپنی خوش قسمتی کا اظہار کرتا ہے، چنانچہ جس وقت یہ پیام لیکر اس کے یہاں قاصد پہنچتا ہے، تو وہ گوہر افشانی کرتا ہے:

صباح عید کہ در تکیہ گاہ ناز و نعیم گدا کلاہ نمد کج نہادہ شہ دیہیم

جہان چنین خوش و من خوشتر از جہان و ثاق نشستہ با خرد و از ور تعلم و تعلیم

---

[۵۱] بدایونی جلد سوم ص ۲۷۶۔ [۵۲] میخانہ ص ۲۲۹۔ [۵۳] خزانہ عامرہ قلمی نسخہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی۔

که ناگهان ز درم در رسید مژده دہے — چنان که از چمن طالعم زمعز نسیم
چه گفت؟ گفت که اے مخزن جواهر قدس — چه گفت؟ گفت که اے مطلب بهشت نعیم
بیا که از گهرت یاد می کند دریا — بیا که تشنه لبت را طلب کند تسنیم
ازین پیام دلم شد شگفته و شاداب — چنان که باغ ز شبنم چنانکه گل ز نسیم

عرفی ہمہ تن شوق بنکر اور بے تابی کے عالم میں دربار روانہ ہوا،

به ره فتادم و گشتم چنان شتاب زده — که دست اہل کرم در نثار گوہر و سیم

اور جب وہ دربار میں پہونچکر شہزادہ سلیم کے سامنے آیا، تو زمین بوس ہوا، اسکو وہ لطیف پیرایہ میں کہتا ہے کہ اگر میں ادب سے رک نہ جاتا تو بجائے اس کے کہ میرے لب اس کے قدم چومتے اس کے قدم میرے لب کو چوم لیتے،

چو روزگار رسیدم به درگہے که کند — زمانه طوف حریمش به دیده تعظیم
رسیدن من و اقبال آن ہمایون فال — چنان فتاد مطابق در آن خجسته حریم
که اگر ادب نکشیدی عنان من قدمش — بہ بوسه گاہ ہمی کرد بر لبم تقدیم

شہزادہ سلیم اس کے ساتھ خاص لطف و کرم کے ساتھ پیش آیا جس کے بعد وہ آداب شاہی بجا لایا،

مرا چو دوش به دوش ادب بدید استاد — به لطف خاص بدل کرد التفات عمیم
ز موج کرنش و تسلیم را ادا کردم — به داب مردم دانا و بذله سنج ندیم

شہزادہ سلیم نے وقار و تمکنت میں عرفی کی طرف صرف نگاہیں اٹھائیں لیکن جب عرفی سے مخاطب ہوا تو مغرور و خود بین شاعر نے محسوس کیا کہ اس کا سامعہ گوہر کی موجوں میں ڈوب گیا

بگفت و من بشنودم ہر آنچه گفتن داشت — که در میان گہش کرد در زبان تقدیم

بس چو نوبت تو بیش از نگاہ باز گرفت — فتاد سامعہ در موج کوثر و تسنیم

شہزادے نے بلیغ پیرایہ میں عرفی کی تعریف کی اور پھر قصیدہ کی فرمایش کی،

نجندہ گفت کہ دہ عذر ایں گناہ بزرگ — کہ رفتہ نام تو بے حکم بایہ سیفت اقلیم

ہمیں کہ رفتی ازیں آستان نوشتہ بیار — گزیدہ نسخہ از رادھاے طبع سلیم

عرفی نے شہزادہ سلیم کی شان میں اور بھی قصیدے لکھے، دو کے مطلعے یہ ہیں،

دگر سفیر طبیعت بساز آگاہی — بعالم ملکوت است محملش راہی

نو بہار آمد کہ افشاند چو حسن یار گل — چون وصال عام پیزد ہر خس و ہر خار گل

عرفی کو عالم شباب ہی میں حاسدوں نے زہر دیدیا، اس لیے جہانگیر کی بادشاہت کے زمانے میں اس کی سرپرستی سے مستفید نہ ہو سکا، اس کے دیوان میں ۲۶ قصیدے، ۲۷۰۰ غزلیں، اور ان کے علاوہ بہت سے قطعات اور رباعیاں تھیں جنمیں ۷۰۰ شعر تھے، مخزن اسرار، شیرین خسرو کے جواب میں دو مثنویاں بھی لکھیں، ایک رسالہ نفسیہ کے نام سے فن تصوف میں تحریر کیا،

جہانگیر تخت پر جلوہ افروز ہوا، تو شاہی دربار باکمال شعراء سے بھرا ہوا تھا، جہانگیر نے جوہر شناسی سے کام لے کر طالب آملی کو ملک الشعراء کے عہدہ پر فائز کیا، طالب آمل کا رہنے والا تھا، جو مازندران کا ایک شہر ہے، سولہ برس کی عمر میں اس نے ہندسہ، منطق، ہیئت، فلسفہ، تصوف اور خوشنویسی میں کمال حاصل کر لیا تھا، تیموری حکمرانوں کی فیاضیوں کا شہرہ سنکر ہندوستان آیا، قندھار میں غازی خاں کے یہاں ایک قصیدہ لکھکر حاضر ہوا، غازی خان نے بڑی گرمجوشی سے اس کی پذیرائی کی، اور ندیم خاص بنایا، غازی خان کی موت کے بعد خواجہ قاسم دیانت خان کے پاس آگرہ آیا، اور کچھ وقفہ کے بعد دیانت خاں نے جہانگیر کے دربار میں اس کی تقریب کی، مگر طالب جب جہانگیر کے حضور میں پہنچا تو کچھ ایسا مخمور اور مسحور ہو گیا کہ اس کی کسی بات کا جواب نہ دے سکا،

دیانت خان کو بڑی ندامت ہوئی مگر طالب گھر پر آیا تو ۹ شعروں کا ایک قطعہ فی البدیہہ لکھکر دیانت خان کے پاس بطور معذرت بھیجا، اس کے بعد اعتماد الدولہ نے اس کو دربار میں پیش کیا، جہانگیر بہت لطف و محبت سے پیش آیا، رفتہ رفتہ سخن سنج اور سخن فہم بادشاہ طالب کی شاعری کی تشبیہات کی ندرت اور استعارات کی لطافت و نزاکت سے ایسا متاثر ہوا کہ اس کو دربار کا ملک الشعرا بنایا، جس کے بعد اس نے بڑی خوشحالی سے زندگی بسر کی، اس کا معاصر عبد النبی فخر الزمانی قزوینی مؤلف میخانہ رقمطراز ہے کہ

> وزیر اعظم دارالامان مدار المہامی فرمانروائے ہندوستان اعتماد الدولۃ العلیہ العالیہ .... بعد از اندک ایامی خود باعث از دیاد رشد طالب گردیدہ او را داخل بساط بوسان محفل عظمت و شوکت بادشاہ جہان پناہ آسمان جاہ سلیمان دستگاہ شاہ نور الدین محمد جہانگیر بادشاہ گردانید، آن منتخب نکتہ سنجان در اندک زمانی جوہر خویش بر فرمان روای دار الامان ہندوستان و شہریار بجان بخش جہان ستان ظاہر ساخت تا در سنہ ثمان عشرین و الف آن شہنشاہ گردوں اساس واین بادشاہ جوہر شناس طالب را از امثال و اقران برگزیدہ بخطاب ملک الشعرائی مفتخر و سرفراز گردانید۔ الحال بدولت این خسرو غریب دوست، مسکین نواز و این خورشید ذرہ پرور، از ہمہ چیز بے نیاز سر آمد سخنوران و برگزیدۂ نکتہ پروران است۔" (ص ۳۸۸)

جہانگیر ایک موقع پر طالب سے ناراض ہوگیا۔ طالب چند روز شرفیابی سے محروم کر دیا گیا، اس کا قصور معاف ہوا تو اس واقعہ کو ایک قصیدہ میں خاص شاعرانہ لطافت و بلاغت کے ساتھ ادا کرتا ہے، جہانگیر کے ساتھ طالب کو جو قلبی لگاؤ تھا، اس کا بھی اندازہ حسب ذیل اشعار سے ہوگا،

به نسبت گهرم داده بودی از کف خویش | ترا زجود زبانے چنین ہزار افتاد
چو رو شدم زکفت چترخم از ہوا بربود | بہ گرمئی کہ زبانم بزینہا ر افتاد
یکے مقابل خورشید داشتنت آئینہ ام | بدید کز عرق موج بر عذار افتاد
چو پیش مشعل مہ پردۂ شب چراغ مرا | بچہرہ گونہ کاہیش شمع وار افتاد
ازیں نشاط مگر دست آسمان لرزید | کہ باز در کف خاقان کامگار افتاد
کنوں برشتہ امرش بدار کز تقدیر | دو بار در کفت این در شاہوار افتاد[1]

نظیری نیشاپوری کو بھی جہانگیر نے شاہانہ الطاف واکرام سے سرفراز کیا، اس کے بارے میں تزک جہانگیری میں لکھتا ہے:

"در فن شعر و شاعری از مردم قرار داده بود" (ص ۹۲)

سنہ جلوس شاہی میں جہانگیر نے اس کا شہرہ سنکر دربار میں طلب کیا، نظیری نے انوری کے اس قصیدہ پر

باز این چہ جوانی و جمال ست جہاں را

ایک قصیدہ لکھکر پیش کیا۔ جہانگیر نے اس کے صلہ میں ہزار روپیہ، گھوڑا اور خلعت عطا کیا ہے[2]

جہانگیر نے ایک دفعہ نظیری سے ایک عمارت کے کتبہ کی فرمایش کی، اس نے ایک غزل لکھ کر پیش کی جس کا مطلع یہ تھا،

ایں خاک درت صندل سرگشتہ سران را | باوہ مژہ جاروب رہت تاجوران را

---

[1] منقول از شعر العجم حصہ سوم ص ۷۹-۱۸۰، [2] تزک جہانگیری (ص ۹۲)، شعر العجم حصہ سوم (ص ۱۳۹) نیا نظیری کا قصیدہ ملاحظہ ہو۔

جہانگیر نے اس کے صلہ میں تین ہزار بیگہہ زمین انعام دی ؎

حیاتی گیلانی بھی جہانگیر کے دربار سے منسلک رہا، اس کا ذکر گذشتہ باب میں آچکا ہے، آخر عمر تک جہانگیر کے جود و کرم سے فیضیاب ہوتا رہا، جہانگیر اس کو ہمیشہ سفر و حضر میں ساتھ رکھتا تھا، بہت ہی پرگو شاعر تھا، سات ہزار شعر اس کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں، خسرو و شیرین کی بحر میں قصہ سلیمان و بلقیس لکھ کر جہانگیر کی خدمت میں پیش کیا، جہانگیر نے خوش ہو کر اس کو سونے میں تلوا کر سونا انعام دیا ؎

مولانا شکیبی صفاہانی، یہ اپنے شیرین و رنگین کلام کے لیے مشہور تھے، ہندوستان آئے تو کچھ دنوں عبد الرحیم خانخانان کے دربار میں رہے، پھر مہابت خان کی وساطت سے جہانگیر کے دربار میں پہنچے، اور ایک قصیدہ پیش کیا جس کے تین شعر یہ ہیں:-

فتادہ بر سر ہم از ہجوم نقش جباہ ‏ ‏ ‏ ‏ بر آستان جہانگیر شاہ اکبر شاہ

چہ رفعت تعالی اللہ آستانش را ‏ ‏ ‏ ‏ کہ از بلندی آن پر بریخت مرغ نگاہ

ز بسکہ ناصیۂ خویش سودہ اند ملک ‏ ‏ ‏ ‏ نگار خانۂ چین گشتہ خاک آن درگاہ

جہانگیر اس قصیدہ سے محظوظ ہو کر مولانا شکیبی سے لطف و کرم کے ساتھ پیش آیا، مولانا شکیبی کو توقع ہوئی کہ جہانگیر کے حضور میں ان کی روزبار یابی ہو گی مگر کسی وجہ سے یہ توقع پوری نہیں ہوئی اسلئے کبیدہ خاطر ہو کر ایران واپس جانے کا ارادہ ظاہر کیا، جہانگیر کو جب ان کی اس کبیدگی کی خبر ملی، تو طلب کر کے کہا

مولانا شکیبی باستی کہ از رونے چند بموجب تخلص خود شکیبا ئی نمی کبیدید۔

مولانا نے اس لطف خسروانہ کو ایک رباعی میں قلمبند کر کے بطور معذرت پیش کیا،

گفتی شکیبی کہ زما کبیدی ‏ ‏ ‏ ‏ لیتی کہ ز قبلہ دعا کبیدی

حد نیست مرا کہ گویم ای ہمہ دان ‏ ‏ ‏ ‏ گویند بسا کسا کہ از وفا کبیدی

اس رباعی کو سنکر جہانگیر خوش ہوا، پھر مولانا شکیبی سے کہا کہ آپ کی ایک اور رباعی مجھکو بہت پسند آئی ہے جو میں نے اپنی بیاض میں اپنے ہاتھ سے لکھ لی ہے

نزدیست جہان کہ پرورش باختن است | نرّادی آن بداو کم ساختن است
دنیا بمثال کعبتین و نرد است | برداشتنش برائے انداختن است

جہانگیر نے ازراہ قدر دانی مولانا کو دہلی کی صدارت پر فائز کیا، اور اسی شہر میں آخر عمر تک رہے "شکیبی رفت" (۱۰۲۳ھ) تاریخ وفات ہے، چار ہزار بیت کے ایک دیوان کے علاوہ ایک مثنوی خسرو شیریں بھی یادگار چھوڑی، (میخانہ ص ۲۳)

ملا لطفی تبریزی ہندوستان آئے تو جہانگیر ان کے کلام کی لطافت، دلآویزی اور رنگینی سے محظوظ ہوا، اور موزون الملک کے خطاب سے سرفراز کیا، اور ندیم خاص بنایا، کچھ دنوں کے بعد ان کو ٹھٹھ کے علاقہ میں بندر لہری کی حکومت تفویض کی، وہاں تین سال رہ کر آگرہ واپس ہوئے، دوسری بار جہانگیر نے ان کو گجرات کے دار الضرب کا داروغہ بنا کر بھیجا ۱۰۳۰ھ میں وفات پائی، ان کے کلام کا نمونہ یہ ہے :-

(۱)
ہنوز جام شرابے بتو سگے نزدیم | نوائے قہقہہ بر صوت بلبلے نزدیم
ہزار فصل گل آرزو رسید و گذشت | ہنوز بر سر یک آرزو گلے نزدیم

(۲)
ہمین نہ کارمن از روزگار تلخ شدہ است | کہ زندگانیم از ہجر یار تلخ شدہ است
ز روزگار بود تلخکامی ہمہ کس | ز تلخکامی من روزگار تلخ شدہ است

(۳)
یکچند پے گردش افلاک شدیم | یکچند پے دانش و ادراک شدیم
از آمد و رفت خود ہمی فہمیدیم | خاک بر آمدیم و در خاک شدیم[۱]

---

[۱] میخانہ ص ۱۳۹-۲۳۰ و تذکرۂ گلشن ص ۳۵۵

مولانا علی احمد **نشانی** کا ذکر پہلے آچکا ہے، یہ صاحب فن، صاحب سخن اور صاحب دل بھی تھے، ایک بار جہانگیر کے حضور میں محفل سماع گرم تھی کہ ایک مطرب نے یہ بیت پڑھی

ہر قوم راست راہے دینے و قبلہ گاہے　　　　من قبلہ راست کردم بر سمت کجکلاہے

جہانگیر نے حاضرین سے اس بیت کا مطلب پوچھا، مولانا نشانی پر ایک وجد کی کیفیت طاری تھی، اسی عالم میں رقص کرتے اور تالیاں بجاتے ہوئے شاہی تخت کے پاس پہنچے، اور کہنے لگے کہ ایک روز جمنا کے کنارے ہندو عورتیں اور مرد غسل کر رہے تھے، کہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ اپنی خانقاہ سے امیر خسرو کے ساتھ نکلے، دریا کے کنارے نظر اٹھائی تو یہ مصرع زبان مبارک سے نکلا،

ہر قوم راست راہے دینے و قبلہ گاہے

امیر خسرو نے یہ مصرع سنا تو فوراً ہی فی البدیہہ عرض کیا کہ

من قبلہ راست کردم بر سمت کجکلاہی

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے سر مبارک پر اس وقت طاقیہ تھی، وہ تھوڑی سی کج تھی، مولانا نشانی نے اس بیت کی تشریح کرنے میں اپنی کلاہ کو کج کیا، اور وجد کی حالت میں بسمل کی طرح رقص کرتے ہوئے فرش پر گر پڑے، حاضرین کو خیال ہوا کہ مولانا بیہوش ہو گئے ہیں، جہانگیر اپنے استاد کی یہ کیفیت دیکھکر بے چین ہو گیا، غایت اضطراب میں تخت سے اتر کر مولانا کے سر کو اپنے زانو پر رکھ لیا، اسی سکر میں مولانا کی روح مالک حقیقی سے جا ملی،[1]

عطائی معنوی جونپوری۔ شیخ عبد الکریم عطائی نام اور معنوی تخلص تھا، انشا و شعر میں اس کی قابلیت مسلم تھی، بعض امرا نے اس کو جہانگیر کے دربار میں پیش کیا، اس کی شاعری سے جہانگیر محظوظ

---

[1] ریاض الشعراء قلمی نسخہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی،

ہوکر جونپور میں کچھ جاگیر مرحمت کی جس کے بعد معنوی نے خوشحالی سے زندگی بسر کی، اس کی ایک رباعی ہے :-

سودا بسرم ہمچو پلنگ اندر کوہ　　غم بر سر غم بدل چو سنگ اندر کوہ
دور از وطن خویش بخواری گردم　　چو شیر بدریا و نہنگ اندر کوہ[1]

حسن بیگ خاکی، جہانگیر اس کی ذہانت اور دقت نظر کا معترف تھا، شاہانہ نوازش سے سرفراز کرکے اس کو صوبہ بہار کا دیوان بنایا، یہاں اس نے ایک تاریخ عالم بھی لکھی، ۱۰۲۱ھ میں وفات پائی؛

عشق خوبان و فاکیش ندارد شوہی　　سر آن یار بگردم کہ جفا کیش بود[2]

حکیم عارف ایگی، نام سراج الدین حسن تخلص عارف، اپنے وطن ایگ سے کرمان، یزد، کرک اور سیستان ہوتا ہوا ہندوستان پہنچا تو شہزادہ سلیم کی آستان بوسی کی، اور اس کی شان میں متعدد قصیدے کہے، پھر شہزادہ دانیال کے دربار سے وابستہ ہوگیا، جہاں اس کے اچھے نہیں گذرے، اکبر کا بھی پانچ سال تک وظیفہ خوار رہا، پھر وطن چلا گیا، وہاں سے پانچ سال کے بعد واپس ہوا تو کچھ دنوں ہندوستان کے مختلف شہروں کی سیاحت کے بعد اعتماد الدولہ کے وسیلہ سے پھر جہانگیر کی خدمت میں حاضر ہوا، جہانگیر نے شاہانہ لطف و کرم سے نوازا، اور صوبہ بہار میں پانچ سو بگہہ زمین گذران اوقات کے لیے عطا کی، عارف نے جذبۂ تشکر میں ایک قطعہ کہا جس کے دو شعر یہ ہیں؛

خدایا تو این شاہ درویش دوست　　کہ آسایش خلق در ظل اوست
برآرش برا ورنگ شاہی وجاہ　　بر اوج فلک تا بود مہر و ماہ

---

[1] میخانہ ص۵۳۵ ، [2] ریاض الشعراء

وہ ایک کتاب اندرزنامہ کا مصنف بھی تھا جس میں شاہنامہ کی بحر میں دو ہزار تین سو اشعار تھے، ایک ساقی نامہ میخانہ میں منقول ہے[۵۱]، اس کے ایک قصیدہ کا ذکر پہلے آچکا ہے،

شیدا۔ قبیلہ تکلو سے تعلق رکھتا تھا، اس لیے شیدائے تکلو کے نام سے مشہور ہوا، اس کا خاندان مشہد سے ہندوستان آیا، شیدا کی پیدائش فتح پور (آگرہ) میں ہوئی اسیلئے ایرانی شعرا اس کو ہندوستانی سمجھتے تھے، جہانگیر کے لشکر میں احدی کی حیثیت سے مامور ہوا، اور دستور کے مطابق اس کو جاگیر اور علوفہ ملتا تھا، دکن کی تسخیر کے سلسلہ میں اس نے عبدالرحیم خانخاناں کی شان میں بھی انوری کے طرز پر قصیدہ کہا، جو مآثر رحیمی جلد سوم (ص ۱۴۶۹) میں مطالعہ کیا جا سکتا ہے، کچھ دنوں شہزادہ شہریار کی ملازمت میں بھی رہا، اور آخر میں شاہجہان کے دربار سے وابستہ ہوا، بہت ہی ذہین، پرگو اور ذی علم شاعر تھا، مگر تمام شعرا اس کی خردہ گیری، عیب جوئی اور ہجوگوئی سے عاجز تھے، حتی کہ ملک الشعرا طالب آملی کو بھی اپنے طنز و استہزا سے نخچیر کیا،

شب و روز مخدوم ما طالبا | پئے جیفہ دنیوی در تگ است
مگر قول پیغمبر آمد بجا | کہ دنیا است مردار طالب سگ است[۵۲]

ارباب سخن شیدا کو زیر کرنے کی فکر میں رہتے، مگر شاید ایک ہی موقع ایسا آیا جب کہ وہ ان سے پسپا ہوا، اس کی دلچسپ تفصیل سے ہم ناظرین کو بھی محظوظ کرنے کی کوشش کرتے ہیں، ۱۰۲۸ھ میں جہانگیر اجمیر گیا، لشکر کے ساتھ شاہی جلو میں شعرا بھی تھے، ایک روز شیخ فیروز کی قیامگاہ پر تمام اصحاب سخن مثلاً طالب آملی، ملا عطائی جونپوری، انور لاہوری، طفیلی فتحپوری وغیرہ جمع ہوئے، شیخ فیروز کو مقبولیت اس لیے حاصل تھی کہ اس کو اساتذہ کے ہزاروں اشعار زبانی یاد تھے، یہ مجلس جاری تھی کہ شیدا بھی آپہنچا، تمام شعرا نے گرم جوشی سے اس کا خیر مقدم

---

۵۱ ص ۱۱۹۰-۲۰۰ ۵۲ ید بیضا قلمی نسخہ ص ۱۶۲،

کیا، اور نمایاں جگہ پر بٹھا کر اس سے تازہ کلام سنانے کی فرمایش کی شیدا نے یہ شعر پڑھا،

چیست دانی بادۂ گلگوں مصفّا جوہرے ، حسن را پروردگا عشق را پیغمبرے

شیخ فیروز نے کہا یہ تو رودکی کے شعر سے سرقہ ہے،

عشق را پیمبر ولیکن حسن را آفریدگار توئی

شیدا کچھ برہم ہوا لیکن اس نے ایک دوسرا شعر سنایا،

ز بسکہ کرد عنت بتدبیر جگر ناخن چو پشت ماہیم از پا نے تا بسر ناخن

شیخ فیروز نے اعتراض کیا کہ یہ غیاثا کی حلوائی کا چربہ ہے،

از بسکہ سینہ کندم ناخن درو نشستہ چو پشت ماہیست سراپائے سینہ ام

شیدا اور بھی زیادہ چیں بجبیں ہوا، مگر ایک اور شعر پڑھکر داد چاہی،

بہ صحرا موفشانی دشت پر سنبل شود ہمہ بدریا روبشوئی خار ماہی گل شود

مگر شیخ فیروز بولا کہ یہ تو ملا کاتبی کے شعر سے توارد ہے،

گر بدریا افتد از عکس جمال او فروغ خار ماہی آورد در قعر دریا بار گل

شیدا نے چڑھ کر کہا کہ اگر یہی ستم ظریفی ہے تو اس کے مقابلہ کا شعر سناؤ،

ذات تو بود صحیفہ کون کہ کرد از روی ادب مہر خدا بر پشتیت

شیخ فیروز نے فوراً ہی ہاتفی کا شعر پیش کیا،

نبوت را توی آن نامہ در شت کہ از تعظیمش آید مہر بر پشت

حاضرین نے قہقہہ لگایا، شیدا نے زچ ہو کر بدکلامی شروع کر دی لیکن اصحاب مجلس

پھر مصر ہوئے تو اس نے یہ شعر پڑھا،

زلف او را دشتہ جان گفتم و گشتم خجل زانکہ این معنی چو زلفش پیش پا افتادہ است

شیخ فیروز نے کہا کہ جہان کی دلآزاری مراد نہیں لیکن اس مضمون کا ایک شعر پہلے بھی کہا جا چکا ہے،

کس نیابد مصرعہ پیچیدۂ زلف کجست   گرچہ این مضمون ترا در پیش پا افتادہ است

اسی طرح شیدا نے کچھ اور شعر سنائے، تو شیخ فیروز اس کے ہر شعر کا ماخذ بتاتا گیا، بالآخر شیدا پر مہر سکوت لگ گئی، اور باوجود اصرار کے اس نے کوئی اور شعر پڑھنے کی ہمت نہ کی، اور پھر کبھی ایسی مجلس میں شریک نہ ہوا جس میں شیخ فیروز بھی ہوتا، مگر شیخ فیروز کا بیان ہے کہ کشمیر میں ایک روز شیدا اس کے گھر پر آیا، اور پوچھا کہ میرا کوئی شعر بھی قابل ستایش ہے تو فیروز نے کہا ہاں اور وہ شعر یہ ہے

اے بروے تو کرد آئینہ را چشم نیاز   شانہ را دست دعا در شب زلف تو دراز

شیدا نے ہاتھ پھیلا کر دعا کی "عمرت دراز باد"[۱] شیدا کا ذکر شاہجہان کے سلسلہ میں بھی آئے گا،

فضلا، جہانگیر کی قدر دانیوں کے سبب اس کے دربار میں علما بھی بکثرت تھے ہم ان میں سے دو چار کا ذکر کرتے ہیں،

میران صدر جہان پہانی۔ پہلے ذکر آچکا ہے، کہ جہانگیر نے شہزادگی کے زمانہ میں ان سے چہل حدیث پڑھی تھی، ماثر الامرا، جلد سوم (ص ۳۶۸) میں ہے،

"مرد فاضل خوش طبع بود"

اکبر کے زمانہ میں ممالک محروسہ کے صدر تھے، حکیم ہمام کے ساتھ عبد اللہ خان اوزبک والی توران کے پاس ایلچی بنا کر بھی بھیجے گئے، وہاں علما سے بڑے معرکے ہوئے، ہر فن میں صدر جہان ان پر غالب رہے، جس سے وہاں کے ارباب علم کو بڑی حیرت ہوئی، وہاں سے واپس ہوئے تو کچھ دنوں کیلئے صدارت کل کی خدمت تفویض کی گئی، اور منصب دو ہزاری بھی عطا ہوا، جہانگیر کا

---

[۱] مخزن الغرائب قلمی نسخہ، دار المصنفین ورق ۲۱۶ — ۲۱۵

بڑا قدر دان تھا، شہزادگی کے زمانہ میں اس کو معلوم ہوا کہ صدر جہاں مقروض ہیں، تو اس نے وعدہ کیا کہ تخت و تاج کا مالک ہوا تو وہ ان کا سارا قرض ادا کر دیگا، اور ان کی خواہش کے مطابق منصب پیش کریگا، چنانچہ ایسا ہی کیا، چار ہزاری منصب دے کر قنوج کا علاقہ تنخواہ میں عطا کیا، صدر جہان نے جہانگیر کی نوازشوں سے فائدہ اٹھا کر خلق اللہ کی بڑی خدمت کی، اور ان کی مدد معاش کے سلسلہ میں بڑی فیاضی دکھائی، چنانچہ آصف خان جعفر نے جہانگیر سے عرض کیا کہ عرش آشیانی (یعنی اکبر) نے جو بخشش پچاس سال میں کی تھی صدر جہاں نے پانچ سال کی صدارت میں کی (مآثر الامراء، جلد سوم ص ۳۵۰، و مآثر الکرام جلد دوم ص ۹۳)

مولانا مرزا شکر اللہ شیرازی۔ شیراز، قزوین، عراق اور عرب سے علوم متداولہ حاصل کر کے ہندوستان آئے، نسخ، تعلیق اور علم سیاق میں مہارت تامہ رکھتے تھے، پہلے عبد الرحیم خانخانان کی فیاضیوں سے متمتع ہوئے، پھر جہانگیر کی ملازمت میں آئے، جہانگیر نے انھیں شہزادہ خرم کی ماتحتی میں عہدہ دیوانی پر مامور کیا، اپنے فرائض منصبی میں بہت کامیاب رہے، پھر اودے پور کی مہم میں کچھ مفید خدمات انجام دینے پر جہانگیر نے ۱۰۲۴ھ میں انھیں افضل خاں کے خطاب سے مشرف کیا، اور اجمیر کا ناظم بنا کر بھیجا۔[۱]

مولانا تقیا ہی شوستری۔ شیراز سے تعلیم کی تکمیل کر کے ہندوستان آئے، ان کے بارے میں مآثر رحیمی کا مصنف لکھتا ہے،

"مولانا تقیا ہی شوستری طالب علمے بے مثال و قرین دانشی و شاعرے سخن آفرین است در اقسام منظومات غیوری تخلص می فرماید"

جہانگیر نے انھیں صدارت کے منصب سے سرفراز کیا،[۲]

---

[۱] مآثر رحیمی حصہ سوم ص ۱۳۰، [۲] ایضاً ص ۶۶۲۔

مولانا مرزا محمد قاسم گیلانی ۔ حدیث اور فقہ کے متبحر عالم تھے، قزوین اور اصفہان میں کچھ دنوں رہنے کے بعد ہندوستان آئے، تو پہلے بیجا پور میں دربار عادل شاہی سے وابستہ رہے، ۱۰۲۲ھ میں برہانپور خاندیس میں شہزادہ پرویز سے ملے، جس نے ان کی بڑی پذیرائی کی، عبدالرحیم خانخاناں نے بھی اپنے دربار میں ان کا پرجوش خیر مقدم کیا، اور نقد جواہرات کے علاوہ بہت سی اور چیزیں بھی ان کی خدمت میں پیش کیں، اور اسی کی وساطت سے جہانگیر کے دربار میں ملازم ہوئے، جہانگیر ان کا سرپرست اور قدردان رہا[۱]

جہانگیر کے عہد کے دوسرے علماء کے نام جو مصنف اقبال نامۂ جہانگیری نے بتائے ہیں، یہ ہیں

ملا روزبہان شیرازی، امی اعمری، ملا باقر کشمیری، ملا باقر ٹھٹھی، ملا مقصود علی تبریزی، قاضی نور اللہ، ملا فاضل کابلی، ملا عبدالحکیم سیالکوٹی، ملا عبدالمطلب سلطانپوری، ملا عبدالرحمن بوہرہ گجراتی، ملا حسن فراغی گجراتی، خواجہ عثمان حصاری، اور ملا محمد جونپوری،[۲]

جہانگیر ہر مذہب و ملت کے علماء سے بہت بے تکلفی کے ساتھ ملتا تھا، اور ان کے متعلق جو رائے ظاہر کرتا تھا، وہ بڑی محققانہ ہوتی تھی، شیخ عبدالحق دہلوی سے ملا، تو لکھتا ہے:

"مدت ہاست کہ در گوشۂ دہلی بہ وضع توکل و تجرید بسر می برد، مرد گرامی ست صحبتش بے ذوق نیست، بہ انواع مراحم دلنوازی کردہ رخصت فرمودم"

ان کی تصنیف تذکرۂ اولیائے ہند کے بارے میں رائے ظاہر کرتا ہے:-

کتابے تصنیف نمودہ بود مشتمل بر احوال مشائخ ہند بہ نظر در آوردہ خیلے زحمت کشیدہ[۳]

میر عضد الدولہ نے جب فرہنگ جہانگیری پیش کی، تو اس کے متعلق جہانگیر لکھتا ہے:

---

[۱] مآثر رحیمی حصہ سوم ص ۳۹۵، [۲] اقبالنامۂ جہانگیری ص ۳۰۸، [۳] تزک جہانگیری ص ۲۰۴،

"الحق محنت بسیار کشیدہ و خوب پیروی ساختہ و جمیع لغات را از اشعار علما ر قدما استشہاد آوردہ در ین فن کتاب بے مثل ایں نمی باشد"[۱]

مولانا شبلی جہانگیر کی اس رائے کی نسبت لکھتے ہیں کہ "فارسی کا ایک محقق اس کتاب کی نسبت اس سے بڑھ کر کیا رائے دے سکتا ہے، فارسی لغت میں جس قدر کتابیں اس وقت تک لکھی گئی تھیں، کسی میں قدما کے اشعار سے سند لانے کا التزام نہ تھا، اور فرہنگ جہانگیری کا یہی امتیازی وصف ہے"[۲]

وہ ہندو پنڈتوں اور درویشوں سے اسی فراخدلی اور عقیدتمندی سے ملتا جس طرح علمائے اسلام سے پیش آتا تھا، ۱۲ جلوس میں جب اوجین گیا، تو اسے معلوم ہوا کہ سنیاسی مرتاض جدروپ نامی دنیا سے کنارہ کش ہو کر ایک دشوار گذار کھبٹ میں رہتا ہے، جس کا طول ساڑھے پانچ گرہ اور عرض ساڑھے تین گرہ تھا، یہ اس قدر تنگ تھا کہ اس میں مشکل سے ایک شیر خوار بچہ سما سکتا تھا، جہانگیر کو اس سے ملنے کا شوق پیدا ہوا، وہاں تک سواری پہنچ نہ سکتی تھی، مگر وہ تین میل پا پیادہ چل کر وہاں پہنچا، اور چھ گھڑی اس کی صحبت میں رہا، اس ملاقات کی نسبت لکھتا ہے:

"دالحق کہ وجود ش بغایت مغتنم است، در مجلس او محظوظ و مستفید می توان شد، علم بیدانت را کہ علم تصوف باشد، خوب ورزیدہ، تا شش گھڑی با او صحبت داشتم، سخنان خوب ساخت چنانچہ خیلے در من اثر کرد"

اس ملاقات سے وہ سیر نہیں ہوا، پھر گیا، چنانچہ لکھتا ہے:

"باز خاطر را بملاقات گسائیں جدروپ رغبت افزود، بے تکلفانہ بکلبۂ او شتافتہ صحبت

---

[۱] تزک جہانگیری ص ۲۰۷، [۲] مقالات شبلی ج ۴ ص ۱۱۳

داشته شد، سخنان بلند و میان آمد حق جل و علا غریب توفیقے کرامت فرموده فهم عالی فطرت بلند دارد که تند را با دانش خدا داد جمع و دل آزاد و ساخته پشت پا بر عالم و ما فیها زده در گوشهٔ تجرید مستغنی و بے نیاز نشسته۔

اوجین سے رخصت ہوتے وقت اس کے پاس پھر ملاقات کو گیا، الوداعی ملاقات اس پر شاق گذری، لکھتا ہے:

"باز بملاقات گسائیں رفته از وداع شدم، بے تکلف جدائی از صحبت او بر خاطر حقیقت گزیں گرانی نمود"[1]

آخر عمر میں جہانگیر کو حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت کیمیا اثر سے غیر معمولی روحانی اور مذہبی فیوض و برکات حاصل ہوئے، پہلے تو بعض درباری امرا کی فتنہ سامانیوں اور شر انگیزیوں سے حضرت مجدد اعظم سے برگشتہ رہا تھا کہ مشتعل ہو کر ان کو گوالیار میں محبوس کر دیا، مگر عاشق شریعت رسول کی قید و بند کے زمانہ میں ایک روز جہانگیر نے خواب میں دیکھا کہ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اس سے فرما رہے ہیں کہ تم نے ایک بڑے آدمی کو قید کر دیا ہے، جہانگیر نے منفعل ہو کر حضرت شیخ احمد قدس سرہ کی رہائی کا حکم صادر کیا، اور اپنے پاس بلا کر معذرت کی، اور لطف و کرم سے پیش آیا، ان کی ذات اقدس سے جہانگیر کی شیفتگی اور عقیدت اتنی بڑھی کہ اپنے کو زیادہ تر ان ہی کی خدمت بابرکت میں دیکھنا چاہتا تھا، خزینۃ الاصفیا میں ہے:

"بادشاه (جہانگیر) از محبان شیخ شد، مجدیکہ گاہی آنجناب را از خود جدا نمی کرد، و شاہزاده خرم را داخل حلقہ مریدان شیخ نمود، چنانچہ تا عہد شاہجہان و عالمگیر بادشاہان باہمہ علما و وزرا، داخل سلسلہ مجددیہ می شدند" (حصہ اول ص ۶۱۳)

---

[1] تزک جہانگیری ص ۲۴۳

روزانہ مغرب کے بعد جہانگیر حضرت شیخ مجدد الف ثانیؒ سے ملاقات کرتا، ان ملاقاتوں میں حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کے سرچشمۂ علم وفضل سے اس کے قلب کی جس طرح تطہیر ہوئی وہ خود ان کے مکتوب میں سننے کے قابل ہے، وہ اپنے صاحبزادوں خواجہ محمد سعید اور خواجہ معصوم کو تحریر فرماتے ہیں:

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ، اس طرف کے احوال اور اوضاع حمد کے لائق ہیں، (بادشاہ کے ساتھ) عجیب وغریب صحبتیں گزر رہی ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی عنایت سے ان گفتگوؤں سے امور دینیہ اور اصول اسلامیہ میں سرمو سستی اور مداہنت دخل نہیں پاتی، اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ان محفلوں میں بھی وہی باتیں ہوتی ہیں جو خاص خلوتوں اور مجلسوں میں بیان ہوا کرتی ہیں، اگر ایک مجلس کا حال لکھا جائے تو دفتر ہو جائے، خاصکر آج ماہ رمضان کی سترہویں رات کو انبیا علیہم الصلوٰۃ والسلام کی بعثت اور عقل کے عدم استقلال اور آخرت کے ایمان اور اس کے عذاب وثواب اور رویت ودیدار کے اثبات اور حضرت خاتم الرسل کی نبوت کی خاتمیت اور ہر صدی کے مجدد اور خلفاے راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی اقتدا، اور تراویح کے سنت اور تناسخ کے باطل ہونے اور جن اور جنیوں کے احوال اور ان کے عذاب وثواب کی نسبت بہت کچھ مذکور ہوا، اور (بادشاہ) بڑی خوشی سے سنتے رہے، اس اثنا میں اور بھی بہت سی چیزوں کا ذکر ہوا، اور اقطاب، اوتاد ابدال کے احوال اور ان کی خصوصیتوں وغیرہ کا ذکر ہوا، اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ (بادشاہ) سب کچھ قبول کرتے رہے، اور کوئی ایسا تغیر ظاہر نہ ہوا جو بے مزگی پر دلالت کرے، ان واقعات اور ملاقات میں شاید اللہ تعالیٰ کی پوشیدہ حکمت اور راز خفیہ ہوگا، الحمد للہ الذی ھدانا لھٰذا وما کنا لنھتدی لولا ان ھدانا اللہ لقد جاءت

وَسَلِّ رَبَّنَا الحق، دوسرے یہ کہ قرآن مجید کو (بادشاہ سے) سورہ عنکبوت تک ختم کرا چکا ہوں،

جب رات کو اس مجلس (یعنی شاہی مجلس) سے اٹھ کر آتا ہوں تو تراویح میں مشغول ہوتا

ہوں، حفظ قرآن مجید کی یہ اعلیٰ دولت اس پراگندہ حالی میں جو مین جمعیت سے حاصل ہوئی

ہے الحمد للہ اولاً و آخراً، (مکتوبات امام ربانی، دفتر سوم، نمبر ۴۳)

جہانگیر کے اس تزکیۂ باطن کے بعد حضرت مجدد اعظمؒ نے اسلامی شریعت کی فلاح و بہبود کے لیے

جو چاہا اس سے کرایا،

مشہور ہے کہ جہانگیر اکثر کہتا تھا کہ میرے پاس ایک دستاویز نجات ہے، اور وہ حضرت شیخ

کا ارشاد مبارک ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ ہم کو جنت میں لے جائے گا تو ہم تیرے بغیر نہ جائیں گے،

جہانگیر اور کتب خانہ و مدارس جہانگیر ایک شاندار کتب خانہ کا مالک تھا، مکتوب خان اس کا مہتمم تھا،

جب وہ سفر میں ہوتا تو بھی ایک کتب خانہ ساتھ لیجاتا تھا چنانچہ تزک میں ہے کہ جب وہ گجرات پہنچا

تو وہاں کے مشائخ کو اپنے کتب خانہ سے تفسیر حسینی، تفسیر کاشفی، اور روضۃ الاحباب نذر کیں،

اس نے مدارس کی تعمیر کا یہ اہتمام رکھا تھا، کہ جب کوئی امیر یا متمول مسافر لاوارث مر جاتا،

تو اس کے مال و متاع سے مدارس اور خانقاہیں بنوا تا تھا،[۱] تاریخ خان جہان میں ہے کہ اس

نے ان تمام مدارس کو از سر نو آباد کیا، جو گذشتہ تیس سالوں سے پرندوں اور چوپایوں کے

مسکن بنے ہوئے تھے،[۲]

---

[۱] منتخب اللباب خافی خان [۲] تاریخ خان جہان بحوالہ پرو موشن آف مجوکیشن لٹزنگ ص ۱۷۱

شاہجہان

شاہجہان کی نادرۂ کار تعمیری یادگارین اس کے ذوق کی نفاست اور لطافت کی بیّن دلیل ہین، اس کی تمام تکوینی قوتین فنونِ لطیفہ کی اسی شاخ پر صرف ہوئین، اگر ہم بابر کی ذہنی نقش آرائیان اس کی تزک بابری ہین، ہمایون کی تخئیل آرائیان اس کے شعر و شاعری ہین اکبر کی علمی فیاضیان اس کے دربار کی ہنر پرور فضا مین اور جہانگیر کی رنگینیان اس کی تزک جہانگیری مین پاتے ہین، تو شاہجہان کے ذہن کی پرکاریان، اس کے تختِ طاؤس، قلعہ معلّٰی اور روضۂ تاج کے نقش و نگار سے عیان ہین، اس لیے یہ امر موجبِ تعجب نہین کہ اس نے اپنے باپ یا اپنے لڑکون دارا اور اورنگ زیب کی طرح کوئی علمی یادگار نہین چھوڑی، اس کے دماغ کی گل افشانی کاغذ کے صفحات کے بجائے دیوانِ خاص اور دیوانِ عام کی دیوارون پر ہوئی، اس کا حسنِ ذوق علم و ادب کے بجائے جامع مسجد دہلی کی تعمیری ندرت و نفاست مین ظاہر ہوا، اس نے محبت کا ترانہ شعر و شاعری مین نہین بلکہ تاج مین منظوم کیا،

اس کو بابر، ہمایون اور جہانگیر کی طرح علمی انہماک نہ تھا، اس لیے ان کی طرح کوئی علمی تصنیف نہین چھوڑی، لیکن پھر بھی اس کی کتابِ زندگی کا کوئی صفحہ علمی دلچسپیون سے خالی نہین، اس کے دربار کی علمی فضا اور اہلِ علم و سخن کی کیسا تھ اس کی عدیم المثال فیاضیان اور سرپرستیان، پھر دارا شکوہ، جہان آرا، مراد، اور اورنگ زیب کی اعلٰی تعلیم و تربیت اس کے ذوقِ سلیم کی شہادت ہے،

وہ جب چار برس، چار مہینے اور چار روز کا ہوا، تو خاندانی روایات کے مطابق پڑھنے

کے لیے بٹھایا گیا، قاسم بیگ تبریزی، حکیم دوائی گیلانی، شیخ ابوالخیر (برادر علامی ابوالفضل) اور وجیہ الدین گجراتی تعلیم کے لیے مقرر ہوئے، ان باکمال استادوں کی زیرنگرانی شہزادہ خرم نے علوم وفنون کی تکمیل کی، خطاطی میں اس کو بڑی مہارت تھی، محمد صالح کنبوہ لاہوری شاہجہان کی تعلیم وتربیت کے سلسلہ میں لکھتا ہے:۔

"بسے برنیامد کہ بتفصیل تحصیل فصول ابواب دانش نمودہ درجمیع فنون فضائل دقایق نکتہ فہمی را باعلیٰ درجات کمال رسانید، ودرعرض اندک مدتے بے آنکہ کار ربطول کشد، ہیولائے خط نیز صورت درست پذیرفتہ تختۂ مشق از ریختۂ قلم مشکین رقمش چون صفحۂ رخسار نوخطان بحسن خط زینت گرفت"[۱]

ان استادوں میں دوائی گیلانی کی سعی ومحنت زیادہ بارآور تھی، چنانچہ شاہجہان کہا کرتا تھا:۔

"فی الحقیقت حکیم دوائی آموزگار ماست، وحق تعلیم او بر ما از استادان دیگر بیش است"[۲]

تاتارخان جس کو ترکی لغت کی واقفیت میں اعلیٰ کمال حاصل تھا، شہزادہ کی ترکی زبان کی تعلیم کے لیے مامور تھا،[۳] یوں تو اس نے شروع ہی سے اکبر کی سب سے پہلی بیوی خدیجۃ الزمانی رقیہ سلطان بیگم بنت ہندال مرزا کی نگرانی میں پرورش پائی،[۴] جو خالص ترکی زبان بولا کرتی تھی، مگر شاہجہان کو ترکی بولنے کی کبھی مشق نہیں ہوئی، جہانگیر کہا کرتا تھا "کہ اگر کوئی شخص مجھ سے پوچھے کہ خرم میں کیا عیب ہے تو میں کہونگا کہ وہ ترکی زبان نہیں جانتا ہے"[۵] وہ ہندوستانی زبان سے بھی واقف تھا، شاہجہان نے کوئی تصنیف اور نہ رقعات کا مجموعہ چھوڑا، اس لیے اس کی علمی لیاقت کا اندازہ کرنا

---

[۱] عمل صالح موسوم بہ شاہجہان نامہ از محمد صالح کنبوہ جلد اول صا۳ [۲] ایضاً ص۳۲ [۳] ایضاً ص۳۳، [۴] ... بادشاہ نامہ از عبدالحمید لاہوری جلد ا ص۳۰ [۵] تزک جہانگیری،

مشکل ہے، لیکن شاہجہان نامہ میں اس کا ایک رقعہ منقول ہے، جو اس نے تخت نشینی کے بعد دستِ[1] خاص سے لکھکر آصف خان یمین الدولہ کے پاس بھیجا، رقعہ حسب ذیل ہے:۔

"دانائے رموز سلطنت عظمیٰ، واقف اسرار خلافت کبریٰ، سرخیل یکرنگان وفادار، سلالۂ یکجہتان حق گذار، کار فرمائے سیف و قلم، مدبر امور عالم، زبدۂ خوانین عالیشان، قدوۂ امرائے بلند مکان، عضد الخلافت یمین الدولہ، عموی دانا آصف خان، در امان حضرت ملک منان بودہ بدانند، کہ در چہارم گھڑی روز مبارک دوشنبہ بست و ہفتم ماہ بہمن موافق ہشتم جمادی الثانی سنہ ہزار و سی و ہفت ہجری بمبارکی و فیروزی در دار الخلافت اکبرآباد جلوس میمنت مانوس بر تخت سلطنت و سریر خلافت واقع شد، و بدستوری کہ معروض داشتہ بودند، لقب را شہاب الدین قرار دادیم، چنانچہ نام مبارک ما را بعنوان اقبال نشان صاحبقران ثانی شاہجہان بادشاہ غازی درخطبہ کہ درین روز بلند آوازہ گردانیدند، درج نمودند، سکہ ہم بہمین نام مبارک زدہ شد۔"

لِلّٰہ الحمد کہ آن نقش کہ خاطر میخواست

آمد آخر زپس پردۂ تقدیر بیرون

امیدواریم کہ اللہ تعالیٰ این بادشاہی کل ہندوستان بہشت نشان را کہ بمحض کرم خود با عنایت نمودہ بر بادشما کہ شریک غالب دین دولت اید، مبارک گرداند، و روز بروز فتوحات تازہ و نصرتہائے بے اندازہ نصیب ما شود و شما ہم بعمر طبعی رسیدہ از دولت ما مدد عظیم یابید، خدمت پرستی خان آخر روز جمعہ رسید و عرضہ داشت شما را گذرانید، و بعرض

[1] بادشاہنامہ از عبدالحمید لاہوری ج ۱ ص ۱۱۱

[2] شاہجہان نامہ از محمد صالح کنبو ص ۲۶۲، و بادشاہ نامہ جلد اول از عبدالحمید لاہوری ص ۱۱۵، شاہجہان کے بعض اور رقعات بھی نظر سے گذرے، لیکن علمی حیثیت سے وہ بلند نہیں ہیں۔

رسانیدند کہ مقرر نمودہ آمد، کہ روز پنجشنبہ بیست و یکم ماہ بہمن از آنجا روانہ شوند و در روز جمعہ
چہار دہم ماہ اسفندار بملازمت مشرف گردید، این معنی چون دلالت بران می نمود کہ
زمان دریافت ملازمت نزدیک رسید خوشحال شدیم، قرار داد این معنی کہ پادشاہزادہ ہا
کامگار برخوردار را ہمراہ بیاورید، و خواجہ ابوالحسن را در لاہور بگذارید مستحسن افتاد، سروپا
کہ در روز مبارک جلوس میمنت مانوس پوشیدہ بودیم برائے آن عضد الخلافہ فرستادیم
ہر چند کہ ہرچہ بآن عمو عنایت فرمائیم زیادہ از آن گنجایش دارد، اما بالفعل منصب ہشت
ہزاری ذات و ہشت ہزار سوار دو اسپہ سہ اسپہ عنایت نمودیم، و صوبۂ آن بندۂ الٰہی
را بطریق انعام مرحمت فرمودیم، این عنایت ہائے بر شما مبارک باشد"

اس عبارت میں جہانگیر کی تزک کی رنگینی اور روانی ہے، اور عالمگیر کے رقعات کی سلاست و برجستگی، لیکن پھر بھی اس کا کاتب کوئی معمولی استعداد کا آدمی نہیں معلوم ہوتا۔

ایک اور فرمان سے اس کی علمی قابلیت کا اظہار ہوتا ہے، ایک بار کا ذکر ہے کہ شاہجہانی سفرا عراق گئے، تو وہاں کے ایک وزیر نے ان سے دریافت کیا کہ امام غزالی نے تہافت الفلاسفہ میں قدم علم اور نفی علم واجب تعالیٰ کے مسئلہ میں شیخ ابو نصر فارابی اور بو علی سینا کی تکفیر کی ہے، اس کا جواب کیا ہے؟ شاہجہانی سفرا ہندوستان اور سلطنت تیموریہ کے علمی ..... وقار کو قائم رکھنا ضروری سمجھتے تھے، اس لیے انھوں نے شاہجہان کو اطلاع کی، شاہجہان نے اپنے وزیر نواب سعد اللہ خان کو حکم دیا کہ ملا عبد الحکیم سیالکوٹی کو لکھو کہ اس کے متعلق دس پندرہ دن میں ایک رسالہ لکھ کر پیش کریں تاکہ عراق بھیجا جائے، چنانچہ سعد اللہ خان نے ایک فرمان صادر کیا، جس میں لکھا کہ

"درین ہنگام مرحمت انجام کہ [illegible] فضائل و کمالات [illegible] [illegible]

آورد کہ ان افادت و افاضت مرتبت را در بن مسائل مختصر جامع مفیدے کہ مستجمع کلمات حکمای حکما و تاویلات علما و وجہ تکفیر اسلامیین و اقوال ملیین، و مباحثات و مناظرات و شکوک و شبہات و ازالات و اخراجات و اسولہ و اجوبہ و غایت تدقیقات و نہایت تحقیقات و حاصل کلام در ہر باب و اساس سخن در ہر جواب و آن چہ دران ظفر یافتہ باشد و برہان بران قائم شدہ باشد، و احاطہ مسائل متعلقہ بمطلب علم از حصولی و حضوری بودہ و علم و عین عالم و عین معلوم است یا غیر، و تعلق آن بجزئیات بوجہ کلی است یا بوجہ جزئی، و تحریر آنکہ کلیہ و جزئیہ معلوم تابع مدرک و یا تابع مدرک است و نسبۃ الواجب جزئی ست یا نہ، و بیان آنکہ ادراک تعلقی است، نہ احساسی .... الخ"

ایک صاحب نظر کا خیال ہے کہ یہ چیلے شاہجہان کے بنائے ہوئے تھے، چنانچہ عبارت ہذا پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "شاہجہان کی علمی قابلیت کا یہ نمونہ ہے، کہ اس نے اس مسئلہ میں جن امور پر رسالہ لکھوانا چاہا ہے، اس کو چند جملوں میں ادا کر دیا" آگے چل کر پھر لکھتے ہیں کہ "سعد اللہ خان کی علمی استعداد تو مشہور ہی ہے لیکن شاہجہان کی علمی فضیلت بھی اس فرمان سے ظاہر ہوتا ہے، کہ کچھ کم نہ تھی، ظاہر ہے کہ جو شخص کسی علم و فن سے واقف نہ ہو وہ کیا اس کو سمجھ سکتا ہے"[1]

شاہجہان کی علمی لیاقت کا حال ان حکیمانہ اور عالمانہ باتوں سے بھی معلوم ہوتا ہے، جو وہ اپنے درباریوں سے کہا کرتا تھا، عمل صالح جلد اول (ص ۱۵-۱۴ ۵) میں ہے:

ماہ آذر کی چوتھی تاریخ کو بادشاہ کی محفل میں ہر ملک کے علماء جمع تھے، اور شرکاء اپنے اپنے مبلغ علم کے مطابق ہر فن کے تمام مسائل کے متعلق گفتگو کرتے تھے، بادشاہ جو نہایت حکیم اور محقق تھا ہر مسئلہ میں دخل دیتا تھا، اور ہر قسم کی گفتگو کرتا تھا، یہاں تک کہ سلسلۂ سخن ان بادشاہزادوں تک پہنچا جو بادشاہ بھی تھے اور حکیم بھی تھے، ...

[1] لہ معارف نمبر ۲ جلد ۱۰

اثنا رہین یمین الدولہ سکندر کی تعریف اس حد تک کی کہ اتنی طویل مدت مین عقلمندون
کے کسی فرد نے اس بادشاہ کے کسی قول وفعل سے گرفت نہیں کی، بادشاہ نے فرمایا کہ چونکہ
سکندر فیلقوس رومی کی نبوت ثبوت کے درجہ تک نہین پہونچی ہے، اور محققین ائمہ
تاریخ کے قول کے مطابق اسکندر ذوالقرنین دوسرا شخص ہے، اس لیے مجھکو ادب
کے ساتھ اس کے قول وفعل پر دواعتراضات ہیں پہلا یہ کہ دارا کے قاصد کے جواب مین
جب اس نے سونے کے وہ انڈے مانگے تھے جن کو اس کا باپ فیلقوس ہر سال بطور
خراج دیتا تھا تو اس نے کہا کہ

شد آن مرغ کو خایۂ زرین نہاد

اس قسم کی بات اپنے باپ کے متعلق کہنا نہایت بے ادبی ہے، کیونکہ مرغیان نہایت حقیر
جانور ہین اور اسی کے ساتھ انڈا دینا ان کی نسوانیت کو مستلزم ہے، دوسرا اعتراض یہ
ہے کہ اس قاصد کے لباس بین نوشابہ کی مجلس مین جانا دور اندیشی اور احتیاط کے خلاف
تھا، اور یہ طریقہ عقلمندون کے طریقہ سے الگ ہے، کیونکہ عقلمند ایسا کام نہین کرتے
جس سے ان کو پسپائی ہو، حاضرین مجلس نے ان باتون سے اتفاق کیا،

ایک دوسری مجلس کا تذکرہ بھی ملاحظہ ہو:۔

مہینے کی انیسوین تاریخ کو جبکہ تمام حکماء وشعرا دربار مین حاضر تھے، ہر قسم کی گفتگوئین
شروع ہوئین، اور اسی سلسلے مین ایک تقریب سے صوبجات کے ایک دیوانی کے عہدہ دار
کا ذکر آیا کہ وہ کاروبار اور تمام معاملات مین نہایت سخت گیری سے کام لیتا ہے، اعلیٰ
حضرت نے فرمایا کہ کارگذاری کا یہ مناسب طریقہ نہین، کیونکہ کام مین سخت گیری اور
اس کے دائرہ مین تنگی کرنے کا انجام یہ ہوگا کہ کامون کے کرنے مین سستی اور کاہلی ظاہر

ہو گی اور ملک میں فتنہ و فساد پھیل جائے گا، جیسا کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے عہد خلافت میں ہوا، کہ وہ اگرچہ خلیفۂ برحق اور امام مطلق تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کے قول کے موافق حق و صداقت کے ساتھ کام کرتے تھے تاہم کوئی کام ان کی مرضی کے مطابق نہیں ہوا، کیونکہ وہ دین اور دنیا کے کسی کام میں سہل انگاری اور رد و رعایت سے کام نہیں لیتے تھے، اس لیے دنیا کے لوگ جو دین و آخرت کے بالکل مخالف بلکہ سراپا باطل ہیں، اٹھ کھڑے ہوئے، اور فتنہ و فساد برپا کرنا شروع کیا (عمل صالح جلد دوم ص ۲۳۲)،

اسی اثنا میں سید جلال بخاری نے شاہجہان کے ایک ارشاد عالی کا حوالہ دیا کہ دنیا دو پاؤں پر قائم ہے، ایک حق دوسرا باطل لیکن سید جلال بخاری نے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ حق پر قائم ہو، شاہجہان نے کہا کہ حق و باطل ہر زمانہ میں رہا، اور اس سلسلہ میں یہ تقریر کی :-

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تمام کاموں کی بنیاد حق پر تھی، اور تمام ترقیاں اس لیے ہوتی تھیں کہ آپؐ کے وجود کی برکت سے اس زمانہ کے لوگ حق و صداقت پر تھے، اور سب کے دل فطری پاکیزگی اور صفائی کے علاوہ آپ کے مواعظ و نصائح سے پاک و صاف ہو گئے تھے، اس لیے حق و صداقت کے سوا کسی چیز کا نقش ان پر قائم نہیں ہو سکتا تھا، اور باطل کے لیے ان میں کوئی جگہ نہ تھی، اس لیے تمام امور واقعہ کے مطابق حق و صداقت کے ساتھ انجام پاتے تھے، یہی حال خلفائے راشدین کے زمانے کا تھا، کہ جس طرح سورج کے ڈوبنے کے بعد بھی کچھ دیر تک روشنی قائم رہتی ہے، اسی طرح آفتاب نبوت کے ڈوبنے کے بعد بھی خلفائے راشدین کے زمانے کے لوگوں کے دلوں پر بھی غفلت کا زنگ لگنے نہ پایا، لیکن جب رفتہ رفتہ لوگوں کے حالات بدل گئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے بالکل بعد ہو گیا اور لوگوں کے دل زنگ خوردہ ہو گئے، نوبت یہاں تک

پہونچی کہ سبہ کار ظالموں نے حضرت عثمانؓ ذی النورین کی شمع زندگی کو بجھا دیا، اور اس
حالت میں دنیا حق و صداقت پر قائم نہ رہ سکی، اسی بنا پر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو اقامت
حق میں جو ان کا مقصود تھا کامیابی نہ ہو سکی" (عمل صالح جلد دوم ص ۲۴۲)

شاہجہان شاعر تو نہ تھا، مگر شعر و شاعری سے اس کو غیر معمولی مناسبت تھی، جیسا کہ آیندہ صفحات
سے اندازہ ہوگا، جب ہم شعراء کے ساتھ اس کی قدردانی کی تفصیل بیان کریں گے، مگر ایک بار اس نے
شہزادہ اورنگ زیب کو ایک رباعی لکھکر اپنی پدرانہ محبت کا جو ثبوت دیا تھا، اس کا یہاں پر ذکر
کرنا شاید بے جا نہ ہوگا، اورنگ زیب کی شادی کی تقریب انجام پانے والی تھی، اورنگ زیب دولت آباد
سے چل کر دہلی آیا تو نور منزل میں مقیم ہوا، شاہجہان اس مسرت و انبساط کے جشن کے موقع پر غایت
اشتیاق میں بیٹے سے جلد از جلد ملنا چاہتا تھا، اس لیے کلیم کی یہ رباعی اپنے ہاتھ سے لکھ بھیجی:

تا تاختہ پیش از خبر آئی چہ شود	باعزوہ اگر زود در آئی چہ شود
از زود اگر زود تر آئی چہ شود[1]	زود آمدنت نظر بشوقم دیر است

شاہجہان اپنے گوناگون مشاغل کے باوجود روزانہ کتابوں کا مطالعہ جاری رکھتا تھا، جب
تمام کاموں سے فارغ ہو کر رات کو سونے جاتا، تو اس کے مقربان خاص پردہ کے پیچھے سے کتابیں
پڑھتے تھے، جو زیادہ تر انبیاء، اولیاء، وسلاطین کی سوانحعمریاں اور تاریخیں ہوتیں، وہ ظفرنامہ اور
واقعات بابری کو بہت پسند کرتا تھا[2]

اس کا گھر خود علم و ادب کا گہوارہ تھا[3]، اس کے دربار میں علمی شان و شوکت، دیرینہ
روایات کے ساتھ قائم رہی، وہ اہل علم و فضل کو کن نظروں سے دیکھا کرتا تھا، یہ ذیل کے پند و نصائح

[1] عمل صالح جلد دوم ص ۴۴۲ [2] بادشاہنامہ اول ص ۱۵۰، [3] شاہجہان کی اولاد کی علم نوازی کا حال
ہم تیموری شہزادوں اور شہزادیوں کے علمی ذوق کے سلسلے میں لکھیں گے،

سے معلوم ہوگا، جو اس نے اپنی بیاض خاص میں لکھ رکھی تھیں،

"رو ندادن بمردم بد، نرنجیدن بعدم حصول مقصد، نرنجانیدن مردم خوب مزاج ، در خواستن بکمال احتیاج صحبت داشتن باہل معاد جستجو کردن قابلان با ستعداد، بانہ [نہادن] پیش خود بمردم جہان، دادن پایہ باستحقاق بقدر توفیق پیش از سوال، بکرم داشتن اہل فضل مصروف نمودن مزاج بعدل میل نکردن باقوال غیر عقائد، بے خبر نبودن از احوال متوکلان بے مکائد، غنیمت داشتن وجود نگاہبانان کہ بیگانہ از خلق باشند، پیش داشتن جمیعکہ مصالح امور دنیا وعقبیٰ بودند"

یہ نکات علمی اور عملی حیثیت سے کس قدر سبق آموز ہیں، عالمگیر نے ان کو شاہجہان کی بیاض سے نقل کرکے اپنے فرزند عالیجاہ شاہزادہ معظم کو بطور نصیحت لکھ بھیجا تھا،[1]

شعراء | اکبر اور جہانگیر نے شعراء کی سرپرستی میں جو شاہانہ فیاضیاں کیں، ان کے غلغلہ سے ہندوستان اور ایران گونج رہا تھا، ایران سے شعراء ہندوستان اٹے چلے آرہے تھے، اور بقول مولانا شبلیؒ ایران اور ہندوستان ایک مکان کے دو صحن بن گئے تھے، چنانچہ شاہجہان کے دربار میں بھی شعراء کی تعداد بکثرت رہی، وہ اپنی فیاضی و قدردانی میں اکبر اور جہانگیر دونوں سے بازی لے گیا، اس نے شعراء و فضلاء کے ساتھ جو داد و دہش اور انعام و اکرام کا ثبوت دیا ہے اس کی زرین مثال شاید ہی کسی حکمران خاندان میں پائی جائے گی۔

لطف اللہ مہندس[2] نے جو دارا شکوہ کے مقربان خاص میں تھا، شاہجہانی شعراء کے نام مندرجہ ذیل اشعار میں نظم کیے ہیں:-

---

[1] وقائع عالمگیری مرتبہ چودھری نبی احمد سندیلوی۔ [2] لطف اللہ مہندس کے حالات کے لیے دیکھو مضمون "تاج محل اور لال قلعہ کے معمار" از علامہ سید سلیمان صاحب ندوی، معارف فروری و مارچ، اپریل ۱۹۳۳ء

وحید دہر امانی بن مہابت خان — ولے سحبان زبان است شہرۂ دوران

دگر یگانہ ظفر خان تخلص احسن — ربودہ گوئے سخن از سخنوران دکن

دگر وحید زمن آشنا عنایت خان — بود بحر سخن آشنا عنایت خان

دگر وحید زمن شادمان غم پرور — بیان شادی و غم در کلام او مضمر

دگر سخنور کشمیر محسن فانی است — بقائے نام وے از دولت سخندانی است

سپہر سیادت یگانہ میر عماد — کہ بود در غزل و مدح و مثنوی استاد

لبیب عصر محمد حسین آشوب است — سخنورے کہ سخنہاش جملہ مرغوب است

دگر وحید زمان ہست طالبائے کلیم — کہ شعر او ید بیضا است نزد طبع سلیم

دگر فرید جہان قدسی محمد خان — بعہد شاہجہان گو ربودہ از اقران

الٰہی ہمدانی است در سخن استاد — سخنورے است کہ داد سخنوری می داد

لبیب از منہ امی نخواند ہیچ کتاب — ز فیض حق شدہ مفتوح بر رخش صد باب

دگر وحید زمن باقیا ترانہ او — خوش است ہمچو غزلہائے عاشقانہ او

فصیح از منہ تنہا کہ چون غزل می گفت — چو غنچہ لبیب غزلخوان در و گہر می سفت

اس چمنستان شعراء کا گل سرسبد حاجی محمد جان قدسی تھا، جس کو تمام انواع سخن پر قدرت حاصل تھی، مشہد کا رہنے والا تھا، مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں تعلیم پاکر ہندوستان آیا، خواجہ عبداللہ خان زخمی کی مدح میں، جو ہفت ہزاری منصب کا شاہجہانی امیر تھا، ایک قصیدہ کہا، عبداللہ سفر میں تھا، قدسی نے قصیدہ پڑھا، تو عبداللہ خان اس قدر متاثر اور محظوظ ہوا کہ اپنی مسند سے اٹھ گیا، اور قدسی کو اپنی جگہ پر بٹھایا، پھر باہر نکل کر اپنا خیمہ اس کے تمام متعلقات اور لشکر کی تمام چیزیں

لہ دیکھو مضمون ہٰذا و فہرست کتب خانہ شاہ اودھ از ڈاکٹر اسپرنگر ص ۱۱۷

قدسی کو انعام میں دیدیں، سنہ ۱۰۴۲ھ[1] میں قدسی شاہجہان کی خدمت میں حاضر ہوا، اور ایک قصیدہ کہا جس کے کچھ اشعار یہ ہیں:

اے قلم برخود ببال از شادی یکجا زبان — در ثنای قبلۂ اقبال خاقان زمان

شہریار اول شہاب الدین محمد کز ازل — از برائے خدمتش زد چرخ دامن بر میان

اختر برج کرامت مظہر لطف الٰہ — جوہر تیغ شجاعت مصدر امن و امان

آنکہ از آغاز فطرت بستہ شہپا زظفر — چون عقاب تیر بر شاخ کمانش آشیان

گر مخالف ور موافق از ولایش دم زنند — با بد و نیک است چون خورشید گرم و مہربان

سرمۂ چشم غزالان سازد از داغ پلنگ — سازگاریہای عدلش چو نہد پا درمیان

شہرت آثار عدلش زود برخواہد گرفت — تہمت زنجیر عدل از گردن نوشیروان

خوش نشست از نقش پایش نقش ہفت اقلیم — ربع مسکون گو دگر بنشین بعیش جاودان

آفتابی ہمچنین طالع نہ شد در ہیچ قرن — از زمان حضرت صاحبقران تا این زمان

بجز دولت کہ بیند با تو خود را در رکاب — مرحبا نصرت کہ باشد با تو و ہم عنان[2]

مراۃ الخیال کے مؤلف کی روایت ہے کہ اس قصیدہ کے صلہ میں شاہجہان نے قدسی کے منہ کو سات دفعہ جواہرات سے بھرا، اصل عبارت کا لفظی ترجمہ یہ ہے:

"چند روز کے بعد (یعنی عبد اللہ خان سے انعام پانے کے چند دن کے بعد) محمد جان نے صاحبقران ثانی کی مدح میں اور بھی زیادہ رنگین قصیدہ لکھکر سنایا، بادشاہ عبد اللہ خان کی بخشش کا حال سن چکا تھا، اس نے کہا کہ حاجی! عبد اللہ خان نے تم کو جو انعام دیا ہے وہ کوئی اور نہیں دے سکتا ہے لیکن اس نے جواہرات کی تھیلیاں نہیں طلب کیں،

لہ مراۃ الخیال صفحہ ۱۲۳ ؎ عمل صالح جلد ۲ صفحہ ۹ - ۳۰۸

اور حکم دیا کہ اس کا (یعنی قدسی کا) منہ سات بار ان موتیوں سے پر کیا جائے، سامنے سونے کا طشت رکھا ہوا تھا، قدسی کا منہ بھر جاتا تو اس طشت میں موتیوں کو گرا دیتا تھا (ص۱۷۱)

اس قصیدہ کے بعد شاہجہان نے قدسی کو اپنے دربار سے منسلک کر لیا، جہان سے اس کو روزانہ وظیفہ ملتا تھا، اور جب اس نے دربار میں اپنی شاعری و نکتہ سنجی کا سکہ بٹھا دیا، تو ملک الشعراء کے خطاب سے سرفراز کیا گیا، ۱۰۵۲ھ میں اس نے جشن نوروز کے موقع پر ایک قصیدہ لکھا جس کو شاہجہان نے بہت پسند کیا، انعام میں اس کو روپے میں تلوایا جو وزن میں پانچ ہزار پانچ سو تھے[۱]۔ ۱۰۴۹ھ میں قدسی کو کچھ اشعار کے صلہ میں سو اشرفیاں مرحمت ہوئیں، جہان آرا بیگم کی صحت یابی کے موقع پر قدسی نے ایک قصیدہ کہا تو شاہجہان نے دو ہزار روپے عطا کئے[۲]، جہان آرا بیگم کے جلنے کے موقع پر قدسی نے ایک رباعی لکھ کر گذرانی، اس کی آخری بیت یہ ہے (کلمات الشعراء)

ناسر زدہ از شمع چنین بے ادبی   پروانہ ز عشق شمع واسوختہ است

قدسی کا انتقال ۱۰۵۶ھ میں ہوا، طالب کلیم نے ایک مرثیہ لکھا جس کے ایک ترکیب بند سے تاریخ نکلتی ہے، ع دور از ان بلبل قدسی چمنم زندان شد،

قدسی نے ایک مثنوی "تعریف کشمیر و صعوبت راہ" بھی لکھی، (کلمات الشعراء قلمی نسخہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی)

قدسی کا مد مقابل ابو طالب کلیم تھا، کلیم کاشان کا رہنے والا تھا، جہانگیر کے عہد حکومت میں ہندوستان آیا، لیکن ۱۰۲۸ھ میں وطن واپس چلا گیا، پھر ہندوستان آیا، جہانگیر

---

[۱] بادشاہ نامہ جلد اول حصہ دوم ص ۱۴۲ [۲] عمل صالح حصہ دوم ص ۱۸۱، سرو آزاد (ص ۶۲) میں ہے کہ قدسی بادشاہ نامہ را بطرز ثانی بنظم اوردہ"، تذکرہ سرخوش میں ہے کہ "ظفر نامہ شاہجہان با حسن وجوہ وطرز دلخواہ بفصاحت و بلاغت تمام ادا کردہ"

کے دربار میں ملک الشعراء طالب آملی کے مقابلہ میں اگرچہ کوفروغ حاصل نہ ہوسکا، لیکن شاہجہان کے عہد میں کلیم کا کلام شعلۂ طور بن کر چمکا، اس کے اشعار کے حسنِ تعلیل، خیال بندی، ترکیبوں کے سلجھاؤ، روزمرہ کی صفائی، محاورات کی برجستگی، شستگی اور روانی سے اس عہد کی شاعری جگمگا اٹھی، اسی لیے شاہجہان کے دربار سے اس کو ملک الشعراء کا خطاب ملا سنہ ۱۰۴۴ھ میں جب شاہجہان نے ایک کروڑ روپیہ کی لاگت سے تختِ طاؤس تیار کرایا، اور آگرہ میں جشنِ نوروز کے موقع پر اس پر جلوس کی رسم ادا کی تو دربار کے شعراء نے اس تقریب میں قصائد کہہ کر اپنی لیاقت و ذہانت کا ثبوت دیا، کلیم نے بھی ایک قصیدہ کہا جس کے جستہ جستہ اشعار ملاحظہ ہوں،

خجستہ مقدمِ نوروز و غرہ شوال   فشاندہ اند گلِ عیش بر سر مہ و سال

بچشمِ مردمِ دار الخلافہ عید نویست   غبار موکب شاہجہان جہان جلال

شرف پذیرد نوروز چنین عیدی   کہ بادشاہ نشیند بہ تختِ استقلال

بوصفِ تختِ مرصع گہر فشان گشتم   خدا نصیب کند عمرِ خضر و طولِ مقال

ہزار سیلان یاقوت صد بدخشان لعل   بروئمائی گرفت است تا نمود جمال

توان ز آتشِ یاقوت آن چراغ افروخت   کہ نے ز باد رسد آفتش نہ ز آبِ زلال

فتادہ پرتوِ یاقوت و لعل بر الماس   چنانچہ عکسِ چراغان فتد در آبِ زلال

زمردیش تازہ تر ز سبزۂ نو   کہ اجتماعِ نقیضین را شمردہ محال

طلاے تخت شدی آب ز آتشِ یاقوت   اگر نہ قطرہ فشانی می شدی زلال لال

بہانہ ارد دو دیگر ہر آنچہ خواہی ہست   ز شان و شوکت و فرو شکوہ و حسن و جمال

شاہجہان کو یہ قصیدہ اس قدر پسند آیا کہ کلیم کو اس کے صلہ میں روپے کے برابر تلوایا، جو ۵۵۰۰ وزن میں آئے، اور اس کو عطا کیے، سنہ ۱۰۴۴ھ میں جشنِ وزنِ شمسی کے موقع پر شاہی خزانہ سے کلیم کو کچھ

۱؎ بادشاہ نامہ حصہ ۲ ص ۸۳، عمل صالح ج ۲ ص ۱۰۶، ۸۹

اشعار کے صلہ میں ایک ہزار روپے ملے، ۱۰۴۹ھ میں کلیم شاہجہان کے ساتھ کشمیر گیا، اس جگہ کی دلآویزیون اور رنگینیون کو دیکھ کر فریفتہ ہوگیا، بادشاہ سے وہان قیام کی اجازت چاہی، جو منظور ہوئی، یہین بیٹھکر شاہی فتوحات منظوم کرتا تھا، جس کے لیے کلیم کو سالانہ وظیفہ ملتا تھا،

۱۰۵۵ھ میں شاہجہان پھر کشمیر گیا، تو کلیم نے تہنیت کا قصیدہ لکھکر پیش کیا، جس کے انعام مین خلعت اور دوسو اشرفیان پائین، شاہجہان جب واپس ہونے لگا، تو کلیم نے پھر ایک قصیدہ کہا، اور دوسو اشرفیان پھر انعام مین ملین،[۱] کلمات الشعراء، مؤلفہ سرخوش میں ہے کہ قیصر روم نے شاہجہان کو خط لکھکر یہ اعتراض کیا کہ صرف ہندوستان کا بادشاہ ہوکر شاہجہان کا لقب اختیار کرنا صحیح نہیں، اس اعتراض پر شاہجہان بھی کچھ پریشان ہوا، اور یمین الدولہ سے اپنے لقب کو بدلنے کے لیے مشورہ کرنے والا تھا، کہ کلیم نے ایک قصیدہ لکھکر پیش کیا، جس مین لقب کی یہ توجیہ کی،

هند و جهان ز روی عدد هر دو چون یکیست[۲]   شه را خطاب شاه جهانی مبرهن است

شاہجہان نے خوش ہوکر روپے مین اس کو تلوا دیا،

کلیم نے بہت سے قصائد کہے،[۳] ان قصائد مین طبیعت کا اصلی زور تشبیب خصوصاً بہاریہ تمہید

---

[۱] بادشاہ نامہ جلد دوم ص۴۹۹، نیز شعر العجم حصہ سوم، مآثر الکرام دفتر ثانی ص۸ [۲] یہ شعر اس طرح بھی نقل کیا گیا ہے

هند و جهان ز روے عدد چون برابر است   بر شه خطاب شاهجهان زان مقرر است

[۳] مولانا شبلی شعر العجم حصہ سوم (ص۱۷۲) مین اس کے ایک قصیدہ کا کچھ حصہ نقل کرتے ہین، جو شاید شاہجہان ہی کی شان مین کہا گیا تھا، اس کی جدت آفرینیان ملاحظہ ہون

بهدش آنچنان در خواب امن است   که بادبان سبا سنه پاسبان را

ملکش راه زن باشند جاده   بمنزل میرساند کاروان را

(باقی حاشیہ صفحہ ۱۸۳)

مین صرف کرتا تھا، مگر بقول مولانا شبلی کلیم کا اصلی کمال غزل گوئی ہے[۵] اس کا خاص رنگ مضمون بندی اور خیال آفرینی ہے، اس کا ہر شعر قوت تخیل کا ایک منظر ہے، جب اس کا انتقال ہوا تو غنی کشمیری نے تاریخ وفات یہ کہی

گفت تاریخ وفات او غنی　　　طور معنی بود روشن از کلیم
۱۰۶۱ھ

کلیم نے بہت سی مثنویاں بھی لکھیں، تعریف اکبرآباد، قحط دکن، صعوبت دکن کے علاوہ ایک مثنوی بادشاہ نامہ بھی قلمبند کی، جس مین عہد شاہجہانی کے ۱۰۴۶ تک کے حالات ہین، یہ شاید قدسی کی مثنوی ظفرنامہ شاہجہانی کے تتبع مین لکھی گئی جس مین ۱۰۴۱ تک کے واقعات ہین،

(بقیہ حاشیہ ص) بعہد عدل او وا پس ستانند　　　چمن از خاک زرہاے خزان را

کفش بر داخت کان گوہر وزر　　　فلک برچید آخر این دکان را

درون شیشۂ افلاک بینی　　　لبالب ہم فضاے آسمان را

(حاشیہ صفحہ ہذا) [۵] مراۃ الخیال ص ۷۶-۱۷۵ میں کلیم کی کچھ منتخب غزلین منقول ہین، ان مین سے ایک ہم بھی ناظرین کی ضیافت کے لیے پیش کرتے ہیں،

پیری رسید و مستی طبع جوان گذشت　　　ضعف تن از تحمل رطل گران گذشت

وضع زمانہ قابل دیدن دوبارہ نیست　　　رو پس نکرد ہر کہ ازین خاکدان گذشت

در راہ عشق گریہ متاع اثر نداشت　　　صد بار از کنار من این کاروان گذشت

طبعی بہم رسان کہ بسازی بعالمی　　　یا ہمتی کہ از سر عالم توان گذشت

در کیش ما تجرد عنقا تمام نیست　　　در قید نام ماند اگر از نشان گذشت

بدنامی حیات دو روزی نبود بیش　　　آنہم کلیم با تو بگویم چسان گذشت

یکروز صرف بستن دل شد باین و آن　　　روز دگر بکندن دل زین و آن گذشت

کلیم کو شاہجہان کی فرمائش پر شعر کہنے کی قدرت اتنی حاصل تھی کہ اس نے شاہی تخت مرصع، شاہی سپر، شاہی شمشیر اور شاہی قلمدان پر اشعار کہے، شاہجہان نے اپنی ہر چیز پر اس کے اشعار کندہ کرا دیے تھے، (کلمات الشعراء قلمی نسخہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی)

ظفر خان احسن کو شاہجہانی عہد کا عبد الرحیم خانخانان سمجھنا چاہیے، مجمع النفائس میں ہے:[۱]

"بعد از عبد الرحیم خانخانان مثل او از امرائے ہند یہ نشان ندارد"

نام اصلی احسن اللہ، تخلص احسن اور ظفر خان خطاب تھا، اس کا باپ خواجہ ابو الحسن تربتی خراسان سے اکبر کے زمانہ میں ہندوستان آیا، شہزادہ دانیال کا وزیر اور دکن کا دیوان مقرر ہوا، جہانگیر کے زمانہ میں پہلے میر بخشی پھر دیوان کل کے عہدہ پر مامور ہوا، اور پنج ہزاری منصب سے سرفراز کیا گیا، کابل کا حاکم بھی مقرر ہوا، شاہجہان کے زمانہ میں شش ہزاری و شش ہزار سوار کا منصب اور کشمیر کا علاقہ عطا ہوا، اس کے مرنے کے بعد احسن اللہ شاہانہ عنایت سے مستفیض ہوا، جہانگیر کے زمانہ ہی میں وہ باپ کی جگہ کابل کا حاکم، اور ظفر خان کے خطاب سے سرفراز کیا جا چکا تھا، شاہجہان نے خواجہ ابو الحسن کی زندگی ہی میں ظفر خان کو کشمیر کی حکومت تفویض کی، جہاں سے اس نے تبت پر فوج کشی کی، کچھ دنوں ٹھٹھ کا بھی حاکم رہا، وہ ایک بلند پایہ شاعر بھی تھا، مرزا صائب سے مشق سخن کرتا ...... رفتہ رفتہ اس کا ذوق اتنا بڑھا کہ خود مرزا صائب اس کی سخندانی کا مداح ہو گیا، جب صائب کے کلام پر نکتہ چینی کرتا تو خود صائب اس کی داد دیتا، چنانچہ صائب ظفر خان کو مخاطب کر کے ایک قصیدہ میں کہتا ہے:

تو جان ز دنقل بجا مصرع مرا دادی　　تو از فصاحت دادی خطاب سحبانم

صائب کو ظفر خان کی مداحی پر فخر تھا، اس کی شان میں بہت سے قصائد کہے، ظفر خان

---

[۱] مجمع النفائس قلمی نسخہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی

بھی اس کا بڑا قدردان تھا، ارباب علم کے ساتھ اس کی فیاضی مشہور تھی، مآثر الامرا جلد ۲ (ص ۱۷۶) میں ہے،

"ظفر خان ایرانیوں کو بکثرت روپے دیتا تھا خصوصاً شعراء کے ساتھ خوب بذل و کرم کرتا، صاحب استعداد شعراء اپنے وطن سے دل برداشتہ اس کی بارگاہ میں پہنچتے، اور جن احسانات کی توقعات کے ساتھ آتے، وہ پوری ہوتیں، افصح المتاخرین مرزا صائب تبریزی ایران سے کابل آیا تو اس کی (یعنی ظفر خان کی) گرمجوشی اور فیاضی سے اس کی صحبت میں اس کی دلبستگی ایسی ہوئی کہ مدتوں ظفر خان کے ساتھ ہندوستان میں رہا، چنانچہ کہتا ہے،

خان خانان را بہ بزم و رزم صائب دیدہ ام
در سخا و در شجاعت چون ظفر خان نیست نیست

ظفر خان کے ذوق شاعری کا اندازہ اس سے بھی ہوگا کہ وہ اپنے عہد کے تمام شعراء مثلاً صائب، کلیم، قدسی، سعیدای زرگری، سالک یزدی، سالک قزوینی، دانش اور میر صیدی وغیرہ کے کلام کو ایک بیاض میں ہر ایک کے دست خاص سے لکھوایا تھا، اور ہر ایک کی تصویر اس کے ساتھ منسلک کرائی تھی[1]، وہ خود بھی صاحب دیوان تھا، میر غلام علی آزاد بلگرامی نے اس کے دیوان سے مآثر الکرام جلد دوم (ص ۹۹) میں حسب ذیل اشعار منتخب کئے ہیں؛

دلم بکوی تو امیدوار می آید ‌ ‌ ‌ نگاہ دار کہ روزنے بکار می آید

درگوشۂ میخانہ سخن گفت و شنید است ‌ ‌ ‌ [illegible]

[illegible] ‌ ‌ ‌ [illegible]

[1] مآثر الامرا جلد دوم ص ۱۶۵ ، تجلی دلکشا [illegible]

شادم بدل تنگی خود کہ پیش من | قدر دل شکستہ چو زلف شکستہ است
گوشۂ چشمی اگر ساقی بما دارد بجاست | عمرہا در گوشۂ میخانہ خدمت کردہ ام

ظفرخان نے دو مثنویاں بھی لکھیں، ایک لاہور، پنجاب، کشمیر اور آگرہ وغیرہ کی تعریف میں تھی، دوسری مثنوی کا نام میخانۂ راز تھا[1]

مرزا محمد طاہر آشنا۔ ظفرخان کا لڑکا تھا، اس کی ماں بزرگ خانم ممتاز محل کی بڑی بہن ملکہ بانو کی لڑکی تھی، شاہجہان نے اس کو بہت ہی کم عمری میں یعنی جب وہ صرف سات سال کا تھا منصب عطا کیا، اور جب سن شعور کو پہنچا تو ہزار و پانصدی کے منصب پر مامور ہوا، اور اسی کے ساتھ "داروغہ حضور" بنایا گیا، یہ عہدہ صرف خاندان کے معتبر اراکین کیلئے مخصوص ہوتا تھا، شاہجہانی عہد کے آخر میں وہ شاہی کتب خانہ کا داروغہ مقرر ہوا، شاہجہان نے اس کو ہمیشہ اپنا ندیم خاص بنا کر رکھا، آشنا نے اپنی عمر کا آخری حصہ کشمیر میں گذارا، عالمگیر کے زمانہ میں اس کو چوبیس ہزار روپے سالانہ کا وظیفہ ملتا تھا، باپ سے شعر و شاعری کا ذوق وراثت میں پایا تھا، مآثر الامراء میں ہے:

"در معنی بندی و سخن سنجی استاد است، صاحب مثنوی و دیوان"[2]

تذکرہ نصرآبادی کا مولف رقمطراز ہے:

"بڑا سمجھدار جوان تھا، لیکن طبیعت میں شوخی تھی، اپنے دوستوں مثلاً ابوطالب کلیم اور دوسرے شعراء کو اپنے گھر میں بلاتا، اور کھانے کی چیزوں میں نشہ آور چیزیں ملا دیتا، .... مجھ پر بھی وہ مہربان تھا، اور اس سے غائبانہ ملاقات تھی، کئی بار خط بھی لکھا، اپنا دیوان، خسرو کی غزلیات اور دوسری کتابیں بھی میرے پاس بھیجیں، شاعری میں اس کو

---

[1] فہرست کتب خانہ شاہ اودھ ص ۲۲۶، [2] مآثر الامراء جلد دوم ص ۷۶۲،

بڑی قدرت تھی، آشنا تخلص کرتا تھا، سنا ہے کہ دو سال ہوئے اسکا انتقال ہوگیا ہے،
یہ لکھکر آشنا کی رباعیاں اور اشعار بھی نقل کیے ہیں، مثلاً شاہی آئینہ خانہ کی تعریف
مین وہ کہتا ہے:

حبذا این نشیمن والا	کہ بود رشک عالم بالا
دل ز کلک برد حسن دلجویش	طاق آئینہ چشم و ابرویش
کردہ بناے این نکو منزل	از یک آئینہ اش تمام چو دل

ایک غزل کے دو شعر ملاحظہ ہون:

چشم آن لحظہ کہ در ہجر تو بیمار شود	خار پشت مژدہ ام غیرت گلزار شود
عقل ناچار کشد زحمت آلایش نفس	دایہ پرہیز کند طفل چو بیمار شود

ایک رباعی بھی سننے کے قابل ہے:

کم ظرف ز عشق خرمن ہستی سوخت	پر حوصلہ نور زندگانی افروخت
کاہید خرد ز عشق و افزود جنون	از باد چراغ مردہ آتش افروخت[۵۱]

کشمیر پر ایک مثنوی بھی لکھی[۵۲] ایک ساقی نامہ بھی اس کی طرف منسوب ہے، وہ جب
شاہی کتب خانہ کا نگران تھا، تو عبد الحمید لاہوری اور محمد امین قزوینی کی تاریخون کا ایک
ملخص تیار کیا، جس مین شاہجہانی عہد کے پہلے تیس سال کے حالات تھے[۵۳] الیٹ نے شاہجہان نامہ
کے نام سے اس کے اقتباسات جلد ہفتم مین دیے ہین،

جہانگیری عہد کے جلیل القدر امیر اور شاہجہان کے مربی مہابت خان سپہ سالار کا لڑکا

---

[۵۱] تذکرہ نصرآبادی ص ۵۹-۵۸ [۵۲] فہرست کتبخانہ شاہ اودھ ص ۳۳۹ [۵۳] برٹش میوزیم کیٹلاک، فارسی
مخطوطات جلد اول ص ۲۶۱

مرزا امان اللہ بھی صاحب علم اور صاحب سخن تھا، امانی تخلص کرتا تھا، جہانگیر کے زمانہ میں اس کو سہ ہزاری منصب اور خانہ زاد خان کا خطاب ملا، شاہجہان نے اس کو پنجہزار سوار کا منصب اور خان زمان کا خطاب عنایت کیا، مختلف اوقات میں وہ کابل، بنگالہ، مالوہ اور دکن کا صوبیدار رہا، شجاعت و سپہگری کے علاوہ علوم و فنون کی سرپرستی کے لیے بھی مشہور تھا، اس کی کئی تصنیفیں تھیں، تاریخ سلاطین عالم، مجموعۂ گنج بادآورد، اور ایک دیوان تھا[۱] اس کی سخن سنجی کی داد تذکرہ نگاروں نے دی ہے، تذکرہ نصر آبادی میں ہے (ص ۵۹)

"شورش خالی از لطفی نیست۔"

آزاد بلگرامی ید بیضا میں لکھتے ہیں:

"درواوی شعر نہایت خوش سلیقہ است۔"

مرزا محمد طاہر نصر آبادی نے اس کے جو اشعار پسند کئے ہیں ان میں سے بعض یہ ہیں:

تا نام ما بود و بماند نہ جام ما	بر دور جام ما بنویسید نام او
این بس کہ دور جام نگردد بکام ما	دوران اگر بکام نگردد گلہ نکرد
نشست شو از آب حیوان می دہم این مردہ را	ہر نفس از گریہ می شویم دل افسردہ را

(رباعی)

در پہلوی عندلیب جا می خواہم	بیگانہ خوشیم آشنا می خواہم
تحریک نسیمی از صبا می خواہم	چون غنچہ ہیای شگفتن شدہ ام

سلطان شادمان۔ پنجاب اور حسن ابدال کے درمیان بسنے والی قوم گکھر کے حکمران خاندان کی نسل سے تھا، مرأۃ الخیال کا مصنف اس کو ایک "عالی فطرت" اور "نیکو بیان" شاعر کہتا ہے، اس کی زبان میں لکنت تھی، مگر شاہجہان کو اس کا کلام بہت پسند تھا اسی وجہ سے اس کو انعام و اکرام

---

[۱] ماٰثر الامراء جلد اول ص ۷۴۸

سے مالامال کرتا رہتا تھا۔[1] جب تخت طاؤس تیار ہوا تو قدسی، کلیم اور دوسرے درباری شعراء کے ساتھ شاداں نے بھی ایک قصیدہ کہا جو پسند کیا گیا، اور وہ یہ ہے:

صبحدم کز فیض گشتم ہمنشین آفتاب — نقش نام شاہ دیدم در نگین آفتاب

شاہ دین پرور شہاب الدین محمد بادشاہ — ثانی صاحب قران، مہ قرین آفتاب

تا قرین آفتابش گفتہ ام ہستم خجل — زانکہ باشد سایۂ حق برترین آفتاب

مجمر وصف سریرش بین کہ میکارم ندوق — تخم گلہائے مدیحش در زمین آفتاب

تخت شاہنشاہ ما زآب گہر پیدا کند — موج دریائے خجالت بر جبین آفتاب

صفحۂ اشعار من از وصف تخت پادشاہ — چون ید بیضا بود در آستین آفتاب

روئے اورنگ شہنشہ زآب و تاب لعل و در — خیرگی بخشد بچشم دوربین آفتاب

خوبی اعجاز مدح شاہ را نازم کہ ساخت — از بلندی معنی من دلنشین آفتاب

شاد مان ظل شہنشہ بر جہان پایندہ باد — تا بود نقش فلک در زیر زین آفتاب[2]

شیخ محمد محسن **فانی** کشمیری ملا طاہر غنی کشمیری کے استاد تھے، جو ان کے علمی کمالات کی بہت بڑی دلیل ہے، مرآۃ الخیال میں ہے

"سالک مسالک نکتہ دانی شیخ محسن فانی فاضل متبحر و صاحب جاہ و پاکیزہ روزگار و خوش گو و خوش صحبت بودہ" (ص ۲۵۴)۔

ید بیضا میں آزاد بلگرامی لکھتے ہیں

از اہالی کشمیر است، درویشی صوفی مشرب صاحب ذوق بودہ، غنی کشمیری بخدمتش وی

۱؎ مرآۃ الخیال ص۲۵۲ میں ہے: شاداں باوجود لکنت زبان طبعی نو آئینی داشت و صاحب قران ثانی با نکہ بسیار خوش بودہ مورد التفاتات فاخرہ می گردانید۔ ۲؎ ایضاً ص۲۵۲

کسب کمالات کردہ"۔

صبح گلشن (ص ۳۰۰) میں ہے:

"دی در اکثر علوم علم یکتائی می افراشت"

دارا شکوہ کے بھی ندیم خاص رہے، اور اس کے یہاں بڑی ثروت و عظمت حاصل کی، شاہ جہان نے الہ آباد کی صدارت تفویض کی، یہاں حضرت شیخ محب اللہ الہ آبادی قدس سرہ سے سلوک کی تعلیم پائی، اور تصفیۂ دل اور تزکیۂ باطن کی نعمت سے سرفراز ہوئے، مگر جب نذر محمد خان والی بلخ و بخارا کو شاہی فوجوں سے شکست ہوئی تو اس کے مال و اسباب میں شیخ فانی کا ایک دیوان بھی پایا گیا، جس میں اس کی شان میں ایک قصیدہ بھی تھا، شاہجہان کو یہ بات ناگوار ہوئی، اور شیخ فانی کو صدارت کے عہدہ سے معزول کر دیا، لیکن ان کے علم و فضل کی قدر کی، اور سالانہ وظیفہ مقرر کر دیا، فانی نے بقیہ عمر کشمیر میں گزاری، ان سے فیضیاب ہونے کے لیے ان کے یہاں امرار اور تلامذہ کا ہجوم رہتا تھا، ان کے کلام میں بڑی رنگینی، روانی اور لطافت ہوتی تھی، مثال کے طور پر ہم ایک قصیدہ پیش کرتے ہیں، جو انھوں نے شاہ جہان کی مدح میں کہا تھا، اس میں ہندی الفاظ اس طرح استعمال کئے گئے ہیں کہ ان کی وجہ سے قصیدہ میں قبح کے بجائے حسن پیدا ہو گیا ہے، شاہ جہان کی فیاضی، کرم گستری اور زرپاشی کے ساتھ ہندوستان کی جو تعریف کی گئی ہے، وہ بھی لائق توجہ ہے،

نو بہار آمد بسیر گلشن ہندوستان	زیبد ار طوطی بجائے پر برآرد برگ پان
چشم مردم از سواد ہند روشن می شود	کو تیار دکس متاع سرمہ را از اصفہان
در چمن ہر صبح بنا جی کند رنگ بسنت	نیست طوطی را بجز کلیان چو بلبل زبان
بسکہ دارد در چمن بلبل گرفتاری بسر	زیبد ار قمری ز طوق خویش بندد آشیان

چلنیہ می گیرد چو نرگس دست گلچین را بزر — لالہ می بندد حنا چون گل بپای باغبان

گل ز شبنم ہار چنبیلی بگردن افگند — تا تواند شد حریف شاہد ہندوستان

باغ و صحرا سبز شد از فیض ابر نو بہار — شد ہمہ صحن زمین ہمرنگ بام آسمان

چشم نرگس از سواد ہند روشن می شود — در گلستان لالہ از سرمہ پر شد سرمہ دان

گرچہ گلہا ہم غزلہا خواندہ در وصف بہار — لیک نبود در چمن چون سبزہ کس رطب اللسان

بسکہ سوسن می کند یا وہ زبان وصف چمن — دور نبود گر ز حیرت غنچہ را وا شد دہان

تا لب جو سبز شد از فیض ابر نو بہار — جدول زنگار دارد صفحۂ آب روان

سیم و زر دائم می گیرد ز چنبیلی و بیل — نرگس از بہر نثار ثانی صاحبقران

پادشاہ قدردان شاہ جہان کز فیض او — گوشۂ باغ جہان شد رشک گلزار جنان

از ہوائے کرم در ہندوستانش باک نیست — بر سرش سایۂ بال ہما شد سایہ بان

نیست تنہا بار بردار وقار او زمین — بستہ گردون ہم کمر در خدمتش از کہکشان

جزیہ از کافر گرفتن پیش او چون فرض بود — ہمت از حاتم گرفت و عدل از نوشیروان

ہیچ کس از سفرۂ احسان او بے بہرہ نیست — شد ز دود مطبخش آباد چندین دودمان

در زمان دولتش نبود عدو ہم بے نصیب — می کشد در چشم دشمن سرمہ از میل سنان[1]

شیخ فانی نے ایک مثنوی مصدر الآثار بھی لکھی، اس کا آغاز اس شعر سے کیا:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم — تازہ نہالے است ز باغ قدیم[2]

محمد حسین آشوب کے بارہ میں غلام علی آزاد بلگرامی صرف اتنا لکھتے ہیں کہ ماژندران سے آکر ظفر خان احسن کے دربار سے وابستہ ہوا، مگر لطف اللہ مہندس کی نظم سے پتہ چلتا ہے کہ

---

[1] مراۃ الخیال صفحہ ۲۵ ، [2] ید بیضا صفحہ ۱۰۲ قلمی نسخہ دار المصنفین

وہ شاہجہانی دربار کے شعراء مین سے تھا، آزاد بلگرامی اس کے حسب ذیل دو شعر نقل کرتے ہین، مگر یہ بھی لکھتے ہین کہ یہ دونون شعر حسن بیگ رفیع کی طرف بھی منسوب ہین،

سبزہ از فرگان من نیز مشق شادابی گرفت ۔۔۔ نرگس از چشم ترم تعلیم بے خوابی گرفت

نقد اشکم را بزور از مردم چشمم ربود ۔۔۔ گرد او گردم کہ باج از مردم آبی گرفت[1]

میر الٰہی ہمدانی - ہمدان کے علاقہ اسد آباد کے سادات مین سے تھا، اصفہان مین حکیم صفائی اور آقا رضی کی صحبت سے فیضیاب ہو کر ہندوستان آیا، اور شاہجہان کے دربار مین ملازم ہوا، آزاد بلگرامی اس کے کلام کے بہت مداح ہین، لکھتے ہین:

کلامش لطافتے وعذوبتے دارد، وندرا قمارا لذتے خاص می بخشد[2]

غنی کشمیری بھی اس کے شاعرانہ کمال کا معترف تھا، چنانچہ الٰہی کی وفات پر یہ تاریخ کہی، ع

برد الٰہی ز جہان گوی سخن

کلام کا نمونہ یہ ہے:

زمانہ بسکہ مرا خاکسار ہر دم کرد ۔۔۔ ز آب دیدہ من می توان تیمم کرد

رباعی

از دوریت اے تازہ گل باغ مراد ۔۔۔ چون غنچہ چیدہ خندہ ام رفتہ ز یاد

گریان چو پیالہ پر مے در کف مست ۔۔۔ نالان چو سبوی خالیم در رہ باد[3]

امی شیرازی - نوشت وخواند سے بے بہرہ تھا، مگر شعر گوئی مین کافی شہرت حاصل کی، شاہجہان کے جود و سخا کی شہرت سنکر شیراز سے شاہجہان آباد آیا، اور شاہی دربار مین کئی قصائد پیش کیے، انعام واکرام پاکر وطن لوٹ گیا[4]، اس کا یہ شعر روز روشن مین منقول ہے:

---

[1] ید بیضا ص۱ [2] ماثر الکرام جلد دوم ص۸ [3] ایضاً [4] روز روشن مین ہے: امی شیرازی اگرچہ از نوشت وخواند

(باقی حاشیہ ص۱۹۳ پر)

تا دلم در صفت حسن غزل خوان شده است وصف ابروئے تو سر مطلع دیوان شده است

باقیا نائینی شاہجہانی دربار کا ایک مقبول شاعر تھا، نام باقی، اور وطن نائین تھا، عراق میں حکیم شفائی، اور خراسان میں مرزا فصیحی کی صحبت سے فیضیاب ہو کر ہندوستان آیا، طالب آملی کی وساطت سے مرزا غیاث بیگ اعتماد الدولہ کے دربار میں پہنچا، اور ایک قصیدہ پیش کر کے تقرب حاصل کیا، پھر شہزادہ خرم کی خدمت میں حاضر ہوا[1]، اور جب شہزادہ سریر آرائے سلطنت ہوا تو اس کو اپنی شاہانہ نوازش سے برابر سرفراز کرتا رہا، چنانچہ ۱۰۴۶ھ میں جشن نوروز کے موقع پر باقیا نے ایک قصیدہ کہا تو شاہجہان نے قدسی اور کلیم کی طرح اس کو بھی روپے سے تلوایا جو وزن میں پانچ ہزار...... ہوئے،[2] شاعری کے ساتھ ساتھ موسیقی کا بھی ماہر تھا، چنانچہ معاصر مورخین ان فنون لطیفہ میں اس کے کمال کے مداح اور معترف ہیں، عبد الحمید لاہوری کا بیان ہے:

"باقیا نائینی را در شعر طبیعت روان و تصانیف فارسی او از آمیزش نغمات ہندوستانی تاثیر وارد"

عمل صالح (حصہ دوم ص ۲۳۰) میں ہے:

"سخنورے طبع روان دارد، و در تصنیف و تالیف نغمات بروش موسیقائے یونان و فارس بے نہایت ماہر است و تصانیف خود را کہ برونق ریختہ، طرز امیر خسرو و نغمہ ہوش ربائے ہند بر آمیختہ لہذا مرغوب و مطبوع مسامع و طبائع افتادہ"

(بقیہ حاشیہ ص ۱۹۲) بہم رسانیدہ است لیکن کام فکر بر جادۂ خوشخیالی می گذاشت، در عہد شاہجہان بادشاہ بشاہجہان آباد رسیدہ، قصائد فصیحہ بحضور شاہی گذرانید و بجوائز مترقبہ متمتع گشتہ بوطن خود باز گردید۔ (ص ۷۱)

(حواشی صفحہ ہذا): [1] میخانہ ص ۵۰۰، [2] مآثر الکرام جلد دوم ص ۶۹

میخانہ کا مؤلف رقم طراز ہے (ص ۵۶۰)

"رسالہ در علم موسیقی ترتیب دادہ کہ تا بحال کسے باین روش ترتیب نساختہ

تذکرہ نصرآبادی کا مصنف بھی اس کی سخن سنجی کا معترف ہے، اور اس کے تین شعر اپنے تذکرہ میں نقل کئے ہیں (ص ۳۰۷)

زان زخم کوس نوبتِ کاسسان از بہمن | می رساند لرزہ بر چرخ دگر ہم می زند

ہمہ حاصل جہان را بہ تماشا صرف کن | بر کافر و مسلمان بنشین و صلح کل کن

رفتہ بہنر انکہ مقصود عزیزان | باقیست کہ واماندہ درین مرحلہ تنہا

کچھ رندی و مستی کے اشعار بھی سنیے:

توبہ کردیم کہ تا بادہ نباشد نخوریم | تا کہ ساقی پسر سادہ نباشد نخوریم

بادہ تا میکدہ معمور نباشد نکشیم | روزہ تا رندی آمادہ نباشد نخوریم [۱]

لطف اللہ کے گنائے ہوئے شعراء کے علاوہ بہت سے اور بھی ارباب سخن بارگاہ شاہجہانی سے منسلک تھے، ان میں سب سے پہلے مرزا صائب پر نظر پڑتی ہے، صائب کی ولادت تبریز میں ہوئی، لیکن تعلیم اصفہان میں پائی، شاعری میں حکیم رکنا مسیح کاشی اور حکیم شفائی کا شاگرد تھا، جہانگیر کے زمانہ میں تجارت کے سلسلہ سے ہندوستان آیا، جہانگیر کے دربار میں اس کی رسائی ہوئی، لیکن اس کی شاعرانہ صلاحیت کا جوہر شاہجہان کے زمانہ میں چمکا، شاہ جہان جب تخت پر بیٹھا تو اس نے ایک تاریخی قطعہ لکھا جس کے صلے میں شاہجہان نے اس کو بارہ ہزار روپے دیے، کچھ دنوں کے بعد منصب ہزاری اور مستعد خان کا خطاب بھی عطا کیا [۲] ۱۰۳۸ھ میں شاہجہان نے دکن کا رخ کیا، تو مرزا صائب اس کے ہمرکاب تھا، شاہی دربار میں ظفر خان احسن

---

[۱] میخانہ ص ۵۶۰، [۲] مرآۃ الخیال ص ۱۴۰

سے ملاقات ہوئی، پھر دونوں ایسے شیر و شکر ہوئے کہ اب بھی دونوں کا نام ساتھ ساتھ لیا جاتا ہے۔ ظفر خان کشمیر کا صوبہ دار مقرر ہوا تو مرزا صائب کو ساتھ لے گیا، ظفر خان کو مرزا صائب کی مداحی پر اور مرزا صائب کو ظفر خان کی شاگردی پر ناز تھا۔ سنہ ۱۰۴۱ھ میں صائب مشہد اقدس کی زیارت کو جانا چاہتا تھا تو شاہجہان نے زاد سفر کے لیے پانچ ہزار روپے عنایت کئے، صائب کے باپ کو اس سے ایسی محبت تھی کہ اس کی جدائی زیادہ دنوں تک گوارا نہ کی اور خود ہندوستان آکر اس کو اپنے ساتھ وطن واپس لے گیا، ایران میں شاہ عباس ثانی نے اس کی بڑی قدر دانی کی اور ملک الشعراء کا خطاب دیا، لیکن صائب کو ہندوستان کی فیاضیاں رہ رہ کر یاد آتی تھیں جب نواب جعفر خان عالمگیر کے عہد میں وزیر اعظم مقرر ہوا تو مرزا نے یہ شعر لکھ کر بھیجا،

دور دستان را باحسان یاد کردن ہمت است   ورنہ ہر نخلے بپائے خود ثمر می افگند

جعفر خان نے پانچ ہزار روپے اور ایک دوسری روایت کے مطابق پانچ ہزار اشرفیاں بھیجیں، سنہ ۱۰۸۱ھ میں وفات پائی، اس کے مزار پر اس کی ایک غزل کندہ ہے جس کا مطلع یہ ہے:

در ہیچ پردہ نیست نباشد نوائے تو   عالم پر است از تو و خالیست جائے تو

ایک صاحب سخن نے اس کے مزار کو ایک پر فضا مقام پر دیکھ کر یہ شعر بھی لکھ دیا ہے:

اے صبا آہستہ پا بر برگہائے غنچہ نہ   پاسبانا نند گلہا صائبا خوابیدہ است[1]

مولانا شبلی شعر العجم حصہ سوم (ص ۱۸۹) میں لکھتے ہیں کہ ایران میں شاعری رودکی سے شروع ہوئی اور مرزا صائب پر ختم ہو گئی، اس وقیع رائے کے بعد کسی مزید تبصرہ کی گنجائش نہیں، مولانا شبلی کلمات الشعراء کے حوالہ سے یہ بھی تحریر فرماتے ہیں کہ مرزا کی زندگی ہی میں اس کے کلام کو یہ حسن قبول حاصل ہو چکا تھا کہ سلاطین اور امراء شاہان ایران اس سے اس کے کلام کی استدعا کرتے

---

[1] کلمات الشعراء ذکر مرزا صائب۔

کرتے تھے، اور تحفہ اور سوغات کی طرح اس کی غزلیں بھیجی جاتی تھیں[1]،

ابھی ذکر کیا گیا ہے کہ مرزا صائبؔ نے شعر و شاعری میں حکیم رکنا مسیح کاشی سے تعلیم پائی،

اس کا پورا نام رکن الدین مسعود اور تخلص مسیح کبھی مسیحا اور کبھی مسیحی تھا، آبا و اجداد شیراز کے

رہنے والے تھے لیکن کاشان میں توطن اختیار کر لیا تھا، طبابت خاندانی پیشہ تھا، اس لیے حکیم

رکن کاشی کے نام سے بھی شہرت پائی، ایران میں شاہ عباس صفوی کا ندیم خاص تھا، مگر کسی سبب

سے کبیدہ خاطر ہو کر اس نے شاہ ایران کے دربار سے قطع تعلق کر لیا، اور یہ شعر لکھا،

گر فلک یک صبحدم با من گران باشد سرش   شام بیرون می روم چون آفتاب از کشورش

اس کے بعد ہندوستان چلا آیا، اور اکبر و جہانگیر کے خوان کرم کی زلہ ربائی کی، کچھ دنوں مہابت

خان اور اس کے لڑکے امان اللہ کی خدمت میں بھی رہا، شاہجہان جب تخت پر بیٹھا تو حسب ذیل

قطعہ لکھ کر بارہ ہزار روپے انعام میں حاصل کیے،

بادشاہ زمانہ شاہ جہان   خرم و شاد و کامران باشد

ہر سال جلوس او گفتم   در جہان بادشاہ جہان باشد

۱۰۳۷ھ

سنہ ۱۰۴۱ھ میں مشہد اقدس کی زیارت کی اجازت شاہ جہان سے لی تو خزانہ عامرہ سے

زاد سفر کے لیے پانچ ہزار روپے عنایت کیے گئے، زیارت کے بعد وطن کی طرف مراجعت کی،

اور وہیں سنہ ۱۰۶۶ھ وفات پائی، شاہجہان غائبانہ طور پر بھی اس کو یاد کیا کرتا تھا، اور وقتاً فوقتاً

تحفے بھیجا رہتا تھا[2]، ایک دیوان چھوڑا جس میں ایک لاکھ اشعار تھے، مرزا صائبؔ نے اس کے

دیوان کا انتخاب کر کے حق شاگردی ادا کیا، میخانہ کا مولف اس کے محاسن شاعری کا اعتراف

کرتے ہوئے لکھتا ہے:

---

[1] شعر العجم حصہ سوم ص ۲۰۰ [2] مآثر الکرام ص ۱۹۱ - ۹۵ ج ۲

اشعارِ دلپذیرش، بغایت رنگین و دہانِ سخنانیش بے نہایت متین است"۔ (ص۳۲)

غلام علی آزاد بلگرامی نے بھی خزانۂ عامرہ میں اس کے اشعار کی فصاحت و بلاغت کی بڑی تعریف کی ہے،

سرخوش کلمات الشعراء میں رقمطراز ہے:

"در معنی یابی ید بیضا داشت بسیار خوش فکر است"

یہ لکھ کر طرز کلام کا یہ نمونہ پیش کیا ہے:

درمن آمیختہ تو تو اثر پیدا نیست	ہمہ شیر است درین کاسہ شکر پیدا نیست
آنچنان با تو یکے گشت وجودم اکنون	کہ ترا بے تو توان دیدن و بے من نتوان
تمام عمرم با شاہد و رسالہ گذشت	حباب وار مرا عمر در پیالہ گذشت
روز اول کاندرین ویرانہ بنہادم قدم	بازی بابست گشتن دہر دیواری نداشت
ہمچون نگین کہ بہر نگین دان شدست خلق	او را خدا برائے کنارا فریدہ است

میخانہ میں اس کا ایک ساقی نامہ اور دوسرے اشعار بھی درج ہیں، مخزن الغرائب میں بھی اس کے دیوان کے طویل اقتباسات ہیں، مؤخر الذکر تذکرہ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ جہانگیر کے زمانہ میں حکیم رکنا کاشی اس کی فیاضی کی بدولت ایک بڑی دولت حاصل کر کے وطن لوٹ گیا تھا، اور وہاں سے پھر آیا تو ایک سو پانچ سال کی عمر میں وطن واپس گیا، رکنا کاشی کے دو بھائی حکیم قطبا اور حکیم نصیرا کا خاندان بھی شاہی جود و سخا سے فیضیاب ہوتا رہا، حکیم قطبا کا لڑکا ضیاء الدین رحمت خان شاہجہان اور عالمگیر کے منصبداری امراء میں سے تھا، اور ابو طالب کلیم کی لڑکی اس کے حبالۂ عقد میں تھی، (دیکھو مآثر الامراء جلد ۲ ص۲۸)

حکیم رکنا کاشی نے شیدا کے ذوق سخن کی داد دی ہے،

مسیحا را بشید ا یان عالم الغنی باشد　　　　بجز شید انگو ید شعر گو کس در زمین من

اور یہ دعویٰ موجب تعجب ہے، کیونکہ تمام ایرانی شعرا شیدا سے نالاں اور آزردہ خاطر رہے
شیدا کو ایرانی شعرا کے احساس برتری سے چڑھ تھی، کشمیر پر اس نے نثر میں ایک کتاب لکھی ہے اس
کے خاتمہ میں لکھتا ہے،

"اہل ایران ہندی نژاد ہونے کی وجہ سے میری کوئی حقیقت نہیں سمجھتے ہیں، وہ اسکو
بھول گئے ہیں، کہ جب حضرت آدم علیہ السلام بہشت سے دنیا میں آئے تو سراندیپ
کی زمین کو اپنی ذات سے مشرف فرمایا، اور اس پر تمام مورخین کا اتفاق ہے، اس لیے حضرت
آدم علیہ السلام ہندی ہیں، اور جن لوگوں نے ہند میں نشو ونما پائی ہے ان میں آدمیت زیادہ
ہے اصلی بات یہ ہے کہ ایرانی اور ہندی ہونا فخر کی سند نہیں ہے، آدمی کی عزت اس کی ذاتی
عزت سے ہوتی ہے، اگر ایرانی طنز کریں گے کہ فارسی ہماری زبان ہے، تو اپنی زبان کو اپنے
تالو میں نہ پائیں گے، اور اگر زبان ان کے تالو میں ہو بھی تو مذاق شاعری سے آشنا نہ ہوں گے
چونکہ شاعری کی قدرت نہیں رکھتے ہیں، مجبوراً ہاتھ پاؤں مارتے ہیں، ظاہر میں لوگ جو صورت
کو دیکھ کر معانی کا پتہ نہیں پا سکتے ہیں، میری ظاہری حالت کو دیکھتے ہیں، میرے رنگین معانی
ان کے خلعت کی طرح خوبصورت ہیں، اور ان کے اشعار میرے کپڑے کی طرح بدصورت
یہ میرے کپڑوں پر نظر رکھتے ہیں اور میں ان کے سامنے رنگین معانی پیش کرتا ہوں، جو کچھ کہ
بے تکلفی سے کہا گیا وہ سچ ہے، اور سچ سے رنجیدہ ہونا عقلمندوں کا کام نہیں، (قرۃ الخیال) ورق ۱۰۹

ان ہی جذبات کی بنا پر اس نے ایرانی شعرا کی ہجو لکھی، طالب آملی کی مذمت کا ذکر پہلے آچکا
ہے، الٰہی ہمدانی پر ایک قطعہ لکھا،

اے میر من کہ کردہ الٰہی تخلصی　　　　از مرد لاہی از چہ الٰہی شدن خطاست

زین رطب و یابسی کہ بود در کلام تو ۔۔۔ گر منکر کلام الٰہی شوم رواست[1]

قدسی نے ایک قصیدہ کہا تھا جس کا مطلع یہ ہے

عالم از نالۂ من بے تو چنان تنگ فضاست ۔۔۔ کہ شنید از سر آتش نتواند برخاست

شیدا نے اس قصیدہ کے ہر شعر پر اعتراض کیا، اور ان اعتراضات کو منظوم کیا جن میں سے کچھ اشعار یہ ہیں:

اے سخن سنج ہنرمند باندیشہ سنج ۔۔۔ نقد ہر حرف بمیزان خرد بے کم و کاست

نالہ در سینہ ہوا نیست کہ بے قصد رود ۔۔۔ چونکہ از سینہ ہوا گیر شد از جنس ہواست

عالم از وی نشود تنگ ولیکن ز ملال ۔۔۔ خلق عالم کہ از و تنگ نشیند رواست

خود گرفتم کہ جہان تنگ شد از نالۂ تو ۔۔۔ کہ ز تنگی نظر از چشم نیارد برخاست

نیست ترتیب دو مصراع بہم ربط پذیر ۔۔۔ کہ سیاق سخن از ہر دو باندیشہ جداست

تنگی عالم از نالہ بکیفیت اوست ۔۔۔ کہ جہان تنگ نداند و شنیدہ لہاست

تنگی جا نہ کجا تنگی اندوہ کجا ۔۔۔ بیشتر از تن و جان تفرقہ بہم پیداست[2]

اسی طرح کی اور بھی ابیات ہیں، مراۃ الخیال کے مولف کا بیان ہے کہ شیدا کے یہ اعتراضات بہت مشہور ہوئے، مگر مرزا محمد طاہر نصرآبادی اپنے تذکرہ میں لکھتا ہے کہ شیدا نے اپنے اعتراضات میں نا انصافی سے کام لیا ہے۔ (ص ۴۴۰)

شاہ جہان بھی شیدا کی گستاخی اور بے باکی سے کئی بار رنجیدہ ہوا، ایک بار شاہ جہان نے اس سے پوچھا کہ "تم شعر اچھا کہتے ہو یا حکیم حاذق گیلانی"، شیدا نے بادشاہ کے اس سوال کو ناپسند کیا، کیونکہ وہ حکیم حاذق گیلانی کو اپنا مقابل نہیں سمجھتا تھا، اور اس کی ہجو کر چکا تھا،

---

[1] ید بیضا ص ۹۲، [2] مراۃ الخیال ص ۱۴۰ سے ۱۴۱

اس لیے جل کر بولا "ہم دو نون سے رائے پائے واس بہتر کہتا ہے" رائے پائے واس شاہی دربار کا ادنی ملازم تھا، جو مضحک اشعار کہا کرتا تھا، شاہجہان اس جواب سے بہت کبیدہ خاطر ہوا، اور شیدا کو دربار سے نکل جانے کا حکم دیا، ایک موقع پر شیدا کا یہ مشہور شعر شاہجہان کو سنایا گیا

چیست دانی بادۂ گلگون مصفا جوہرے   حسن را پروردگار و عشق را پیغمبرے

شاہجہان نے ام الخبائث شراب کی یہ توقیر اپنے قلمرو مین پسند نہین کی، اور فوراً شیدا کو شہر بدر کرنے کا حکم جاری کیا، شیدا نے اپنی برأت کے لیے پہلے جامی کا مندرجہ ذیل شعر استشہاد مین پیش کیا،

از صراحی دو بار قلقل مے   پیش جامی بہ از چہار قل است

پھر ایک طویل قطعہ معذرت مین لکھا جس کے کچھ اشعار یہ ہین:

جہان پناہا شاہا بقدر جاہ و جلال   نیافرید خدا چون ترا عدیل و نظیر
بوصف مے زدہ سر از من این مصرعۂ خوش   کہ گشتہ ورد زبان ہمہ صغیر و کبیر
اگرچہ لفظش عام است معنیش خاص است   بخاص و عام بود شہرۂ ہمچو بدر منیر
چنین کہ مکش اسرار مولوی جامی   کہ بست گفتہ او دور از در تقصیر
بوصف مے ز صراحی دو بارہ قلقل مے   بہ از چہار قلش گفت و فارغ از تکفیر
مرا بہ کفر چہ نسبت بود کہ بہ ز مے   سخن چنین کند و ہیچ نایدش بضمیر
مرا چہ شاہ بہ اندکجا قوانم رفت   بگاہ راندن از کف کسی رود شمشیر[۱]

اس قطعہ کو سنکر شاہجہان نے شیدا کو معاف کر دیا، آخر عمر مین وہ کشمیر مین گوشہ نشین ہو گیا تھا، جہان اس کو شاہجہان کی طرف سے وظیفہ ملتا تھا، اپنی علمی یادگار مین ایک مثنوی

---

[۱] کلمات الشعراء سرخوش

موسوم بہ دولت بیدار اور ایک دیوان بھی چھوڑا، دیوان میں ایک لاکھ اشعار تھے، مرزا محمد طاہر نصرآبادی اپنے تذکرہ میں اس کے کلام کی تعریف کرتا ہوا لکھتا ہے:

"خیالش غریب و افکارش لطیف است، شعر بسیاری گفته (ص۲۴۴)

غلام علی آزاد بلگرامی مآثر الکرام جلد دوم (ص۸۵) میں تحریر فرماتے ہیں:

"صاحب ذہن رسا و فکر آسمان پیما بود شعر را بسرعت تمام می گفت، و بچشم زدن جواہر فراوان می سفت"

مگر خود شیدا کے معاصر منیر لاہوری نے اس کے کلام کی ہجو کی ہے،

شیدا گوید کہ شعر من لک بیت است	ہر نقطہ من بصفحہ بے شک بیت است
یک بیت درست نیست در دیوانش	از جفت بر وفت صاحب لک بیت است[۱]

یہ ہجو شاید اسی افرا تفری کا نتیجہ ہے جس میں خود شیدا بھی مبتلا تھا، مراۃ الخیال کے مولف کا بیان ہے کہ شیدا بہت ہی ذی استعداد شاعر تھا، علم عروض میں اس کی مہارت کا ملہ ضرب المثل تھی، وہ ایسے شعراء کو خاطر میں نہیں لاتا تھا، جو مقبول خاص و عام ہوتے تھے مگر فن شاعری سے بیگانہ تھے، ان کے کلام کے عیوب و نقائص کو بہت بے باکانہ طریقہ سے آشکارا کرتا تھا، اسی لیے اس کی بھی ہجو کہی گئی،

شاہجہانی دربار کے شعراء میں حکیم حاذق گیلانی کی رعونت اور خود پسندی مشہور تھی، وہ حکیم ہمام گیلانی کا لڑکا تھا، اس لیے وراثت میں طبابت اور امارت کے علاوہ علم و ادب کا بھی ذوق پایا، شاہ جہان نے اپنی تخت نشینی کے موقع پر اس کو منصب ہزار ہا نصدداری شش صد سوار عطا کیا، اور اسی سال والی توران کے پاس سفیر بنا کر بھیجا، وہاں سے واپسی کے بعد اس کو

---

[۱] ید بیضا ص۹۳

عرض مکرر کی خدمت تفویض کی گئی، اور سہ ہزاری منصب دیا گیا، کچھ دنوں کے بعد گوشہ نشینی اختیار کر لی، مگر اس زمانہ میں بھی شاہی خزانہ سے بیس ہزار اور پھر بعد میں چالیس ہزار روپے سالانہ وظیفہ ملتا تھا، کچھ دنوں درباری مورخوں کے ساتھ اس عہد کی تاریخ لکھنے میں بھی شریک رہا، اس کے اشعار صاف اور پاکیزہ ضرور ہوتے تھے، مگر اپنی خود بینی کی بنا پر اپنے کو انوری سے بھی بہتر تصور کرتا تھا، اپنے دیوان کو بڑی زینت و آرایش کے ساتھ لکھوا کر ایک مرصع طشت پر رکھتا تھا، اور جب کسی مجلس میں جاتا اور عمائدین سلطنت اس کی تعظیم کے لیے نہ اٹھتے تو برہمی کا اظہار کرتا دیوان کو ایک مطلا رحل پر رکھ کر اپنا کلام سناتا تھا، اس کے اس شعر کی داد تو آج بھی دی جا سکتی ہے

دلم ہیچ تسلی نمی شود حاذق ۔۔۔ بہار دیدم و گل دیدم و خزان دیدم [1]

کچھ اور بھی سنیے

بوے گل امشب زدود شمع می آید مگر ۔۔۔ بلبل از شکوہ بر سر خاکستر پروانہ ریخت

زبر تسبیح و سلم عار دارد ۔۔۔ کہ سبحہ بر میان زنار دارد

من آن تسبیح را بر دست گیرم ۔۔۔ کہ او ذاکر بود گر من بمیرم [2]

سعیدای گیلانی شاعر بھی تھا اور اعلیٰ قسم کا صناع بھی، اس کو زرگری میں غیر معمولی کمال حاصل تھا، اسی لیے شاہجہان نے اس کو زرگر خانہ کا داروغہ مقرر کیا، اور بے بدل خان کا خطاب دیا، شاہجہانی عہد کا سب سے بڑا صنعتی کارنامہ تخت طاؤس اسی کے ہاتھوں انجام پایا، یہ ایک کروڑ روپے کی لاگت سے سات سال میں تیار ہوا، اس کا طول سوا تین گز، عرض ڈھائی گز، بلندی پانچ گز تھی، اس تخت کے اندرونی حصہ میں زیادہ تر مینا کاری کا کام اور کچھ حصہ مرصع تھا، چھت کے بیرونی حصہ میں لعل و یاقوت جڑے ہوئے تھے، اور اس کو زمرد کے بارہ ستون پر قائم کیا گیا تھا، چھت کے اوپر دو مرصع طاؤس بنائے گئے تھے،

---

[1] مآثر الامراء جلد اول ص ۵۹۰، [2] تذکرہ نصر آبادی ص ۶۲

اور دونوں طاؤس کے درمیان ایک درخت نصب کیا گیا تھا جو لعل، الماس، زمرد اور مروارید سے مرصع تھا، تخت پر چڑھنے کے لیے تین پائے کی ایک سیڑھی بنائی گئی تھی جو جواہرات سے آراستہ تھی، تخت کے گرد تکیہ لگانے کے لیے گیارہ مرصع تختے تھے جن میں سے درمیان کا تختہ جس پر بادشاہ ہاتھ رکھ کر تکیہ لگا کے بیٹھتا تھا دس لاکھ روپے کی قیمت کا تھا، اور ان میں ایک لعل تھا جس کو شاہ عباس صفوی نے تحفۃً جہانگیر کی خدمت میں بھیجا تھا۔ اس پر پہلے امیر تیمور، مرزا شاہ رخ، مرزا الغ بیگ کے نام کندہ تھے، شاہ عباس نے بھی اس پر اپنا نام لکھوایا، پھر جہانگیر نے اپنا اور اکبر کا نام کھدوایا، اس کے بعد شاہ جہان نے اپنا نام کندہ کرایا، عالمگیر کے اوائل دور حکومت میں اس تخت کی ترصیع و ترتیب میں اور اضافہ کیا گیا۔[5] بے بدل خان نے جب اس کو تیار کیا تو شاہ جہان نے خوش ہو کر بے بدل خان کو روپے میں تلوایا، اور جب آٹھویں سال جلوس کے جشن میں شاہجہان اس پر جلوہ افروز ہوا تو تمام شعراء نے قصیدے، نظمیں اور مثنویاں پیش کیں، حاجی محمد جان قدسی نے اس کی تاریخ اورنگ شاہنشاہ عادل نکالی۔ قدسی کی اس مثنوی کے کچھ اشعار یہ ہیں

زہے فرخندہ تخت پادشاہی — کہ شد سامان بتائید الٰہی

فلک روزے کہ تا گردش بکمل — ز زر خورشید را بگداخت اول

بحکم کار فرما صرف شد پاک — بمینا کاریش مینائے افلاک

جز این تخت از زر و گوہر چہ مقصود — وجود بحر و کان را حکمت این بود

ریاقوتش کہ در قید بہا نیست — لب لعل بتان را دل بجا نیست

برائے پایہ اش عمرے کشیدہ — گہر افسر بسر خاتم بدیدہ

بجز جشن عالم از زر شد چنان پاک — کہ شد از گنج خالی کیسہ خاک

---

[5] تفصیل کے لیے دیکھو بادشاہ نامہ جلد اول حصہ دوم ص ۷۸-۸۱، مآثر الامرا جلد اول ص ۲۴۲

رساند گر فلک خود را بپایش　　دہد خورشید و مہ را زود بہایش

سرافرازی کہ سر بر پایہ اش شود　　زگردون پایۂ بر تخت افزود

اثر باقیست تا کون و مکان را　　بود بر تخت جا شاہ جہان را

بود تختی چنین ہر روز جایش　　خراج ہفت کشور زیر پایش

چو تاریخش زبان پرسید از دل　　بگفت اورنگ شاہنشاہ عادل[1]

اس جشن میں ابو طالب کلیم، سلطان شادمان اور دوسرے شعرا نے بھی قصیدے کہے جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے، خود سعیدائی گیلانی نے ۴۳ شعروں کا ایک قصیدہ کہا جس کے مختلف اشعار سے شاہجہان کے مختلف واقعات سلطنت کی تاریخیں نکلتی تھیں، اسکے کچھ حصے یہ ہیں:

خدای واحد بیچون جہان نمود عیان　　برای شاہجہان بادشاہ کل جہان

بداد وجود باحسان شہنشہ آفاق　　علیم و عالی و دانواز و ملک ستان

ہزار سال بماناد آنکہ ہر دم ازو　　بود بدور جہان صد ہزار جان شادان

بمدح شاہ جہان طبع این دو ازدہ بیت　　ز قسمت ازل اوراز دلم بزبان

ازان دو ازدہ ہر مصرعی نگاہ نگار　　کند تولد شاہ جہان پناہ بیان

باکبر آباد از جہد کامران بسریر[1]　　جلوس کرد تا شد عالمشان

ہزار بود و چہل و سہ بسال از ہجرت　　کہ شد بدہلی بادشاہی و سپہ گران

بشو بہار بپا بہ گلشن سر بہشت　　گل بہار آید با ہوا چو گل خندان

زکامرانی نوروز عزم کردہ زدو　　سوی مدینہ لاہور بر جہان شادان

ہزار گونہ بود گل بکوہ ہر شہ مشق　　ہزار چشمہ دلی بہ ز چشمہ حیوان

---

[1] مصرعہ ناقص معلوم ہوتا ہے، مگر اسی طرح منقول ہے،

بسوی ہند عنان زد و تاب شد باجاہ | جہاندہ برق نما ابرشے چو باد وزان
بداد وجود بدار الخلافہ آمد باز | فلک بدور رکاب و ملک بدُ عنان
ہزار شکر بیفزود باز حسن جہان | ز نو بہار سریر جواہر الوان
بہر زمین کہ از آن سایہ فتاد فلک | بداد تا بابد و دستگاہ پایۂ کان
جمال و رنگ زاورنگ بادشاہ زمن | بداد گیتی صد رنگ بزمین و زمان
خدیو ملک و ملل بادشاہ دین و دل | جہان کشاد بامداد قوت ایمان
جہان پناہا شاہنشہی و دریا دل | محیطی از کرم و جود لیک بے پایان
ز سہم گرز و ستانت دل عدو جاوید | شود ہزیر زمین چو رگ جہندہ طپان
از ان بود سر دشمن برنگ سنگ سیاہ | کہ از برائے حسامت بود مدام فسانؔ

عبدالحمید لاہوری نے بادشاہ نامہ (جلد اول حصہ دوم ص ۳۵۶) میں سعیدائی گیلانی کی شاعری کی بڑی ستایش کی ہے، لکھتا ہے:

"از رسائی طبع و روانی فکر اکثری بنظم معانی می پردازد، لفظش ہموار و دلنشین است، و مضامین نو آئینش،

اور مثال کے طور پر بہت سے اشعار نقل کئے ہیں، ان میں سے ایک غزل کے شعر ہم بھی ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں:

سوارہ آن مہ زرین رکاب می آید | بچہرہ اشک ہزار آفتاب می آید
بآب تیغ تو دل می کشد ز آب حیات | چو تشنہ کو سوی آب از سراب می آید
کند عرق رخت اے نازنین ز تاب نگاہ | بدور حسن تو از آتش آب می آید

لہ عمل صالح جلد دوم ص ۹۲-۹۰

رہا، جیسا کہ آگے ذکر آئے گا، کچھ دنوں شاہزادہ شجاع کے دربار میں ملازمت کی، اور عبد اللہ قطب شاہ
والی حیدرآباد دکن کے خوانِ کرم کا بھی ریزہ چین ہوا۔[1]

مرزا حسن بیگ رفیع قزوینی کچھ دنوں مشہد مقدس میں حصول سعادت کے لیے مقیم رہا
اس لیے نام کے ساتھ مشہدی بھی لکھا جاتا ہے، نذر محمد خان والی بلخ کے دربار میں ملازم رہنے
کے بعد ۱۰۵۸ھ میں ہندوستان آیا، شاہجہان کی خدمت میں باریاب ہوا تو خلعت اور تین ہزار
روپے ملے، اور شاہی ملازموں میں داخل کر لیا گیا، ۱۰۶۷ھ کے جشن جلوس پر ایک مثنوی کہی تو ایک
ہزار روپیہ انعام پایا، شاہجہان نے اس کو منصب پانصدی بھی عطا کیا، عالمگیر کے زمانہ میں
کشمیر کا دیوان بیوتات مقرر ہوا تھا، اس کو شعر و شاعری میں بڑی شہرت حاصل تھی، اپنے اس
شعر پر فخر کرتا تھا،

عمر گر خوش گذرد زندگی خضر کم است   ور بنا خوش گذرد نیم نفس بسیار است

میر معز موسوی خان نے اعتراض کیا کہ بنا خوش صحیح نہیں یا تو ناخوش ہونا چاہیے یا ناخوشی،
مرزا رفیع نے با دل ناخواستہ "بہ تلخی گذرد" بنا دیا، مگر خود کہتا تھا کہ شعر کا مزہ جاتا رہا،[2] کلمات الشعراء
میں ہے کہ اس نے شاہجہان آباد پر ایک مثنوی بھی لکھی، شکستہ عمارت کی تعریف میں لکھتا ہے:

اگر پاسبانش شود مست خواب   بدوشش فشانند زر یا قوت آب

شاہی عمارت کی تعریف کرتا ہے:

خدا رفعتش را بجائی رساند   کہ آتش ز مہرش بسنگش ماند

میر صیدی طہرانی، اصفہان سے ہندوستان آیا، اور ۱۰۴۵ھ میں شاہجہان کی ملازمت
میں داخل ہوا، تو ایک قصیدہ شاہی خدمت میں پیش کیا، جس کا مطلع یہ ہے

---

[1] مآثر الکرام حصہ دوم ص ۸۸-۸۷ [2] ایضاً [3] کلمات الشعراء قلمی نسخہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی۔

زہے جہان خدا را سپہر عدل و کرم — بزیر سایۂ قدر تو نیر اعظم

شاہجہان نے اس کے صلہ میں ہزار روپے دیے، اس نے شاہجہان کی شان میں بہت سے قصائد کہے، سرخوش نے کلمات الشعرا میں اس کو نازک خیال، بلند فکر، استاد فن اور کامل سخن کہا ہے، دیوان کے علاوہ کشمیر پر ایک مثنوی بھی لکھی ہے، کلام کا نمونہ یہ ہے:

مارا بہ برگ سبز کجا یاد می کند — آن گل کہ منع بوی خود از باد می کند

صیاد ما بنای تازہ کردہ است — مرغی کہ پر شکستہ شد آزاد می کند

سوخت رشک شعلۂ شمعم کہ در راہ طلب — از نظرہا کردہ پنہان جادۂ بیہودہ را

در بزم او مجال نشستن نیافتیم — چون نرگس ایستادہ کشیدیم جام را

غباری وارد از خط ماہ رخسارش کہ گر یکجا — مصور جمع سازد و صورت خالی نمی گردد

عماد، فتحا، عسکری کاشانی، کیفی نومسلمان، اور ادہم مرزا وغیرہ نے بھی شاہجہان کے جود و سخا سے متمتع ہوئے، لیکن ہم ان کی تفصیل بیان کرنے سے اس لیے گریز کرتے ہیں کہ ہم تیموری دربار کے شعرا کا کوئی تذکرہ لکھنا نہیں چاہتے، بلکہ یہ دکھانا مقصود ہے کہ تیموریوں کی بزم میں ارباب سخن کی کیا قدردانی اور حوصلہ افزائی ہوئی، اور اس شاہانہ سرپرستی میں ان کا انداز کلام کیا رہا،

ہندو شعرا: شاہجہانی عہد کا سب سے ممتاز ہندو شاعر اور ادیب چندربھان برہمن تھا، لاہور میں پیدا ہوا، شروع میں میر عبدالکریم میر عمارت لاہور کے یہاں ملازمت کی، پھر امیرالامرا افضل خان دیوان کل کے دربار میں ملازم ہوا، شاید اس کی سرکار کا دیوان مقرر ہوا، افضل خان کی وفات کے بعد شاہجہان کے ایک امیر عاقل خان کی وساطت سے دربار میں پہنچا[۱]، اور خط شکستہ میں ایک رباعی

[۱] اسلامک کلچر اپریل ۱۹۲۸ء اس مضمون میں چہار چمن کا ایک اقتباس دکھا کر یہ بتایا گیا ہے کہ چندربھان برہمن ملا عبدالحکیم سیالکوٹی کا شاگرد تھا،

لکھکر شاہی خدمت مین پیش کی ،

شاہے کہ مطیع او دو عالم گردد　　　　ہر جا کہ سریست پیش او خم گردد

از بسکہ بدورش آدمی یافت شرف　　　　خواہد کہ شرف نیز آدم گردد[1]

شاہجہان نے اس کو وقائع نویسی کے عہدہ پہ مقرر کیا، اس عہدہ پر برہمن فخر کرتا تھا کیونکہ وہ روزانہ بارگاہ شاہی مین حاضر ہو کر ہر روز کے واقعات و حالات سناتا تھا، شاہجہان نے بھی اس کے فرائض منصبی سے خوش ہو کر ایک ہاتھی انعام مین عطا کیا تھا، بعض سیاسی اغراض کی تکمیل کے لیے اودے پور کے رانا کے پاس بھی بھیجا گیا، اسی زمانہ مین چہار چمن لکھکر نوروز کے موقع پہ سرہند مین بادشاہ کی خدمت مین گذرانی، اس مین برہمن کے ذاتی احوال و کوائف کے علاوہ شاہی دربار کے مختلف جشنون، اس کی شان و شوکت، بادشاہ کے روزانہ معمولات اور شاہجہان آباد اور دوسرے شہرون اور صوبون کا ذکر ہے، دارا شکوہ برہمن کی نظم و نثر دونون کا مداح تھا، اس لیے اس کو اپنا میر منشی مقرر کیا، دارا جب قندھار کی مہم پر گیا تو برہمن بھی اس کے ساتھ تھا، ایک روایت یہ بھی ہے کہ علامی سعد اللہ خان کی وفات کے بعد برہمن پھر دربار شاہی سے منسلک ہوا اور دفتر شاہی کا میر منشی مقرر ہوا ، اور رائے کے خطاب سے بھی سرفراز کیا گیا ، عالمگیر تخت پہ جلوہ افروز ہوا تو اس کی تخت نشینی پہ یہ رباعی کہی ،

شاہا عالم مطیع فرمان تو باد　　　　لبریز ادائے شکر احسان تو باد

چون ذات تو خلق را نگہبان باشد　　　　ہر جا باشی خدا نگہبان تو باد

برہمن دارا کا حامی تھا، اس لیے ایک خط مین برہمن نے اورنگ زیب سے یہ شعر لکھکر اپنے قصورون کی معافی مانگی ،

شدیم پیر بہ عصیان و چشم آن داریم　　　　کہ جرم ما بجوانان پارسا بخشد

[1] انشائے برہمن ص ۱۸۳

عالمگیر کے زمانہ میں وہ جہانگیر کے مقبرہ کی نگرانی کے لیے مامور کیا گیا تھا، برہمن صاحب دیوان بھی تھا، اور دارا سے اپنی شاعری کا خراج تحسین برابر حاصل کرتا رہا، شاہی دربار کی حوصلہ افزائی کی بنا پر برہمن نے اپنا دیوان ایران بھیج کر وہاں کے ارباب فن سے بھی داد طلب کرنے کی کوشش کی، چنانچہ اپنے دیوان کے کچھ نسخے بھی وہاں بھجوائے، مگر ایرانی جب ہندوستان کے بڑے بڑے ارباب کمال کی ستائش کرنا اپنے لیے کسر شان سمجھتے تھے تو برہمن کو کب خاطر میں لا سکتے تھے لیکن خوشگو نے کلمات الشعرا میں اس کی تعریف کی ہے،

"طبعی درست داشت، شعر بطور قدما شستہ و صاف می گفت و سلیقہ انشا پردازی نیز داشت، در ہندوان غنیمت بود"

غلام علی آزاد بلگرامی نے سرو آزاد اور ید بیضا میں اس کا ذکر نہیں کیا ہے، مراۃ الخیال کے مولف نے برہمن کے لیے اچھے الفاظ استعمال نہیں کئے ہیں، مگر اس کی یہ غزل پسند کی ہے:

کنم زسادہ دلی بند دیدہ مژگان را	بمشت خس نتوان بست راہ طوفان را
جگر فشان شدم از جلوہ آن دارد	کہ لالہ زار کنم دامن و گریبان را
ہمیشہ زلف ترا اضطراب در کار است	چگونہ جمع کند خاطر پریشان را
شبے خیال تو آمد بخواب و آسودیم	دگر زہم نکشادیم چشم گریان را
برہمن از تو سخن بے دلیل می خواہم	کہ اعتبار نباشد دلیل برہان را

منشآت برہمن جو چندر بھان کے رقعات کا مجموعہ ہے، عرصہ دراز تک مدارس میں زیر درس رہی، اور یہ اس کی نثر نگاری کی مقبولیت کی دلیل تھی، اس کی اور تصانیف کے نام یہ ہیں، گلدستہ، تحفۃ الانوار، کارنامہ، تحفۃ الفصحاء، مجمع الفقرا، اور تحفۃ الوداد،

---

۵ اسلامک کلچر اپریل ۱۹۴۵ء

اکبر و جہانگیر کی طرح شاہجہان بھی ہندو اہل کمال کی برابر سرپرستی کرتا رہا، ۱۰۳۸ھ میں ایک ہندی شاعر نے اس کے نام پر ایک کبت کہی تو اس کو دو ہزار روپے اور ایک ہاتھی مرحمت کیا۔[۱]

ہندی شعرا میں سندر اس کے دربار کا ملک الشعرا تھا، اس کی تصانیف سندر سنگار، اور سنگھاسن بتیسی برج بھاشا میں مشہور ہیں، ہندی کے مشہور شعرا چنتا منی اور راجہ شمبھو ناتھ سنگھ بھی اس کے دربار سے منسلک رہے، چنتا منی سہتا یعنی ترکیب نظم کا استاد تھا، راجہ شمبھو ناتھ نے شاہجہان کی فرمائش پر کوند اکلپ لتا لکھی، اس کتاب میں شاہ جہان، داراشکوہ اور جہان آرا پر مدحیہ نظمیں ہیں،[۲]

ایک بار یمین الدولہ نے ترہٹ کے دو برہمنوں کو دربار میں پیش کر کے عرض کیا کہ یہ دونوں دس ہندی کبتیں جو دس شاعروں نے تازہ کہی ہوں اور کسی نے نہ سنی ہوں ایک بار سنکر یاد کر لیتے ہیں اور اسی وزن اور مضمون میں دس شعر فی البدیہہ کہہ دیتے ہیں، امتحان ہوا تو سچ ثابت ہوا، شاہجہان نے دونوں کو خلعت اور ہزار ہزار روپے انعام دیئے،[۳]

امراء | امراء جب کسی عہدۂ جلیلہ پر مامور کئے جاتے تو اس کا خیال رکھا جاتا تھا، کہ وہ نہ صرف سیاسی نقطۂ نظر سے پختہ کار اور بیدار مغز ہوں بلکہ مختلف علوم و فنون میں بھی ان کو امتیازی حیثیت حاصل ہو، شاہجہان کے خسر یمین الدولہ خانخانان **آصف خان** سپہ سالار کو ہر قسم کے علوم خصوصاً معقولات میں بڑی ادرک حاصل تھا، اس کے القاب کا جزء "شعلہ افروز فطرت اشراقیان دانش آموز طبیعت مشائیان" تھا، وہ خوش بیان، خوش نویس اور اعلیٰ قسم کا سیاق دان بھی تھا،[۴]

شاہ جہان کے دیوان کل **افضل خان** علامی شکر اللہ شیرازی کا شمار جید علما میں کیا گیا ہے، جب وہ دیوان کل کے عہدہ پر فائز ہوا، تو کسی نے تاریخ کہی ع شد فلاطون وزیر اسکندر

۱۰۳۱ھ

---

[۱] خافی خان ج ۱ ص ۴۰۶، [۲] کیئی ہسٹری آف ہندی لٹریچر، [۳] بادشاہ نامہ حصہ اول ص ۲۶۹،

[۴] مآثر الامرا جلد اول ص ۱۵۸،

معقولات، منقولات، ہیئت، ہندسہ اور حساب میں اس کی اعلیٰ قابلیت مشہور تھی، فصاحت میں حسان وقت کہلاتا تھا، شاہ جہان کہا کرتا تھا کہ افضل خان کی زبان سے کسی نے کوئی برا کلمہ نہیں سنا[1]

سعد اللہ خان کو عبد الحمید لاہوری بادشاہ نامہ میں علامۃ الوریٰ اور فہامۃ العصر لکھتا ہے وہ معقولات و منقولات کا ممتاز عالم ہونے کے علاوہ حافظ قرآن بھی تھا، اس کی تقریر کی فصاحت اور تحریر کی بلاغت کی بھی بڑی شہرت تھی، دربار میں پہنچکر اس نے جس طرح رسوخ و اقتدار حاصل کیا، اس کا ذکر عمل صالح میں اس طرح ہے،

رمضان ۱۰۵۰ھ میں موسوی خان صدر کل کی سفارش سے بادشاہ کے حضور میں (سعد اللہ خان نے) شرفیابی حاصل کی پہلی مجلس ہی میں بادشاہ کی کمال شناسی اور قدر دانی کی وجہ سے اس کی استعداد کا مرتبہ نمایان ہوگیا، اور بادشاہ کی دقیقہ رسی کے باعث اس کا کمال ظاہر ہوا، اس کی (یعنی سعد اللہ خان کی) دقت طبع، جدت فہم، کثرت فراست، استنباط دقائق، دریافت حقائق، اور تحصیل علم وہبی و کسبی وغیرہ کا حال اہل علم پر ظاہر ہوگیا، چونکہ بادشاہ شریعت کی ترویج، اکابر دین کی تقویت، علما و صلحا کی تعظیم و تکریم، طلبہ کی تربیت و اہتمام میں ہمیشہ رغبت ظاہر کرتا ہے، اس لیے اس کی خاص مہربانی کی وجہ سے جس میں آب حیات کی خاصیت ہے اس نے (یعنی سعد اللہ خان نے) حیات جاودانی پائی، مناسب روزینہ خلعت اور گھوڑے سے سرفراز ہوکر ملازمان شاہی کے زمرہ میں منسلک ہوا، اور بادشاہ کے حسن تربیت اور اس کی مہربانی کی برکت سے ایک سال میں ایک ہزار دو سو سوار کا منصب خان کا خطاب، عرض مکرر کی خدمت اور غسل خانہ کی داروغگی کا عہدہ عطا ہوا، روز بروز اس کا

---

[1] مآثر الامراء جلد اول ص ۱۱۸ و بادشاہ نامہ ج ۱ حصہ دوم ص ۳۳۹ و ج ۲ ص ۵۵

اقبال بڑھتا گیا، بادشاہ کی نظر عنایت نے اس کی ذاتی استعداد کی مدد کی، اور اس کی سعادت کا ستارہ قابلیت اور اقبال کے مشرق سے کمال کے مطلع پر نکلا، رفتہ رفتہ بادشاہ کی خاص مہربانی سے اس نے اس قدر ترقی کی کہ دوسرے سال تین ہزار منصب، دو ہزار سوار اور خانسامانی کی خدمت سے سربلند ہو کر انجمن میں ہمدم و دمساز اور خلوت میں محرم و ہمراز ہو گیا، اور چوتھے سال بادشاہ کے فیض تربیت سے اس کے اقبال کا درخت طوبی کی طرح بڑھ کر ہندوستان کی وزارت کے باغ کا زینت ہوا، اور ساتویں سال ہفت ہزاری ہفت سوار پنجہزار دو اسپہ سہ اسپہ کا منصب، دس کروڑ دام کا انعام، اور علامی و فہامی کا خطاب ملا۔"

(جلد دوم ص ۴۲۳، ترجمہ آزاد ہے)

محمد امین میر جملہ بہ شستانی شاعر بھی تھا، امیر الامراء علی مردان خان کے دربار کی علم پروری مشہور تھی، نواب قاسم خان، ظفر خان احسن، عنایت خان آشنا، اور مرزا امان اللہ امانی کا ذکر پہلے آ چکا ہے،

فضلا: ملا عبدالحکیم سیالکوٹی۔ ان کے بارہ میں آزاد بلگرامی رقمطراز ہیں:

اپنے زمانہ کے بہت بڑے عالم اور اس زمانہ کے لوگوں کے لیے موجب افتخار ہیں یقیناً تمام درسی علوم میں ہندوستان کی سرزمین سے ان کا ہمسر نہیں پیدا ہوا، اور کمیت و کیفیت اور حسن قبول میں استفادہ علمی یادگاریں ان کی طرح کسی نے دنیا میں نہیں چھوڑیں، سیالکوٹ جو لاہور کے ملحقات میں ہے ان کا مولد ہے اور وہیں ان کی نشو و نما ہوئی، جب ان کے سن شعور کا زمانہ ہوا تو طالب العلمی شروع کی، اور زیادہ تر ملا کمال الدین کشمیری سے جو سیالکوٹ میں رہتے تھے فیض حاصل کیا، اور تھوڑی سی مدت میں بدر کامل ہو کر چمکے اور دنیا کو اپنے علمی فیوض و برکات سے بھر دیا، جہانگیر کے زمانے میں ضروری معاش پر قناعت کر کے اپنے

وطن ہی مین زندگی بسر کی لیکن جب شاہ جہان کا زمانہ آیا اور علما و شعرا کی گرم بازاری ہوئی تو وہ اس کے دربار مین حاضر ہوئے، اور جب جب دربار مین باریابی حاصل کرتے تھے صلۂ گران پاتے تھے، دو مرتبہ روپے مین تولے گئے اور وزن مین جس قدر روپیہ چڑھا ان کو مل گیا،[1] اور چند گاؤن بطور جاگیر کے انعام مین پائے، اب وہ نہایت اطمینان و فارغ البالی کے ساتھ اپنے وطن مین مقیم رہ کر درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کے ذریعہ سے علم کی اشاعت کرنے لگے، اونکی تصنیفات عرب و عجم مین پھیلی ہوئی ہین، اور وہ یہ ہین، حاشیہ تفسیر بیضاوی، حاشیۂ تفسیر تلویح، حاشیہ مطول، حاشیہ شریفیہ، حاشیہ شرح مواقف، حاشیہ شرح عقائد تفتازانی، حاشیہ حاشیہ خیالی، حاشیہ شرح شمسیہ، حاشیہ حاشیہ عبدالغفور، تکملہ حاشیہ عبدالغفور، حاشیہ شرح عقائد ملا جلال دوانی، درۂ ثمنیہ در اثبات واجب تعالی، حواشی در کنار حکمۃ العین، حواشی در کنار شرح ہدایۂ حکمت، حواشی در کنار مراح الارواح، ۲۰ ربیع الاول ۱۰۶۷ھ مین وفات پائی، اور سیالکوٹ مین مدفون ہین" (مآثر الکرام دفتر اول ص۲۰۳)

ملا محمد فاضل، بدخشان کے رہنے والے تھے، کابل، توران، اور شیراز سے علم معقول و منقول حاصل کرکے ہندوستان آئے، تفسیر اور اصول کی تعلیم ملا جمال لاہوری سے حاصل کی، اپنی لیاقت کے سبب "عدالت اردوئے کیہان" سے وابستہ ہوئے، آخر عمر مین درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا، شاہجہان کی طرف سے وظیفہ مقرر تھا، (بادشاہ نامہ، عبدالحمید لاہوری ص۳۴۳ ج ۱ حصہ دوم)

عبدالسلام دیوی، معقول منقول، فقہ اور اصول فقہ مین مہارت تامہ رکھتے تھے، شاہی فوج کیساتھ تو مناسک ساتھے،

قاضی محمد اسلم۔ ہرات مین پیدا ہوئے، مگر کابل مین سکونت اختیار کی، خراسان کے مشہور

---

[1] مزید تائید کے لیے دیکھو بادشاہ نامہ ج ۱ حصہ ۲ ص ۴۱۳

بزرگ مولانا خواجہ کوہی کی نسل سے تھے، جہانگیر کے عہد میں لاہور آئے، اور یہاں شیخ بہلول کے حلقۂ درس میں شریک ہوئے، پھر اکبر آباد پہنچے، اپنے عزیز مولانا میر کلان محدث (نبیسہ مولانا خواجہ کاہی) کی وساطت سے جہانگیر کے دربار میں باریابی حاصل کی، جہانگیر نے ان کی دین داری اور پرہیزگاری سے متاثر ہو کر، کابل کا منصب قضا تفویض کیا، اس کے بعد جہانگیر ہی کے عہد میں شاہی لشکر کے قاضی ہوئے، شاہجہان نے ان کو اپنے زمانہ میں بھی اسی عہدہ پہ مامور رکھا، اور منصب ہزاری عطا کیا، اس خدمت کو ۲۵ سال تک انجام دیتے رہے، شاہجہان ان کی بڑی قدر کرتا تھا، اس نے اپنا امام خاص بھی بنایا تھا، ۱۰۵۰ھ میں ان کو روپیے میں تلوایا، جو وزن میں ساڑھے چھ ہزار تھے، ایک بار گھوڑے سے گر گئے، تو چار مہینے صاحب فراش رہے، شفا پائی تو کابل گئے، شاہجہان نے دس ہزار روپے انعام میں دیئے ۱۰۶۱ھ میں وفات پائی، مزار لاہور میں واقع ہے، ان کے لڑکے میر محمد زاہد بھی جید عالم تھے، شاہجہان نے کابل میں واقعہ نویس کے عہدہ پہ مامور کیا، عالمگیر کے زمانہ میں شاہی لشکر کے محتسب رہے، پھر کابل کی صدارت تفویض کی گئی، ۱۱۰۱ھ میں کابل میں عالم جاودانی کو سدھارے، حاشیہ شرح مواقف، حاشیہ شرح تہذیب علامہ دوانی، حاشیہ تصور و تصدیق ملا قطب الدین رازی، اور حاشیہ شرح ہیاکل ان کی تصانیف ہیں ان کی ایک اور تالیف رسالہ میر زاہد، معقولات میں درس نظامی کی اونچی کتاب سمجھی جاتی ہے۔ (مآثر الکرام جلد اول ص ۲۰۷ و بادشاہ نامہ جلد اول حصہ دوم ص ۳۴۴)

قاضی محمد سعید کرہرودی، کچھ دنوں تک داروغۂ داغ رہے، پھر عرض مکرر کی خدمت انجام دی، آخر میں بیوتات کے دیوان تھے، ہزاری منصب پر فائز تھے،

ملا میرک شیخ ہروی، ہرات سے ہندوستان آئے پھر مکۂ معظمہ گئے، وہاں حدیث

کی تعلیم حاصل کر کے ہندوستان آئے، تو شاہجہان نے دارا شکوہ اور مراد بخش کی تعلیم کے لیے مقرر کیا۔

ملا عبد اللطیف سلطانپوری، تقریر و تحریر اور علمی تحقیق میں یگانۂ روزگار تھے، دارا شکوہ اور اورنگ زیب کی تعلیم کے لیے مقرر تھے، آنکھوں کی بصارت جاتی رہی، تو شاہجہان نے چند مکانات ان کو بطور انعام دیے، اور اجازت دی کہ وطن جا کر علوم دینیہ کا درس دیں،

میر محمد ہاشم گیلانی، منقولات، معقولات، طب اور ریاضی کے عالم تھے، بارہ سال حرمین شریفین میں رہ کر تعلیم پائی، منقولات میں شیخ محمد عربی محدث، شیخ عبد الرحیم حسانی اور ملا علی بن ملا عصام الدین کے شاگرد تھے، اور معقولات میں میر نصیر الدین حسین اور مرزا ابراہیم ہمدانی سے تحصیل کی تھی، طب حکیم علی گیلانی سے پڑھی، شاہجہان نے ان کی لیاقت کو دیکھکر تمام ملک کی صدارت "بالنیابت" کی خدمت پر مامور کیا، پھر اورنگ زیب کی تعلیم انہی کے سپرد کی گئی، تفسیر بیضاوی پر حاشیہ لکھکر شاہجہان کے نام معنون کیا،

شیخ محمد، اکبری عہد کے مشہور طبیب حکیم الملک کے پوتے تھے، مکہ معظمہ میں پیدا ہوئے وہاں سے تعلیم حاصل کر کے ہندوستان آئے، پرہیزگاری، نیک کرداری اور دوسرے فضائل سے متصف تھے، شاہجہان نے انھیں دار السلطنت کا میر عدل مقرر کیا،[1]

ملا فرید دہلوی، یمین الدولہ آصف خان کے حسن اہتمام سے ملا فرید دہلوی نے اور منجموں کی مدد سے ایک زیچ تیار کی جس کا نام زیچ شاہجہانی رکھا، اس میں زیچ الغ بیگ کے بعض مسامحات بھی دکھائے گئے ہیں، شاہجہان کے سامنے جب یہ زیچ پیش کی گئی، تو اس نے عام استفادہ کی خاطر ہندوستان کی زبان میں ترجمہ کے لیے حکم دیا،[2]

---

[1] مذکورہ بالا علماء کے حالات کے لیے دیکھو بادشاہ نامہ ج ۲ از عبد الحمید لاہوری ص ۳۴۶ - ۳۴۹،

[2] عمل صالح ج ۱ ص ۳۶۱،

میر محمد صالح مشکین قلم، میر عبد اللہ زرین رقم کا لڑکا تھا، ایک کتاب مناقب مرتضوی لکھ کر شاہجہان کو گذرانی، شاہجہان نے چند ورق دیکھے، تو بہت پسند کی، پانچ ہزار روپے اور ایک ہاتھی انعام مین دیا[1]،

اس عہد کے اور دوسرے علماء و مشائخ کے نام یہ ہین، شیخ عبد الحق دہلوی، ملا یوسف، ملا عبد السلام لاہوری، مولانا محب علی، سید محمد رضوی، میان میر، سید جلال، خواجہ خاوند محمود، خواجہ اسحق وہ بیری حجازی، ملا شاہ بدخشی، ملا خواجہ، شیخ بلاول قادری، شیخ پیر، میر حسام الدین بدخشی، شیخ ابو المعالی اور شیخ ناظر، ان کے فیوض و برکات کا ذکر عبد الحمید لاہوری کی تاریخ بادشاہ نامہ جلد اول حصہ دوم مین ملے گا،

مورخین شاہان مغلیہ کو تاریخ سے خاص ذوق تھا، اس لیے ہر حکمران کے دور حکومت مین تاریخ نویسی کا باضابطہ محکمہ قائم تھا، شاہجہان نے اپنے عہد کی تاریخ نویسی کے لیے متعدد اہل قلم کی خدمات حاصل کین، چنانچہ اس کی فرمائش سے جو تاریخین مرتب ہوئین وہ مندرجۂ ذیل ہیں،

۱- بادشاہ نامہ از محمد امین قزوینی،

۲- بادشاہ نامہ از عبد الحمید لاہوری،

۳- بادشاہ نامہ از محمد وارث،

۴- شاہجہان نامہ از مرزا جلال الدین طباطبائی،

محمد امین قزوینی، محمد امین بن ابو الحسین قزوینی ایران سے آکر پانچوین سنہ جلوس مین شاہجہانی دربار مین منشی کے عہدہ پر مامور ہوا، شاہجہان اپنے دربار کے تاریخ نویسوں کے کام سے خوش نہین تھا، وہ ایک لائق اہل قلم کی تلاش مین تھا، اتفاق سے قزوینی نے بندیلہ کی جنگ کے

---

[1] خافی خان جلد اول ص ۵۰۴،

حالات لکھکر پیش کیے، شاہجہان اس کی لیاقت سے خوش ہوا، ۱۰۴۳ھ یعنی سنہ جلوس میں قزوینی سے فرمایش کی کہ وہ اس کی پیدایش سے ابتک اس عہد تک کی ایک مفصل تاریخ لکھے، قزوینی نے ابتدائی دس سال کے احوال قلمبند کیے، دوسرے دس سال کی تاریخ لکھنا چاہتا تھا لیکن بعض نامعلوم اسباب کی بنا پر نہ لکھ سکا، عمل صالح میں اسکی فضیلت و قابلیت کا ذکر ان الفاظ میں ہے:-

"مرزا امینا در اصطلاحات زبان فارسی مہارت تمام دارد و قاعدہ فن انشا را نیکو از روی شناسد، شاہد سخنش از لباس تکلف مبراست و صاحب طبع و ذہن مستقیم و فکر رسا، سابق خدمت نگارش بادشاہ نامہ بدو متعلق بود و بعد ازان بخدمت جمع و قائع می پرداخت مردے خوش ظاہر و خوش محاورہ بود"

عبد الحمید لاہوری، عبد الحمید کا مولد اور مسکن لاہور تھا، علامی ابو الفضل کا شاگرد تھا، اس لیے اسی کے طرز انشا میں لکھنے کی مہارت پیدا کی، لیکن زمانہ کی نامساعدت سے ٹھٹھہ[۲] میں آکر عزلت نشین ہو گیا تھا، اس کے ادب و انشا کی خبر شاہجہان کو ملی، تو اس نے اس کو دربار میں طلب کیا، شاہجہان چاہتا تھا کہ ابو الفضل کی "اکبر نامہ" کے طرز پر اس کی حکومت کی بھی تاریخ لکھی جائے، چنانچہ اسی خواہش کو ملحوظ رکھتے ہوئے عبد الحمید کو تاریخ نویسی کے لیے مامور کیا، عبد الحمید خود لکھتا ہے:-

"بوسیلۂ بعضی از ملتزمان بساط تقرب بعرض اشرف اقدس رسید، کہ عبد الحمید لاہوری المولد والمنشا، کہ دل رمیدہ را از اختلاط این و آن و خاطر شوریدہ را از ارتباط فلان و

۱؎ ایتھے ج ۱ صـ ... برٹش میوزیم کیٹلاگ صـ ۲۵۹۔ ۲؎ ایتھے ٹھٹھہ کے بجائے پٹنہ لکھتا ہے، ایشیاٹک سوسائٹی کے مطبوعہ نسخہ میں بھی پٹنہ لکھا ہے لیکن اورینٹل لائبریری پٹنہ کے فاضل کیٹلاگ نگار نے صاف طور سے بتایا ہے کہ پٹنہ نہیں ہے بلکہ ٹھٹھہ ہے، ٹھٹھہ کا پٹنہ ہو جانا کتابت کی غلطی ہے، ملاحظہ ہو کیٹلاگ ج ۷ صـ ۲۲

بهان، واپرداخته در معموره پٹنه بزاویه تنهائی، وبمشغوله بے نوائی درساخته است، روش سخن پردازی وطراز انشا طرازی شیخ ابوالفضل نیک فراگرفته، اگر نگارش معالی ومکارم این دولت والا وگذارش محامد ومآثر این سلطنت دست بالا، بدو بازگذاشته آید، آئینه این لطیف منیف وازین تصنیف شریف بیبهے که درخاطر دوربین صواب گزین مرکوز است نگاشته بود،[1]"

تصنیف شاہجہان کی بیس سال کی حکومت کی تاریخ عمل صالح کا مصنف لکھتا ہے کہ شاہجہان اس کی خدمت سے اسقدر خوش تھا کہ اس نے دو مرتبہ اس کو روپے میں تلوا کر انعام عطا کیا،[2]

محمد وارث، آخر میں کبرسنی اور ضعف کے سبب عبدالحمید اس کام کو انجام نہیں دے سکتا تھا، اسلیے اسکے شاگرد محمد وارث کے ذمہ یہ خدمت سپرد کی گئی جس نے بقیہ دس سال کی تاریخ کو مکمل کیا، وارث لکھتا تھا اور علامی فہامی سعداللہ خان دیکھتے تھے، بعد علاءالملک طوفی الملخاطب بہ فاضل خان جو شاہجہانی عہد میں خانسامان کے عہدہ پر ممتاز تھا اور اورنگ زیب کے زمانہ میں وزیر ہوا، اس پر نظرثانی کرتا تھا، آخر کا کچھ حصہ اس نے خود لکھا،[3]

مرزا جلالہ طباطبائی، اصفہان سے ہندوستان ۱۰۴۶ھ میں آیا، شاہجہان کے زمانہ کے مورخین میں داخل ہوا، پانچ برس کی تاریخ لکھنے پایا تھا، کہ دشمنوں نے اس کے خلاف سازشیں کی، اور وہ اس خدمت سے محروم کر دیا گیا، "شش فتح کانگرہ" اسی کے رشحات قلم کا نتیجہ ہے، اس میں شاہجہان کی شاندار فتح کا حال لکھا ہے، اور کمال یہ کیا ہے کہ ایک ہی واقعہ کی تحریر میں چھ قسم کا طرز اختیار کیا ہے[4]

[1] بادشاہ نامہ ج ۱ ص ۱۰ [2] عمل صالح [3] ایضاً ج ۲ ص ۱۲۱ [4] اس عہد کی اور بھی متعدد تاریخیں ہیں مثلاً محمد صالح کی عمل صالح جو چھپ چکی ہیں اور محمد صادق خان کی شاہجہان نامہ، مگر ان مورخوں کا زیادہ تر کوئی تعلق شاہی دربار سے نہیں معلوم ہوتا ہے، اس لیے اس کتاب میں ان کا ذکر ضروری نہیں سمجھا گیا،

خوشنویس تیموریون نے اپنے دور میں فن خطاطی کو بھی بڑی ترقی دی۔ اکبری عہد کے خطاطون کا ذکر کیا جا چکا ہے، جہانگیر کو مصوری کے ساتھ اس فن سے بھی گہری دلچسپی تھی اور اس نے اپنے تمام لڑکوں کو اس کی خاص طور پر تعلیم دلائی۔ شہزادہ خسرو کی خوش خطی مشہور تھی، سلطان پرویز کلام اللہ کی کتابت میں اکثر مشغول رہتا، خود شاہجہان خط نستعلیق کا بڑا ماہر تھا، اس کی سرپرستی میں سید علی خان الحسینی جواہر رقم، عبدالباقی خداداد یاقوت رقم، محمد مراد شیرین قلم، میر صالح ولد عبداللہ مشکین رقم، ملا باقر کشمیری، محمد حسین کشمیری، مقصود علی، میر محمد کاشی، حافظ عبدالرحمٰن رشیدائی، عبداللہ، شکراللہ، محمد معیم، محمد جعفر، کفایت خان، درایت خان، محمد اکبر اور محمد موسیٰ نے نستعلیق تعلیق، نسخ اور شکستہ لکھنے میں بڑا کمال پیدا کیا، شاہجہان میر عماد الحسینی قزوینی کی خطاطی کا بڑا دلدادہ تھا، میر عماد ہندوستان نہیں آیا، لیکن شاہجہان کی خدمت میں جب کوئی اس کی خطاطی کا کوئی نمونہ نذر کرتا، تو شاہجہان اس کو انعام میں یکصدی منصب عطا کرتا تھا، عبدالرشید دیلمی میر عماد کا بھانجہ اور شاگرد بھی تھا، وہ ہندوستان آیا تو دارا کا استاد مقرر ہوا، جس کے بعد اس نے دربار میں بڑا رسوخ حاصل کیا، تذکرۂ خوشنویسان کے مولف نے اس کو ملک خطاطی کا پیغمبر کہا ہے، اور یہ بھی لکھا ہے کہ یہ فن اسی کے ساتھ ختم ہو گیا، اس کے ممتاز شاگردوں میں دارا شکوہ کے علاوہ، محمد اشرف خواجہ سرا، سعیدائی اشرف، عبدالرحمٰن اور میر حاجی وغیرہ تھے[1]

کتب خانہ شاہی کتب خانہ کا داروغہ بعض اوقات خوشنویسون ہی میں سے مقرر ہوتا تھا، چنانچہ ۱۰۵۵ھ تک اس خدمت کو عبدالرحمٰن رشیدائی نے انجام دیا تھا، اس کے بعد میر صالح ولد عبداللہ مشکین رقم اس عہدہ پر متعین ہوا،[2]

درسگاہیں ان درسگاہون کو جو اکبر و جہانگیر اور ان کے امرا نے قائم کیں شاہجہان

---

[1] تذکرہ خوشنویسان ص ۹۰-۱۰۵   [2] شاہجہان نامہ ص ۵۰۵ ج ۲

نے نہ صرف یہ کہ ان کو بجنسہ قائم رہنے دیا، بلکہ انھیں فروغ دینے کی کوشش کی۔ ان کے علاوہ جامع مسجد دہلی کے جوار میں اس نے ایک مدرسہ دارالبقا نامی قائم کیا، جس میں طلبہ معقول و منقول کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔[1]

اس مدرسہ کا فیض عرصہ تک جاری رہا، کچھ عرصہ کے بعد اس کی عمارتیں مرمت طلب ہو گئیں، تو صدرالدین خاں بہادر صدرالصدور شاہجہان آباد نے ایک کثیر رقم خرچ کر کے از سر نو تعمیر کرائیں، اور وہاں کے طلبہ کے کھانے اور کپڑے کے اخراجات خود ہی برداشت کیے۔

[1] آثارالصنادید از سید احمد خاں باب تیسرا ص ۱۲

عالمگیر

جسمانی ہمت اور تمکنت کے علاوہ اس نے اوائل زندگی ہی سے بادشاہت کی
مشقتوں اور خطروں کو اپنا شیوہ بنا لیا تھا، اور اس عظیم الشان عہدہ کے لیے احترام ذات،
معرفت ذات اور ضبط نفس سے اپنے کو تیار کیا، بادشاہوں کے لڑکوں سے بالکل مختلف
اورنگ زیب ایک وسیع النظر اور سلیم الفطرت عالم تھا، اور زندگی کی آخری سانس تک کتابوں
سے محبت کرتا رہا، اگر ہم قرآن شریف کے ان متعدد نسخوں کو نظر انداز بھی کر دیں جن کو اس نے
اپنے ہاتھوں سے ایک عابد کی سرگرم ریاضت کے ساتھ لکھا، تو بھی ہم اس کو فراموش نہیں
کر سکتے، کہ وہ ایک مشغول حکمران ہونے کے باوجود اپنی قلیل فرصت کو عربی کی فقہی اور
مذہبی کتابوں کے مطالعہ میں شوق سے گذارتا، اور پرانے اور نادر مخطوطات مثلاً نہایہ،
احیاء العلوم اور دیوان صائب کو کتابوں کے ایک کامل عاشق کی ہوس سے ڈھونڈتا،
اس کے کثیر رقعات اس کی فارسی شاعری اور عربی ادب پر قدرت کی دلیل ہے، کیونکہ
وہ ہمیشہ اپنے ایک خط کو مناسب اشعار و اقتباسات سے مزین کرتا ہے، عربی اور فارسی
کے علاوہ ترکی اور ہندی بھی آزادی کے ساتھ بول سکتا تھا، یہ اسی کی جودت طبع اور سرپرستی
کا نتیجہ ہے کہ آج ہمارے پاس ہندوستان میں مسلمانوں کے قانون کا سب سے بڑا خلاصہ
فتاوی عالمگیری ہے، جو نہایت مناسب طور پر اسی کے نام سے منسوب ہے، اور جس
نے اس کے عہد میں ہندوستان میں اسلامی نظام عدل کو وسیع طور پر آسان کر دیا ہے۔

ملاحظہ اورنگ زیب مصنفہ جادو ناتھ سرکار ص ۴۷۹

یہ الفاظ اورنگ زیب کے اس سوانح نگار کے ہیں جس نے اس کے خلاف تعصب اور عداوت کا اظہار کرنا اپنی زندگی کا واحد اور معنی خیز مقصد قرار دیا ہے، مگر اورنگ زیب کے علمی کمالات کے لیے مذکورہ بالا تعریفی کلمات بادل ناخواستہ شاید اس لیے لکھ دیے گئے ہیں کہ اس عظیم المرتبت اور جلیل القدر فرمانروا کے آفتاب علم پر خاک ڈالنے کی کوشش بے سود ہوتی،

اورنگ زیب کی تعلیم لائق اور قابل اساتذہ کی نگرانی میں ہوئی، جن ارباب علم و کمال سے اس نے فیض حاصل کیا، ان کے نام یہ ہیں:-

مولانا عبداللطیف سلطانپوری، مولانا ہاشم گیلانی، علامی سعد اللہ، ملا موہن بہاری، مولانا سید محمد قنوجی، ملا شیخ احمد معروف بہ ملا جیون، شیخ عبدالقوی، دانشمند خان،[۱]

مولانا عبداللطیف سلطانپوری، مولانا ہاشم گیلانی، اور علامی سعد اللہ کا ذکر پہلے آچکا ہے،

مولانا عبداللطیف کے بارے میں اورنگ زیب کہا کرتا تھا کہ میرے تمام استادوں میں ان کا حق زیادہ ہے، کیونکہ وہ میری تعلیم میں کسی قسم کی مداہنت اور تساہل کو راہ نہ دیتے تھے،[۲]

ملا موہن کا اصلی نام محی الدین تھا، قصبہ بہار شریف کے رہنے والے تھے، نو سال کی عمر میں کلام پاک حفظ کیا، حضرت شاہ عبیداللہ نبیرہ شیخ وجیہ الدین گجراتی سے شرف بیعت حاصل کیا، شاہجہان کے دربار سے منسلک ہوئے، تو اورنگ زیب کی تعلیم کی بھی خدمت ان کے سپرد ہوئی، ۱۰۶۴ھ میں ۴۴ سال کی عمر میں وطن ہی میں وفات پائی،

---

[۱] اورنگ زیب کی تعلیم، تربیت اور اساتذہ پر جناب سید نجیب اشرف صاحب ندوی (سابق رفیق دار المصنفین) نے حال پر وفیسر اسماعیل کالج بمبئی) نے مقدمہ رقعات عالمگیر (سلسلہ دار المصنفین) میں نہایت فاضلانہ بحث کی ہے، یہ مقدمہ علیحدہ بھی شائع کیا گیا ہے،

[۲] مرآۃ العالم قلمی نسخہ دار المصنفین، ورق ۳۱۹ ب

مولانا سید محمد قنوجی ریاضی اور ادب کے ماہر تھے، عالمگیر نے امام غزالی کی اکثر کتابیں خصوصاً احیاء العلوم ان ہی سے پڑھی، تخت پر جلوہ افروز ہونے کے بعد بھی عالمگیر نے ان سے استفادہ جاری رکھا، اور ہفتہ میں تین روز اس کے یہاں علمی مجلس ہوتی جس میں مولانا محمد قنوجی ضرور شرکت کرتے، فتاوی عالمگیری کی تدوین میں بھی وہ شریک رہے،[1] ۱۰۹۰ھ وہ اجمیر جاکر عالمگیر سے ملے تھے، اس کا ذکر مآثر عالمگیری کا مؤلف اس طرح کرتا ہے:-

"بیس محرم کو جامع الکمالات میر محمد قنوجی تخت گاہ سے آستانہ شاہی پہ حاضر ہوئے، اور شرف یابی سے شاد کام ہو کر ایک ہزار روپیہ و دو خوان میوہ کے عطیات سے سرفراز ہوئے،"[2]

عالمگیر اپنے بعض اہم خانگی کام ان ہی کی نگرانی میں انجام دلاتا تھا، مثلاً شاہجہان کی تجہیز و تکفین شاہی غسل خانہ میں ہوئی، تو وہ بھی موجود رہے، شاہزادہ محمد اعظم کا نکاح ان ہی کی وکالت میں انجام پایا،[3] ان کے لڑکے سید احمد خان کو عالمگیر نے محتسب کے عہدہ پہ مامور کیا تھا،[4]

ملا جیون ان کا اصلی نام شیخ احمد تھا، صدیقی تھے، امیٹھی ضلع لکھنؤ میں پیدا ہوئے، کلام پاک حفظ کر کے اپنے عہد کے تمام ممتاز علماء سے تعلیم پائی، ملا لطف اللہ کوڑہ جہان ابادی سے فاتحۂ فراغ پڑھا، حافظہ بڑا قوی رکھتے تھے، ایک بار کوئی قصیدہ سن لیتے تو وہ پورا یاد ہو جاتا درس کی کتابوں کی عبارت بغیر دیکھے پڑھتے، عالمگیر کے دربار سے وابستہ ہوئے تو اس نے ان سے بہت سی کتابیں پڑھیں، اور پھر زندگی بھر ان کا احترام کرتا رہا، ان سے اسی طرح ادب سے پیش آتا جس طرح بچے باپ سے پیش آتے ہیں، ملا صاحب کے بھولے پن اور عالمگیر کی سعادت مندانہ

---

[1] تذکرہ علمائے ہند ص ۲۱۶، [2] مآثر عالمگیری ص ۱۴۵ اردو ترجمہ جامعہ عثمانیہ [3] ایضاً ص ۳۷، ۵۲

[4] ایضاً ص ۶۵،

اطاعت گذاری کے قصے اور لطیفے آج بھی مجلسون مین بیان کئے جاتے ہین، ملا صاحب کی
پوری عمر درس و تدریس اور تصنیف و تالیف مین گذری، حرمین شریفین کی زیارت کو گئے
تو مدینہ مین ربیع الاول ۱۱۰۵ھ مین منار کی شرح نور الانوار کے نام سے لکھنی شروع کی،
رجمادی الاول ۱۱۰۵ھ کو یہ شرح ختم کی، اور کسی کتاب سے مدد نہ لی، ان کی تفسیر احمدی آجتک
مشہور ہے، ۱۱۳۰ھ مین دہلی مین وفات پائی، مگر امیٹھی مین دفن ہین[۱]

شیخ عبد القوی برہان پوری اپنے علم و فضل، سچائی اور سلامت روی کے لیے مشہور
تھے، اس لیے اورنگ زیب کے استاد مقرر ہوئے، اورنگ زیب نے جب زمام سلطنت سنبھالی
تو ان کو ہزار و پانصدی کا منصب[۲] عطا کیا، اور اس کے مقرب خاص رہے،
وہ ان کو اخوند کہا کرتا تھا، اور خلوت مین بلا کر ان کے مشورون سے مستفید ہوتا تھا، اسی لیے
جلوس کے چوتھے سال اعتماد خان کا بھی خطاب دیا، تفسیر کے عالم ہونے کے علاوہ شرعی
احکام اور فقہی جزئیات کا بھی بڑا لحاظ رکھتے تھے، احتساب مین بھی بہت سخت تھے،
حضرت سرمد کی برہنگی کا سوال اٹھا تو عالمگیر نے ان ہی کو حضرت سرمد سے بازپرس کرنے
کا حکم دیا، اور جب وہ ان کے سامنے لائے گئے، تو اپنی برہنگی کی وجہ یہ بتائی کہ شیطان قوی
ہے اور پھر یہ رباعی پڑھی

خوش بالائے کردہ چنین پست مرا	چشمے بدو جام بردہ از دست مرا
او در بغل من است و من در طلبش	دزدے عجبے برہنہ کردہ است مرا

شیخ عبد القوی مطمئن نہین ہوئے، مزید یہ کہ حضرت سرمد کی حسب ذیل رباعی سے ان کو
انکار معراج کا بھی مجرم قرار دیا،

---

[۱] تذکرہ علمائے ہندی ص۲۴۸ [۲] مراۃ العالم مین ہے کہ دو ہزار و پانصدی کا منصب ملا (ورق ۲۹۷)

ان کو سر حقیقتش یاد رسشد　　خود ہین تر از سپہر بہناور شد
ملا گوید کہ بر شد احمد بفلک　　سرمد گوید فلک با حمد در شد

اور اس کے بعد دوسرے فقہا کی رائے لیکر حضرت سرمد کے قتل کا حکم صادر کیا
شیخ عبد القوی ایک جاسوس کے جرم کی تفتیش کے سلسلہ مین قتل ہوئے تو عالمگیر اپنے محبوب
استاد کی موت پر بڑا متاسف اور دلگیر ہوا، ان کی اولاد کو اپنی نوازشون سے سرفراز کرتا رہا[1]
دانشمند خان خطاب، نام ملا شفیعائی، اور وطن یزد تھا، ایران مین معقولات
ومنقولات کی تعلیم پاکر تجارت کے سلسلہ سے ہندوستان آئے، مگر تجارت کرنے کے بجائے
شاہی فوج سے منسلک ہوگئے، لیکن اس ملازمت سے بد دل ہوکر وطن واپس جانے لگے
شاہجہان کے مقربین نے ان کی استعداد ولیاقت کا ذکر اس سے کیا، تو اس نے فورا
شاہی فرمان بھیجکر ان کو دربار مین طلب کیا، وہ سورت پہنچ چکے تھے لیکن شاہی حکم پاکر
لوٹے، دربار مین پہنچے تو شاہجہان نے ان کی لیاقت کو جانچنا چاہا، ایک روز علمی مجلس منعقد
کرائی جس مین ملا عبد الحکیم سیالکوٹی خاص طور پر مدعو کیے گئے، شاہجہان کی فرمایش سے
ملا شفیعائی یزدی اور ملا عبد الحکیم سیالکوٹی مین علمی مذاکرہ شروع ہوا، بادشاہ نے علامی
سعد اللہ کو حکم مقرر کیا، بحث ایاک نعبد وایاک نستعین کی تفسیر پر تھی، ملا عبد الحکیم اور ملا
شفیعائی نے اہم نکتے بیان کیے، اور جب بحث ختم ہوئی تو علامی سعد اللہ کے لیے یہ فیصلہ کرنا
مشکل تھا کہ دونون مین سے کس کا علم زیادہ گہرا اور وسیع ہے، شاہجہان ملا شفیعائی کی فصاحت
گفتار سے خوش ہوا اور شاہی ملازمین کے زمرہ مین داخل کر لیا، وہ رفتہ رفتہ ترقی کر کے میر بخشی
کے عہدہ پر مامور ہوئے، اور دانشمند خان کے خطاب اور سہ ہزاری ہشت صد سوار کے منصب

[1] مآثر الامراء ج ۲ ص ۲۹-۲۲۷، مراۃ العالم ورق ۲۹۸

سے سرفراز کئے گئے۔ شاہجہان کے آخری زمانہ حکومت میں کسی سبب سے گوشہ نشین ہوگئے
تھے۔ جب اورنگ زیب تخت پر جلوہ افروز ہوا، تو پھر شاہی لطف و کرم سے نوازے
گئے۔ میر بخشی اور مختلف عہدوں کی خدمت ان کے سپرد ہوتی رہی، پنجہزاری منصب
بھی عطا ہوا، فرحۃ الناظرین میں ہے کہ عالمگیر بادشاہ ہونے کے بعد بھی ان سے خاص
خاص کتابیں پڑھا کرتا تھا، امام غزالی کی احیاء العلوم ان ہی سے آخر تک پڑھی۔ دانشمند خان
کے بارے میں مآثر الامراء میں ہے:

"امیر موصوف اپنے زمانہ کے بڑے فضلاء میں سے تھے، نیک نفسی اور نیک اندیشی
میں مشہور تھے۔ ان کے بعد اب تک ایسے لوگوں میں جنہوں نے فضیلت اور امارت
کو ایک ساتھ جمع کر لیا تھا کوئی ان کے درجہ کا نہیں پیدا ہوا۔"[1]

سنہ ۱۰۸۱ھ میں وفات پائی۔

اورنگ زیب کو علوم دینیہ سے فطری رغبت تھی، لائق اور فاضل اساتذہ کی نگرانی
میں ان علوم سے اس کا شغف اور بھی زیادہ بڑھا، عالمگیر نامہ میں ہے:

از کمالات کسبیہ آنحضرت کہ زینت بخش حالات قدسیہ بوده، گذشتہ تتبع علوم دینیہ از
حدیث و تفسیر عزیز و فقہ شریف حنفیہ است، از بس بممارست در کتب شرعیہ و استکشاف
عقائد اصلیہ و مسائل شرعیہ اشتغال ورزیده اند، قوت حافظہ اشرف، مخزن این حقائق
شده و بسیاری از کتب طریقت و سلوک و اخلاق چون احیاء العلوم و کیمیای سعادت
و دیگر تصانیف عرفا و اکابر رسائل و مؤلفات علمای باطن و ظاہری بمطالعہ ہمایون

[1] مآثر الامراء جلد دوم ص ۳۲-۳۰ نیز دیکھو مراۃ العالم قلمی ورق ۲۹۰، و اقتباس فرحۃ الناظرین
لاہور ص ۷۱

رسید مل......عضلات وکشف اسرار آن فرمودہ اند و بالفعل نیز بعد فراغ از نظم ِمہام سلطنت و سروری تمہید مراسم دین پروری و عدالت گستری باین شرائف اشتغال پیوستگی دارند[1]

اسی چیز کو ماثر عالمگیری کا مصنف ان مختصر الفاظ میں پیش کرتا ہے،

قبلہ عالم کے کمالات کسبیہ کا عظیم الشان کارنامہ علوم دینیہ یعنی فقہ و تفسیر و حدیث کی تحصیل ہے، جہاں پناہ کو حضرت امام غزالی کی تصنیفات، شیخ شرف الدین یحیٰی منیری کے منظومات اور شیخ زین الدین و قطب الدین محی الدین شیرازی کے رسائل سے خاص شوق تھا، اور یہ کتابیں اکثر مطالعے میں رہتی تھیں[2]

اورنگ زیب حافظ قرآن بھی تھا، اور یہ سعادت تیموری بادشاہوں میں صرف اسی کو حاصل تھی، اور سب سے زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ اس نے کلام پاک اس وقت حفظ کیا جب وہ اپنی عمر کے تینتالیسویں سال میں تھا، اور یہ دولت صرف ایک سال کے اندر جمع کی ۱۰۷۱ھ میں حفظ کرنا شروع کیا، اور ۱۰۷۲ھ میں ختم کیا، سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰى سے ابتدا کی اور لَوْحٍ مَّحْفُوظٍ سے اختتام کی تاریخ نکلتی ہے، اورنگ زیب کے ایک درباری شاعر نے اس موقع پر یہ شعر کہا:

توحامی شرع و حامی تو شارع ۔۔۔ تو حافظ قرآن و خدا حافظ تو[3]

ماثر عالمگیری میں ہے:-

حضرت کے فضائل میں سب سے اہم و عظیم الشان امر حفظ قرآن مجید کی سعادت ہے، اگرچہ ابتدا ہی سے قبلہ عالم کو اکثر سورتیں قرآن مجید کی حفظ تھیں، لیکن تمام و کمال کلام پاک کے حفظ سے بعد جلوس بہرہ اندوز ہوئے، حضرت کو قرآن پاک بہت اچھا

---

[1] عالمگیر نامہ ص۱۰۹۲، [2] ماثر عالمگیری ص۵۳۲، [3] عالمگیر نامہ ص۱۰۹۲ و مراۃ العالم قلمی نسخہ ۔

یاد تھا، اور اس امر مین بیحد اہتمام فرماتے تھے کہ کلام الٰہی کو نہایت صحت کے ساتھ لکھین، قصۂ عالم کے شروع حفظ کی تاریخ خود قرآن کریم کی آیت سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰى ہے، اور ختم کلام مجید کا سنہ لوحِ محفوظ کے اعداد سے برآمد ہوتا ہے، (۱۰۸۰ھ)

اورنگ زیب فن خطاطی مین ید طولیٰ رکھتا تھا، یہ فن اس نے سید علی خان الحسینی جواہر رقم[1] اور عبد الباقی حداد (عبد اللہ)[2] سے سیکھا، چنانچہ اسکو خط نسخ اور خط نستعلیق لکھنے مین کامل مہارت تھی، منشی کاظم مصنف عالمگیر نامہ لکھتا ہے:-

از رتبۂ خط و حسن تحریر آن شہنشاہ فلاطون فطنت سکندر نظیر کہ صفحات روزگار و اوراق دفاتر لیل و نہار از ان زینت پذیر است خامہ نکتہ پرداز جادو فن را چہ یارائے دم زدن بقدرت کلک بدائع آثار معنی استادی و سحر نگاری رد جہان برکرسی نشانیدہ اند کہ دست استادان اقالیم سبعہ خط بدان نتواند رسید و بر شجرۂ عقیق انامل در بار نہال موزون قلم را در خوشنویسی شاخ دیدگی بخشیدہ کہ یکتایان صنعت خط از تتبع آن شیوہ حز بخجلت ثمری نتوانستہ چید، خط نسخ آن حضرت کہ رقم نسخ خط یاقوت و صیرفی تواند بود، در غایت پختگی و مزہ و متانت و اسلوب است و کمال قدرت در نوشتن آن دارند، و اکثر اوقات توفیق ثواب اندوزی کتابت کلام اللہ از ضمائم عبادات و کرائم عادات آن شہنشاہ دین پناہ است، ...... خط نستعلیق آنحضرت بے شائبہ اطرای مدح طرازی و اغراق نکتہ پردازی دراں رتبہ است کہ قطعہاے کہ در عین ایام ذوق و سرگرمی مشق قلم پذیر خامہ اشرف گشتہ بقطعہاے خوب استادان کہ عمر گرانمایہ صرف تحصیل آن سرمایہ ساختہ تکمیل امرے دیگر نپرداختہ اند در نظر خط شناسان مبصر مشتبہ می شود، و شکستہ نستعلیق در غایت مفرد ازی و صفا متانت و پختگی می نویسند،[3]

---

[1] تاریخ خوشنویسان صفحہ ۵ [2] ایضاً صفحہ ۱۲۵، [3] عالمگیر نامہ ص ۱۰۹۳-۱۰۹۴

مآثر عالمگیری میں ہے،

"قبلۂ عالم خط نستعلیق و شکستہ بھی بہت خوب لکھتے تھے، ان خطوط میں حضرت کو کمال حاصل تھا"[1]

بختاور خان مرآۃ العالم میں لکھتا ہے،

"در نوشتن اقسام خطوط مہارت اندوختہ"

اورنگ زیب نے خطاطی کا فن محض ذاتی زیب و زینت کے لیے نہیں سیکھا تھا، بلکہ اس کے ذریعہ سے حصول سعادت دین کے ساتھ ساتھ کسب معاش دنیا بھی کیا کرتا تھا، وہ فرصت کے اوقات میں عموماً صبح کو پانچ بجے سے سات بجے تک اور سہ پہر کو ۲ بجے سے ۴ بجے تک کلام مجید کے نسخے اپنے ہاتھ سے لکھتا تھا جس کا سلسلہ اس نے ایام شہزادگی سے لے کر آخر عمر تک جاری رکھا، عالمگیر نامہ میں ہے، (ص۱۰۹۲)

"شہزادگی کے زمانہ میں بہت سے تحفوں اور قیمتی خلعت کے ساتھ ایک مصحف مکہ کو بھیجا تاکہ وہاں اس کی تلاوت ہو، تخت شاہی پر بیٹھنے کے بعد شاہانہ مشاغل کی کثرت کے باوجود مصحف کی کتابت اور عبادات و وظائف کے لیے کچھ وقت الگ کر لیا تھا، چنانچہ تھوڑے ہی عرصہ میں ایک اور مصحف کی تکمیل کی، ان دو مصحفوں کے علاوہ پنج سورہ اور دوسری قرآنی سورتیں بھی لکھیں۔ (یہ عبارت اصل کی تلخیص ہے)

مآثر عالمگیری میں ہے کہ عالمگیر نے دو مصحف مدینہ منورہ بھیجے

قبلۂ عالم خط نسخ نہایت خوب تحریر فرماتے تھے، اور اس کی کتابت پر حضرت کو خاص قدرت حاصل تھی، جہاں پناہ نے دو قرآن مجید اپنے قلم خاص سے تحریر فرما کر مبلغ سات ہزار روپے ان کی تیاری اور جدول کی زیب و زینت میں صرف فرما

[1] مآثر عالمگیری ص۵۳۲ و مرآۃ العالم

رکھے ہوئے ہیں[1]، دونوں نسخے مدینہ منورہ میں حرم نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے اندر ہیں،

اورنگزیب کے ہاتھ کے لکھے ہوئے کلام پاک کے نسخے آج بھی ہندوستان کے مختلف حصوں میں پائے جاتے ہیں، ایک نسخہ اعلیٰ حضرت حضور نظام دکن کی ملکیت میں ہے، دوسرا جناب مولوی سید خورشید علی صاحب ناظم دیوانی حیدرآباد کے پاس ہے، تیسرا نواب صاحب مانگرول کے پاس ہے، جس کا عکس جناب خواجہ حسن نظامی صاحب نے شائع بھی کر دیا ہے، مگر یہ نسخہ مشکوک ہے، ایک پنج سورہ کرزن میموریل کلکتہ میں ہے[2]،

اور عبرت کی بات یہ ہے کہ دنیا کے سب سے بڑے ملک اور سب سے بڑی مملکت کے شہنشاہ نے کلام پاک کے انہی نسخوں کے ہدیہ کی رقموں کو اپنی آخرت کی نجات کا ذریعہ سمجھا، چنانچہ اپنے وصیت نامہ میں لکھتا ہے:

"چہار روپیہ و دو آنہ از وجہ کلاہ دوزی نزد آیہ بیگہ محلدار است بگیرند، و صرف کفن این بیچارہ نمایند، و سہ صد و پنجہ و روپیہ از وجہ کتابت قرآن در حرف خاص است، روز وفات بفقرا دہند[3]"

عالمگیر نے سلوک و طریقت کی بھی تعلیم پائی، اس سلسلہ میں وہ حضرت مجدد الف ثانی رح کی تعلیمات سے متاثر تھا، اسی لیے ان کے فرزند ارجمند حضرت محمد معصوم قدس سرہ کے رشد و ہدایت سے مستفید ہوتا رہا[4]، عہد اکبری میں بعض علمائے سوء کی فتنہ سامانیوں کی وجہ سے عالم اسلامی شعائر

[1] مراۃ العالم زیب تجی ... و قرآن مجید بخط اقدس بصورت ترتیب پذیرفتہ، و مبلغ ہفت ہزار روپیہ بر لوح و جدول آن صرف شدہ، و باماکن شریفہ ترسیل یافتہ" [2] تفصیلات کے لیے دیکھو مقدمہ رقعات عالمگیری از سید نجیب اشرف ندوی ملخصاً، [3] سفر کاہ احکام عالمگیری ص۳۳، طبع ثانی، بحوالہ مقدمہ رقعات عالمگیر از سید نجیب اشرف ندوی [4] تکملہ خزینۃ الاصفیا ص۹۲،

سے بیگانہ ہوکر کفر و ضلالت کی طرف مائل ہو گئے تھے، ان کی زندگی بدعت، شرک اور زندقیت سے ملوث ہو گئی تھی، بعض صوفیہ نے اپنے کو بندگان دین کہکر طریقت و معرفت کے نام سے تصوف کی ایسی تعلیم دی تھی جس سے شریعت کے تمام قوانین نظر انداز کر دیے گئے تھے، حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے علم جہاد بلند کر کے اسلام اور پیروان اسلام کی زندگی کو مشرکانہ رسوم، ملحدانہ عقائد، اور غیر شرعی رجحانات سے پاک و صاف کیا، اور ایک بار پھر کتاب و سنت کے احکام کی تجدید کی، ان کی تعلیم تھی کہ ہر مسلمان خواہ وہ بادشاہ ہو یا ادنیٰ سپاہی، عالم ہو یا جاہل، امیر ہو یا غریب، عارف ہو یا سالک، اپنے عقائد کو کتاب و سنت کے مطابق صحیح کرے[1]، اور کتاب و سنت سے جو علوم مستفاد ہیں ان میں سے وہی معتبر ہیں جن کو بزرگان نے سمجھا اور اخذ کیا ہے، ورنہ ہر بدعتی اور ہر گمراہ اپنے عقائد فاسدہ کی بنیاد کتاب و سنت ہی پر رکھتا ہے، پس قرآن و حدیث سے جو شخص جو معنے سمجھے وہ سب معتبر نہیں ہیں[2]، اعتقاد صحیح وہی ہے جس کو علمائے اہل سنت نے کتاب و سنت اور آثار سلف سے سمجھا ہو، اگر بالفرض کشف و الہام سے جمہور علماء کے خلاف کسی نص کے معنے معلوم ہوں تو اس کا اعتبار نہیں، بلکہ اس سے پناہ مانگنا چاہیے[3]، نجات ابدی اور فلاح سرمدی اسی میں ہے کہ ان ہی علماء کا تتبع کیا جائے جنھوں نے صحابہ کرام اور اسلاف صالحین کے سرچشمہ ہدایت سے فیض اٹھایا ہے، بعض عارف شرعی احکام کی پابندی کو ضروری نہیں سمجھتے ہیں، مگر جو عارف ایسا سمجھتا ہے وہ جاہل ہے، عبادت کی جسقدر ضرورت عارفوں کو ہے مبتدیوں کو اس کے دسویں حصہ کی بھی حاجت نہیں[4]، شریعت کی پابندی کے بغیر صرف اعمال کی [illegible] قلب کی سلامتی ممکن ہے جو شخص باطن کو درست کرتا ہے اور ظاہر کو یونہی چھوڑ دیتا ہے وہ ملحد ہے، اگر اس کو کچھ باطنی

۱؎ مکتوب نمبر ۱۵۶[?] دفتر اول ۲؎ مکتوب نمبر ۱۹۳[?] ۳؎ مکتوب نمبر ۲۸۶[?] دفتر اول، ۴؎ مکتوب نمبر ۲۶۶[?] دفتر اول

احوال حاصل ہون تو وہ اس کے حق مین استدراج ہے، احوال باطنی کا احکام شرعیہ سے آراستہ ہونا ضروری ہے، اگر علوم لدنیہ کی مطابقت صریح علوم شرعیہ سے نہین تو ایسے تمام علوم کو حاصل کرنا الحاد اور بے دینی ہے،[1] طریقۂ سنت سے ہٹ کر جو ریاضتین اور مجاہدے لوگ کرتے ہین، ان کا کچھ وزن و اعتبار نہین، ایسی ریاضتین تو یونان کے فلسفی اور ہندوستان کے برہمن اور جوگی بھی کرتے ہین، لیکن ان کو گمراہی اور خسارہ کے سوا کچھ حاصل نہین ہوتا،[2] نامشروع طریقون سے جو احوال وکیفیات مترتب ہون وہ استدراج ہین، احکام شرعیہ کے اثبات مین صرف کتاب و سنت کا اعتبار ہے، اور قیاس و اجماع امت بھی مثبت احکام ہین، ان چار ادلۂ شرعیہ کے بعد کوئی ایسی دلیل نہین جس سے احکام ثابت ہون،[3]

ہم نے حضرت مجدد اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیمات کا بہت سرسری خاکہ پیش کیا ہے، عالمگیر نے ان تعلیمات کی تمام جزئیات کا خود بھی مطالعہ کیا تھا، پھر حضرت خواجہ محمد معصوم قدس سرہ کی بیعت اس کے حق مین سونے پر سہاگہ ثابت ہوئی، وہ عالم دین اور حافظ قرآن تو پہلے ہی سے تھا پھر حامی دین اور پابند شریعت بننے مین اس کو کیا دیر لگ سکتی تھی، ہندوستان کے اس مسلمان بادشاہ کی جو قلمی تصویر ماثر عالمگیری کے مولف نے پیش کی ہے اس کو ہم ہوبہو ہدیۂ ناظرین کرتے ہین:

> حضرت خلد مکان اپنی فطری سعادت اندوزی کی وجہ سے مذہبی احکام وشعائر کے بے حد پابند تھے، قبلۂ عالم حنفی المذہب سنی تھے، اور اسلامی فرائض خمسہ کی پابندی اور نیز ان کے اجرا مین بے حد کوشان رہتے تھے، حضرت ہمیشہ باوضو رہتے، اور کلمۂ طیبہ اور نیز دیگر اوراد و وظائف ہر وقت زبان پر جاری رہتے تھے، نماز اول وقت مسجد مین جماعت کے ساتھ ادا فرماتے، اور تمام سنن و نوافل کو بے حد خلوص وحضور قلب سے

---

[1] مکتوب نمبر ۳۰ دفتر اول [2] مکتوب نمبر ۳۲۱ [3] مکتوب نمبر ۵۵

ادا فرماتے تھے، ایام بیض کے روزوں کے بے حد پابند تھے، اور ہفتے میں دوشنبہ، پنجشنبہ اور جمعہ کو صائم رہتے تھے، جمعہ کی نماز بھی مسجد میں تمام مسلمانوں کے ساتھ ادا فرماتے مقدس شب ہائے اسلامی میں بیداری و عبادت میں بسر فرماتے، اور انوار فیض الٰہی سے جو غ دین دو دولت ہو کر اپنی دینی شعاع سے اہل علم کو منور فرماتے تھے،

قبلۂ عالم حق طلبی کے شیدائی تھے، حضرت کا معمول تھا کہ دولت خانے کی مسجد میں تمام رات اہل اللہ کے ساتھ سرگرم گفتگو و ذکر رہتے، اور خلوت میں کبھی تکیہ و مسند پر جلوہ افروز نہ فرماتے تھے،

زکوٰۃ شرعی ادا کرنے میں خاص اہتمام فرماتے اور قبل جلوس جو زکوٰۃ اپنی ضروریات زندگی کے حساب میں سے ادا فرماتے، اس کے علاوہ عہد حکومت میں مصارف ذاتی کے لیے جو چند مواضع خاص فرمائے تھے، ان کی زکوٰۃ بھی خود ادا فرماتے، اور اولاد امجاد کو بھی تاکید فرماتے کہ نصاب زکوٰۃ کامل طور پر ادا فرمائیں،

رمضان کا مقدس مہینہ ادائے صوم و پابندی سنن و تراویح وغیرہ عبادت دینی میں بسر ہوتا تھا، ماہ صیام میں دو پہر رات گذرنے پر بیدار اور علماء و اولیا کے ساتھ ذکر و عبادت میں مشغول رہتے تھے،

رمضان کے آخر عشرے میں مسجد میں اعتکاف فرماتے، حج بیت اللہ جس کے ادا کرنے کے بے حد مشتاق و گرویدہ تھے، اگرچہ بظاہر تو ادا نہ فرما سکے، لیکن اس کا کافی تدارک فرماتے اور حجاج کے ساتھ جو خاص رعایتیں کی جاتی تھیں، ان کو نگاہ میں رکھنے کے بعد یہ امر یقینی ہے کہ خلد مکان ہر سال حج کبریٰ کا ثواب حاصل فرما لیتے تھے،

آپ نے عہد معدلت میں ہر سال، اور کبھی کبھی دوسرے اور تیسرے سال کے بعد جو امیر

کے زائرین و مجاورین کے لیے رقم کثیر ارسال فرماتے، اور حجاج کا ایک گروہ کثیر بادشاہ کی نیابت
مین طواف حج و سلام رسانی وغیرہ خدمات عبادت مین ہمیشہ مصروف رہتا.......

حقیقت یہ ہے کہ حضرت کی ذات پاک تمام صفات حسنہ کی جامع تھی، قبلۂ عالم نے ابتدائے
سن تمیز سے تمام مکروہات و محرمات سے شدید پرہیز فرمایا، اور منکوحہ عورتون کے سوا
کسی غیر محرم کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا،

بارگاہ شاہی مین نغمہ و سرود کے کامل استاد ہر وقت موجود رہتے اور باکمال سازندے
اور اہل نشاط کا ایک گروہ دربار مین ہر وقت حاضر رہتا تھا، لیکن قبلۂ عالم اس طرف بہت
کم توجہ فرماتے تھے، ابتدائے عہد معدلت مین تو کبھی کبھی نغمہ و سرود سن بھی لیتے تھے، لیکن
آخر مین اس سے بالکل تائب ہو گئے تھے، ارباب نشاط کے گروہ مین سے جو شخص ہمیشہ
سرود سے توبہ کر لیتا، حضرت اس کو مدد معاش کے طور پر کچھ جاگیر عطا فرماتے تھے، مرزا
مکرم خان صفوی نے جو فن موسیقی کا بہترین ماہر تھا، قبلۂ عالم سے سوال کیا کہ نغمہ و سرود کی
بابت حضرت کی کیا رائے ہے؟ قبلۂ عالم نے فرمایا کہ جو اس کے اہل ہین ان کے لیے حلال ہے،
مرزا نے عرض کیا کہ پھر حضرت اہل ہونے کے باوجود کیون اس سے پرہیز فرماتے ہین،
قبلۂ عالم نے جواب دیا کہ تمام راگ راگنیان بغیر مزامیر اور خصوصاً پکھاوج کے مزہ نہین دیتین
اور مزامیر بالاتفاق حرام ہین، حرمت مزامیر کی وجہ سے مین نے نفس سرود سے بھی
کنارہ کشی اختیار کر لی،

حضرت نے کبھی غیر مشروع لباس زیب تن نہین فرمایا، اور چاندی اور سونے
کے برتنون کے استعمال سے ہمیشہ پرہیز فرماتے رہے،

بادشاہ دین پناہ کی مجلس مین کبھی غیبت و کذب کا چرچا نہین ہوا اور حاضرین

دربار کو حکم تھا کہ اگر کسی شخص کا عیب بیان کرنا ناگزیر ہو جائے تو اس کو ایسے مناسب الفاظ میں بیان کریں کہ گفتگو عیب جوئی میں نہ داخل ہونے پائے .....

بادشاہ رعیت نواز نے کبھی کوئی ایسا حکم صادر نہیں فرمایا جو رفاہ عام کے منافی ہو اور کبھی ایسے فعل کے مرتکب نہیں ہوئے جو مخلوق خدا کی پریشانی کا باعث ہوا ہو، زنان بازاری اور دیگر فواحش کے شیدائی دار الحکومت سے خارج کر دیے گئے تھے، اور تمام ممالک محروسہ میں اسی قسم کے احکام جاری تھے، احتساب کا محکمہ قائم تھا، اور عاملان احتساب ہر شخص سے باز پرس کرتے تھے، اور تمام ممالک محروسہ میں سلطنت کی وسعت کے باوصف احکام شرعی جاری و نافذ تھے،

قبلۂ عالم نے کبھی اپنے نفس سے مغلوب ہو کر محض ذاتی بغض و عناد کی وجہ سے کسی فرد کو قتل نہیں کرایا، اور نہ کسی غیر کو اس سنگین جرم کے ارتکاب کی ہمت ہوئی، جہان پناہ اپنی قدر دانی و پایہ شناسی سے سادات علماء و اولیاء کی تعظیم و تکریم کرتے تھے، اور اس طرح اپنے فیض باطن سے بہترین طریقے پر اہل عالم کی رہنمائی کا فریضہ ادا فرماتے تھے،

غرض کہ حضرت کے عہد معدلت میں دین متین کا آوازہ بلند ہوا، اور جس طرح ملک ہندوستان میں شریعت اسلامی کا کامل لحاظ رکھا گیا، اس کی نظیر فرمانروایان سابق کے کارناموں میں قطعاً معدوم ہے" (۳۸۲-۸۵)

کتاب و سنت کے احکام کی احیاء و ترویج کے لیے عالمگیر نے **فتاوی عالمگیری** کی تدوین کرائی، جس کو اس کے حربی فتوحات ہی کی طرح ایک عظیم الشان کارنامہ کہا جا سکتا ہے، اس نے اپنے زمانہ حکومت میں محسوس کیا کہ حنفی مذہب کے فقہی مسائل مخلوط طور پر تمام کتابوں

مین پھیلے ہوئے ہین، کہین ایک جگہ مرقوم نہین، اور کوئی خاص کتاب جو تمام مسائل پر حاوی ہو، موجود نہین، اسلیے جب کوئی فقہی مسئلہ درپیش ہوتا تھا تو اس پر فتوی دینے کے لیے تمام کتابون کی چھان بین کرنی پڑتی تھی، جو ایک دشوار طلب اور صبر آزما کام تھا، انہی مشکلات کا لحاظ کرکے عالمگیر نے تمام ہندوستان کے ممتاز علماء کے ایک گروہ سے فرمایش کی کہ فقہ کی تمام کتابون سے مفتی بہ مسائل کا انتخاب کرکے ایک کتاب تیار کرین، عالمگیر نامہ کا مولف اس کتاب کی تیاری کے سلسلہ مین لکھتا ہے:

چونکہ بادشاہ سلامت کو اس کا خاص خیال ہے کہ تمام مسلمان ان دینی مسائل پر عمل کرین جن کو حنفی مذہب کے علماء واکابر واجب العمل سمجھتے ہین، لیکن یہ مسائل فقہ اور فتاوے کی کتابون مین فقہاء وعلماء کے اختلاف کی وجہ سے روایات ضعیفہ اور اقوال مختلفہ سے مل جل گئے ہین، اور اسی کے ساتھ وہ کسی ایک کتاب مین موجود بھی نہین ہین اور جب تک مبسوط کتابین جمع نہ کی جائین اور ایک شخص کو احکام علم فقہ مین کامل مہارت حاصل نہ ہو، وہ مفتی بہ مسئلہ کو ان سے اخذ نہین کرسکتا، اس لیے بادشاہ سلامت کے دل مین یہ خیال پیدا ہوا کہ پایۂ تخت کے علماء کی ایک جماعت شاہی کتبخانہ کی ان فقہی کتابون کو جو ایک مدت مین تمام اطراف عالم سے جمع کی گئی ہین سامنے رکھکر نہایت تحقیق وتدقیق کے ساتھ ان مسائل کو ایک کتاب مین جمع کرین تاکہ ہر شخص اس کتاب سے مسئلہ مفتی بہا کو آسانی سے معلوم کرسکے اور اسلام کے قاضی اور مفتی بہت سی کتابون کے جمع کرنے اور پڑھنے سے بے نیاز ہوجائین، اس کام کی ذمہ داری اور اس کا اہتمام شیخ نظام کے سپرد کیا گیا کہ تمام علماء کے اتفاق رائے سے ان مسائل کو ایک کتاب مین جمع کرین، علماء وفضلاء کا ایک گروہ جو پایۂ تخت مین موجود تھا،

اس کام مین مشغول ہوا، اور ہندوستان کے اطراف مین جو شخص علم فقہ مین شہرت
اور کمال رکھتا تھا شاہی فرمان کے روسے طلب کرکے ان کا شریک کار بنایا گیا، اور
یہ تمام علما، وفضلا معقول وظیفہ کے ساتھ اس کام مین مشغول ہو گئے، اور اس کام کیلیے
جن کتابون کی ضرورت تھی وہ شاہی کتب خانہ سے ان لوگون کے حوالے کی گئین، اور
ہر سال اس کام کے اسٹاف کے لیے ایک بہت بڑی رقم خزانہ شاہی سے صرف کی
جاتی تھی کہ جب یہ کتاب مکمل ہو جائے گی تو دنیا تمام فقہی کتابون سے بے نیاز ہو جائیگی
اور اس کا ثواب بادشاہ سلامت کے نامۂ اعمال مین درج ہوگا، (ص ۱۰۸۷)

فتاوی عالمگیری مصر مین چھ جلدون مین چھپ گئی ہے، ہر جلد مین تقریباً پانچسو صفحے
ہون گے، اس مین فقہی مسائل کے استنباط کے سلسلہ مین جن کتابون اور انکے ماخذ سے مدد لی
گئی ہے، ان کے نام اتنے کثیر ہین کہ ان کو گنایا نہین جا سکتا ہے، اور یہ تمام کتابین شاہی
کتب خانہ مین موجود تھین، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کتب خانہ مین مذہبی علوم وفنون کا
ذخیرہ کس قدر وسیع تھا، علماء کے وظائف مین بھی کثیر رقم خرچ ہوئی، آٹھ سال کی مدت
مین جب یہ کتاب تیار ہوئی تو اس پر دو لاکھ روپے صرف ہوئے، مآثر عالمگیری کے مولف
کا یہ بیان بالکل صحیح ہے کہ "اس کتاب نے علما، وطلبہ کو تمام کتب فقہ سے بے نیاز کر دیا"
اور آج بھی اسلامی فقہ پر اس سے زیادہ مفصل، واضح، اور مبسوط کتاب کوئی اور نہین ہے

فتاوی عالمگیری کی تدوین وترتیب کا نظام بہت ہی باضابطہ تھا، تمام فقہی ابواب
مختلف حصون مین تقسیم کر دیے گئے تھے، ہر حصہ کے لیے ایک صدر، اور اس کے معاونین
ہوتے تھے، تمام علماء کے گروہ کی صدارت **شیخ نظام** برہان پوری کو تفویض کی گئی،
شیخ صاحب عالمگیر کی شہزادگی ہی کے زمانہ سے چالیس سال تک اس کے ساتھ رہے،

عالمگیر کے دل میں ان کے تبحر علمی کی وجہ سے انکی بڑی عزت اور وقعت تھی، وہ خلوت میں بلا کر ان سے احیاء العلوم پر مذاکرہ کرتا تھا، شاہزادہ سلطان کا عقد راجہ کشتو ر بادکی لڑکی سے ان ہی نے پڑھایا، اور جب شاہزادہ کا انتقال ہوا تو شاہی حکم کے بموجب ان ہی نے شاہزادہ کو حضرت قطب الاولیا خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کے جوار میں پیوند خاک کیا[۱]، دربار میں ان کے لیے کورنش و تسلیم کی کوئی پابندی نہ تھی[۲]، فتاویٰ عالمگیری کی ترتیب و جمع کے زمانہ میں ان کا معمول یہ تھا کہ ہفتے میں تین روز کچھ حصہ عالمگیر کو پڑھکر سناتے تھے، عالمگیر کی نظر میں جب کوئی مسئلہ کھٹکتا تو اس پر شیخ صاحب سے بحث و تمحیص کرتا[۳]، فتاویٰ عالمگیری کی تدوین اور دوسری خدمات کے سلسلہ میں عالمگیر نے شیخ صاحب کو غیر معمولی شاہانہ الطاف و اکرام سے نوازا، مآثر عالمگیری کے مولف کا بیان ہے کہ ۱۰۹۷ھ میں قبلہ عالم نے شیخ نظام کو مقرب خان سے سرفراز فرما کر شش ہزاری پنج ہزار سوار کا منصب عطا فرمایا اور خلعت خاص و شمشیر و خنجر مروارید، سپر مرصع و علم و نقارہ اور ایک لاکھ روپیہ نقد اور تیس عربی و عراقی گھوڑے اور دو ہاتھی بھی مرحمت کئے" (ص ۳۰۹)۔ عالمگیر شیخ صاحب کے لڑکوں کو بھی اپنی نوازشوں سے سرفراز کرتا رہا، شیخ داؤد، شیخ ملک منور اور شیخ عبد اللہ کو خطابات اور چار ہزاری مناصب عطا کئے، (ص ۲۰۹)۔ اور شیخ ابوالخیر کو داروغہ جائے نماز مقرر کیا (ص ۱۹۷)، شیخ عبد اللہ کچھ دنوں داروغہ واخانہ بھی رہے (ص ۱۸۰)

اورنگ زیب کے استاد مولانا میر محمد قنوجی بھی فتاویٰ کی ترتیب میں شریک رہے، ان کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں، تقریباً پچاس علماء نے اس عظیم الشان کو اختتام تک پہنچایا۔

---

[۱] مآثر عالمگیری ص ۱۰۹، ۱۰۰۔ [۲] مراۃ العالم ورق ۲۹۷ [۳] مراۃ العالم ورق ۲۹۷، و انفاس العارفین مرتبہ شاہ ولی اللہ صاحب (ص ۱۴۷) میں ہے کہ پہلے شیخ صاحب اس کام کیلئے روزانہ عالمگیر کی خدمت میں جاتے تھے،

ان میں سے بعض مشاہیر کا ہم اجمالی طور پر ذکر کرتے ہیں[۱]

ملا محمد جمیل، جون پور میں ۱۰۵۵ھ میں پیدا ہوئے، ان کے دادا ملا شمس قریا اور والد ملا عبد الجلیل اور دو چچا ملا صادق اور ملا خلیل اپنے عہد کے مشاہیر فضلاء میں سے تھے، ملا جمیل بھی اپنے صوری فضائل اور باطنی کمالات کی وجہ سے اپنے زمانہ میں بہت مشہور ہوئے، دہلی کے تمام علماء ان کے علم و استعداد کے معترف تھے، اسی لیے فتاوی عالمگیری کی ترتیب میں شریک کیے گئے، مطول، شرح جامی کے ایک باب عطف، اور دوسری کتابوں پر حاشیے لکھے تصوف میں ایک رسالہ تحریر کیا، تصوف میں، تنبیہات کے نام سے انکی ایک تصنیف ہے،

قاضی محمد حسین جونپوری، شاہجہاں کے زمانہ میں جونپور کے قاضی تھے، عالمگیر نے ان کو منصب عطا کر کے الہ آباد کا قاضی مقرر کیا، ساتویں سنہ جلوس میں شاہی فوج کے محتسب کے عہدہ پر مامور ہوئے، مراۃ العالم کے مؤلف کا بیان ہے کہ ان کی وجہ سے احکام دینیہ کی بہت ترویج ہوئی، عالمگیر ان کے علم و فضل سے متاثر تھا، اسی لیے فتاوی عالمگیری کی تدوین میں ان کا حصہ بھی رہا، مراۃ العالم میں ہے، (ورق ۲۰)

یعنی از فتاوی عالمگیر شاہی باہتمام او زینت اتمام یافت،

عالمگیر کے تیرہویں سنہ جلوس میں وفات پائی،

ملا حامد جونپوری، میر محمد زاہد اور دانشمند خان کے شاگرد تھے، عالمگیر کے دربار میں شہزادہ اکبر کی تعلیم و تربیت ان ہی کے ذمہ تھی، مراۃ العالم کے مولف کا بیان ہے کہ

---

[۱] ہمارے ادارہ کے رفیق حافظ مولوی مجیب اللہ صاحب ندوی نے معارف ۱۹۶۳ء، ۱۹۶۴ء اور ۱۹۶۵ء کے متعدد نمبروں میں "مولفین فتاوی عالمگیری" کے عنوان سے ایک مبسوط اور مفید مقالہ لکھا ہے، اس سلسلہ میں ملک کے اور اہل قلم نے بھی بعض مفید معلومات فراہم کیے ہیں، ہم نے ان سے بھی مدد لی ہے،

فتاوی عالمگیری کی ترتیب وتالیف میں شریک رہے، (ورق ۳۰۱) شاہ ولی اللہ صاحب کے والد بزرگوار شاہ عبدالرحیم صاحب فتاوی کی تصحیح میں ملا حامد کے معاونین میں تھے، شاہ صاحب اپنے علم وفضل، عبادت، ریاضت، زہد، تقوی اور تورع کے لحاظ سے ہندوستان کے مایۂ ناز علما میں سے گذرے ہیں، انہی کے خاندان سے علمی وروحانی فیوض وبرکات کا سرچشمہ پھوٹا ہے، جس سے آج تک ہندوستان کے ارباب علم اور اصحاب دل سیراب ہو رہے ہیں، ملا حامد شاہ صاحب کے ہمدرس رہ چکے تھے، اس لیے فتاوی کی تدوین میں ان کی معاونت بھی چاہی، اور مالی معاوضہ کی بھی امید دلائی، شاہ صاحب شاہی دربار سے کسی قسم کی وابستگی پسند نہیں کرتے تھے، مگر اپنی والدہ کے اصرار پر فتاوی کی ترتیب میں شریک ہوگئے لیکن شاہ صاحب کے مرشد حضرت خلیفہ ابوالقاسم نے دربار سے یہ تعلق کسی حال میں بھی پسند نہیں کیا، اور جب شاہ صاحب کا دربار سے قطع تعلق ہو گیا تو عالمگیر نے کچھ زمین دینی چاہی لیکن اس پیش کش کو قبول کرنے سے انکار کردیا، عالمگیر ان سے ملنے کا برابر مشتاق رہتا، مگر شاہ صاحب بادشاہوں اور امرا کے گھر جانا اپنے روحانی بزرگوں کے مسلک کے خلاف سمجھتے تھے، ایک بار عالمگیر نے شاہ صاحب کے ایک مخلص کے ذریعہ شوق ملاقات کا پیام بھیجا، مگر وہ عالمگیر کے دربار میں جانے پر مطلق راضی نہ ہوئے، بلکہ ایک معمولی کاغذ پر جس میں ان کا جوتا لپٹا ہوا رکھا تھا یہ عبارت لکھ کر شہنشاہ ہندوستان کے پاس بھیجدی،

> اہل اللہ کا اس پر اجماع ہے کہ وہ فقیر بہت برا ہے جو امیر کے آستانہ پر ہو، حق سبحانہ تعالی فرماتا ہے وَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا اِلَّا قَلِيْل یعنی دنیاوی زندگی کا سرمایہ بہت ہی قلیل ہے تم کو قلیل ترین چیز ملا ہے، اگر بالفرض مجھے دوگے تو وہ حقیر لایتجزی ہوگا، اس ٹکڑے کے لیے جو پھر ٹکڑا نہ ہوسکے گا، میں اپنے نام کو خدا تعالی کے دفتر سے کیوں نکلواؤں

چشت کے بعض ملفوظات مین مذکور ہے کہ جس کا نام بادشاہ کے دفتر مین لکھ لیا جاتا ہے،

حق تعالیٰ کے دفتر سے اس کا نام کٹ جاتا ہے (انفاس العارفین ص۹۹)

شاہ ولی اللہ صاحب اس خط کو نقل کرکے تحریر فرماتے ہین کہ عالمگیر کو جب یہ رقعہ ملا، تو اس نے اپنی جیب مین رکھ لیا، اور جب کپڑے بدلتا تو پھر اس کو اپنی جیب مین رکھ لیتا، فرصت کے وقت اس کو پڑھ کر روتا تھا،

شیخ وجیہ الدین گوپاموی اپنی تحریر کی دلکشی، تقریر کی دلآویزی، ذہانت کی تیزی اور ضمیر کی صفائی کے لحاظ سے ممتاز عالم سمجھے جاتے تھے، پہلے داراشکوہ کے ساتھ رہے، داراشکوہ کی موت کے بعد عزلت نشینی اختیار کر لی، مگر جوہر شناس عالمگیر نے ان کو دربار مین بلا کر منصب عطا کیا، فتاویٰ کا ربع حصہ ان ہی کی نگرانی مین تالیف کیا گیا، دس فضلاء ان کی مدد و اعانت کے لیے مامور تھے، مرآۃ العالم کے مولف نے اس سلسلہ مین ان کی خدمات کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

> در ترتیب و تالیف ربع از فتاویٰ عالمگیر شاہی مامور شد، و دہ کس دیگر از فضلا بمدد و اعانت او متقرر شدند او در آن کار مساعی جمیلہ بکار بردہ (ورق ۱۰۳)،

عالمگیر کے چودھوین سنہ جلوس مین وفات پائی،

شیخ رضی الدین، ماثر عالمگیری مین ہے:-

شیخ رضی الدین بھاگلپور بہار کے شرفا مین تھے، یہ فاضل مولفین فتاویٰ عالمگیری مین شامل تھے، اور تین روپیہ یومیہ ان کی تنخواہ مقرر تھی، شیخ رضی الدین علاوہ ایک فاضل متبحر ہونے کے فن سپاہ گری مین کامل تھے، اور بہادری دندیھی وغیرہ کمالات مین بھی ان کو کافی دستگاہ تھی، حضور پرنو

کے محتسب قاضی محمد حسین مقرب درگاہ مسمی بختاور خان نے ان کے کمالات وہمہ گیر قابلیت سے قبلہ عالم کو آگاہ کیا، بادشاہ ہنر پرور نے ان کو ایک صدی منصب داد مقرر فرمایا، رفتہ رفتہ حسین علی خان کی اعانت وامداد اور اپنی سلیقہ شعاری سے رتبہ امارت وخانی پر فائز ہو کر دنیا سے رخصت ہوئے۔" (ص ۹۶)

اور دوسرے علما، جو فتاویٰ کی ترتیب، تدوین اور تصحیح میں عالمگیری دربار سے وابستہ رہے، ان میں سے بعض کے اسمائے گرامی یہ ہیں، سید علی اکبر سعد اللہ خان، سید نظام الدین ٹھٹھوی، جلال الدین محمد، مولانا محمد شفیع، ملا وجیہ الرب، مولانا محمد فائق ملا محمد اکرم، ملا محمد غوث، امیر میران علامہ ابو الفرح معروف بہ سید معدن، ملا غلام محمد قاضی القضاۃ لاہور، اور قاضی سید عنایت اللہ مونگیری وغیرہ۔

عالمگیر نے فتاویٰ کا فارسی ترجمہ بھی کرایا، اور یہ کام مولانا چلپی عبداللہ رومی نے انجام دیا، ان کے بارہ میں مراۃ العالم میں ہے:-

"چلپی عبد اللہ رومی علوم ظاہری اور معارف باطنی سے بہرہ ور ہیں، صوفیہ کی مصطلحات سے پوری واقفیت رکھتے ہیں، عربی، فارسی اور ترکی عبارت خوب لکھتے ہیں، اور اکثر فنون میں یگانہ اور بے مثل ہیں، تصوف اور حکمت میں ان کی اچھی تصانیف ہیں، فردوس آشیانی کے عہد میں روم سے ہندوستان آئے، فقیرانہ زندگی کے عادی تھے، علامی سعد اللہ خان ان کی ضروریات پوری کرتے تھے، اس عہد (یعنی عہد عالمگیری) میں ان کو روزانہ وظیفہ ملتا ہے، ان کے لیے نوکری معاف کر دی گئی ہے، فتاویٰ عالمگیر شاہی کے ترجمہ پر مامور ہیں۔" (ورق ۱۰۰)

یہ فارسی ترجمہ شاید مقبول نہیں ہوا، اسی لیے اس کا کوئی نسخہ پایا نہیں جاتا،

اور دوسرے علما، | فتاویٰ عالمگیری کی جامعیت اس بات کا ثبوت ہے کہ عالمگیر کا عہد با کمال علما، و فضلا کے لحاظ سے نہایت ممتاز تھا، ان مولفین فتاوی کے علاوہ علوم و فنون کے اور مسند نشینوں نے بھی شاہی دربار کو زینت بخشی، جن میں سے کچھ اور کا ذکر یہاں پر درج کیا جاتا ہے،

ملا محمد یعقوب، اپنے علم و فضل، ذہانت و ذکاوت اور فطرت عالی کی وجہ سے عزت و وقعت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے، درس و تدریس کے سلسلہ میں بہت سی کتابوں پر حواشی لکھے، تفسیر بیضاوی پر بھی حاشیہ تحریر کیا، اس حاشیہ کے متعلق مراۃ العالم کا مولف لکھتا ہے:-

> دریں اوقات بر تفسیر قاضی بیضاوی حاشیہ مرقوم نمود کہ اہل استعداد وارباب فہم را از حواشی دیگر مستغنی گردانیدہ و تحقیقات ارجمند و تدقیقات بلند درآن مندرج ساختہ، (ورق ۳۰۰)،

ان کے علم و فضل اور ذہانت و راستبازی سے متاثر ہو کر عالمگیر نے ان کو میر عدل مقرر کیا تھا،

شیخ سلیمان منیری، معقولات و منقولات کے جید عالم تھے، عالمگیر کی شہزادگی ہی کے زمانہ سے عزت و حرمت کے ساتھ اس کے دربار سے وابستہ رہے، اپنی بادشاہت کے عہد میں عالمگیر نے ان کو داروغۂ اردوئے معلی کے عہدہ پر فائز کیا، ون میں دو مرتبہ ملک کے لاتعداد مستغیثوں اور داد خواہوں کو شاہی خدمت میں پیش کر کے ان کے حالات عرض کرتے، اور مظلوموں کے حقوق دلاتے، دیانت دار ہونے کے علاوہ نہایت بردبار خلیق اور خندہ جبین تھے، فریادیوں کے ہجوم، داد خواہوں کے اژدحام، ان کے شور و غل

نرم و گرم گفتگو سے کبیدہ نہیں ہوتے تھے، ان کا معاصر مراۃ العالم کا مولف رقمطراز ہے کہ کمزوروں اور غریبوں کی درخواستوں کو بڑی توجہ سے سنتے ہیں، اور داروغگی کی خدمت کو حسن و خوبی سے بجالاتے ہیں، کثرت مشاغل کے باوجود رات کو طلبہ کو درس بھی دیتے ہیں

شیخ عبدالعزیز اکبرآبادی، مراۃ العالم کے مصنف کا بیان ہے کہ وہ عقلی و نقلی علوم کے کمال، ذکاوت و ذہانت، اصابت رائے، فصاحت اور خوش بیانی میں اپنے تمام معاصرین میں ممتاز تھے، اپنے والد مولانا عبدالرشید سے جو اپنے زمانہ کے اکابر علماء میں تھے تحصیل علم کی، اور عنفوان شباب ہی میں درس و تدریس میں مشغول ہوگئے تھے جو تھے سنہ جلوس میں عالمگیر اکبرآباد گیا، تو دربار میں شیخ عبدالعزیز کا تذکرہ آیا، اور ان کی بعض تحریریں اس کی نگاہ سے گذریں، اس نے بڑے اشتیاق اور لطف سے شیخ صاحب کو دربار میں بلایا، اور الطاف خسروانہ سے عرض مکرر کے منصب پر مامور کیا، شاہی دربار میں اشراف کہ اور ائمہ مین کے جو خطوط آتے تھے ان کے جواب کی خدمت ان کے سپرد تھی، عربی فارسی انشار میں یگانہ عصر سمجھے جاتے تھے، متداول کتابوں پر حواشی بھی لکھے، جس سے اہل علم ان کی قوت فکر اور جودت طبع کے معترف ہوئے، عربی، فارسی اور ہندی میں شعر بھی کہتے تھے، ان کے اشعار آبدار کی رنگینی اور مضمون آفرینی کی تعریف مراۃ العالم میں کی گئی ہے۔ (ورق ۳۰۰)

ملا قطب ہانسی، ملتان کے نواح کے رہنے والے اور شیخ عبداللطیف برہانپوری کے مخصوص مریدوں میں سے تھے، عالمگیر کی شہزادگی کے زمانہ میں برہانپور میں اس سے ملے، اور اسی وقت سے گہرے تعلقات قائم ہوئے، عالمگیر جب تخت پر جلوہ افروز ہوا تو اس نے ملا صاحب کی خدمت میں چار لاکھ دام پیش کئے اور ایک گاؤں بھی ان کے نام

سے موسوم کیا، اس گاؤں کا نام قطب آباد رکھا گیا،[۱]

شیخ قطب برہانپوری، متورع، عابد اور زاہد ہونے کے علاوہ حافظ قرآن تھے، عالمگیر رمضان المبارک میں ان ہی کی امامت میں تراویح پڑھا کرتا تھا، ان کو عربی اشعار بھی بہت زیادہ یاد تھے، کچھ دنوں شہزادہ محمد اعظم کے استاد بھی رہے،[۲]

ملا عوض وجیہ، مآثر عالمگیری میں ہے:-

ملا عوض اخسیکت کے باشندے تھے، یہ مقام مضافات سمرقند میں داخل ہے، ملا عوض وجیہ میر عوض تاشکندی کے حلقۂ درس کے بہترین طالب العلم تھے جو اپنے تمام ہم سبق طلبہ پر سبقت لے گئے، ملائے مرحوم نے ایک مدت تک بلخ میں درس دیا، اور حضرت فردوس آشیانی کے عہد معدلت میں ۱۳ جلوس شاہجہانی میں اعلیٰ حضرت کی فضیلت پناہ بارگاہ میں حاضر ہوئے، حضرت فردوس آشیانی نے ملا عوض وجیہ کو مفتی لشکر کے عہدہ پر مقرر فرمایا، عہد مبارک عالمگیری میں ملا عوض محتسب لشکر مقرر فرمائے گئے، اس میں شبہ نہیں کہ ملا عوض نے بے حد اتقیاء و پرہیزگاری کے ساتھ احکام شرع کی پابندی کی، اور عوام کو اس راہ پر قائم رکھنے و نیز بدعات کا قلع قمع کرنے میں پوری سعی و کوشش سے کام لیا، اور یہ کہنا قطعاً مبالغہ نہیں ہے کہ ملائے مرحوم کے ایسا محتسب کوئی دوسرا نہیں ہوا، ملا نے خدمت احتساب سے علیحدہ ہونے کے بعد بقیہ عمر درس و تدریس میں بسر کی، اور ان کے فیض کمال کا ہر صاحب علم کو اعتراف ہے" (ص ۱۰۶)، ۱۰۸۰ھ میں وفات پائی،

ملا عبداللہ سیالکوٹی، ملا عبدالحکیم سیالکوٹی کے صاحبزادے تھے، مآثر عالمگیری کے

[۱] مرأۃ العالم ورق ۱۰۳۰، [۲] ایضاً ص ۱۰۳

مولف کا بیان ہے کہ علاوہ عالم و فاضل ہونے کے صاحب عرفان بھی تھے، اور اپنے اخلاق و اعمال میں اسلام کا بہترین نمونہ سمجھے جاتے تھے، عالمگیر نے ان کے اوصاف سنے تو ان سے ملنے کا مشتاق ہوا، چنانچہ ۱۰۸۰ھ میں حسن ابدال سے پیام شوق ملاقات لکھ بھیجا، اور جب عالمگیر لاہور پہنچا تو ملا عبداللہ بھی لاہور تشریف لائے، عالمگیر ان سے مل کر بہت محظوظ ہوا خلعت خاص دو سو اشرفیاں اور ایک ہاتھی دے کر وطن رخصت کیا، آخر عمر میں ملا صاحب فقر و فاقہ کی زندگی بسر کرنے لگے تھے، ۱۰۹۳ھ میں عالمگیر کو اجمیر کے قیام کے زمانہ میں ملا صاحب کی عسرت کی خبر ملی، تو اس نے ملا صاحب کو عہدۂ صدارت پر مامور کرنا چاہا، مگر اس بے نیاز عارف نے یہ کہلا بھیجا کہ "اب زمان فراق ہے نہ کہ وقت تحصیل شہرۂ آفاق"، عالمگیر کو ملا صاحب کا جواب بے حد پسند آیا، اجمیر میں ملا صاحب عالمگیر سے ملنے آئے، اور پھر وطن جا کر رحلت فرمائی، ماثر عالمگیری کے مولف کا لکھتا ہے کہ "شہریار فاضل نواز اور معارف پرور کو ملا مرحوم کی وفات کی خبر ملی، تو ان کے چار لڑکوں اور بیوی کے لیے خلعت تعزیت ارسال کیا اور ان کے وظائف میں بھی اضافہ کیا،[۱] ملا عبداللہ نے ہدایہ پر حاشیہ لکھا جو بہت مقبول ہوا،

قاضی عبدالوہاب، شیخ محمد طاہر بوہرہ کے پوتے تھے، شاہ جہان کے زمانہ میں اپنے مولد پٹن میں مفتی مقرر ہوئے، پھر اورنگ زیب کی دکن کی صوبہ داری کے زمانہ میں اس سے وابستہ ہوئے، جب اورنگ زیب تخت پر بیٹھا تو ان کو قاضی عسکر بنایا، پھر قاضی القضاۃ ہوئے، ماثر الامراء میں ہے کہ

در علم فقہ و اصول مہارت تمام داشت (جلد اول ص ۲۳۵)،

وہ اپنے فرائض کو بڑی دینداری اور بیباکی سے انجام دیتے تھے، عالمگیر کو خود بھی شرعی

---

[۱] ماثر عالمگیری ص ۲۰۰ و ص ۲۱۶

امور کا لحاظ رہتا تھا، اس لیے قاضی عبدالوہاب نے بھی شرعی احکام کے نفاذ میں بڑی سختی کی جس سے بعض امراء ان سے بدظن ہو کر طرح طرح کے الزامات عائد کرتے تھے، مگر عالمگیر کو ان کے زہد و تقوی پر برابر اعتماد رہا، مآثر الامراء کے مولف کا بیان ہے کہ قاضی عبدالوہاب کے عہد قضا میں نظم و نسق میں شریعت کی اتنی پابندی رہی کہ پہلے نہیں ہو سکی تھی، عالمگیر کو درباریوں نے ان سے بدظن کرنے کی کوشش کی، مگر اس نے اپنے احترام میں فرق ظاہر ہونے نہیں دیا، شاہزادہ محمد اعظم، شہزادہ محمد اکبر، سلطان ایزدبخش ولد سلطان مراد بخش اور شہزادہ سلطان کا نکاح ان ہی نے پڑھایا[1]، شاہی الطاف و اکرام اور ذاتی حسن اہتمام کی وجہ سے ان کے پاس بہت بڑی دولت جمع ہو گئی تھی، ایک بار ایک حاسد امیر نے ان کے تین لاکھ روپے راستے میں لٹوا دیے تھے، اس بربادی پر صبر کیا، پھر بھی ترکہ میں ان کے چاروں لڑکوں کو دو دو لاکھ روپے ملے[2]،

قاضی عبدالوہاب کے انتقال کے بعد ان کے صاحبزادے شیخ الاسلام اسی عہدہ پر مامور کیے گئے، وہ اپنے تقوی و پرہیزگاری کے لیے مشہور تھے، مگر کچھ دنوں کے بعد اس عہدہ سے کنارہ کش ہو گئے، مآثر عالمگیری میں ہے:-

قاضی شیخ الاسلام پسر قاضی عبدالوہاب اپنی ذاتی استعداد و فطرت سلیمہ کے تقاضہ سے جذبۂ محبت الٰہی میں بے قرار ہوئے، اور دنیا سے قطع تعلق کرنے پر مجبور ہو گئے، ہر چند جہاں پناہ نے ان پر عنایتیں فرمائیں اور ترک خدمت سے انھیں منع کیا اور عہدۂ قضا کو جو ایسے ہی مقدس و پاکیزہ نفوس کے لیے عطائے الٰہی کی ذات سے وابستہ رکھنا چاہا، لیکن قاضی صاحب نے اپنے ارادوں

[1] مآثر عالمگیری ص ۵۳، ۷۹، ۸۰، ۱۳۰؛ [2] مآثر الامراء جلد اول ص ۲۳۶،

مین کسی طرح تبدیلی نہ کی[1]، بادشاہ نے مجبور ہوکر خود قاضی صاحب کی رائے سے سید ابو سعید کو جو عالی نسب سید اور قاضی عبدالوہاب کے داماد تھے، عہدۂ قضا مرحمت فرمایا، سید ابو سعید دار الخلافت سے بادشاہ کے حضور مین (احمد نگر) حاضر ہوئے، اور خلعت، شمشیر، جمدھر کے عطیہ و انعام سے خوش اور معزز کئے گئے۔" (ص ۱۶۸)

قاضی ابو سعید نے شہزادہ معز الدین کا نکاح سیدۃ النساء بیگم دختر مرزا رستم سے پڑھایا تو عالمگیر نے ان کو خلعت اور ایک ہزار روپے نقد مرحمت کیے[2] شیخ الاسلام کے لڑکے محمد اکرام کو عالمگیر نے احمد آباد کی صدارت دیکر شیخ الاسلام کا خطاب عطا کیا،[3]

مولانا سید محمد بیجاپوری حضرت غوث الاعظم قدس سرہٗ العزیز کی اولاد اور بیجاپور کے برگزیدہ عالم اور بزرگ تھے ۱۰۸۰ھ مین عالمگیر سے ملے تو اس نے ان کو چھ ہزار روپے سالانہ کے وظیفہ سے مطمئن خاطر کیا،[4]

[1] ۱۰۸۰ھ کے واقعات کے سلسلہ مین مآثر عالمگیری کا مولف لکھتا ہے "حجت خداوندی و شفقت بندہ نوازی کے لحاظ سے شیخ الاسلام کے نام ایک اشتیاق آمیز فرمان ان کے برادر نور الحق کے ہمراہ ارسال ہوا، فرمان مبارک کا مضمون یہ تھا کہ شغل قضا سے مستعفی ہوئے اور سفر حجاز سے واپس ہونے کے بعد ایک بار بھی حضور مین نہین آئے، اگر اس طرف توجہ کرین تو مناسب ہے، شیخ الاسلام اس وقت احمد آباد مین مقیم تھے، حضرت کا منشا یہ تھا کہ اگر شیخ مذکور حضور مین آجائین اور صدارت کی خدمت اختیار کرین تو یہ عہدہ جلیلہ ان کو تفویض فرمایا جائے۔ شیخ کا ارادہ تھا کہ طواف کعبہ کا احرام باندھین کہ وفعۃً مرض نے شدت اختیار کی اور مرحوم کو سفر آخرت طے کرنا پڑا، اللہ مغفرت کرے، (ص ۲۸۳) [2] مآثر عالمگیری ص ۱۷۲، و مآثر الامراء جلد اول ص ۲۴۳، [3] ایضاً ص ۱۱۵،

حاجی احمد سعید، قصبہ بہار کے رہنے والے تھے، اپنے والد بزرگوار مولانا محمد سعید اور اس عہد کے دوسرے اکابر علماء سے تحصیل علم کی، مراۃ العالم میں ہے:-

"در علم فقہ مہارت کامل دارد"

شاہجہان کے زمانہ میں شاہی لشکر کے مفتی رہے، پھر حرمین شریفین کی زیارت کو گئے وہاں سے واپس ہوئے تو عالمگیر نے ان کو ہزار و پانصدی کا منصب عطا کیا، اور شاہی حرم کی سرکار میں دیوان کی خدمت تفویض کی گئی، [۵۱]

قاضی خلیل الرحمٰن، فدائی خان المخاطب بہ اعظم خان فوجدار گورکھپور کے زمانہ میں اس شہر کے قاضی تھے، اعظم خان نے عالمگیر سے ان کے علم، صلاح، تقویٰ، دیانت اور بزرگی کی تعریف کی، تو اس نے ان کو گورکھپور کا فوجدار مقرر کیا، [۵۲]

سید علی اکبر سعد اللہ خانی، علامی سعد اللہ خان کے ہم جلیس و ندیم تھے، اس لیے نام کے ساتھ سعد اللہ خانی کا جزء بھی لکھا جاتا تھا، مراۃ العالم میں ہے:-

اکثر فنون دانش ورزیدہ و بر غوامض و دقایق علوم آگہی داشت، در علم فقہ نیک متبحر است، [۵۳]

علامی سعد اللہ خان کے لڑکے لطف اللہ کے معلم بھی رہے، ان کے مکارم اخلاق سے متاثر ہو کر عالمگیر نے شہزادہ محمد اعظم کی تعلیم بھی ان کے سپرد کی، پھر لاہور کے قاضی مقرر کیے گئے، فرحۃ الناظرین میں ہے کہ فتاویٰ عالمگیری کی تدوین میں بھی شریک رہے، مگر مراۃ العالم میں ان کی شرکت کا ذکر نہیں کیا گیا ہے،

---

[۵۱] مراۃ العالم ورق ۲۹۹ [۵۲] مراۃ العالم ورق ۳۰۰، فرحۃ الناظرین میں ان کا نام قاضی عبدالرحمٰن مرقوم ہے، [۵۳] مراۃ العالم ورق ۳۰۱،

ملا محمد اکرم لاہوری، مراۃ العالم میں ہے کہ بڑے لائق معلم تھے، صلاح، حلم، بردباری، تقویٰ اور پرہیزگاری ان کے نمایاں اوصاف تھے، اس لیے جہانگیر نے ان کو شاہزادہ کامگار محمد کی تعلیم کے لیے مامور کیا[1]، مآثر عالمگیری میں ہے کہ موروثی مفتی تھے، قاضی عبداللہ کے انتقال کے بعد اردوے معلی کے قاضی مقرر ہوئے[2]۔

حافظ ابراہیم، عالمگیر نے قرأت و تجوید ان ہی سے سیکھی، شہزادہ محمد سلطان کی تعلیم ان ہی کے ذمہ تھی، وہ اس کو کلام پاک بھی پڑھایا کرتے تھے[3]۔

ملا شرف الدین لاہوری، مراۃ العالم کا مولف لکھتا ہے:-

فضیلت درست داشتہ، و بفصاحت و طلاقت لسان و حسن خلق موصوف بود"

لاہور کے مفتی کے عہدہ پر مامور تھے، ان کے صاحبزادے ملا محمد باقر بھی صوری اور باطنی خوبیوں سے آراستہ تھے، عالمگیر ان سے بھی خسروانہ نوازشوں سے پیش آتا تھا۔

ملا عبدالباقی جونپوری ملا محمد جونپوری مصنف شمس بازغہ کے لائق شاگرد تھے، ان کے علمی فضل و کمال کی ستایش ان الفاظ میں کی گئی ہے،

"در اکثر علوم علی الخصوص در منقولات یگانہ بود و بدقت فکر و غور مطالعہ از فضلاے عصر گوے مسابقت می ربود"

ایک بار عالمگیر کے دربار میں آئے تو اس نے نو سو روپے سالانہ آمدنی کا ایک گاؤں ان کو عطا کیا، اس کے بعد وطن میں رہ کر تمام عمر وطن ہی میں درس و تدریس میں گذار دی[4]۔

قاضی سید عنایت اللہ مونگیری کو ان کے والد بزرگوار سید عبدالغنی کی جگہ پر عالمگیر

[1] مراۃ العالم ورق ۳۰۱، [2] مآثر عالمگیری ص ۲۸۱، [3] مراۃ العالم ورق ۳۰۱، [4] ایضاً ص ۳۰۲
[5] ایضاً ورق ۳۰۲

نے سورج گڑھا اور گجرا (مونگیر) کا قاضی مقرر کیا تو اس نے محکمۂ قضا کی سند عطا کرتے وقت اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی دو حمائل اور چالیس بیگہ زمین عنایت کی،[1]

قاضی ملا محب اللہ بہاری، موضع کرا، علاقہ بہار شریف (پٹنہ) کے رہنے والے تھے، ملا قطب الدین شمس آبادی اور دوسرے علماء روزگار سے تعلیم پا کر دکن گئے، جہاں عالمگیر نے شاہی ملازمت میں منسلک کر لیا، لکھنؤ اور حیدر آباد میں قاضی رہے، پھر عالمگیر نے اپنے پوتے رفیع القدر بن شاہ عالم کی تعلیم کے لیے مامور کیا، شاہ عالم کے زمانہ میں قاضی القضاۃ کا عہدہ تفویض ہوا، اور فاضل خان کا خطاب ملا، ۱۱۱۹ھ میں وفات پائی، اور محلہ چاند پورہ بہار شریف میں دفن ہوئے، منطق میں سلم العلوم، افادات، اصول فقہ میں مسلم الثبوت، جزء لایتجزی کے بیان میں الجواہر الفرد رسالہ مغالطۂ عامۃ الورود ان کی تصانیف ہیں، ان کی استعداد و قابلیت مصنف تذکرہ علمائے ہند کے صرف ایک جملہ سے ظاہر ہوگی،

"بحرے بود از بحار علوم و بدرے بود میں النجوم" (ص ۱۸۵)

سید سعد اللہ، شیخ پیر محمد سلونی کے نواسے تھے، پینتیس[35] سال تک اپنے نانا سے درس لیتے رہے، علم ریاضی کے ساتھ ساتھ معقولات و منقولات کی بھی تعلیم پائی، راہ سلوک کی منزلیں طے کر کے بیت اللہ کی زیارت کو گئے، جہاں بارہ سال تک تعلیم و تعلم کا سلسلہ جاری رکھا، شریف مکہ بھی ان کی بزرگی کا معترف تھا، اور ان سے اعزاز و اکرام سے پیش آتا تھا، عرصہ دراز تک حجاز، عجم اور ہند کے لوگ ان کی تعلیم عرفان سے متمتع ہوتے رہے، مگر بعض ناخوشگوار واقعات کی بنا پر ہندوستان واپس آ گئے، اور پھر سورت میں قیام پذیر ہو گئے،

---

[1] شاہی فرمان کے لیے دیکھو معارف ماہ اکتوبر ۱۹۴۶ء

عالمگیر کو جب ان کے فضل و کمال کا حال معلوم ہوا، تو ان کی مدد خانقاہ کے لیے اور دو گاؤں جن کی آمدنی سات آٹھ ہزار روپے سالانہ کو ان کی ذات سے بڑی عقیدت تھی، دست خاص سے ان کو خط لکھا کرتا، محض خلق اللہ کی نفع رسانی کی خاطر ہر خاص و عام کی سفارش شاہی بارگاہ میں کرتے عالمگیر نے ان کو لکھا کہ وہ صرف درویشوں، عالموں اور دینداروں کے لیے سفارش کیا کریں مگر انھوں نے بادشاہ کی بات نہ مانی، [۱]

عالمگیر کو ایسے تمام مشائخ کے ساتھ جو شریعت کے پابند تھے بڑا والہانہ لگاؤ رہا، دکن کی صوبہ داری کے زمانہ میں اس نے حضرت عبد اللطیف برہانپوری کی خدمت میں پہونچکر کچھ گاؤں پیش کیے، مگر انھوں نے یہ گاؤں قبول کرنے سے انکار کیا، اور یہ شعر پڑھا،

شاہ ما را دہ دہد منت نہد رازق ما رزق بے منت دہد

اورنگ زیب اس شعر کو سنکر متاثر ہوا، مگر اس نے عرض کیا کہ ہم فقراء اور اہل اللہ کی خدمت خیر دنیوی اور برکت اخروی کے لیے کرتے ہیں، گاؤں پیش کرکے احسان کرنا مقصود نہیں حضرت عبد اللطیف نے فرمایا کہ اگر خیر و برکت حاصل کرنا ہے، تو گوشہ نشینوں اور متوکلوں کے لیے وظائف مقرر کرو، مظلوموں کو ظالموں سے بچاؤ، کمزوروں کو ان کے حقوق دو، وغیرہ وغیرہ، اورنگ زیب نے ان باتوں کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا، اور اس نصیحت پر عمل کرنے کی کوشش کی، جیسا کہ اس نے اپنے ایک رقعہ میں اس کا ذکر کیا ہے، [۲] بادشاہت کے زمانہ میں بھی عالمگیر نے حضرت عبد اللطیف سے بہت ہی نیازمندانہ تعلقات قائم رکھے،

[۱] منتخب اللباب از خافی خان جلد دوم ص ۶۰۵، [۲] مقدمہ رقعات عالمگیر مرتبہ سید نجیب اشرف ندوی ص ۱۴۳

دست خاص سے رقعہ تحریر کرتا تھا۔[۱]

...ینی کے لیے رخصت ہوتے وقت اورنگ زیب حضرت شیخ برہان کی
... برہان پور حاضر ہوا، شیخ برہان بادشاہ اور امرا سے ملنا اپنے مسلک کے
... سمجھتے تھے، اس لیے اورنگ زیب بھیس بدل کر ان کی مجلس میں شریک ہوا، ایک
دو دارد کو دیکھ کر شیخ برہان نے نام پوچھا۔ اورنگ زیب نے جب اپنا نام بتایا تو وہ اس کی
طرف مخاطب نہیں ہوئے،... نہ اور لوگوں کی طرح اس کو کوئی تبرک دیا، اورنگ زیب
دوسرے دن بھی ان کی خانقاہ میں پہنچا، شیخ برہان نے اپنی آزردگی کا اظہار کرتے ہوئے
اوس سے کہا کہ یہ مکان تم کو پسند ہے، تو لے لو ہم کہیں اور جگہ چلے جائیں گے، مگر تیسرے
دن اورنگ زیب پھر ان کے پاس گیا، وہ نماز کے لیے خانقاہ سے باہر نکل رہے تھے،
کہ اورنگ زیب مودبانہ ان کے سامنے کھڑا ہو گیا، اور عرض کی کہ دارا نے شریعت کو نظر انداز
کر رکھا ہے، اگر مجھ کو حکومت ملی تو دین نبوی کے احکام کے ساتھ رعیت پروری بھی کرونگا، آپ
باطنی توجہ فرمائیں، شیخ برہان نے فوراً کہا کہ ہمارے جیسے کم اعتبار فقیروں کی دعا سے کیا
ہوتا ہے تم بادشاہ ہو، نیکی، عدل پروری، رعیت نوازی کی نیت کے ساتھ دعا کرو، ہم بھی
دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتے ہیں، اسی وقت اورنگ زیب کے ساتھی شیخ نظام نے اورنگ زیب
سے کہا بادشاہی مبارک ہو۔[۲]

اولیاء اللہ کی بے رخی سے عالمگیر کبھی دل گیر نہ ہوتا، ملا قطب الدین شہید سہالوی سے
کئی بار ملنے کی خواہش ظاہر کی، مگر ہر بار ملا صاحب[۳] اس سے ملنے سے انکار کیا، حضرت
شیخ بایزید نے ایک روز جامع مسجد میں تمام لوگوں کے سامنے عالمگیر سے پوچھا کہ اس کی

۱۔ منتخب اللباب ج ۲ ص ۵۵۵، ۲۔ ایضاً ص ۵۵۵، ۳۔ فرحۃ الناظرین ص ۱۰۰۔

لڑکیوں میں بعض ناکتخدا کیوں ہیں؟ یہ پوچھا، ملقین کی خاطر ایک وعظ کہا، عالمگیر نے ان کی نصیحتوں کو خاموشی سے سنا،[1] میر مرتضیٰ وانجوی ملتانی کو اس نے اس لیے پسند کیا کہ وہ شرعی اور مذہبی امور میں حق گوئی سے کام لیتے تھے، اسی لیے ان کو شہزادہ کام بخش کی اصلاح و تربیت کے لیے مامور کیا،[2] حضرت میر نصیر الدین ہروی کی اصلاح و تقوی اور عارفانہ تعلیمات سے متاثر ہوا، اس نے ان کی خدمت میں بھی کچھ گاؤں پیش کئے، مگر انھوں نے جاگیر قبول کرنا پسند نہیں کیا،[3]

عالمگیر کا ذوقِ ادب عالمگیر نے چار زبانیں سیکھیں، عربی، فارسی، ترکی اور ہندوستانی، وہ ترکوں سے ترکی ہی میں باتیں کرتا تھا، عالمگیر نامہ کا مولف لکھتا ہے کہ

ترکی چغتائی را بغایت خوب می دانند (۱۰۹۵)

اور ہندوستان کے ایسے باشندوں سے جو فارسی نہیں بول سکتے تھے، وہ ضرورت کے وقت ان ہی کی زبان میں گفتگو کر لیتا تھا،[4] مگر اس کا انشا پردازانہ جوہر فارسی نثر لکھنے میں چمکا، بابر اور جہانگیر کی طرح اس کے قلم میں بھی غیر معمولی قوت تھی، اور اگر حکمرانی کرنے کے بجائے کوئی کتاب لکھتا تو بلاشک وشبہ ایک معجز نگار اور سحر پرداز ادیب ہوتا، سلطنت کے کاروبار کی مشغولیتوں ہی میں وہ شہزادوں اور خاص خاص لوگوں کو رقعے لکھتا جو ظاہر ہے کہ منظر عام پر لانے کے لیے نہیں لکھے گئے تھے، مگر یہی رقعات جب اکٹھے کر لیے گئے تو اس کے ادب و انشا کی داد ہر زمانہ کے اہل کمال نے دل کھول کر دی، وہ آیات قرآن مجید، احادیث نبوی اور سعدی، حافظ، نظیری اور نظامی کے اشعار اس برجستگی اور خوبی سے اپنے رقعات میں استعمال کرتا ہے کہ وہ سب ادبی شہ پارے بن گئے ہیں، جن کو پڑھنے میں

[1] منتخب اللباب، جلد دوم ص ۵۴۲، [2] ایضاً ص ۶۶۲، [3] ایضاً ص ۵۵۴، [4] عالمگیر نامہ ص ۱۰۹۵

بڑی گھلاوٹ اور لطافت محسوس ہوتی ہے، عالمگیرنامہ کا مولف اس کے انشا کی تعریف
کرتے ہوئے رقمطراز ہے :-

"نکتہ دانی، معنی شناسی، ربط اور مناسبت فطری اس پایہ کی ہے کہ نثر و انشا کے
معنی طراز، سخن سنج اور نکتہ پرداز فصاحت پیشہ لوگ ان کی تعلیم و ارشاد کے فیض سے
مستفید ہوتے ہیں، کسی بلیغ منشی سے جب کوئی منشور لکھواتے ہیں تو مقصود کی تلقین اس
حسن و خوبی سے فرماتے ہیں کہ اگر یہ منشی ان باتوں کو ذہن میں رکھ کر منشور لکھتے ہیں تو
غور و فکر سے مستغنی رہتے ہیں، منشور کا مسودہ جب آپ کے مطالعہ میں آتا ہے تو قلم بدایع رقم
ایسی اصلاحوں سے مزین کر دیتا ہے، کہ ادیب اسے دیکھتے ہی اپنے عجز و قصور کا معترف
ہو کر ان سے سخن طرازی اور اسلوب و قواعد سیکھتا ہے" (ص ۱۰۹۵)

مآثر عالمگیری میں ہے :-

فن خوشنویسی کے علاوہ جہان پناہ کو فن انشا میں بھی خاص مہارت تھی، اور نثر نگاری
و انشا پردازی میں ید طولی حاصل تھا، جہان پناہ نثر نہایت خوب تحریر فرماتے تھے، (صفحہ ۳۵۹)

یہ تو درباری مورخین کے بیانات ہیں، لیکن بیسویں صدی کے ممتاز انشا پرداز اور
نکتہ سنج ادیب بھی اس کے ادب کی تعریف اسی گرم جوشی کے ساتھ کرتے ہیں، مولانا شبلی رقمطراز ہیں

"عالمگیر تیغ و قلم دونوں کا مالک تھا، اس کی انشا پردازی کی داد مخالفوں تک نے
دی ہے، اس کے رقعے باوجود اس کے کہ واقعات کا ذخیرہ، قصہ طلب حوالوں کا مجموعہ
اور جغرافیانہ اصطلاحوں کی یادداشت ہیں تاہم ادائے مطلب کی قدرت، عبارت کی
سادگی، فقروں کی ہمواری، مطالب کا اختصار، پہلو بہ پہلو جملے، دلنشین ترکیبیں نہایت
حیرت انگیز ہیں" (مضامین عالمگیر ص ۱۴۳)

مولانا آزاد "یادل ناخواستہ" لکھتے ہیں، کہ

" عالمگیر نے دل معتدل اور زبان قادر البیان پائی تھی، اسلیے اپنے فرمان اور خطوط آپ لکھتا تھا، یا سامنے لکھوا تا تھا، کاغذات پر خود حکم چڑھاتا تھا، وہ پچاس برس سلطنت کرکے ۱۱۱۸ھ میں فوت ہوا، اس کی تحریرین دیکھ کر تعجب آتا ہے، کہ جس طرح اورنگ سلطنت زیر قدم رکھتا تھا، اسی طرح کشور سخن بھی زیر قلم، دیکھو اس کے چھوٹے چھوٹے فقرے بھی ملک رانی کے پیچوں مین الجھے ہوئے ہین، مگر عبارت صاف ہے، اور لفظ لفظ مین محاورے کا نمک دیا ہوا ہے، تمام انتظامی ہدایتین اور اکثر اخلاقی نصیحتین ہین کہ تاثیر مین ڈوبی ہوئی ہین، اس کی تحریر کو گلستان سے تشبیہ دون تو مضائقہ نہیں اتنا فرق ہوگا کہ گلستان کے خیالی مضامین اور اس کے عالی عبارت اسکی جتنی پڑھنے مین سہل ہے اتنے ہی لکھنے مین دشوار ہے" [1]

(عالمگیر کے خطوط کی ہمہ گیری کے متعلق سید نجیب اشرف صاحب ندوی مرتب "رقعات عالمگیری" کی رائے ہے، کہ)

(اورنگ زیب کے خطوط..... گلہائے رنگا رنگ کے بہترین مجموعہ ہین، کہین ذاتی حالات کے متعلق اظہار خیال ہے، تو کہین سیاسی و معاشرتی واقعات پر تنقید، کہین شوق وصال بے چین کئے ہوئے ہے، تو کبھی درد فراق نے مضطر کر رکھا ہے، کسی جگہ کسی کی شادی یا ولادت کی خوشی ہے، تو کہین کسی کی موت کا ماتم، کسی جگہ کسی افسر کی سفارش ہے، تو کہین تنبیہ، اگر ایک خط عمارتون اور قلعون کے مفصل حالات سے مملو ہے، تو دوسرا باغون اور چمنون کی رنگین بیانی سے پر، کہیں عتاب ہے، تو کہین عنایت، کبھی گرمجوشی

[1] نیرنگ خیال۔

ہے، تو کبھی سرد مہری، کبھی الزامات کی صفائی ہے، تو کہین دوسرے کے خلاف شکایت، غرضکہ وہ کونسی چیز ہے جو اس مجموعہ مین نہین ہے، پھر وہ کونسی شے ہے جس مین حقیقت نگاری کے ساتھ کمال ادب کو جگہ نہین دی گئی ہے"[1]

عالمگیر کا ذوق شعری

عالمگیر کے دربار مین کوئی ملک الشعراء نہین تھا، اس سے عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے، کہ عالمگیر کو شعر و شاعری سے نفرت تھی، اس لیے اس عہدہ کو اپنے دربار سے ختم کر دیا، مگر اہل نظر یہ کیونکر یقین کر سکتے ہین، جب کہ اس کے اکثر خطوط اشعار اور لمبی لمبی نظمون سے مزین نظر آتے ہین، مثال کے طور پر بعض نمونے ملاحظہ ہون، ایک خط مین لکھتا ہے:-

خان جہان بہادر گذشت، انا للہ وانا الیہ راجعون، سبحان اللہ آدمی چہ قدر غافلست؟ و نفس تا کجا برو غالب؟ درین ایام صوبہ داری دکھن می خواستند دیگر و دیگری آرزوے آن می کرد؟

آرے کار نفس بدتر ازین است، ع

کشتن این کار عقل و ہوش نیست	شیر باطن سخرۂ خرگوش نیست
عالمے را لقمہ کرد و در کشید	معدہ اش نعرہ زنان ہل من مزید
دوزخ است این نفس و دوزخ اژدہاست	کو بدریاہا نگردد کم و کاست
ہفت دریا را در آشامد ہنوز	کم نگردد سوزش آن خلق سوز
سنگہا و کافران سنگ دل	اندر آیند اندران خوار و خجل
ہم نگردد ساکن این چندین غذا	تا ز حق آید مرا ورا این ندا

[1] مقدمہ رقعات عالمگیر از نجیب اشرف ندوی ص ۵۶-۵۵، ہم نمونے کے لیے اورنگزیب کے رقعات کو یہان پیش کرنا ضروری نہیں سمجھتے، کیونکہ مولف ہذا نے اورنگزیب کے خطوط پر ادبی حیثیت سے نہایت ہی مبسوط ناقدانہ اور فاضلانہ بحث کی ہے، ملاحظہ ہو مقدمہ رقعات عالمگیر ص ۵۵ تا ۹۱

سیر گشتی سیر گوید نے ہنوز — این است آتش انیست بالش نیست نو
حق قدم بر وے نہد از لامکان — انگہ او ساکن شود از کن نکان
چونکہ جزء دوزخ است این نفس ما — طبع کل دارد ہمیشہ جز وہا
این قدم حق را بود کو راکشد — غیر حق خود کے کمان او را کشد
قوتے خواہم ز حق دریا شگاف — تا بسوزن برکنم این کوہ قاف

او تعالیٰ توفیق کرامت کند و ازین نیزہ دوزہ رہائی بخشد، بحرمۃ محمد و آل محمد علیہم الصلاۃ والسلام[1]

ایک بار شہزادہ بیدار بخت (خلف اکبر محمد اعظم) نے اپنی محبوبہ بیگم شمس النساء صبیہ سید ممتاز خان کو غصہ کی حالت میں پاجی کی لڑکی کہا، خود دار بیگم نے شہزادہ سے بولنا چھوڑ دیا، عالمگیر کو خبر ہوئی، تو بیدار بخت کو اس دلچسپ انداز میں خط لکھا،

صبحدم مرغ چمن با گل نوخاستہ گفت — ناز کم کن کہ درین باغ بسے چون تو شگفت
گل بخندید کہ از راست نرنجم لیکن — ہیچ عاشق سخن تلخ بمعشوق نگفت

بآن نور الابصار واضح باد کہ در ایام جوانی کہ اصطلاح پوارج مصاحبان شاہجہانی دیوانی می گویند مارا ہم دران ایام این تعلق باشخصیکہ نہایت تنجز داشت ہم رسیدہ بود تا حیات محبت او را بانجام رسانیدیم دگاہے، آزردہ نکردیم دیگران کہ با سادات لفظ پاجی گفتن محض پاجی گریست، کسے اگر سید را پاجی بگوید البتہ پاجی نخواہد شد، اگر از نوشتہ محلدار و ناظر رضامندی آن سیدہ نشود عتاب، بلکہ عقاب گرفتار خواہید شد، جزاءً بما کانوا یعملون،[2]

شاہزادہ محمد اعظم کو ایک موقع پر تنبیہ کرتا ہے،

عجب از آن فرزند کہ بہبیت ما ہیچ اشتہ کردہ؟ از احتیاط دور بینی ہزار مرحلہ دور افتادہ

---

[1] وقائع عالمگیر مرتبہ چودھری نبی احمد سندیلوی ص ۹۰-۸۹، [2] ایضاً ص ۹۰،

الحذر در سوء الظن بخاطر نیاورده و از آیت ولا تلقوا بایدیکم الی التهلکة بهره نیافته؟

مرغی که زیرک است درین بوستان سرا ... گل را خیال چنگل شهباز می کند

خون می چکد ز زخم نمایان ز خنده اش ... کبکی که بی ملاحظه پرواز می کند

مردی در تهوری و بی باکی نیست بلکه در خود شکنی ست

کمال مردی و فرزانگی ست خود شکنی ست ... بهوس دست نا کسی را که این کمان شکنند

ایک دوسرے رقعہ میں لکھتا ہے:-

بفرزند عالیجاه عرضداشت کند که ایشان استشفاع تقصیر اعتبار خان کرده اند، احتمال قوی که سید سعد اللہ در دلش نوشته باشند بنویسید که عبد القادر بیدل درین مقام دو مصرع دلچسپ گفته

بترس از آه مظلومان که هنگام دعا کردن

اجابت از در حق بهر استقبال می آید[51]

سعدی، حافظ، نظامی، نظیری، صائب، ملا شاہ اور فانی کشمیری کے دواوین عالمگیر خاص طور سے پڑھتا تھا، اور ان کے اشعار زبانی یاد رکھتا تھا، بخشی الممالک مخلص خان نے ایک بار دیوان صائب پیش کیا، جس میں ایک لاکھ اشعار تھے، عالمگیر صائب کے ایسے اشعار پڑھ کر بہت محظوظ ہوا، جو معرفت و تصوف میں ڈوبے تھے، اور اس دیوان کو محبوب رکھنے لگا، اس کی مندرجہ ذیل غزل ایک مدت تک اپنی محفل میں بار بار پڑھا کر سنتا تھا،

خم چو گردید قد افراخته می باید رفت ... پل برین آب چو شد ساخته می باید رفت

هر چه در کار بود ساختنش خود ساز نیست ... گو شود کار جهان ساخته می باید رفت

این سفر هیچ سفر های دگر صائب نیست ... رخت هستی ز خود انداخته می باید رفت[52]

[51] وقائع عالمگیری ص ۱۲۲،
[52] مآثر عالمگیری ص ۲۶۳

جو شعراس کو پسند آتے تھے ان کو وہ خود اپنی بیاض مین لکھ لیتا تھا، اور اکثر اوقات اپنے لڑکون کی بیاض مین بھی بالالتزام لکھوا تا تھا، ایک رقعہ مین لکھتا ہے،

بہدایت اللہ زرین رقم بگوئید، کہ این رباعی در بیاضے کہ بپادشاہزادہ کام بخش مرحمت می شود، بخط خود بنویسد ؎

آتش بدودست خویش درخرمن خویش ۔۔۔ من خود زدہ ام چہ نالم از دشمن خویش

کس دشمن من نیست منم دشمن خویش ۔۔۔ اے وائے من و دست من و دامن خویش[1]

علالت اور حتی کہ بستر مرگ پر بھی عالمگیر کی زبان پر شعر ہوتے تھے، ۱۱۱۶ھ مین ایک بار بیمار پڑا، تو ضعف کی حالت مین یہ شعر ترنم کے ساتھ پڑھ رہا تھا،

بہشتاد و نود چون در رسیدی ۔۔۔ بسا سختی کہ از دوران کشیدی

دران جا چون بہ صد منزل رسانی ۔۔۔ بود مرگے بصورت زندگانی

امیر خان نے جو اس وقت اس کے ساتھ تھا، عالمگیر کو شعر پڑھتے سنا تو عرض کیا کہ نظامی گنجوی نے ان ابیات کی تمہید مین یہ بیت کہی ہے،

پس آن بہتر کہ خود را شاد داری ۔۔۔ دران شادی خدا را یاد داری

عالمگیر نے اس شعر کو کئی بار سنا، پھر اپنی بیاض مین لکھوایا، اور مدت تک یاد رکھا[2] بستر مرگ پر یہ شعر اکثر اس کے ورد زبان رہتا تھا،

یک لحظہ، یک ساعت، یک دم ۔۔۔ دگرگون می شود احوال عالم[3]

یہ تعجب سے سنا جائے گا وہ خود بھی کبھی کبھی طبع آزمائی کرتا تھا لیکن ہم کو اسکا صرف ایک شعر مل سکا،

---

[1] وقائع عالمگیر صفحہ ۔ [2] مآثر عالمگیری واقعات ۱۱۱۶ھ ۔ [3] واقعات ۱۱۱۸ھ

غم عالم فراوان ست و من یک غنچہ دل دارم — چسان در شیشۂ ساعت کنم ریگ بیابان را[1]

ان شواہد کی موجودگی میں یہ کہنا کہاں تک درست ہے، کہ عالمگیر کو شعر و سخن سے دلچسپی نہیں تھی، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ وہ عملی اور کار فرما دل و دماغ لیکر آیا تھا، وہ تفریحی مشاغل کا شیدا نہ تھا، اس کی سنجیدہ اور متین طبیعت شعرا کی مبالغہ طرازیوں، خوشامدانہ مداحیوں، اور جھوٹی بناوٹی باتوں کو نہیں پسند کرتی تھی، چنانچہ مراۃ العالم میں ہے؛

و در مراتب نثر و انشا دستے تمام داشت و در مہارت نظم ہم بہرہ تمام اما بمودار ی مستشہد صادق کریمہ و الشعراء یتبعہم الغاوٗون متمسک گشتہ توجہ باستماع شعر ندارند تا بشنیدن اشعار چہ رسد الا شعر کہ متضمن موعظت باشد

نہ کردہ بہر رضائے خدائے عزوجل — نہ چشم سوئے غزال و نہ گوش سوئے غزل

مآثر عالمگیری کا مصنف لکھتا ہے،

جہان پناہ اگرچہ نظم و نثر کے سمجھنے اور لکھنے میں کمال قدرت رکھتے تھے لیکن بیفائدہ اشعار اور خصوصاً کاذب مدح سرائی کے سننے سے پرہیز فرماتے تھے نصیحت آمیز اشعار سے البتہ بے حد ذوق تھا،[2]

ایک بار سلطان شادمان نے اسکی مدح میں مندرجہ ذیل قصیدہ اس کے سامنے پڑھا،

آن کیست کز حلقہ، لعلت نشان دہد — در خواب اگر دہد بطریق گمان دہد

آب حیات خضر کہ عمریست جاودان — تا مگر بحسرت لب لعل تو جان دہد

فکر سخن طراز کہ خضریست فی المثل — خود در عدم رود چو نشان زان بیان دہد

ابر قلم کہ آب سیہ می چکد ازو — رنگ سخن ز وصف لب دلگی رخان دہد

[1] بحوالہ پادشاہ نامہ عالمگیری از ذکا اللہ ص ۷۰۵ — [2] مآثر عالمگیری ص ۳۸۹

قدِ تو در خرام بگلگشت بوستان — صد پیچ و خم ز شرم بسرو جوان دہد

آنجا کہ اوست نالۂ عاشق کجا رسد — گر بال جبرئیل طریق فغان دہد

از چشم جانستانش چہ خواہم حیات نو — مژگان جواب من بزبانِ سنان دہد

گر دل ستاند از نگہ عشوہ آفرین — صد دل عوض ز طرۂ عنبر فشان دہد

چون شیشۂ شراب کہ با محتسب دہند — کس دل چرا بدست تو نامہربان دہد

نازم بچہرۂ کہ بہنگام مے ز عکس — رنگینیٔ بہار بفصل خزان دہد

ہر چیز را بجا صفتے آفریدہ اند — مے سرمہ در گلو اثر زعفران دہد

من خود بدر و یار خوشم ورنہ روزگار — کے این قدر الم بدل شادمان دہد

چشمش بابروان و مژہ گشت عالمی — کس ترک مست را زچہ تیر و کمان دہد

زلفش مزد رسیت مکن اعتبار او — از عشوہ گر دلی بتو شب میان دہد

مضمون دلنشین کہ رسد از جہان غیب — یاد از طراوت سخن باستان دہد

مرد آن بود کہ گر ہمہ عالم بدو دہند — دل کم دہد بشادی و غم تا کہ جان دہد

ما جان بنقد مہر و وفا دادہ ایم و بس — دیوانہ نیستیم کہ جانی بنان دہد

شاید مراد من کہ تدخواہم ز آسمان — اورنگ زیب عادل گیتی ستان دہد

شاہے کہ از برائے سر دشمنان دین — بہر نثار گوہر تیغ بمیان دہد

بہرام صولتے کہ ز بیمش سپہ گریز — گردون عنان خود بہ کہکشان دہد

تا ارض بر سکون و سما در تحرک است — تا چتر آفتاب ز مشرق نشان دہد

زیبندہ باد بر سر او رنگ سلطنت — تا ابر و مہر راتب دریا و کان دہد

باوجودیکہ اورنگ زیب اپنی مدح سرائی مطلق پسند نہ کرتا تھا، اور شاعروں کی قصیدہ

خوانی کو فعل عبث سمجھتا تھا، چنانچہ شادمان کو آئندہ مدح سرائی سے منع کر دیا، لیکن قصیدہ کے بعض بعض اشعار کو شاعرانہ نقطۂ نظر سے بہت پسند کیا، اور بار بار پڑھوا کر سنا مراۃ الخیال میں ہے،

"سلطان شادمان قصیدۂ مشتمل بر مدح گفتہ بسمع مبارک رسانید وبعض ابیاتش پسند خاطر فیاض افتاد، و بتکرار استماع فرمودند"[۵۱]

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ باوجود اس ذوق شعری کے ملک الشعراء کا عہدہ عالمگیر نے کیوں تخفیف کر دیا، دیکھنا یہ ہے کہ اس کے دربار کے ممتاز ترین شعراء کون تھے، نعمت خان عالی، عاقل خان رازی، ملا اشرف ماژندرانی اور موسوی خان وغیرہ وغیرہ کیا ان میں کوئی ایسا تھا جو فیضی طالب آملی، قدسی اور ابوطالب کلیم کا مدمقابل ہو سکتا تھا، اگر ان میں کسی کو ملک الشعراء کے خطاب سے سرفراز کر کے ان نادرۂ روزگار شعراء کی صف میں کھڑا کر دیا جاتا، تو کیا عالمگیر کے علم وادب کے بلند اور اعلیٰ ذوق پر حرف نہ آتا، ان میں سے کسی ایک میں بھی فیضی کا جوش بیان اور استعارات کی شوخی، یا طالب آملی کی تشبیہات کی ندرت، یا قدسی کا جوش و خروش، یا کلیم کی مضمون آفرینی اور خیال بندی پائی جاتی ہے؟ مولانا شبلی قمطراز ہیں کہ مرزا صائب کے بعد بھی لوگوں نے طبع آزمائیاں کیں لیکن وہ شمار کے قابل نہیں، وہ تو یہ بھی لکھتے ہیں کہ ایران میں شاعری مرزا صائب پر ختم ہو گئی، ہندوستان میں بھی یہ کہنا صحیح ہے کہ شاہجہانی دور میں فارسی شاعری اوج کمال پر پہنچ کر زوال کی طرف مائل ہوتی گئی، بعد کے شعراء پرانی شراب کو صرف نئی بوتلوں میں انڈیلتے رہے،

شعراء یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ عالمگیر کا دربار شعراء سے خالی ہو گیا تھا، اس کے دربار میں بھی شعراء تھے وہ ان کے اشعار سنتا، اور موقع بموقع اپنے جود و سخا سے ان کو فیضیاب کرتا تھا، مگر وہ مفت خوری

---

[۵۱] مراۃ الخیال ص ۲۵۲، ۲۵۳

کا قائل نہ تھا، اور نفس شاعری کو ذریعہ معاش ٹھہرانا پسند نہ کرتا تھا، یہی سبب ہے کہ اس نے دربار کے
شعراء کو بھی ان کی استعداد و لیاقت کے مطابق کسی منصب و دیگر روزی کمانے کا ذریعہ فراہم کیا،
اس نے نفس شاعری کا منصب قائم رکھنا پسند نہیں کیا۔

دربار کے متوسلین شعراء کی تعداد تو زیادہ ہے، مگر ہم یہاں پر صرف تھوڑے سے
ارباب سخن کا ذکر کرتے ہیں

نعمت خان عالی، عالی تخلص تھا، اور مرزا محمد علی نام، حکیم فتح الدین شیرازی کا لڑکا
تھا، مرزا محمد ہندوستان ہی میں پیدا ہوا، لیکن صغر سنی میں باپ کے ساتھ شیراز چلا گیا، اور وہیں
تعلیم پائی، ہندوستان آیا تو ملا شفیعائی یزدی کے سامنے بھی زانوے تلمذ تہ کیا، یہاں طب کا
آبائی پیشہ اختیار کیا، پھر اورنگ زیب نے اپنے ملازمان خاص میں داخل کر لیا، اورنگ زیب
نے جب حیدرآباد فتح کیا، تو اس نے یہ تاریخ کہی،

از نصرت پادشاہ غازی　　گردید دل جہانیان شاد
آمد بقلم حساب تاریخ　　شد فتح بجنگ حیدرآباد

اورنگزیب نے خوش ہو کر اس کو خلعت و انعام عطا کیا[1]

سنہ ۱۱۰۵ھ میں اس کو نعمت خان کا خطاب ملا، اور باورچی خانہ کا داروغہ مقرر ہوا، آخر
عہد میں اورنگزیب نے اسے مقرب خان کے خطاب سے سرفراز کیا، اور جواہر خانہ نگین دولت کا
داروغہ بنایا، شاہ عالم کے زمانہ میں دانشمند خان ہوا، اور بہادر شاہ نامہ لکھ رہا تھا کہ زندگی کو خیر آباد
کہا، اس کی مختلف تصانیف کا ذکر آگے آئیگا، لیکن یہ سنکر تعجب ہوگا کہ اس کی کتاب وقائع
نعمت خان میں عالمگیر کی ہجو ملیح بھی ہے، احمد علی سندیلوی مخزن الغرائب میں لکھتے ہیں:

[1] مآثر عالمگیری، واقعات سنہ ۱۰۹۸ھ

بے حد شوخ، بے باک، حاضر جواب اور لطیفہ گو تھا، محی الدین اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ کی ملازمت سے سرفراز ہوا، بادشاہ قابل دوست اور جوہر شناس تھا، اس کو بکاولی کا منصب دیکر نعمت خان کا خطاب دیا، مگر اس نے اپنے ولی نعمت کے حق نمک کا خیال نہین رکھا، اور ہجو ملیح لکھی

نمک سودہ الماس شبیہ است بہم ہر کہ این را بغلط خوردہ دگر جان نبرد

آخر اپنی نامناسب اور ناشایستہ باتون سے لوگون کی نظرون سے گر گیا۔ اس کی غزلون کے اشعار ہین تو کوئی لطف نہین، بلکہ بے مزہ اور پھسپھسے خالی ہین، مگر اس کی مثنوی، ہجو اور نثر پسندیدہ ہے[1]

اورنگ زیب نعمت خان عالی کی دریدہ دہنی سے واقف تھا، لیکن اس سے وہ قصداً اغماض کرتا تھا، ایک بار کامگار خان نامی ایک امیر کی شادی کے موقع پر نعمت خان عالی نے ایک ہجو لکھی، تو امیر نے اورنگ زیب سے اس کو تنبیہ کرنے کی درخواست کی لیکن اورنگ زیب نے لکھا:

خانہ زاد سادہ لوح (کامگار خان) می خواہد کہ مارا ہم درین رسوائی شریک سازد کہ او ہر چہ خواہد در باب ما گوید، و بہجو بسیار، و شہرۂ عالم سازد، و بیشتر ہم در باب ما مقصر نبود[2]، تلافی بانعام و انعام شدہ کہ دیگر ارتکاب نکند، با وجود این خود کی نکردہ زبان بریدن و گردن زدن مقدور نیست، باید سوخت، و باید ساخت، رفیق کا ہیرا فقات و لایفارقک[3]

میر غلام علی آزاد اس کے بارے مین لکھتے ہین، کہ

---

[1] مخزن الغرائب قلمی نسخہ مملوکہ دار المصنفین اعظم گڈھ، [2] یہ اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے جب کہ فتح دکن کے موقع پر تاخیر ہوئی تو بعض امراء نے اورنگ زیب سے واپس جانے کی درخواست کی، اورنگ زیب واپس جانے کے خلاف تھا اس موقع پر نعمت خان عالی نے جڑ کر کہا: شہنشہ جہان فوری کہ بروا مشتت نش ✻ کارے دگر بے نیست خدا بر دارد عالمگیر ہنس پڑا، [3] رقائع عالمگیر ص ۶۶۔

"حاوی فنون وافر بود و جامع علوم متکاثرہ ...... مرزا محمد در نظم و نثر قدرت عالی دارد خصوص در وادی نثر طلسم حیرت می بندد"

مآثر الامراء کا مصنف اس کو ہمیشہ ہاجی کے نام سے یاد کرتا ہے، اور لکھتا ہے،

"ہیچ یکے از زبانش نرستہ"[1]

عالمگیر نے نعمت خان عالی کے لڑکے حکیم حاذق کو حکیم الملک کا خطاب دیا محمد شاہ کے عہد میں یہ خطاب حکیم الملوک ہو گیا، اور پنجہزاری منصب بھی ملا۔[2]

عاقل خان رازی، میر عسکری نام، خواف کا رہنے والا تھا، شاہجہان کے عہد میں ہندوستان آیا، اور شہزادہ اورنگ زیب کے ساتھ دکن میں ضلعدار مقرر ہوا، ایام شاہزادگی میں اورنگ زیب کی ایک کنیز (جسکے اندر پرستان خاص) کا انتقال ہو گیا اس سے اورنگ زیب "روز تازہ بتازہ اور نو بنو" گانے سنکر محظوظ ہوا کرتا تھا، اس کے انتقال پر ملال پر اورنگزیب بہت ہی غمگین ہوا اسنا غم غلط کرنے کے لیے دوسرے روز شکار میں چلا گیا، میر عسکری بھی ساتھ تھا، تنہائی میں میر عسکری نے پوچھا کہ اندوہ و ملال کی شدت میں شکار کھیلنے کے کیا معنی؟ اورنگ زیب نے جواب میں یہ شعر پڑھا:۔

نالہائے خانگی دل را تسلی بخش نیست — در بیابان می توان فریاد خاطر خواہ کرد

میر عسکری نے یہ شعر سنکر عرض کیا، کہ

عشق چہ آسان نمود آہ چہ دشوار بود — ہجر چہ دشوار بود یار چہ آسان گرفت

[1] مآثر الامراء جلد سوم ص ۰۵۷، (ہاجی کے نمونے مخزن الغرائب میں ملاحظہ ہوں، کلیات نعمت خان عالی کتب خانۂ آصفیہ حیدرآباد دکن میں ہے۔ کلام کے کچھ نمونے مآثر الکرام دفتر ثانی ص ۱۲۸ پر بھی درج ہیں۔ [2] مآثر الکرام ص ۱۳۱

اورنگزیب نے شعر سنا تو اس پر رقت طاری ہو گئی، اور اس کو بار بار پڑھتا رہا۔[1]

میر عسکری حضرت برہان الدین رازی کا معتقد تھا، اس لیے رازی تخلص کرتا تھا، جب اورنگزیب دکن سے دارا سے لڑنے چلا، تو قلعۂ دولت آباد میں اپنے اہل و عیال کو چھوڑا، میر عسکری اس شہر کا نگہبان ہوا، اورنگ زیب جب سریر آرائے سلطنت ہوا تو اس کو عاقل خان کا خطاب دیا، اور دو آبہ کا فوجدار مقرر کیا، لیکن چند مہینے کے بعد میر عسکری صحت کی خرابی کی وجہ سے خانہ نشین ہو گیا، اس مدت میں اس کو ۵۰۰۰ روپیہ ملتے رہے، سنہ ۱۰۸۶ھ میں پھر ملازمت شاہی میں منسلک ہوا، اور داروغۂ حرم خاص مقرر ہوا، جس پر بہت ہی معتمد امیر مامور ہوتا تھا، اس زمانہ میں اورنگزیب کے عنایات و اکرام سے برابر فیضیاب ہوتا رہا، سنہ ۱۰۸۷ھ میں اس کو ایک شاہی خلعت عطا کیا گیا، اور ڈاک چوکی کا داروغہ مقرر ہوا، لیکن اس عہدہ سے مستعفی ہو گیا، سنہ ۱۰۸۹ھ میں اس کا ایک ہزار روپیہ وظیفہ مقرر ہوا، سنہ ۱۰۹۱ھ میں بخشی دوم کے عہدہ پر مامور ہوا، سنہ ۱۰۹۳ھ میں اسکو دہلی کی صوبہ داری سپرد کی گئی، اس عہدۂ جلیلہ پر اپنی وفات تک فائز رہا، مآثر عالمگیری کے مصنف کا بیان ہے کہ عاقل خان کی خدمات، دیانت داری اور اخلاص کی وجہ سے عالمگیر اسکی خود رائی و خود بینی و خود آرائی سے چشم پوشی کر کے عہدہ اور اہم خدمات اسکے سپرد کرتا تھا،[2]

ظفرنامۂ عالمگیری، ایک دیوان، مرقع تصنیفات رازی، اور چند مثنویاں، نغمات العشق، مرآۃ الحیات، شمع و پروانہ، اور مہر و ماہ اس کی یادگار ہیں، ظفرنامۂ عالمگیری میں عالمگیر کے واقعات جنگ بیجاپور سے میر جملہ کی وفات تک درج ہیں، مرقع تصنیفات رازی میں مولانا جلال الدین رومی کی طرز پر ایک مثنوی ہے، مرآۃ الحیات اس کے مرشد شیخ برہان الدین رازی کی تصنیف ہے، اس سے اس کو نثر میں منتقل کیا تو شیخ نے اس کی غلطیاں درست کر کے اس کی اصلاح کی

[1] مرآۃ الخیال، ص ۳۳۳، مآثر الامراء ج ۲، ص ۲

کا قصہ ہے، مہر و ماہ میں ایک ہندوستانی قصہ منظوم ہے،[۵۱] مصنف مآثر عالمگیری کا بیان ہے کہ مثنوی مولانا روم کے دقائق کو حل کرنے میں وہ اپنے کو یکتا خیال کرتا تھا،[۵۲] اس کے تغزل کا رنگ یہ ہے

خشک کنم ز سوز دل دیدۂ اشکبار را — چند در آب افگنم آئینۂ نگار را

منتظران یار را جلوہ ہر صنو نکوست — سرمہ بود غبار رہ دیدۂ انتظار را

قبلۂ مست می کند خانۂ مے فروش را — آنکہ بکعبہ می برد سالک ہوشیار را

پائے طلب براہ نہ شرط ادب نگاہ دار — چونکہ تو کردہ ای اختیار تہمت اختیار را

چند غمِ جہان خوری دل چہ نہی برین چمن — باد خزان چو در پے است جلوہ این بہار را

بست گرہ ز خون دل نافۂ آہوئے ختن — تا بکشاد آن غزال طرۂ مشکبار را

ساقی مست را بدہ یا ساغر بہشتی دہد — این مے اگر نمی چشی بس کہ کشتی خمار را[۵۳]

ملا محمد سعید اشرف[۵۴] مازندرانی، ملا محمد صالح مازندرانی کے لڑکے اور ملا محمد تقی مجلسی کے نواسے تھے، عالمگیر کے اوائل حکومت میں ہندوستان آئے، ان کی استعداد و قابلیت کو دیکھ کر عالمگیر نے ان کو زیب النساء کا اتالیق مقرر کیا، ۱۰۹۳ھ میں زیب النساء سے اجازت لے کر اصفہان واپس گئے، پھر واپس آئے تو شہزادہ عظیم الشان بن شاہ عالم کے ساتھ عظیم آباد میں رہے، شہزادہ انہیں بہت ہی محبوب رکھتا تھا، باوجود کبر سنی کے انہیں اپنے پاس برابر بٹھائے رہتا تھا، آخر عمر میں بیت اللہ کی زیارت کو جا رہے تھے کہ مونگیر پہنچ کر مالک حقیقی سے جا ملے، یہیں ان کی قبر بھی ہے، ان کے دیوان میں قصائد، قطعات، غزلیات کے علاوہ مثنویات بھی ہیں، ان کی بعض غزلوں کے پسندیدہ اشعار یہ ہیں،

[illegible] دو زبان گرو — [illegible] آید بہ تشنہ می گردد

[۵۱] [illegible] ۱۳۰ - ۱۴۴ ھ

[۵۲] [illegible]

ساقیا ساغر بگردش آر تمکین واگذار ... کشتی دریا کنان را لنگر و در کار نیست

گشت مستغنی ز وصل اشرف بیاد عارضش ... ہمچون آن حافظ کہ مصحف را تمام از بر نوشت

در جوانی روشن حالت پیری دارم ... چون گل زرد بہارم بخزان می ماند

رفتہ رفتہ ابرو را بر طرف سازد غضب ... آب را چندانکہ جوشانند کمتر می شود[۱]

روشن ضمیر، ایران کا مشہور شاعر تھا، ہندوستان آیا تو عالمگیر نے اس کی سرپرستی کی اور رفتہ رفتہ شاہی منصبداروں میں داخل ہوگیا، جب اورنگزیب شہزادہ شجاع سے لڑ رہا تھا تو ضمیر نے مندرجۂ ذیل تاریخ لکھ کر پیش کی،

اے حرز تو سورۂ تبارک بادا ... پیوستہ ترا تاج مبارک بادا

جستم ز پے سکون فتحت تاریخ ... دل گفت شود فتح مبارک بادا

اورنگزیب کو یہ تاریخ بہت پسند آئی، اس نے انعام میں پانچہزار روپے مرحمت کئے،[۲]

عالمگیر نے جب کلام پاک حفظ کیا تو اس موقع پر روشن ضمیر نے یہ تاریخ لکھکر گذرانی،

محی الدین و مصطفےٰ حافظ تو ... صاحب سیفی و مرتضیٰ حافظ تو

تو حامی شرع و حامی تو شارع ... تو حافظ قرآن و خدا حافظ تو

عالمگیر نے خوش ہوکر اس کو انعام میں سات ہزار روپے عطا کئے[۳]، وہ کچھ دنوں تک بندر سورت کا واقع نگار اور بخشی کے عہدہ پر بھی مامور رہا،[۴]

ضمیر ایرانی نژاد ہونے کی وجہ سے بھاشا و سنسکرت کے الفاظ کا صحیح تلفظ نہیں کرسکتا تھا مگر اپنی ذہانت اور جودت سے ہندی کا بلند پایہ شاعر ہوا، ہندی میں اس کا تخلص بیتی تھا، خافی خان اس کو امیر خسرو ثانی کہتا ہے، مراۃ الخیال کا مولف ضمیر کی مجلسوں میں برابر شریک رہا ہے،

---

[۱] مآثر الکرام ج ۲ صفحہ ۱۱۸، ۱۱۹ [۲،۳] منتخب اللباب از خافی خان جلد دوم ص ... [۴] مراۃ الخیال ص ۲۲۸

وہ لکھتا ہے :-

مرزا روشن ضمیر آسمان فضل و کمال کے بدر منیر تھے، بڑے صاحب استعداد و بلند فطرت تھے۔ لطائف خسروی کو عربی اور فارسی میں رائج کیا، اور ہندی کے علم میں اس فن کے استادوں سے آگے بڑھ گئے تھے، ہندی کے اکثر اساتذہ ان کے سامنے تعظیم بجا لاتے تھے، فن موسیقی میں اسقدر کمال حاصل کیا تھا، کہ بڑے بڑے ماہرین ان کی شاگردی پر فخر کرتے تھے، چودہ ہزار راگنیوں سے اہل صحبت کو محظوظ کرتے تھے، عربی، فارسی اور ہندی گیت بنا کر طرح طرح سے گاتے تھے، (ص ۲۲۸)

نغمے اور رقص پر ہندی زبان میں پارجاتک ایک مشہور کتاب ہے، ضمیر نے اس کا ترجمہ فارسی زبان میں کیا،[1]

رفیع خان باذل کا خاندان مشہد سے ہندوستان شاہجہاں کے زمانہ میں آیا، اس کا چچا مرزا محمد طاہر، وزیر خاں عالمگیر کے زمانہ میں برہان پور، اکبرآباد اور مالوہ کا صوبہ دار رہا، رفیع خاں باذل شاہجہاں آباد میں پیدا ہوا، جوان ہوا تو عالمگیر کے دامن دولت سے وابستہ ہو کر سرکار بانس بریلی کا فوجدار مقرر ہوا، بڑا قادر الکلام شاعر تھا، فردوسی کے شاہنامہ کی تقلید میں غزوات نبوی پر ایک مثنوی حملۂ حیدری لکھی جس میں ماثر الامراء کے مؤلف کے بیان کے مطابق چالیس ہزار اور ماثر الکرام کے مصنف کے مطابق نو ہزار اشعار تھے،[2]

التفات خان نقدہ صفاہانی طاہر نام مرزا محمد طاہر تھا، اصفہان کا رہنے والا تھا عالمگیر کے عہد میں ہندوستان آیا، مخلص خان کے ذریعہ سے شاہی ملازمت اور منصب حاصل کیا، پہلے التفات خان پھر ملتفت خان کے خطاب سے سرفراز کیا گیا، مضافات اورنگ آباد

[1] ید بیضا قلمی نسخہ دار المصنفین، [2] ماثر الامراء جلد سوم ص ۴۹۹ و ماثر الکرام جلد دوم ص ۱۴۳

مین بیڑ کا فوجدار مقرر ہوا، نثر لکھنے مین غیر معمولی مہارت رکھتا تھا، اور ایک ہی وقت مین تین کاتبون کو مختلف عبارتین لکھوانا اور ربط و تحریر کو قائم رکھنا، بلکہ خود بھی کتابت کرتا جاتا تھا

اس کے کلام کا نمونہ یہ ہے:-

مکن گویا بعرض مدعا یا رب زبانم را　　　　بہ بند از مہر خاموشی تا بہ قانون فغانم را

شہید بیکسیم پوشیدہ ام بعد از قبای خود　　　　برنگ مردۂ فیروزہ نیلی در عزای خود

شہرت حسن تو شد از کشتۂ دیدار تو　　　　از نسیم بال بلبل بشگفد گلزار تو[۱]

حکیم محمد کاظم صاحب، عالمگیر کے خاص طبیبون مین سے تھا، ہزاری منصب بھی شاہی دربار سے عطا ہوا تھا، اس نے متعدد مثنویان لکھین، جن مین سے کچھ کے نام یہ ہین، آئینہ خانہ، پری خانہ، ملاحت احمدی، صباحت یوسفی، کمال محمدی، کلیات کو انفاس مسیحی کے نام سے ترتیب دیا تھا، اس کو مصحف شریف کی طرح رحل پر رکھ مطالعہ کیا کرتا تھا، اس نے خود ستائی اور خود بینی مین خود ہی مسیح البیان کا خطاب اختیار کر لیا تھا، اس کے متعلق سرخوش کے جستہ جستہ فقرے یہ ہین :-

اکثر شعر بطرز مولوی روم می گفت، دیوانے ضخیم پر از رطب و یابس ترتیب دادہ، بہ طبع واستادی خود مغرور بود، از غایت بے خودی غلطی اکثر شعر پوچ و بے معنی می گفت وازمردم تحسین می داشت"

اس کی کچھ رباعیاں ملاحظہ ہون :-

بر بالاے خط کشیدہ کان سنبل مو ستا　　　　گل را بگلاب شست کین غنچہ رو ست

عالم ہمہ او ست لیک نتوان گفتن　　　　شہ را بسر انگشت نمودن نہ نکوست

---

[۱] مآثر الکرام ج ۲ ص ۱۴۵

ما را بخدای خویشتن راہے ہست | در ظلمت تن نور شہنشاہی ہست
چشمک زدن ستارہ بے چیزے نیست | در پردہ عنبرین شب ماہی ہست

تحسین، غلام علی نام تھا، عالمگیر کے دربار سے وابستہ ہو کر اس کے لڑکے شہزادہ معظم کا ندیم خاص رہا، ۱۰۸۰ھ میں شہزادہ لاہور سے عالمگیر کے پاس جا رہا تھا کہ راستے میں تحسین سے ترشروئی کے ساتھ گفتگو کی، جس کو وہ برداشت نہ کر سکا، اور راستہ ہی میں جان بحق ہو گیا، اس کے کلام کا رنگ یہ ہے:۔

تا تاب مہر بس نرم شد دل کہسار | توان کشود رگ سنگ را بہ نشتر خار
خندہ از یاد لبش چون گند مینای من | آب حیوان ریزد از ہر قطرہ صہبای من
مست بیباکم من و یارم بدوش دیگر است | گردن میناست خم از بار عصیان ہای من
در خاک فرو بردہ خیال لب یارم | یاقوت برآید چو کنی سنگ مزارم[1]

صہبائی، نام عبد الباقی، مراۃ العالم میں ہے کہ وہ شاہی ملازموں کے زمرہ میں داخل تھا، مگر ملازمت کی نوعیت معلوم نہیں ہو سکی، خط نستعلیق کا بھی ماہر تھا، مراۃ العالم کے مولف کے بیان کے مطابق اس کا کلام نشاط بخش اور شور انگیز ہوتا ہے، اسکے دو شعر یہ ہیں:

لب فرو بستیم از مستی و مدہوشی نیست | سخنی نیست کہ شرمندہ خاموشی نیست
ز دست سرکشی شانہ سینہ چاک شوم | کہ کاکل تو در آغوش او بمو گیرد

مرزا محمد علی ماہر اکبر آبادی۔ اپنے عہد کے اساتذہ فن میں شمار کیے جاتے تھے، کلیم، قدسی اور میر یحییٰ وغیرہ کی صحبت میں ان کے ذوق سخن کا نشو و نما ہوا، کچھ دنوں دانشمند خان شفیعا یزدی کے ہم جلیس رہے، پھر دارا شکوہ نے ان کو اپنے یہاں طلب کر لیا، اور مہابت خان

---

[1] فرحۃ الناظرین ص و مراۃ العالم ا

کا خطاب عطا کیا، یہ معلوم نہ ہوسکا کہ عالمگیر کے دربار سے بھی وابستہ رہے یا نہیں، مگر اسکی مدح مین ظہوری کے تتبع مین ایک رسالہ گل اورنگ لکھا جس کا انداز یہ ہے :-

در عہد صبی بمقتضای سن اگر بیازی گنجفہ دست کشادی شمشیر سر دا کردی و زد سرخ و سفید بخرج دادی تا از مرکب سازسر کارش نام سیاہی باد اش نشنیده یا دام چو پستہ خندان در پوست نگنجیده ؎

آرد از بہر مشق شاہ مدام   چشم خوبان سیاہی یا دام

در عہد خوش نویسی اش اندیشکہ یاقوت را مناسبتی بنقطہ نویسی نمی بیند، محرران دفتر ہمایونش یاقوت را قطعہ نمی نویسند"

مرزا محمد علی ماہر کی طبیعت مین قناعت پسندی اور درویشی تھی، اس لیے ترک دنیا کر کے عزلت نشین ہو گئے، کلمات الشعرا کا مولف محمد افضل سرخوش ان کا محبوب شاگرد تھا، ایک روز سرخوش نے استاد سے عرض کیا کہ دانشمند خان بخشی اور ہمت خان تن بخشی آپ پر مہربان ہین، ان کے ذریعہ سے کیون نہین کسی منصب کی کوشش فرماتے ہین، مرزا محمد علی ماہر نے جواب دیا کہ اب مشہور ہو چکا ہے کہ مین نے دنیا چھوڑ کر فقیری لے لی ہے، اگر دنیا کی طرف رغبت کرون گا تو میرا حال اس ہندو عورت کی طرح ہو گا جو شوہر کے مرنے پر جلنے کو جاتی ہے مگر آگ دیکھکر بھاگنا چاہتی ہے تو بھنگی اس کے سر کو لکڑیون سے کچل کر اس کو جلا دیتے ہین، چنانچہ آخر وقت تک صبر و قناعت ہی کے ساتھ زندگی بسر کی، انکے دیوان کو سرخوش نے مرتب کیا تھا ماہر نے متعدد مثنویان بھی لکھین جن مین ایک مثنوی جامع نشاتین ہے، یہ تحفۃ العراقین کی بحر مین ہے، سرخوش نے اپنے استاد کے جن اشعار کو خاص طور سے پسند کیا ہے، ان مین سے کچھ یہ ہین،

چشم چگونہ دیدن رویت ہوس کند   نظارہ بر چراغ تو کار نفس کند

می کند معشوق از پہلوی عاشق دلبری ‏ ‏ از پر خود شمع را پروانہ می سازد پری

تا بدل گردیدہ ام خورسند عالم از من است ‏ ‏ در قناعت مور را نہ یکدانہ حباب خرمن است

بسکہ در ہجر تو چون نال قلم کاہیدہ ام ‏ ‏ از تنم صد پیرہن بالیدہ تر پیراہن است

دود یار سوز دانہ دفغان بلند کشد ‏ ‏ مے دود آتشہ در سوختن سپند کشد

محمد افضل سرخوش، سنہ ۱۰۵۰ھ مین کشمیر مین پیدا ہوا، اس کا باپ محمد زاہد شاہ جہانی امیر عبداللہ خان زخمی کی سرکار مین ملازم تھا، سرخوش بھی اس امیر کے ملازمون کے زمرہ مین داخل ہوا، پھر اس کی وفات کے بعد نواب بخشی الملک روح اللہ خان کی وساطت سے عالمگیر کے دربار سے وابستہ ہوا، وہان سے اس کو منصب ملا، اور سنہ ۱۰۸۱ھ مین حسن ابدال مین مشرفی عدالت کے عہدہ پہ مامور ہوا، سرخوش نے عالمگیر کے دربار سے اپنی وابستگی کو فخر و امتیاز کے ساتھ لکھا ہے :-

خادم درویشان بلکہ خاکپاے ایشان محمد افضل سرخوش از خانہ زادان شاہ عالمگیر است

آخر مین شاہجہان آباد مین خوشحالی اور عزلت نشینی کی زندگی بسر کی، چہتر سال کی عمر مین ۱۱۲۶ھ وفات پائی، شاعری مین مرزا محمد علی ماہر اکبرآبادی، منعم حکاک شیرازی اور میر معز موسوی خان سے فیض حاصل کیا، مرزا محمد علی ماہر اور موسوی خان اس کی شاعرانہ صلاحیتون کے بیحد معترف تھے، مرزا محمد علی کو اس کی شاگردی پر فخر تھا، موسوی خان نے ہندوستان کے صرف تین شاعرون کو تسلیم کیا تھا جن مین سے ایک سرخوش تھا، بقیہ دو ناصر علی اور غنی کشمیری تھے، سرخوش نے بھی لائق شاگرد پیدا کئے، بندرابن خوشگو، حافظ محمد جمال تلاش، تنعم بیراگی، شیخ اللہ گلشن، عبدالرحیم لنگو کشمیری اور حکیم چند ندرت وغیرہ اسی کے شاگرد تھے، سرخوش نے اپنا دیوان خود ہی مرتب کیا تھا، اس مین تقریباً ۵ ہزار اشعار تھے، اس کے علاوہ بہت سی

مثنویان بھی لکھین، مثلاً مثنوی نورٌ علیٰ نور، مثنوی حسن وعشق، مثنوی قضا وقدر، مثنوی در بعض خصوصیات ہندوستان، جنگ نامۂ محمد اعظم، مثنوی در تعریف غسخانہ، جامی کی لوائح کے تتبع مین ایک رسالہ روائح بھی لکھا، نثر مین اس کی ایک کتاب جوش وخروش ہے، مگر اس کی سب سے اہم تصنیف کلمات الشعراء ہے جس مین جہانگیر سے لیکر عالمگیر کے عہد تک کے شعراء سے متعلق بہت مفید اور دلچسپ معلومات ہین، اور اس زمانہ کے مذاق کے مطابق ان کی شاعری پر تنقید وتبصرہ بھی ہے، بعد کے تمام تذکرہ نگارون نے اس کتاب سے استفادہ کیا ہے، غلام علی آزاد بلگرامی نے اپنے مختلف تذکرون مین اسکا بار بار حوالہ دیا ہے، جو اسکی اہمیت کی دلیل ہے، سرخوش نے اپنے جو منتخب اشعار پیش کیے ہین، ان مین سے کچھ یہ ہین :-

ہوشیاری را حجاب یار می دانیم ما　　بیخودی را بزم بے اغیار می دانیم ما

تیز می سازد بقتل عاشقان شمشیر را　　این قدر ہم رحم از دلدار می دانیم ما

نظرے بر گل شبنم زدہ افتاد مرا　　آمد از زخم نمک سود جگر یاد مرا

ز چشم شوخ کردی تیرہ روز لالہ و گل را　　بخاک سرمہ کشتی شعلۂ آواز بلبل را

غنچۂ تبسم بر رہ نازنینم بشکند　　برگ گل در زیر پا لیش کم ز تخت شیشہ نیست

خواہی کہ قدم براہ حق بگذاری　　باید کہ بکف دامن پیری آری

بے آئینہ پنبہ در نگیرد ہرگز　　یک عمر اگر در آفتابش داری

از بادہ مرا فزون شود عقل وشعور　　ساغر خضر رہ نشاط است وسرور

می روشنی طبع بود سرخوش را　　روغن ہمہ در چراغ گردد نور

ناصر علی سرہندی اور غنی کشمیری بھی اس عہد کے مشہور اور مقبول شاعر تھے، مگر دونون اپنی

؎ اورینٹل کالج لاہور کی اور مفید مطبوعات کے ساتھ یہ کتاب بھی شائع ہو گئی ہے، مگر راقم الحروف نے زیادہ تر بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کے قلمی نسخہ سے استفادہ کیا ہے،

قناعت پسندی کی وجہ سے شاہی دربار سے بے نیاز رہے، اس دور کے اور دوسرے شعراء کے نام یہ ہین، عبدالرسول، اسیر لاہوری، آصف عمر، افسری، اعجاز اکبرآبادی، جعفر نبیرہ آصف خان، سیادت لاہوری، ضیاء الدین خیرآبادی، عارف لاہوری، سید کبیر علوی، ملا سعداللہ غریب، عبدالوہاب عنایتی، فیضا، عبداللطیف قیصر، احمد بیگ کامل، منیر لاہوری، شیخ نورالحق مشرقی، نسبتی، عبدالاحد وحدت وغیرہ ؛

امراء | تیموریون کے دور حکومت مین علم پروری وعلم نوازی شان امارت مین داخل تھی، اسلیے امرائے عالمگیر بھی اپنی محفلون کو علم و ادب اور شعر و سخن سے پر رونق رکھا، اور ان مین بھی ادب انشا پرداز، سخن سنج اور سخن فہم پیدا ہوئے ؛

علاء الملک تونی فاضل خان عالمگیر کا پہلا وزیر اعظم ہوا، وہ معقولات، منقولات، الہیات، طبیعیات، ریاضیات اور نجوم وہیئت کا جید عالم تھا[1]، ادب و انشاء مین اس کو بڑی مہارت حاصل تھی، اوپر گذر چکا ہے کہ محمد وارث کی بادشاہ نامہ مین کچھ حصہ فاضل خان ہی کا نوشتہ ہے، عالمگیر کے عہد مین اہم شاہی فرمان وہی لکھا کرتا تھا[2]،

محمد اسمٰعیل ذوالفقار خان نصرت جنگ عالمگیر کے آخری وزیر اعظم اسد خان آصف الدولہ کا لڑکا تھا، آصف خان یمین الدولہ کی لڑکی مہرالنساء بیگم کے بطن سے پیدا ہوا، عالمگیر نے اس کو مختلف ملکی وحربی خدمات کے صلہ مین ذوالفقار خان اور نصرت خان کا خطاب اور پنجہزاری منصب عطا کیا، وہ شاعر بھی تھا اور شعراء کا سرپرست بھی، اور اس سلسلہ مین اس کی فیاضی

---

[1] ماثر الامراء جلد سوم ص ۶۱۳ مین ہے "در فنون حکمت طبیعی و ریاضی از یکتایان روزگار بود، سیادر علم ہیئت و نجوم گوے سبقت از جمہرۂ این فن می ربود و با کثرت فضل و کمال سامان و شعر عشق و سنوہ العمل دانشوران خان" [2] عالمگیر نامہ ص ۳۹۵،

کی بڑی شہرت تھی، ناصر علی سرہندی جس کو سرخوش نے "ابروے ہندوستان" لکھا ہے، کچھ دنوں دربار سے بھی وابستہ رہا، ناصر ایک غزل کے مطلع میں ذوالفقار کو مخاطب کرکے کہتا ہے :-

اے شانِ حیدری زجبین تو آشکار　　نام تو در نبرد کند کار ذوالفقار

ذوالفقار خان نے خوش ہو کر ایک بڑی رقم اور ایک ہاتھی انعام میں دیا، مگر ناصر علی نے اسی وقت ہاتھی اور روپے لوگوں میں تقسیم کردیئے اور گھر خالی ہاتھ واپس آیا، ذوالفقار خان نے ۱۱۰۲ھ میں کرناٹک پر فوج کشی کی، اس نواح میں حضرت شاہ حمید سے ملا تو ان کا گرویدہ ہوگیا، ان کی مدح میں کہتا ہے :

اینک اینک ساقی شیرین رسید　　نوبت جام حمید الدین رسید

حلقۂ درگاہ بیچون جامِ او　　از زمین تا آسمان دردام او

جام او خورشید ربانی بود　　انجمن افروز سبحانی بود

گر جمالِ او بر اندازد نقاب　　روزنِ ہر خانہ گردد آفتاب

در جلالش بر کشد تیغ از نیام　　غیر او باقی نماند والسلام

سیف خان، بن تربیت خان بخشی شاہجہانی، عالمگیر کے زمانہ میں پہلے کشمیر اور پھر الہ آباد کا صوبہ دار تھا، مآثر الامرا جلد دوم (ص ۴۸۴) میں ہے :

"بند مشرب بیتم وشع بود، با قابلیت ومساس شعر وسخن دارد۔"

ناصر علی سرہندی کو اس سے بڑی شیفتگی تھی، چنانچہ کہتا ہے :

گفت وگوی طوطی از آئینہ می خیزد علی　　گر بنا شد سیف خان را نفس در کار نیست

سیف خان فن موسیقی کا بڑا ماہر تھا، اس فن میں ایک رسالہ راگ درپن لکھا جو درحقیقت ایک مستند ہندی کتاب مانک سوہل کا اضافہ کے ساتھ ترجمہ ہے،

د مآثر الامرا ج ۲ ص ۱۰۴، د ذخیرۃ الخوانین ج ۲ ص ۱۳۰ ص ۵۲

جعفر الہ وردی خان، کچھ دنوں متھرا، گورکھپور اور مرادآباد کا فوجدار رہا، دسویں سال جلوس میں اس کو منصب چہار ہزاری سہ ہزار سوار دو اسپہ سہ اسپہ ملا، اور الہ آباد کا ناظم مقرر ہوا، بارہویں سنہ جلوس میں وفات پائی، اپنی شجاعت اور سخاوت میں مشہور ہونے کے علاوہ شعروشاعری سے بھی ذوق رکھتا تھا، اور اپنا ایک دیوان بھی مرتب کیا، اس کا ایک شعر یہ ہے:

کمتر زقاشقے نتوان بود طلب   صد تیشہ می خورد کہ رساند لبے بلب[1]

منعم خان۔ اکبرآباد کے کوتوال سلطان لاس کا لڑکا تھا، حضرت شیخ کلیم اللہ سے تعلیم پائی، عالمگیر کے عہد میں مختلف عہدوں پر فائز رہا، آخر میں جموں کا فوجدار رہا، مگر بہادر شاہ کے دور حکومت میں اپنی خدمات کی بنا پر ترقی کرکے سپہ سالار کے عہدہ پر مامور ہوا، اور خانخانان کے خطاب سے سرفراز کیا گیا، اپنی تلوار کی جھنکار دن میں شعروسخن کے نغمے بھی بلند کرتا تھا، کہتا ہے:۔

بلبل از نالۂ گل از جنون دل ایجاد کنم   عالم ناز و نیاز دگر آباد کنم
رفت مجنون فراست بیابان جنون   گرد باد دگر از خاک خود ایجاد کنم[2]

اس نے شیخ محمدی رحمۃ اللہ علیہ سے شرف بیعت بھی حاصل کیا تھا اسی کے اثر سے اسکی شاعری میں بادۂ تصوف کی سرمستیاں بھی آگئی تھیں، حقائق و معارف پر ایک رسالہ الہامات منعمی تحریر کیا،[3]

اسلام خان میر ضیاء الدین حسین بدخشی، عالمگیر کی شہزادگی کے زمانے سے اس کے ساتھ رہا، جنگ جانشینی میں دارا شکوہ اور شجاع کے خلاف لڑائیوں میں بہت ہی مفید خدمات انجام دیں، عالمگیر نے خوش ہو کر اس کو اچھے اچھے عہدے دیئے، چوتھے سال جلوس میں وہ کشمیر

---

[1] مآثر الامراء ج ۱ ص ۲۳۱ [2] مخزن الغرائب ورق ۱۲۱۴ [3] مآثر الامراء ج ۳ ص ۶۷۵

کا اور چھٹے سال میں الہ آباد کا صوبہ دار مقرر ہوا، اور پنج ہزاری سہ ہزار سوار کے خطاب سے سرفراز کیا گیا، مگر اسی سال وفات پائی، وہ الٰہی تخلص کرتا تھا،[۱] مآثر الامرا میں ہے

"اسلام خان خالی از کمال نبود، و اشعار آبدار از جویبار طبع نکتہ بارش تراوش می کرد" (ج ۱ ص ۲۲۰)

اس تعریف کے بعد اس کے دو مشہور شعر بھی نقل کیے ہیں،

بے تو شام غم بروز شبیخون می زند | مردم چشمم ز گریہ غوطہ در خون می زند
وسعتے پیدا کن اے صحرا کہ امشب در غمش | لشکر آہ من از دل خیمہ بیرون می زند

ہمت خان میر عیسیٰ۔ اسلام خان بدخشی کا لڑکا تھا، عالمگیر نے ایام طفلی ہی سے اس کی تعلیم و تربیت اپنی نگرانی میں کی، مآثر الامراء کے مولف کا بیان ہے کہ اسی شاہانہ نوازش کی وجہ سے میر عیسیٰ جامع فضل و کمال ہوا، جسونت سنگھ کے محاربہ کے بعد عالمگیر نے اس کو منصب اور ہمت خان کا خطاب دیا، مختلف عہدوں پر رہنے کے بعد آخر عمر میں اجمیر میں بخشی اول کے عہدہ پر مامور ہوا

مآثر الامرا میں ہے:

"از مستعدان روزگار بود، و در ہمسران سرآمد اقوام، فصاحت و بلاغت از نظم و نثر بر صفحہ یادگار نگاشتہ" (جلد سوم ص ۹۴۸)

ہندی اور فارسی دونوں میں طبع آزمائی کرتا تھا، ہندی میں اس کا تخلص میرن تھا، فارسی میں اس کے دو شعر یہ ہیں:

بجز خارے کہ مجنون داشت در دل | بیابان جنون خارے ندارد[۲]
من چہ گویم کہ چہ مقدار بدل نزدیکی | چشم بد دور کہ بسیار بدل نزدیکی[۳]

---

[۱] فرحۃ الناظرین ص ۱۰۶، [۲] مآثر الامرا ج ۳ ص ۹۴۸ [۳] کلمات الشعرا قلمی نسخہ

میرک معین الدین احمد امانت خان۔ کابل اور دکن کی دیوانی کی خدمت انجام دی، ماثر الامراء کے مولف کا بیان ہے کہ اس کی زندگی عام امراء کے طرز زندگی سے مختلف تھی، دنیاداروں کے اوصاف اس میں نہ تھے، فضل و کمال سے متصف تھا، ترجمۂ شرعۃ الاسلام، اس کی خاص کتاب تھی، جس میں آداب شریعت کو واضح طور پر بیان کیا گیا ہے خط شکستہ و نستعلیق جاننے کے علاوہ صاحب دل اور صاحب عرفان بھی تھا، اس کا ایک لڑکا وزارت خان گرامی شاعر تھا[۱]

سید حسین امتیاز خان خالص۔ اصفہان سے ہندوستان آیا، عالمگیر نے اس کو صوبہ عظیم آباد پٹنہ کا دیوان مقرر کرکے امتیاز خان کا خطاب دیا، آزاد بلگرامی اس کے کلام کی صفائی کے معترف ہیں، کچھ اشعار ملاحظہ ہوں

رسید فصل بہار و زمانہ گلچین است	سپند آتش می شو چہ وقت تمکین است
نیست بے لطفی جواب نامہ گر ننوشت دوست	از زبان خامہ مارا یا و نتوانست کرد
ساقی بیا کہ فصل خزان شور می رسد	اے مے تو ہم برس کہ سفر می کند بہار
لطف حق را کرد برا ظلمت عصیان غضب	آب دریا را شب تاریک آتش می کند[۲]

احمد یار خان یکتا۔ ٹھٹھہ کا صوبہ دار تھا، مختلف قسم کے علوم و فنون حاصل کئے، خطاطی میں اس کو بڑی مہارت تھی، خط نسخ میں ایک کلام پاک لکھ کر میر عبد الجلیل بلگرامی کی خدمت میں پیش کیا، شعر و شاعری میں اساتذۂ فن سے معرکہ آرا ہوتا تھا۔ لاہور کے ایک شاعر محمد عاقل کا تخلص بھی یکتا تھا، اس نے احمد یار خان سے اصرار کیا کہ وہ اس کے حق میں اپنے تخلص سے دستبردار ہو جائے، احمد یار خان نے کہا کہ ایک طرحی غزل ہم دونوں کہیں، اور جس کی غزل بہتر ہو وہی اس تخلص کا مستحق ہو، چنانچہ دونوں نے غزلیں کہیں، اور وہ اساتذۂ فن کے سامنے پڑھی گئیں،

---

[۱] ماثر الامراء جلد اول ص ۲۶۷ ، [۲] ماثر الکرام جلد دوم ص ۱۹۱

احمد یار خاں کی غزل سننے کے بعد محمد عاقل کے لب پر مہر سکوت لگ گئی، اور اپنی غزل پڑھنے سے انکار کر دیا، پھر تمام حاضرین نے ایک محضر پر دستخط کیا کہ

بر این معنی گواہیم آفرین ما — کہ احمد یار خاں یکتاست یکتا

احمد یار خاں کی وہ طرحی غزل یہ تھی:-

تا خطش طرح جہانگیری کاؤسی گرفت — لشکر زنگ چو رومی بسر روسی ریخت

بامیدیکہ شود جلوہ گر آن سرو روان — خاک شد جبہہ و در راہ قدم بوسی ریخت

سرمہ آلود نگاہی کہ بیاد مرآمد — کہ سرشک شفقے از مژہ ام طوسی ریخت

بر در بتکدہ از نالۂ زارم ناقوس — ہم تن اشک سند و در پا قوسی ریخت

شمع از اشک زخش بوقلمون سوخت بہ بزم — جائے اشکش ہمہ خاکستر طاؤسی ریخت [۱]

موسوی خاں مرزا معز الدین محمد **فطرت**، نسباً امام ضامن ثامن موسیٰ الرضا کی اولاد میں سے تھا، اور میر محمد زمان مشہدی کا نواسہ تھا، عین شباب کے زمانہ میں اپنے باپ مرزا فخرو سے خفا ہو کر اصفہان چلا آیا، جہاں آقا حسین خوانساری سے علوم و فنون کی تحصیل کی، بہت ہی ذہین و فہیم تھا، اس لیے علوم عقلیہ میں بڑا درک حاصل کیا، ۱۰۸۲ھ میں ہندوستان آیا، تو اورنگزیب نے اس میں ذاتی اور نسبی جوہر دیکھکر اپنے لطف و کرم سے مالا مال کیا، شاہ نواز خاں کی لڑکی یعنی شاہزادہ محمد اعظم کی خالہ سے اس کی شادی ہوئی اور وہ عظیم آباد کا دیوان مقرر ہوا، لیکن وہاں کے ناظم سے اس کا اتفاق نہ رہا، اس لیے واپس بلا لیا گیا، ۱۰۹۹ھ میں موسوی خاں کے خطاب سے سرفراز ہوا، اور دیوان تن مقرر ہوا، ایک سال کے بعد تمام دکن کا دیوان ہوا، ۱۱۰۱ھ میں وفات پائی [۲]، مرزا معز الدین بہت ہی خود دار اور نازک مزاج تھا، ایک موقع پر عالمگیر کو اس سے

---

[۱] مآثر الکرام ج ۲ ص ۲۰۲ ، [۲] مآثر الامراء ج ۳ ص ۶۲۳ ، و نیز مآثر الکرام دفتر ثانی ص ۱۲۵

رنجش پیدا ہو گئی اور وہ تھوڑے دنوں تک شاہی التفات سے محروم رہا، مگر وہ بھی اپنی خودداری کے باعث بے نیاز رہا، جب لوگوں نے سمجھایا کہ بادشاہ سے اپنی تقصیر کی معافی مانگو، تو اس نے ایک معروضہ لکھا، جس میں یہ شعر تھے،

درطلب ما بے زبانان امت پروانہ ایم — سوختن، از عرض مطلب پیش من آسان تراست

شد از غرور غلامی زبان عرض خموش — مرا براہ خطا، این صدا بہا انداخت

از موج فیض بحر کرم را قرار نیست — اہل سوال بیہودہ ابرام می کنند

عالمگیر نے اس درخواست کو پڑھا تو یہ لکھا،

بے زبانی می کشاید بندہائے سخت را — در قفس طوطی ز منقار سخنگوئے خود است

لیکن :-

ہیچ مردے در پئے اصلاح خوئے خویش نیست — ہر کرا دیدم در آزار دلش خوئے خود است

"بموجب حدیث السلطان ظل اللہ ہر گاہ سلطان عصر با نوکران خود التجا مطلب او کند او جواب باین خوبی می دہد، از اخلاق بعید است کہ التفات بحال او نشود"[۱]

مگر موسوی خان کا اصلی جوہر اس کی شاعری میں کھلتا ہے، شروع میں فطرت تخلص کرتا تھا، مگر آخر میں اس کو موسوی سے بدل دیا، کلمات الشعراء کا مؤلف محمد افضل سرخوش اس کا شاگرد اور ہمجلیس تھا، سرخوش نے اس کی معنی آفرینی، شعر فہمی اور انشا پردازی کی بہت تعریف کی ہے، اور لکھا ہے کہ ایسا باکمال اہل علم ایران میں بھی کم پیدا ہوا، شاید یہ توصیفی کلمات ایک شاگرد نے غایت محبت و احترام میں لکھے ہوں، موسوی خان بھی سرخوش کا بڑا مداح تھا، اور کہا کرتا تھا کہ ہندوستان میں صرف تین ہی شاعر ہیں، غنی، ناصر علی اور سرخوش، مگر اس میں

۱۔ وقائع عالمگیری ص۳۷،

شک نہین کہ موسوی خان بھی اپنے عہد کا ممتاز اور بلند پایہ شاعر تھا، مآثر الامراء کے مولف نے بھی اسکی دقت آفرینی کی داد دی ہے، سرخوش نے اپنے ممدوح کے جو خاص خاص اشعار پسند کئے ہین ان مین سے کچھ یہ ہین

شدم خاک و ہنوز از عشق او آتش بجان دارم — در آغوش کفن جسمی چو تب در استخوان دارم

ما طائر عشقیم و قفس بال و پر ماست — چون بوی گل چیده وطن ہمسفر ماست

چہ سوز عشق را کامل کنی عیبت ہنر گردد — شود یاقوت ہر سنگی کہ ابر یشمہ ر گردد

ندارد آفتی چون غنچہ از صرصر چراغ من — برنگ لالہ در آغوش ناخن خفتہ مرغ من

آتشم در تہ پا بود و نے ہیچو سپند — کام اول نفسم سوخت ازین راہ مپرس

مرد حق در عین دنیاداری از دنیا بریست — ملک در دست سلیمان نیست در انگشتریست

این سبو مستی مرا از بادۂ خود پرور یست — شیشہ تا موج شکستن می زند بال پریست

عشق در مصر جنون لاف قدارائی می زند — حسن گر یوسف شود در کسوت پیغمبریست

بختاور خان۔ عالمگیر کا بہت ہی محبوب ملازم اور دربار کا بڑا ذی اثر اور ذی علم امیر تھا، مآثر عالمگیری کا مؤلف اس کا منشی اور دیوان تھا، جب اس کا انتقال ہوا، تو مآثر عالمگیری مین لکھتا ہے :-

۱۵ ربیع الاول سنہ ۱۰۹۵ھ بختاور خان داروغہ خواصان نے رحلت کی، بادشاہ خادم نواز کو مرحوم ملازم کے، جو مصاحب، رازدان، اور مالک کا مزاج دان ہونے کے علاوہ صاحب فہم و فراست و بزرگ منش خادم بھی تھا، اور جس نے ۳۰ سال کامل جانثاری کے ساتھ خدمت کی تھی، انتقال سے بیحد افسوس ہوا، فرمان مبارک کے موافق بختاور خان کا جنازہ عدالت گاہ کی طرف لایا گیا، اور خود قبلۂ عالم نے نماز جنازہ کی امامت فرمائی،

اور چند قدم جنازہ کے ہمراہ تشریف لے گئے، جہان پناہ نے مرحوم کے فاتحہ و نیز اس کے
نام پر خیرات و مبرات جاری کرنے کے احکام صادر فرمائے، بختاور خان کی لاش حسب الحکم
تخت گاہ کو روانہ اور خود مرحوم کی تیار کردہ قبر مین پیوند خاک کی گئی، بختاور خان مرحوم
علما و فقرا، و شعرا، کو بحد عزیز رکھتا تھا، اور جیسا کہ بیشتر مذکور ہوا، اہل ہنر و باکمال حضرات
کا ہمیشہ معاون و مددگار رہا کرتا تھا، فن انشا و تاریخ دانی مین اچھی مہارت رکھتا تھا، مرحوم
کی تصنیف و تالیف مین نسخہ مراۃ العالم یادگار زمانہ و مقبول خاص و عام ہے، یہ امیر تہذیب
اخلاق و خیر خواہی خلائق مین عدیم المثال تھا، رحمہ اللہ، (ص ۱۷۹)

مراۃ العالم کا تاریخی نام آئینہ بخت (۱۰۷۸ھ) ہے، اس کے مختلف ابواب (آرایش) ہیں
پیغمبر اسلام کے علاوہ خلفا، سلاطین، ائمہ، مشائخ، فلاسفہ، علما، شعرا، خوشنویس وغیرہ وغیرہ
کے اجمالی حالات درج کئے گئے ہین، آخر مین عالمگیر کے عہد حکومت کی دس سالہ تاریخ ہے،
اس کے اوصاف حمیدہ، اور اس کی سلطنت کے مختلف حصون کا بھی ذکر ہے، پھر اکبر سے لے کر
عالمگیر کے عہد تک کے مشائخ علما، اور شعرا کے بھی حالات ہین، یہ اس دور کی اہم تاریخی کتابون
مین سے ہے، مراۃ العالم ہی مین مذکور ہے کہ بختاور خان نے کچھ اور کتابین بھی لکھین (۱) چہار آئینہ
جس مین اورنگ زیب کی جنگ جانشینی کے سلسلہ مین چار لڑائیون کا ذکر ہے (۲) ریاض
الاولیا جس مین مشائخ کے حالات ہین (۳) سواد اعظم جو شعرا کے منتخب کلام کا مجموعہ ہے (۴) ملخص
تاریخ الفی (۵) سنائی کی حدیقہ، فرید الدین عطار کی منطق الطیر، مولانا روم کی مثنوی، اور
روضۃ الاحباب کا بھی ایک ملخص تیار کیا، اپنی علم پروری کی وجہ سے شعرا، اور فضلا کو بے حد عزیز
رکھتا تھا، شعرا بھی اس کی بڑی قدر کرتے تھے، کمال الدین افسری نے اس کی مدح مین دس ہزار
اشعار لکھے تھے[۱]، جن مین عالمگیر کی فتوحات کا بھی ذکر تھا، غلام علی تحسین[۲] اور عبد اللطیف قیصر[۳]

[۱] نزہۃ الناظرین ص ۵۸
[۲] مراۃ العالم ورق ۳۸۷
[۳] نزہۃ الناظرین ص ۱۰۳

بھی اس کی شان میں لمبے لمبے قصائد کہے، ملا سید کبیر علوی بھی اس کی سرپرستی میں رہے، یہ اپنے زمانہ کے جید عالم اور اچھے شاعر تھے، بختاور خان نے دہلی میں ایک مدرسہ قائم کیا تھا، اسی میں ملا سید کبیر طلبہ کو درس دیتے تھے،[۱] بختاور خان شیخ محمد بقا بقائی کا بھی مربی رہا، شیخ صاحب شیخ نور الحق ابن مولانا عبد الحق دہلوی کے شاگرد، اور شیخ محمد معصوم سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کے مرید تھے، افتخار خان میر خانساماں کی وساطت سے شاہی دربار کے ملازموں کے زمرہ میں داخل ہوئے، مگر شاہی نوازش کی وجہ سے زیادہ تر وقت علمی مشاغل میں گذارتے تھے، بختاور خان سے ان کے گہرے مراسم تھے، ان کی مشہور اور اہم تصنیف مراۃ جہان نما ہے جس کا موضوع مراۃ العالم سے ملتا جلتا ہے،[۲] ان کی طرف ایسی کتابیں بھی منسوب ہیں جن کو بختاور خان کی تصنیف کہا جاتا ہے،

ہندو فضلاء و شعراء عالمگیر کی سرپرستی نہ صرف مسلمان فضلاء و شعراء تک محدود رہی، بلکہ اس نے ہندو اہل علم و کمال کو بھی اپنا رہین منت بنایا، ہندی کا مشہور رزمیہ شاعر یعنی بیر داس اور بھوشن کوی کا بھائی چنتامنی کوی اورنگ زیب ہی کے سایۂ عاطفت میں بڑھا، چنتامنی کے توسل سے بھوشن کوی دہلی مغل دربار میں پہنچا، اور وہاں عرصہ تک رہا، کئی اپنی ہسٹری آف ہندی لٹریچر میں لکھتا ہے کہ "سخت گیر اورنگ زیب ہندوؤں کے فنون اور علوم کا دلدادہ نہ تھا لیکن ہندی کے ہندو شعراء دربار کی اعانت اور سرپرستی سے قطعاً محروم نہیں رہے، بہت سے شاعر اورنگ زیب اور اس کے بیٹے بہادر شاہ کے دربار سے وابستہ رہے"، اسی حقیقت کو مولانا شبلی اس طرح واضح کرتے ہیں کہ "عام خیال یہ ہے کہ ہندوؤں کے علوم اور زبان سے نہایت نفرت

---

[۱] فرحۃ الناظرین ۵۵ا [۲] یہ ایک متنازعہ فیہ بحث ہے کہ بختاور خان نے مراۃ العالم خود ہی لکھی، یا شیخ محمد بقا سے لکھوائی دیکھو ایلیٹ ۷، ہم مراۃ العالم کو مآثر عالمگیری کے بیان کے مطابق بختاور خان ہی کی تصنیف قرار دیتے ہیں،

رکھتا تھا، لیکن مسلمانوں نے بھاشا زبان پر جس قدر اس کے زمانہ مین توجہ کی، پہلے نہیں کی[1]،

عالمگیر کے مسلمان درباریون مین علاوہ روشن ضمیر کے دانا[2] اور عبد الجلیل بلگرامی بھاشا کے بہت ہی ممتاز شاعر تھے، اسی طرح ہند و درباریون مین فارسی کے بہت قابل قدر ادیب، شاعر اور مورخ تھے، جو عالمگیر کے ابر لطف و کرم سے برابر سیراب ہوتے رہے، ان مین سے چند کے احوال ملاحظہ ہون،

وامق کھتری۔ امرائے عالمگیری مین سے ایک امیر کا وکیل تھا، اس کے نظم و نثر اور ادب فارسی کی یہ دھوم تھی کہ اس کو سن کر شہنشاہ عالمگیر جو خود ایک بلند پایہ ادیب تھا، تحسین و آفرین کہتا تھا،

رائے بندرابن۔ رائے بہارامل کا بیٹا تھا، بہارامل نے سنہ ۳۰ جلوس شاہجہانی مین حسن خدمات کے صلہ مین رائے کا خطاب پایا تھا، دارا شکوہ نے اس کو اپنا دیوان مقرر کیا، اس کے بیٹے بندرابن کو عالمگیر نے تربیت دی، اور رائے کا خطاب بخشا، وہ بہادر شاہ کی شہزادگی ہی کے زمانہ سے اس کی ملازمت مین رہا، اس لیے بندرابن بہادر شاہی کہلاتا تھا، لب التواریخ کے نام سے ایک کتاب اپنی بہترین یادگار چھوڑی ہے، اس مین شہاب الدین غوری سے لے کر ۱۱۰۱ھ تک کے حالات ہین، اس مین کہین کہین عربی آمیز فارسی اس خوبی سے لکھی گئی ہے کہ بعض اوقات مصنف کے ایرانی ہونے کا دھوکا ہوتا ہے،

ایسر داس، قوم کا ناگر اور پٹن کا باشندہ تھا، ۳۰ سال کی عمر تک قاضی شیخ الاسلام ابن عبد الوہاب کی خدمت مین تحصیل علم کرتا رہا، شاہی ملازمین مین منسلک ہو کر جودھپور کا امین مقرر ہوا، اس نے میدان جنگ مین مفید خدمات انجام دین اور دولت و پنج صدی افسر مقرر

---

[1] مقالات شبلی حصہ دوم ص ۸، [2] اسکی نسبت علامہ غلام علی آزاد بلگرامی یدبیضا میں لکھتے ہیں کہ نظم ہندی بسیار خوب میگفت

ہوا، فتوحات عالمگیری اس کی ایک علمی یادگار ہے، جس میں ۱۶۵۷ء سے ۱۶۹۵ء تک کے واقعات ہیں،

بھیم سین کایستھ۔ شاہی ملازمت میں بندیلہ کے حاکم کے ساتھ منسلک تھا، دکن کی لڑائیوں میں بہت ہی کارآمد ثابت ہوا، تو عالمگیر نے راؤ کے خطاب کے ساتھ تین ہزار فوج کا افسر بنایا، پھر قلعہ نالدرک کا قلعہ دار ہوا، دلکشا کے نام سے عہد عالمگیری کی ایک تاریخ لکھی جو بہت اہم سمجھی جاتی ہے،

سوجان رائے کھتری بٹالہ کا رہنے والا تھا، خلاصۃ التواریخ کے نام سے ایک پرازمعلومات تاریخ ابتدائے عالم سے لیکر شہنشاہ اورنگ زیب کے عہد تک لکھی،[1] اور عالمگیر کے نام سے معنون کی، اس عہد میں ہندوؤں کے علوم و فنون کو فارسی زبان میں منتقل کرنے کی کوششیں کی گئیں وہ عالمگیر کو بدنام کرنے والے اصحاب اور مؤرخوں کے لئے بصیرت افروز ہے، میرزا خان بن فخرالدین محمد نے شاہزادہ اعظم شاہ کے مطالعہ کے لئے تحفۃ الہند تصنیف کی جس کا موضوع ہندوؤں کا فن بلاغت اور عروض و قافیہ وغیرہ ہے ابوسعید الحسینی الرضوی الشیرازی نے ۲۷ھ جلوس عالمگیری مطابق ۱۱۰۳ھ میں ہندو علوم ہیئت و نجوم پر نظام النجم کے نام سے ایک کتاب لکھی،[2] اس عہد کی دو اور عجیب کتابیں ہیں ہمت اچھرا اور رد الکفر دونوں ہندوؤں کے رسوم و عقائد پر ہیں، پہلی کتاب ایک ہندو کی لکھی ہے جس کا مقصد سنسکرت نہ جاننے والے ہندوؤں کو ان کے مذہب سے آگاہ کرنا ہے، اس کا لکھنے والا لعل بہاری ولد کاہید سنگھ ہے، جو بھوجپور ضلع شاہ آباد قنوج کا رہنے والا تھا، اور اورنگ زیب کے درباری امیر اللہ وردی کا متوسل تھا، لعل بہاری نے اس کتاب کے دیباچہ میں عالمگیر کو جن الفاظ اور خلوص و عقیدت سے یاد کیا ہے

---

[1] اس کتاب پر مولینا شبلی کا مضمون مقالات شبلی ادبی جلد دوم میں ملاحظہ ہو۔ [2] اس کا ایک قلمی نسخہ دارالمصنفین اعظم گڈھ میں موجود ہے،

وہ ہندوؤن کے پڑھنے کے لائق ہے[1]، دوسری کتاب رد الکفر ایک نومسلم کی لکھی ہوئی ہے جس مین ہندوؤن کے عقائد پر تبصرہ کیا ہے[2]

مورخین اورنگ زیب کے درباری مورخین کی تعداد زیادہ نہین، وقائع و اخبار نویسون کے علاوہ صرف ایک درباری مورخ منشی محمد کاظم تھا جس نے عالمگیر کی حکومت کے دس سالہ واقعات عالمگیر نامہ مین لکھے ہین، منشی محمد کاظم، مرزا محمد امین منشی مصنف پادشاہ نامہ کا لڑکا تھا، اس کے ادب و انشاء کے چند نمونون کو دیکھکر عالمگیر نے اسے اپنے عہد کے حالات لکھنے کے لیے مامور کیا، لیکن دس سال کے واقعات لکھنے پایا تھا، کہ عالمگیر نے دربار کے محکمۂ تاریخ نویسی کو بالکل ختم کر دیا، اس کی خاکسار طبیعت پسند نہین کرتی تھی کہ اس کے مفاخر و مکارم کی داستان گوئی کے لیے ایک سرکاری ترجم قائم رہے، عالمگیر نامہ کے مقدمہ مین ہے:-

چونکہ بندگان عالی اپنے قدرتی علم اور بلند حوصلگی کی بنا پر ظاہری چیزون کے بقاء و قیام کو ان کے فنا ہونے پر ترجیح نہین دیتے تھے، اس لیے روحانی خوبیون کی تعمیر کی طرف زیادہ توجہ کرتے تھے، اس لیے دس سال کے واقعات لکھنے کے بعد حکم دیا کہ عالمگیر نامہ کا مصنف محمد کاظم جو ان کے مفاخر و مکارم کی داستان بیان کرتا تھا، اس کے بعد کے واقعات کو قید تحریر مین نہ لائے، اس لیے اس نے اسی پر اکتفا کیا،

مآثر عالمگیری کا مصنف بھی اپنے دیباچہ مین اسی بات کو ظاہر کرتا ہے،

کتاب عالمگیر نامہ مصنفہ مرزا محمد کاظم مین بادشاہ دین پناہ ابو المظفر محی الدین محمد اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ غازی رحمۃ اللہ علیہ و اسعہٗ کے عہد سلطنت کے صرف دس سالہ واقعات

---

[1] اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ جامعہ ملیہ لائبریری دہلی مین موجود ہے، اس پر علامہ سید سلیمان صاحب ندوی کا ایک مضمون معارف نمبر ۲ جلد ۲۳ مین ملاحظہ ہو، [2] ایضاً

مندرج ہیں، جن کا خلاصہ سابقہ اوراق میں ہدیۂ ناظرین ہو چکا ہے، مرزا محمد کاظم عہد سلطانی کے بیشتر واقعات اس وجہ سے قلم بند نہ کر سکے کہ بادشاہ دین پناہ باطنی آرایش کے مقابلہ میں ظاہری نام و نمود کو قطعاً ہیچ تصور فرماتے تھے، اس لیے راقم مرحوم کو عہد معدلت کے حالات لکھنے سے ممانعت فرما دی گئی،

مگر آزاد اہل قلم جن میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل تھے اس عہد کی تاریخ برابر لکھتے رہے، جن میں سے کچھ کے نام یہ ہیں، واقعات عالمگیری مصنفہ امیر خان، عجیبہ غریبہ مؤلفہ شہاب طالش (سنہ ۱۰۶۰ھ)، واقعات عالمگیر مؤلفہ عاقل خان رازی، تاریخ شاہ شجاعی مصنفہ میر محمد معصوم (سنہ ۱۰۷۳ھ)، مراۃ العالم مؤلفہ بختاور خان، مراۃ جہان نما مصنفہ شیخ محمد بقا، ان دونوں کا ذکر پہلے آچکا ہے، زینۃ التواریخ مؤلفہ عزیز اللہ (سنہ ۱۰۸۶ھ)، وقائع نعمت خان عالی، جواہر التاریخ مؤلفہ سلیمان قزوینی، فتوحات عالمگیری مصنفہ ایسر داس، نسخۂ دلکشا مؤلفہ بھیم سین (سنہ ۱۱۲۰ھ)، منتخب التواریخ مؤلفہ جگ جیون داس (سنہ ۱۱۲۱ھ)، لب التواریخ ہند مؤلفہ رائے بندرابن، خلاصۃ التواریخ مؤلفہ سبحان رائے (سنہ ۱۱۰۷ھ)، موخر الذکر دونوں کتابیں عالمگیر کے نام سے معنون ہیں،[۱]

محمد ساقی مستعد خان ساقی نے مآثر عالمگیری لکھکر عالمگیر کی پچاس سالہ حکومت کی مکمل تاریخ پیش کر دی ہے، مستعد خان ساقی کو عالمگیر نے وقائع نگار کے عہدہ پر مامور کیا تھا، جس کی وجہ سے اس کو ہر وقت بادشاہ کا تقرب حاصل رہا، عالمگیر کی وفات کے بعد وہ بہادر شاہ کے صدر دیوانی وزارت عنایت اللہ کا منشی مقرر ہوا، اور عنایت اللہ خان کی فرمایش ہی سے اس نے مآثر عالمگیر لکھنی شروع کی، جو سنہ ۱۱۲۲ھ یعنی عالمگیر کی وفات کے تین سال بعد ہی ختم ہوئی، اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ طویل واقعات بہت ہی اختصار و جامعیت کے ساتھ لکھے گئے ہیں، اور

---

[۱] تفصیل کیلیے دیکھو مقدمہ رقعات عالمگیری از سید نجیب اشرف صاحب ندوی و معارف مئی سنہ ۱۹۳۲ء

اس میں عالمگیر کی صحیح تصویر نظر آتی ہے ،

مدارس برنیر نے شہزادوں کی ابتدائی تعلیم کے متعلق اورنگ زیب کی زبانی ایک دلچسپ اور پرمغز تقریر نقل کی ہے[1]، جس سے اورنگ زیب کا تعلیمی نقطۂ نظر معلوم ہوتا ہے، لیکن برنیر کا بیان عموماً سنجیدہ اور وقیع نہیں ہوتا، اس لیے ہم اس کو نظرانداز کرتے ہیں خصوصاً جب ہم دیکھتے ہیں کہ اورنگ زیب کی اس تقریر کا مخاطب اس کا ایک استاد ملا محمد صالح ہے جس کا نام معاصر مستند تاریخوں میں کہیں نہیں آتا ،

(۱) عالمگیر کو جو علم و ہنر سے شغف تھا، اس کا اقتضا یہ تھا کہ وہ اپنی سلطنت میں اس کی ترویج ہر ممکن صورت سے کرے، چنانچہ اس نے تمام شہروں اور قصبوں میں مدارس و مکاتب قائم کئے، لائق اساتذہ مقرر کئے، اور طلبہ کو وظائف دیے، عالمگیر نامہ کے مصنف کا بیان ہے،

> چونکہ علم و فضل کی تاسیس و ترویج کا اعلیٰ حضرت کو بے حد شوق ہے، اس لیے اس وسیع ملک کے تمام شہروں اور قصبات میں فضلا، اور مدرسین کو مناسب وظیفے، روزینے اور املاک عطا فرما کر علوم کی تعلیم و تدریس میں مشغول فرما رکھا ہے، اور طالبان علم کے لیے ہر علاقہ میں ان کے حالات و رتبہ اور استعداد کے مطابق وجوہ معیشت مقرر کر دیے ہیں، ہر سال اس مصرف پر احسان شاہی کی مد سے معتد بہ رقم صرف ہوتی اور شاہی فیاضی اور سخاوت کے فیض سے طالبان علم و کمال کی تعداد بڑھ گئی ہے، اور وہ اطمینان کے ساتھ علوم و فنون کے حاصل کرنے میں لگے ہوئے ہیں، اور ان کی دعاؤں کی برکت، اس آسمان شکوہ حکومت کے مفاد و دوام کا سرچشمہ بنی ہوئی ہے[2]،

---

[1] دیکھو تاریخ سیر و سیاحت ڈاکٹر برنیر مترجمہ سید محمد حسین ص ۱۵۲ ، [2] عالمگیر نامہ ص ۱۰۸۵ - ۱۰۸۶ انگریز مورخین نے بھی اس کی شہادت دی ہے کہ اورنگ زیب نے زراعت کو ترقی دی تھی، باضابطہ سڑکیں بنوائیں، اور بہت سے مکاتب و مدارس قائم کئے (کیمبرج ہسٹری [illegible])

گجرات میں جو مدارس قائم ہوئے، اور وہاں کے طلبہ کو جو سہولتیں پہنچائی گئیں، اس کا حال

مراۃ احمدی میں اس طرح درج ہے،

کرامت خان دیوان صوبہ کے نام حکم صادر ہوا، چونکہ ممالک محروسہ کے تمام صوبوں میں

یہ مقدس اور بلند فرمان نافذ ہو چکا ہے، کہ ہر صوبہ میں مدرسین مقرر کیے جائیں اور میزان

سے کر کشاف تک کے طالبعلموں کو صدر صوبہ کے استصواب اور راست سے اور مدرسوں کی

تصدیق کو دیکھ کر اس صوبہ کے خزانچی کی تحویل سے وجہ معاش دی جائے، اس لیے اس وقت

احمد آباد، پٹن اور سورت میں تین مدرسین کا اور صوبہ احمد آباد میں ۴۵ طالبان علم کا

اضافہ کیا گیا،[1]

اسی عہد میں شیخ محمد اکرام الدین نے ایک لاکھ چوبیس ہزار روپیے کے خرچ سے ایک

مدرسہ کی عمارت بنوائی، عالمگیر نے اس مدرسہ کے اخراجات کے لیے موضع سوندرہ پرگنہ سانولی

و موضع سیہالہ پرگنہ کڑی وقف کیا، اور شاہی ساتھ دو روپیہ یومیہ محتاج طلبہ کے لیے بھی مقرر کیا،[2]

(عالمگیر کو اس بات کا بے حد خیال رہتا تھا کہ جو کتابیں پڑھائی جائیں یا عام طور سے پڑھی جائیں

ان میں مسلمانوں کے عقائد کے خلاف کوئی چیز نہ ہو، چنانچہ حضرت شیخ محب اللہ الہ آبادی کے

رسالہ تسویہ میں اس کی نظر بعض ایسی عبارتوں پر پڑی، جو اس کے خیال کے مطابق اسلامی عقائد

---

[1] مراۃ احمدی ص ۲۲۰ تاریخ فرح بخش مصنفہ محمد فیض بخش (مترجمہ ہو ئیلو) دہلی سے زینت النساء نے نقل کیا ہے

کہ اورنگ زیب میزان کے پڑھنے والے طلبہ کو دو، نشعب پڑھنے والے کو تین، شرح وقایہ اور فقہ پڑھنے والوں کو مزید دیا کرتا تھا،

[2] مراۃ احمدی ج ا ص ۲۲۵، اورنگ زیب نے گجرات کے بوہروں کی تعلیم کے لیے بھی اساتذہ مقرر کیے تا کہ ان کی صحیح تعلیم ہو، ان کے

ماہانہ امتحان کے نتائج براہ راست اس کے پاس بھیجے جاتے تھے، (مراۃ احمدی ج ا ص ۶۸ - ۲۷۷) بریگز کے

بیان کے مطابق اورنگ زیب نے فرنگی محل لکھنؤ میں [illegible] ایک مدرسہ قائم کیا تھا۔

کے خلاف تھین، حضرت شیخ محب اللہؒ کا وصال ہو چکا تھا، ان کے دو مرید پایۂ تخت مین موجود تھے، ایک تو اورنگزیب کے استاد میر سید محمد قنوجی، اور دوسرے شیخ محمدی جو بڑے زاہد اور عابد صوفی تھے، میر سید محمد قنوجی ان عبارتون کی شرح نہ کر سکے، اورنگزیب نے شیخ محمدی کے پاس پیغام بھیجا کہ اگر آپ شیخ محب اللہ کی مریدی کا دعویٰ کرتے ہین تو ان کے رسالہ کے مقدمات کو شرعی احکام کے مطابق بتائین، ورنہ ان کی مریدی سے استغفار کرین اور کتاب کو آگ مین ڈالدین، شیخ محمدی نے جواب دیا کہ مجھکو حضرت شیخ کی مریدی سے استغفار کی ضرورت نہین، لیکن جس مقام سے شیخ نے گفتگو کی ہے، مجھے وہان تک رسائی حاصل نہین، جس وقت مین اس رتبہ کو پہنچ جاؤن گا تو آپ کی درخواست کے بموجب اس کی شرح لکھ بھیجون گا، اور اگر آپ نے اس رسالہ کو جلانے کا فیصلہ کر لیا ہے تو اس فقیر کے گھر سے کہین زیادہ شاہی مطبخ مین آگ موجود ہے، عالمگیر اس جواب کو سنکر خاموش ہو گیا،[1]

---

[1] مآثر الامرا، جلد سوم ص ۷-۹۰۶

شاہ عالم بہادر شاہ

اور

دوسرے بادشاہ

اورنگزیب کی روح قفسِ عنصری سے پرواز ہوتے ہی تاریخ ہند کا رخ بدل گیا، ہمالیہ سے راس کماری تک پھیلی ہوئی سلطنت کے نظام کو قائم رکھنے کیلئے عالمگیر ہی کا دل و دماغ چاہیے تھا، مگر حکومت بدلنے کے ساتھ زمانہ بدلا، اور تاریخ بھی بدل گئی، تخت طاؤس وہی تھا، لیکن اس کے پروں کی خوشنمائی جاتی رہی تھی، تیموری دربار وہی تھا لیکن اس کی رونق مٹ چکی تھی، ارباب عقل ودانش بھی موجود تھے، مگر ان کی جودت، فطانت اور سیاست سے فائدہ اٹھانے والا کوئی نہ تھا، دیوان خاص کے کنگوروں سے حسرت ویاس برسنے لگی، دیوان عام کی دیواروں پر افسردگی چھا گئی اور قلعہ معلی سوگوار ہوگیا، معلوم نہیں یہ کارکنان قضا وقدر کی مصلحت تھی یا عالمگیر کی اولاد کے اعمال کی پاداش، تیموری سلطنت اوج کمال پر تھی، اس کے زوال کو روکنے کے لیے ایک آہنی قوت کی ضرورت تھی، مگر وہ قوت باقی نہ تھی، فطرت سرگرم کار ہوئی اور تیموری سلطنت کا وہی انجام ہوا جو روم، بابل اور نینوا کا ہو چکا تھا،

عالمگیر کی دور رس نگاہیں اس نتیجہ تک پہنچ گئی تھیں، یہی وجہ ہے کہ وہ ایک لائق جانشین چھوڑنے کے لیے جس قدر مضطرب اور بے چین رہا کوئی اور تیموری حکمران نہ ہوا تھا، وہ اپنے لڑکوں کی

نہ صرف میدان جنگ میں فنونِ سپہ گری، دربار میں رموزِ حکمرانی[۱]، اور قلعہ معلی کے اندر لکھنے پڑھنے کی تعلیم دلاتا تھا، بلکہ ان کو اٹھنے بیٹھنے، رہنے سہنے، اور بولنے چالنے کے آداب خود سکھاتا تھا[۲]، مگر قدرت کو شاید منظور نہ تھا، کہ اس کی عظیم الشان سلطنت کے بارگراں کو اٹھانے کے لیے کوئی لائق جانشین پیدا ہو،

بہرحال یہ اسی کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ شاہ عالم بہادر شاہ نے ایام طفلی میں حفظِ کلام اللہ کی سعادت حاصل کی، اور آگے چل کر قرأت و تجوید کا ماہر ثابت ہوا، مآثرِ عالمگیری کے مصنف کا بیان ہے کہ جب وہ قرآن پاک پڑھتا تو سامعین بہت محظوظ ہوتے تھے، علم حدیث سے وہ خاص دلچسپی رکھتا تھا، اور اس کو اس میں اتنا درک تھا، کہ علمائے حدیث اس کو سردار محدثین کے لقب سے یاد کرتے تھے، فقہی مسائل بلا تکلف قرآن و حدیث سے استنباط کرتا تھا، اس کے زمانہ میں جمعہ کے خطبہ میں حضرت علیؓ کے نام کے آگے لفظ "وصی" کے اضافہ کے سلسلہ میں جو جھگڑا پیدا ہوا، اس میں علماء و فقہا سے اس نے خود مناظرہ کیا[۳]، حدیث، فقہ، تفسیر و سلوک کی کتابیں برابر مطالعہ میں رکھتا تھا، مصنف مذکور کا بیان ہے کہ عربی زبان میں "عرب عربا" اور فارسی و ترکی زبانوں میں بہترین اہل زبان کے ہم پلہ تھا، فن خوشنویسی میں بقول مصنف ہذا "یکتائے زمانہ تھا، اور مختلف قسم کے خطوط میں کمال حاصل کیا تھا[۴]، خلاصۃ التواریخ کا مصنف بھی اس کی تائید ان الفاظ میں کرتا ہے:

اعلیٰ حضرت جو کہ لیل و نہار کے صحیفہ انتخاب تھے، حضرت خلد مکان کی تربیت

---

[۱] وقائع عالمگیری مرتبہ نبی احمد سندیلوی ص۱ ۔ [۲] عالمگیر نے شاہزادہ محمد سلطان بہادر کو جو شب و روز کا نظام اوقات لکھ بھیجا تھا، وہ رقعات عالمگیر مرتبہ نجیب اشرف ندوی ص۲۳۰ میں ملاحظہ ہو، [۳] خافی خان جلد دوم ص۶۲۳ ، [۴] مآثر عالمگیری ذکر اولاد مذکور،

اور اپنی فطری سعادت کی بدولت سن تمیز کے آغاز ہی سے شرف نفسانی اور کمالات انسانی کے ذخیرہ دار ہو گئے تھے، جوانی کے ایام انھوں نے تحصیل علم میں صرف کیے، علم کو عمل سے آراستہ کیا، عربی، ترکی اور فارسی میں فصیح گفتگو کرتے تھے، تحریر و کتابت کے فنون میں استادی کا درجہ حاصل کر لیا تھا، راتوں کو اکثر نوافل، ورد و وظائف تلاوت قرآن اور حدیث، تفسیر، فقہ اور سلوک کی کتابیں مطالعہ کیا کرتے تھے۔[1]

بعض تذکرہ نگاروں نے شاہ عالم بہادر شاہ کا ذکر شاعر کی حیثیت سے بھی کیا ہے، اور بعض رباعیاں اس کی طرف منسوب کی ہیں، ایک ملاحظہ ہو،

الٰہی تا ز آبی کہ دلی خواستہ است   والا تا ز آبی کردلی دانستہ است

بہ ہستی خود گواہی خواست خدا   بے مثل بیا فرید و بے مانند است[2]

یا تو عالمگیری دربار کے زوال کے باعث یا شاہ عالمی عہد کے اختصار کے سبب دربار میں وہ فضا قائم نہ ہو سکی جو اس کے اسلاف کے زمانہ میں تھی، اس لیے اس کا دربار علم و ہنر کی تابانی اور شعر و شاعری[3] کی زمزمہ سنجی سے خالی رہا، گذشتہ عہد میں ایران سے علم و ادب کا جو سرچشمہ پھوٹا تھا، وہ یکایک خشک ہو گیا، بلند پایہ شعراء اور قابل قدر فضلاء ناپید ہو گئے، قابل ذکر شعراء میں صرف عبد القادر بیدل اور نعمت خان عالی باقیات صالحات میں رہ گئے تھے، مرزا بیدل بہادر شاہ کے ایام شاہزادگی میں اس کے متوسلین میں شامل ہو گئے تھے، لیکن درباری قصیدہ خوانی کو ننگ و عار سمجھتے تھے، شہزادہ معظم نے ایک بار قصیدہ کہنے کی فرمائش کی، تو دل برداشتہ ہو کر ملازمت سے کنارہ کش ہو گئے، اور بقیہ عمر فقر و توکل میں بسر کی،

---

[1] خلاصۃ التواریخ از سبحان رائے قلمی نسخہ دار المصنفین ص ۳، روز روشن ص ۱۱۸، مآثر الکرام ص ۱۴۸، دیوان کے علاوہ مرزا بیدل کی تصنیفات یہ ہیں: ۱۔ محیط اعظم، ۲۔ طلسم حیرت، ۳۔ گلگشت حقیقت، ۴۔ طور معرفت، ۵۔ عرفان، ۶۔ بیاض، ۷۔ نکات، ۸۔ رقعات، ۹۔ چہار عنصر

نعمت خان عالی کا ذکر پہلے آچکا ہے، بہادر شاہ نے اپنے زمانہ مین اس کو دانشمند خان کے خطاب سے سرفراز کیا، دانشمند خان اس عہد کی منظوم تاریخ بہادر شاہ نامہ لکھ رہا تھا، کہ خود اس کی زندگی کا ورق الٹ گیا، اس مین بہادر شاہ کے صرف ابتدائی دو سال کے حالات ہین نعمت خان کی اور بھی تصانیف ہین، مثلاً (۱) وقائع نعمت خان عالی، یہ وقائع حیدرآباد یا واقعات حیدرآباد و گولکنڈہ کے نام سے بھی موسوم کی جاتی ہے، عالمگیر کے تیسوین سنہ جلوس مین حیدرآباد کا جو محاصرہ کیا گیا تھا، اس کا تذکرہ اس کتاب مین ہجو ملیح کے ساتھ کیا گیا ہے، (۲) رقعات (یا منشآت) نعمت خان (۳) حسن وعشق (یا مثنوی حسن وعشق، یا کتخدائی حسن وعشق) یہ نثر مین ایک قصہ ہے جس مین جابجا اشعار بھی ہین (۴) ایک مثنوی، جس مین اخلاق اور صوفیانہ نکات ہین (۵) کلیات نعمت خان عالی، اس مین قصائد، ساقی نامہ، قطعات اور مختصر ہجوین مثلاً رسالہ ہجو حکما، مناظرہ اطبا وغیرہ وغیرہ بھی ہین[52]

دربار کے دوسرے نامور شاعر یہ تھے۔

مرزا مبارک اللہ مخاطب بہ ارادت خان المتخلص بہ **واضح**، خان اعظم شاہجہانی کا تیسرا لڑکا تھا، اورنگزیب کے زمانہ مین ارادت خان کا خطاب پایا، سنہ ۱۱... مین جاکنہ کی فوجداری پر مامور ہوا، پھر سنہ ۱۱... مین اورنگ آباد کی فوجداری اور اس کے بعد گلبرگہ کی قلعہ داری پر مقرر ہوا، شاہ عالم کے زمانہ مین منصب چہار ہزاری سے سرفراز ہوا، علم وفضل مین ممتاز تھا، صاحب مآثر الامرا کا بیان ہے:-

"مذاق تصوف داشت، ودر شعر بسیار نازک خیال بود واضح تخلص می کرد صاحب دیوان است"[53]

---

[52] فہرست انڈیا آفس لائبریری ص۹۲۳، [53] مآثر الامراء ج ۱ ص۲۴۵، اسکے بعض اشعار ملاحظہ ہون۔
(باقی حاشیہ ص۲۹۸ پر)

انتخاب کلیات واضح (موجودہ انڈیا آفس لائبریری) میں چھ مثنویاں بھی ہیں جنمیں صوفیانہ خیالات و مسائل منظوم کئے گئے ہیں[1]، تاریخ ارادت خان کے نام سے ایک تاریخ بھی لکھی، جو عالمگیر کی وفات سے لیکر فرخ سیر کے عہد تک کے واقعات پر مشتمل ہے[2]۔

مرزا سید حسین خالص، عالمگیر کے زمانہ میں ایران سے ہندوستان آیا، امتیاز خان کے خطاب سے سرفراز ہوا، بہادر شاہ کے زمانہ میں میر آخور بادشاہی کے عہدہ پر مامور ہوا، ایران واپس جا رہا تھا کہ راستہ میں سندھ کے پاس کسی نے قتل کر دیا، تاریخ وفات "آہ آہ امتیاز خان" سے نکلتی ہے، ایک دیوان یادگار چھوڑا، جس میں قصائد، غزلیات، قطعات اور رباعیات ہیں، ایک مثنوی بھی اس کے نام سے منسوب ہے[3]، اس کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے،

قزلباش خان امید، اصلی نام مرزا محمد رضا تھا، ہمدان کا رہنے والا تھا، بہادر شاہ کے زمانہ میں ہندوستان آیا، اور اس کے دامن دولت سے وابستہ ہوا، قزلباش خان کا خطاب اور ایک ہزاری منصب شاہی دربار سے ملا، چنانچہ خود کہتا ہے،

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۹۷) رشک فرہاد وطن نیست بجز آتش حباب | یافت یک پیرہن ہستی وآن ہم کفن است

عارف از دیر است دلی او دمی شود | آئینہ رو تماشود و رو دمی شود

ز منقراض فنا دور است شمع زندگانی را | بود آب دم شمشیر صندل سر گرانی را

چہ الفت است ندانست تو بیقراری را | حیا سپید اینہ است سوگواران را

موجم و وحشت کشد محروم از ساحل مرا | در تپیدن رفت از کف دامن قاتل مرا

نگہ صافت ہر از غنچہ و غبار آلودہ است | بست در رخ گلشنی کہ بہار را بخشد

بہار وقت صبا گل بہ کام گلچین باد | کہ ما بہ کنج قفس طرح آشیان کردیم

[illegible]

۱؎ انڈیا آفس لائبریری کیٹلاگ ج ا ص ۹۰۹، ۲؎ ایشیاٹک سوسائٹی ج ا ص ۴۳۴ تا ۴۳۵، ۳؎ فہرست کتبخانہ شاہ اودھ اسپرنگر ص ۱۵۰، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۱

ہمچو بلبل ہمیشہ نالانیم — این بود نصیب ہزاری ما

ایک فارسی دیوان چھوڑا،[۱] ریختہ میں بھی طبع آزمائی کرتا تھا، فن موسیقی کا بھی ماہر تھا،[۲]

بندرابن داس بہادر شاہی مصنف لب التواریخ کے علاوہ جگ جیون داس ولد منوہر داس بھی بہادر شاہ اول کے درباری متوسلین میں تھا، گجرات کا باشندہ تھا، ۱۱۱۹ھ میں بہادر شاہ نے لاہور کے دربار میں باریابی بخشی، اور وقائع نگاری کی خدمت پر مامور کیا، ۱۱۲۰ھ میں اس نے منتخب التواریخ لکھ کر بارگاہ شاہی میں پیش کی جس کے صلہ میں خطاب و خلعت اور انعام سے سرفراز ہوا،[۳] اس کتاب کا اہم حصہ اس کا آخری باب ہے جس میں ہندوستان کے مختلف صوبوں کے حالات ہیں، ایک اور ہندو اہل قلم کامراج ولد مین سنگھ نے شہزادہ محمد اعظم کی فرمایش پر اعظم الحرب لکھی، اس میں اورنگزیب کے لڑکوں کی جنگ جانشینی کا اور محمد اعظم کی عارضی حکومت کا ذکر ہے، مصنف نہایت اخلاص اور عقیدت مندی سے اپنے کو تین پشت سے تیموری دربار کا نمک خوار بتاتا ہے،

بہادر شاہ کے انتقال کے بعد مغلیہ سلطنت کے اقبال کا آفتاب اور بھی تیزی سے ڈھلنے لگا، تاریک بادلوں سے کبھی کبھی امید کی شعاعیں نکلتی بھی تھیں، تو ان میں نور کے بجائے

---

[۱] انڈیا آفس لائبریری کیٹلاگ ج ۱ ص ۹۲۲، [۲] اسپرنگر ص ۱۵۴، اس کے بعض اشعار ملاحظہ ہوں،

روشن نشود بہ پیش تو چون شمع سوختن — یک شب اگر تو ہم نشینی بر من

خوشا وقتے کہ می بالید از جانان بزم شیم — بہ بانگ ناوہ بر شام می پرچی گشتہ نغوشم

گشتہ دیگر وان نہ بس آبادی از ویرانم — چون کمان حلقہ بیرون شد درون خانہ ام

قدانا کردہ اند دست جدا از دوستان باشند — شنیدم کلفتے داری نصیب دشمنان باشد

[۳] مآثر الکرام دفتر ثانی ص ۱۴۱، اس کے ریختہ کے اشعار تذکرۂ گلزار ابراہیم اذ نواب علی ابراہیم خان متخلص بہ خلیل میں ملاحظہ ہو،

ظلمت ہی نظر آتی تھی، تیموری دربار کا شیرازہ بکھر گیا، تدبر و سیاست میں انتشار آگیا، بیرونی فتوحات کی جگہ اب صرف خانہ جنگیاں رہ گئی تھیں، میدان جنگ کی خون آشامیوں کے بعد دربار قائم بھی ہوا، تو اس میں نہ اسلاف کی روایات تھیں، نہ ان کی متانت اور ان کا وقار، بہادر شاہ کے بعد جہاندار شاہ تخت نشین ہوا، گو اس کی حکومت کی مدت صرف دس مہینے رہی، لیکن اس کی بوالہوسی اور ہوسناکی نے شاہی دربار کی عزت و ناموس کو ایسا صدمہ پہنچایا، کہ آیندہ تمام تیموری سلاطین کی حکومت محض تذلیل و تضحیک کی داستان بن کر رہ گئی، اس خانہ بربادی اور طوائف الملوکی میں علم و فضل کی مسند دربار میں بچھتی تو کیونکر؟ محمد شاہ، شاہ عالم اور بہادر شاہ ظفر میں اسلاف کی علم پروری اور ادب نوازی کا خمیر موجود ضرور تھا، مگر ان کی شمع سحر میں ان کے اسلاف کے آفتاب نصف النہار کی ضوفشانی کہاں سے آتی، حکومت محض شام غریباں بن کر رہ گئی تھی، اس میں علما و فضلا کی بہار کہاں سے پیدا ہو سکتی تھی؟

فرخ سیر فرخ سیر کی مدت حکومت سات سال رہی، اور یہ مغلیہ خاندان کا وہ زمانہ ہے جب شاہی دربار میں ایرانی اور ہندوستانی امرا کا ایک قابل قدر اجتماع ہو گیا تھا، نظام الملک آصفجاہ کی سیاست، امیر الامرا سید حسین علی خان کی فراست، قطب الملک عبد اللہ کی فرزانگی اور میر جملہ کی مردانگی اگر ایک ساتھ متحد ہو جاتیں، تو کیا عجب تھا کہ ایک بار پھر اکبری دبدبہ اور شاہجہانی شوکت کی جھلک نظر آجاتی، لیکن دربار کی ریشہ دوانیوں اور آپس کی فتنہ انگیزیوں نے تباہی اور بربادی کی چنگاریوں کو اس طرح مشتعل کیا کہ سلطنت محض خاکستر ہو کر رہ گئی،

فرخ سیر حافظ قرآن تھا، مراۃ آفتاب نما میں اس کے کچھ اشعار بھی درج ہیں جو اس نے اپنی اسیری کے زمانہ میں کہے تھے[1]، فرخ سیر کے دربار میں تو علم و فضل کا چرچا زیادہ نہیں رہا،

---

[1] یہ اشعار میری نظر سے نہیں گزرے، مگر ان کا انگریزی ترجمہ اردو کی تاریخ لیٹریچر مستعلہ (جلد اول ص ۳۶۹) میں ملے گا۔

لیکن اس کے امرا، کی علم دوستی اور علم نوازی نے اس کمی کو پورا کر دیا، نظام الملک آصفجاہ معقولات ومنقولات کے عالم ہونے کے علاوہ بہت ہی قادر الکلام اور بلند پایہ شاعر بھی تھے ۔ انکا ایک ضخیم دیوان جو ۳۰۰ صفحوں پر مشتمل ہے زیور طباعت سے آراستہ ہو کر حیدرآباد دکن سے شائع ہو گیا ہے ہم اس میں سے دو غزلیں ناظرین کی ضیافت طبع کے لیے پیش کرتے ہیں،

بیا و یار شب ای دل عنان خواب بگیر (۱) و مد چو صبح بهر نور آفتاب بگیر

چو روز خواهی اگر باشدت شبت روشن — بدست دامن حسن بآفتاب بگیر

تو تشنگی نه کشی گرم سعی اگر گردی — ز چشم سار عرق بهر خویش آب بگیر

بیزم دهر بود عشرت خوش آگاهی — پیاله خواهی اگر عبرت از شراب بگیر

میامن برکت یابی ای دل از حرکت — به هجر یار تو دامان اضطراب بگیر

توجه تو بسویم فتاده مقصد من — اگر ملاطفت نیائی ره عتاب بگیر

چو خواهی اینکه نه بیند کسی جمال ترا — فروغ مهر توئی از رخت نقاب بگیر

در آ بکوچه آن زلف ای دل شیدا — چه میروی تو بهر سو ره صواب بگیر

چو گرم جلوه شود آن نگار در باغ — ز شرم آب گلشن میشود گلاب بگیر

دلم یگانه بود ای نگار در عشقت — بدست خویش تو این فرد انتخاب بگیر

به پیچ و تاب خود ای زلف یار ناز مکن — بیا درون دل ما و پیچ و تاب بگیر

وصال یار چو خواهی مکن درنگ آصف — بجستجو که در آئی ره شتاب بگیر

(۲)

وحشت دلدار ما باشد بسامان دگر — می کند چون آهوان رم در بیابان دگر

در دو دل پرخون ما آن شوخ جولان می کند — جلوه گاه یار ما باشد گلستان دگر

در بیابان طلب خارے که در پایم خلید — یادگار نقش پا خار مغیلان دگر

هیچو زندانی که عاشق است یوسف را بخود — حلقهٔ زلف سمن سا ایست زندان دگر
بسمل و سرگرم خون ریزی است از شمشیر تو — می کند بسمل مرا در عید قربان دگر
خط کشیدن یار را تا دم ز خونریزی کند — می گزد آن ماه رو لب را بدندان دگر
میخورد و زیس فلک هر ماه تان تازه — ماه می آرد برای او لب نان دگر
در جدائی گر گریبان چاک کردم و قبا — چاک خواهم کرد در دل هم گریبان دگر
کاکلش یاد آمد و خلش دل ما را ز بود — می رسد هر دم ز پیش یار فرمان دگر
حال خود را با طبیبان جهان آصف مگو — درد عشق یار دارد ذوق درمان دگر

نظام الملک آصفجاہ کی علم نوازی اور فیاضی کی شہرت چاردانگ عالم مین تھی، اور ہر طرف سے علما، ان کے دربار مین کھنچے چلے آتے تھے، مآثر الکرام مین ہے،

عجیب فرشتہ صفت تھے، اور نیکی ان کی جبلت تھی، ان کی سرکار سے ہمیشہ فقرا، علما، صلحا اور دوسرے مستحقین کیسا تھ انکی قسمتون کے مطابق نوازش ہوتی تھی، عرب، ماوراء النہر، خراسان، عراق اور اطراف ہند سے فضلا و مشائخ ان کی قدردانی کا شہرہ سن کر دکن آتے اور ان کے شیلان کثیر الالوان سے زلہ ربائی کرتے تھے (ج ۳ ف ۵۸)

مآثر الکرام کے مولف مولانا غلام علی آزاد بلگرامی آصفجاہ کے معاصرون اور ان کی مجلسون کی زینت دینے والون مین سے تھے، وہ رقمطراز ہین:

مستحقین پر نہایت کثرت سے خیرات و مبرات کی، دفتر صدارت سے تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ شاہی انعامات کے علاوہ تین لاکھ روپیہ ان کے دستخط سے روزانہ اور ماہانہ وظیفہ کی صورت مین ارباب استحقاق کو دیے گئے، ان کے علاوہ تقریباً ایک لاکھ روپیہ حاجیون وغیرہ کو مرحمت ہوئے، عرب، ماوراءالنہر، خراسان، عراق، عجم اور ہندوستان کے سادات

اور علماء و مشائخ نے اس قدردانی کی شہرت سنی تو وہ دکن میں آئے اور اپنی قسمت کے مطابق اس احسان عام سے بہرہ اندوز ہوئے (ج ۲ ص ۰ ۱۵)

علم نوازی اور معارف پروری کی جو شاندار روایات آصفجاہی خاندان کے بانی نے قائم کیں انکو اس خاندان کے اور فرمانرواؤں نے اسی آب و تاب کے ساتھ برقرار رکھا چنانچہ اس دودمان عالی کے موجودہ فرمانروا اعلیٰ حضرت رفیع المنزلت سلطان العلوم شاہ دکن میر عثمان علی خان بہادر خلد اللہ ملکہٗ و سلطنتہٗ کے فیض عام سے آج بھی حیدرآباد دکن علوم و فنون کا منبع اور مخزن ہے،

امیر الامراء سید حسین علی خان کی شعر فہمی اور تاریخ دانی مشہور تھی، اسکے یہاں معمول تھا فجر کی نماز کے بعد ارباب کمال اس کے پاس جمع ہو کر علمی گفتگو کرتے تھے، اس وقت کسی کو کسی اور کام کیلیے اسکے پاس آنے کی اجازت نہیں ہوتی تھی [۱]

آصفجاہ اور امیر الامراء دونوں علامہ سید عبد الجلیل واسطی بلگرامی [۲] کو بہت محبوب اور عزیز رکھتے تھے، علامہ موصوف فارسی، عربی، ترکی، سنسکرت اور بھاشا کے فاضل اجل تھے، اور اپنے ذاتی تقدس، وجاہت عالیہ اور علمی کمالات کے لحاظ سے ایک نمونۂ عزت و وقعت سے یاد کئے

---

[۱] مآثر الکرام ج ۲ ص ۱۵۱ ۔ [۲] علامہ سید عبد الجلیل واسطی بلگرامی کے حالات مآثر الکرام جلد ۲ میں ملینگے، علامہ موصوف نے فرخ سیر کے یہاں بھی وقائع نگاری کی، ایکبار لشکر میں ژالہ باری ہوئی، ژالے کچھ بیٹھے تھے، علامہ بلگرامی نے یہ بات لکھکر فرخ سیر کی خدمت میں گذرانی

چرخ سیاران شہنشہ بابرکات | چرخ از ادب داد نثار شیرین حرکات

در سند زمین عہد عشرت مہدش | بارید سحاب ریزہ قند و نبات

فرخ سیر کی جب شادی راجہ اجیت سنگھ راٹھوڑ سے ہوئی تو علامہ موصوف نے اس جشن پر ایک مثنوی کہی، مگر یہ مثنوی فرخ سیر کے پاس نہ پہنچ سکی، مآثر الکرام ص ۲۷۵ میں اس مثنوی کے کچھ اقتباسات ملیں گے،

جاتے ہین، امیرالامرا سید حسین علی خان سے ان کے تعلقات کا حال صاحب مآثر الکرام کے الفاظ میں ملاحظہ ہو۔

امیرالامرا سید حسین علی کہ بالیشان التفتے خاص داشت و اکثر در مجالس خود برملامی گفت کہ میر عبدالجلیل درین عصر نظیر ندارند و لوازم احترام فوق الحد تبقدیم می رسانند۔[۱]

علامہ موصوف آصفجاہ کے حضور مین نواب امین الدولہ کی وساطت سے پیش کیے گئے تو نواب آصفجاہ نے ان کا بڑا اعزاز کیا، اور ان کو اپنے برابر جگہ دی، جب قصیدہ نظر سے گذرا تو شمع منگوا کر اسے سنانے کی فرمایش کی، ایک ایک بیت کو نہایت غور سے سنا اور تعریف و تحسین فرمائی، قصیدہ سنکر نقد، خلعت اور اسپ نذر کیا، علامہ مرحوم نے حسب ضابطہ قدیم اس انعام کو قبول نہین کیا۔[۲]

علامہ موصوف کو بھی ان دونون سے بڑی شیفتگی تھی، آصفجاہ کی شان مین جو قصیدہ لکھا اس مین اپنی عقیدت کا اظہار اس طرح کرتے ہین:

نظام ملت و ملک افتخار اہل کرم ۔۔۔ قوام دین و دول آفتاب مجد و علا

چو او ندیدہ امیری مہذب الاخلاق ۔۔۔ بعینک مہ و مہرین سپہر پشت دوتا

مثال روح مصور بود بپاکی ذات ۔۔۔ نشان عقل مجسم بود بفہم و ذکا

صفائی آئینہ رای او بود چندان ۔۔۔ کہ می نماید از و آنچہ رود بفردا

کرم ز دست گہربار او بود ممنون ۔۔۔ ظفر بتیغ جبین کار او بود شیدا

ہزار شکر کہ مسند وزارت یافت ۔۔۔ ہمان کہ یافت تن عاذرا از دم عیسیٰ

ملائک از پے آمین این دعا شدہ اند ۔۔۔ برنگ نرگس و گل چشم و گوش فوق سما

---

[۱] مآثر الکرام دفتر ثانی ص ۲۶۳ ، [۲] ایضاً ص ۱۹۲

ہمیشہ بہر دو زہم شاد و کامران باشند ... وی از وزارت واز وی وزارت اعلیٰ[۱]

امیر الامراء کے قتل سے علامۂ موصوف نے سینہ فگار ہو کر جو خونچکاں ماتم کیا ہے، وہ ملاحظہ ہو:

آثار کربلاست عیان از جبین ہند ... زد جوش خون آل نبی از زمین ہند
شد ماتم حسین علی تازہ در جہان ... سادات گشتہ اند مصیبت نشین ہند
نیلی است زین معاملہ پیراہن عرب ... در خون گرفتہ سرخ شد است آستین ہند
گیتی چرا سیاہ نگردد ز دود غم ... خاموش شد چراغ نشاط آفرین ہند
ہند این چنین مصیبت عظمیٰ ندیدہ است ... ویدیم داستان شہور و سنین ہند
از داغ دل زدند چراغان اشک جوش ... این است نوبہار گل آتشین ہند
ماہی در آب می طپد و مرغ در ہوا ... از شیون عظیم امیر مہین ہند
ہند از شہادتش تن بے روح گشتہ است ... یعنی کہ بود او نفس واپسین ہند[۲]

فرخ سیر کے درباری امراء میں مرزا عبد المعالی عالی وزارت خان بھی شعر و شاعری میں طبع آزمائی کرتا تھا، گرامی تخلص رکھتا تھا، ماثر الامراء میں ہے

"وزارت خان متخلص بہ گرامی بحسنات شگرف سر آمد اوان بود، طبع موزون داشت،

صاحب دیوان است این شعر از و مشہور

تا قافلہ سالار جنون فال سفر زد ... دیوانۂ ما دامن صحرا بکمر زد"[۳]

محمد شاہ محمد شاہی عہد میں سادات کے قتل کے بعد خانہ جنگیوں کی کمی نسبتۃً ضرور رہی، لیکن اس کے طویل زمانہ میں وہ تمام سامان ایک ایک کر کے جمع ہونا شروع ہو گئے، جو ایک عظیم الشان سلطنت کو نیست و نابود کرنے کے لیے ضروری ہیں، دربار میں اکبری اولوالعزمی کے بجائے

---

[۱] کاہواکرام دفتر ثانی ص ۱۸۲، [۲] ص ۱۶۳، ۱۶۲۷۳، ۱۲۷، [۳] ماثر الامراء ج ۱ ص ۳۶۴۔

شمشیر و پیمانہ کی پرستی تھی، شاہجہانی شوکت و حشمت کی جگہ حسرت و یاس کی تصویر تھی، اور عالمگیری جاہ و جلال کی جگہ بے بسی اور بیکسی کا عبرتناک منظر تھا، بادشاہ وقت اپنے امرا اور درباریوں کا ایک آلۂ کار ہو کر رہ گیا تھا، خود غرض امرا میں نیت کی پاکیزگی تھی نہ مقصد کی یکجہتی، رہی سہی قوت نادر شاہ کی خونریزی، مرہٹوں کی غارتگری اور روہیلوں کی سرکشی سے جاتی رہی، تیموریوں کی عظیم الشان حکومت کی بساط اب الٹنے کو تھی، صدیوں کا لگایا ہوا چمن ہمیشہ کے لیے ویران ہونے کو تھا، اور ایک شاندار تہذیب و تمدن کا شیرازہ بکھرنے والا تھا،

سلطنت کا دبدبہ اور حکومت کی شوکت تو جاتی ہی رہی، مغلیہ سلاطین اپنی زبان بھی کھو بیٹھے، دربار اور بازار میں فارسی کے بجائے اب ہندوستانی زبان کا اثر و اقتدار تھا، ایک حکمران قوم کے ہاتھ سے جب دولت گئی، حشمت گئی، اور زبان بھی گئی تو پھر اس کے مٹنے میں کیا دیر تھی، صرف وقت کا انتظار تھا،

محمد شاہ نے فارسی زبان کے بجائے ہندوستانی زبان میں اپنے علمی ذوق کا اظہار کیا، بارہ ماسہ اور گیت، کہانی دو تصنیفیں اس کے نام سے منسوب ہیں، اس نے ہندوستانی زبان میں طبع آزمائی بھی کی ہے، اشعار ملاحظہ ہوں:-

پیری میں نہ کس طرح کروں سیر جہاں کی — دن ڈھلتے ہی ہوتا ہے تماشا گذری کا

کھول کر بند قبا دل کے تئیں مار لیا — کیا ہمارا تلف لہر نے کھلے بندوں لیا

خوف کا پیچ کے یاں اس سے لرزاں نہ کرو — زلف کا نام نہ لو اور پریشان نہ کرو

مندرجہ بالا اشعار کی زبان کتنی صاف ہے، یہ وہ زمانہ ہے جب ہندوستانی زبان دکن سے شاہجہان آباد آگئی تھی، ولی دکنی دکن سے دہلی آئے تو ان کی شاعری کا غلغلہ ہر طرف پھیلا، محفلوں میں ان ہی کی غزلوں کا چرچا ہوتا، ارباب نشاط ان ہی کی غزلیں گاتے سنتے اور سر

رہتے تھے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فارسی کے کہنہ مشق اساتذہ بھی ریختہ میں طبع آزمائی کرنے لگے، چنانچہ قزلباش خان امید، مرزا عبد القادر بیدل، سراج الدین علی خان آرزو، مرزا علی قلی خان ندیم، اور مرزا مرتضیٰ قلی فراق جیسے باکمال فارسی شعراء نے بھی ریختہ میں شعر موزون کیے ہیں[1]، یہی نہیں بلکہ تھوڑے دنوں کے اندر درباروں، مجلسوں اور بازاروں میں فیضی، نظیری، عرفی، طالب، قدسی، صائب اور کلیم کے بجائے مظہر، سودا، میر، درد، انشاء، ذوق، مومن اور غالب کی زمزمہ سنجیاں اور نغمہ سرائیاں فردوس گوش ہونے لگیں، شعراء اپنی تمام جولانیاں ہندوستانی زبان میں دکھلانے لگے، مگر شراب وہی تھی صرف شیشہ وساغر بدل گئے تھے،

محمد شاہ کا عہد اس لحاظ سے نہایت ممتاز تھا کہ اس میں بڑے بڑے ارباب فضل وکمال جمع ہو گئے تھے، فارسی شعراء میں قزلباش خان امید، سلیمان قلی خان داؤد، علی قلی خان ندیم، شیخ سعد اللہ گلشن، مرتضیٰ قلی خان فراق، میر شمس الدین فقیر، مرزا عبد القادر بیدل، سراج الدین علی خان آرزو، فائز، شہرت، صائب، مخلص، ریختہ گویوں میں نواب عمدۃ الملک نواب عنایت خان راسخ، نواب محمد شاکر خان شاکر، خان عالیشان جعفر علی خان، خواجہ ناصر عندلیب، شاہ حاتم، میر ضاحک، میاں عبد الحئی تاباں، جعفر زٹلی، مرزا مظہر جان جاناں، اور ہندی شعراء میں اعظم خان، دیوی کہو کی، صورت مسر، وغیرہ موجود تھے، یہاں ہم صرف ان شعراء کا ذکر کریں گے جن کا تعلق براہ راست محمد شاہ کے دربار سے تھا،

انجام، امیر خان نام اور نواب عمدۃ الملک خطاب، نواب امیر خان عالمگیری کا لڑکا تھا، شعر وشاعری اور لطیفہ گوئی میں ستھرا مذاق رکھنے کی وجہ سے محمد شاہ کے نہایت محبوب ہم جلیسوں میں تھا، تذکرۂ گلزار ابراہیم میں نواب موصوف کا ذکر اس طرح ہے،

---

[1] ان کی ریختہ گوئی کی مثال گلشن ہند مصنفہ مرزا علی لطف میں ملاحظہ ہو،

اس عالی دودمان کو شاہ عالم پناہ محمد شاہ سے ایسی صحبت برآمد ہوئی تھی کہ رشک تھا، ان سب ارکان دولت کو اور اعیان مملکت کو حسد تھا، لطیفہ گوئی کی طرف ان کی طبیعت نہایت مصروف تھی، اور خوش طبعی سے مزاج بہ شدت مالوف، گردش چشم کے سمجھنے میں زمانے کے استاد تھے، اور شیرین کلامی میں اپنے وقت کے فرہاد، موجد ناز و انداز کی تہ داریوں کے، اور اختراع کرنے والے چتون کی جادو کاریوں کے، لگانے میں دخل ایسا تھا کہ استاد اس فن کے دم شاگردی کا مارتے تھے، اور تاویدکی باتوں میں بڑے بڑے گیانی ان کے آگے جی ہارتے تھے، بادشاہ کو ایسا اپنی طرف مصروف کر لیا تھا کہ ایک دم کی جدائی ان کی جہان پناہ کو شاق تھی، اور آٹھ پہر طبیعت انکی طرف مشتاق تھی؛[۱]

سنہ ۱۱۵۲ھ میں شاہی دربار کی سازشوں سے قتل ہوا، فارسی اور ہندوستانی دونوں زبانوں میں طبع آزمائی کرتا تھا[۲] اس کا دربار شعرا کا مرجع بنا ہوا تھا، بذلہ سنجیوں کی محفلیں برابر گرم رہتی تھیں، زمانے کے باکمال ارباب سخن اس کے یہاں جمع ہوتے، نواب عنایت خاں راسخ احمد نواب محمد شاکر خاں شاکر، پانی پت سے آکر شریک بزم ہوتے، شرف الدین مضمون، خواجہ ناصر عندلیب شاہ حاتم، میر ضاحک اور ہندی زبان کے شعرا میں آنند گھن، دیوی کوی اور صورت مسر بھی نواب

---

[۱] گلزار ابراہیم (انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد، ص ۱۲ تذکرۂ میر حسن میں ہے :-

"نواب امیر خان از امرائے عظام و ظرفائے عالی مقام نواب عمدۃ الملک خوش طبع و شیرین کلام از مقربان درگاہ فردوس آرام گاہ بود، لطائف و ظرائف او مشہور و معروف است، (ص ۵۴، مسلم یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ، علی گڑھ)۔

[۲] ریختہ کے اشعار گلزار ابراہیم میں ملاحظہ ہوں،

موصوف کی علم پرور صحبتوں سے مستفید ہوتے تھے، میر محمد شاکر ناجی نواب کے نعمت خانہ کے داروغہ تھے،[۱] بندرابن خوشگو نے سفینۂ خوشگو اور تذکرۃ المعاصرین لکھکر اس کی سرکار میں پیش کیں، اس نے پوری قدردانی کی اور دو روپیہ روزینہ وظیفہ مقرر کیا،[۲]

انجام کی اردو شاعری کے نمونہ میں ہم اسکی صرف ایک غزل ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں،

کیوں بلایا پھر مجھ سے کیا مجھ سے نادانی ہوئی — دختر رز بزم میں آ شرم سے پانی ہوئی
کل محیط عشق کے صد موج پانی تھی تنجا — کشتی دل بے طرح کچھ آج طوفانی ہوئی
ہر پری تمثال جوں آئینہ رکھتا تھا عزیز — ٹوٹتے ہی دل کے مجھ کو سخت حیرانی ہوئی
کیا کہوں انجام میں اس عشق کے آغاز کو — دوستداروں کو محبت دشمن جانی ہوئی
نعش میری دیکھ کے مقتل میں یوں کہنے لگے — کچھ تو یہ صورت نظر آتی ہے پہچانی ہوئی[۳]

خان عالیشان جعفر علی خان، مرزا مومن بیگ کا لڑکا تھا، ذہین، ذکی اور بڑا طباع شاعر تھا محمد شاہ نے سہ ہزاری منصب پر سرفراز کیا، محمد شاہ کی فرمائش پر مثنوی حقہ لکھنی شروع کی لیکن ناکمل رہ گئی، جس کو میاں حاتم نے پورا کیا،[۴] کلام کا نمونہ تذکرہ میر حسن میں مل سکتا ہے،

شیخ حسین شیرازی شہرت عربی النسل تھا، لیکن ایران میں نشو و نما پائی، عالمگیر کے عہد میں ہندوستان آیا، محمد اعظم کا طبیب مقرر ہوا، فرخ سیر نے حکیم الملک کا خطاب دیا، محمد شاہ کے عہد میں چہار ہزاری منصب سے سرفراز ہوا،[۵] ۱۱۴۹ھ میں وفات پائی، پانچہزار اشعار کا ایک فارسی دیوان چھوڑا، اس کے کچھ اشعار یہ ہیں:

زمن شہرت تمنا دارم و نے نام می خواہم — فلک گردا گزارد یک نفس آرام می خواہم
نالہ پنداشت کہ در سینہ ما جا تنگ است — رفت و برگشت سراسیمہ کہ دنیا تنگ است

---

[۱] گل رعنا ص۱۰۱، [۲] معارف نمبر ۴ ج ۳۰ ص۲۹۰، [۳] گلزار ابراہیم ص۱۴۱، [۴] تذکرہ میر حسن ص۷۴، [۵] مآثر الکرام دفتر ثانی ص۲۰۱

اے گل سیر کوی تو جدا از وطنم کرد — من خار تو بودم کہ بیرون از چمنم کرد

صبح شو تا در فرصت از عالم بگذرد — یکنفس دم را غنیمت دان کہ این ہم بگذرد[1]

مصطفیٰ قلی خان یکرنگ تذکرہ میر حسن میں ہے،

در گلشن بہار سخن آب و رنگ و در چمن گلزار معانی بلبل خوش آہنگ مصطفیٰ قلی خان المتخلص بہ یکرنگ از عمدہ بود، در عہد فردوس آرام گاہ نبیرہ خان جہان بود و گاہی در سلک ملازمان شاہی منسلک بود،[2]

اردو میں یکرنگ کے کلام کا رنگ یہ ہے،

ہاتھ اٹھا جور اور جفا سے تو — یہی گویا سلام ہے تیرا

اسقدر کیا ہے عداوت غیر کی — ہم بھی تو تم سے کبھی تھے آشنا

وصل اور ہجر اس صنم کا مجھ پہ یکساں ہو گیا — ورد میرا ہی لگے آخر کو درماں ہو گیا

مجھکو اس دل سے توقع تھی مدد کی وقت پر — تیر خوباں کا تو وہ یکرنگ سے پیکاں ہو گیا

نہ کہو یہ کہ یار جاتا ہے — میرا صبر و قرار جاتا ہے

گر خبر لینی ہے تو لے صیاد — ہاتھ سے یہ شکار جاتا ہے

رائے آنند رام مخلص۔ آنند رام سودھرہ ضلع سیالکوٹ میں ۱۱۱۱ھ میں پیدا ہوا، اس کی کئی پشتیں مختلف تیموری امرا کے درباروں سے بسلسلۂ ملازمت منسلک رہیں، تعلیم پا کر آنند رام محمد شاہ کے وزیر نواب اعتماد الدولہ قمر الدین اور اس کے چچازاد بھائی سیف الدولہ عبد الصمد خان کا وکیل دربار مقرر ہوا،[3] اس لیے شاہی دربار تک بھی اس کو توسل تھا، اور وہاں سے اسکو

---

[1] آثر و افکار اسلم جلد ۲ ص ۲۰۳ [2] تذکرہ میر حسن ص ۲۱۶ [3] خزانۂ عامرہ میں لکھا ہے،

و سے از اعیان کھتریان رست پیشہ و وکالت نواب اعتماد الدولہ قمر الدین خان بہادر و نواب سیف الدولہ عبد الصمد خان ناظم صوبہ لاہور و ملتان دکن بود و در حضور محمد شاہ بادشاہ بخطاب رائے سرفرازی داشت،

رائے رایان کا خطاب ملا، مگر اس کی امتیازی حیثیت خود اس کی علمی صلاحیتوں کی وجہ سے ہے، اور اس کا شمار ان چیدہ ہندوؤں میں کیا جاتا ہے جو فارسی علوم و فنون کے بڑے دلدادہ اور شیدائی تھے، وہ مرزا بیدل کا تو شاگرد تھا ہی، اس عہد کے تمام شعراء سے بھی اسکے گہرے تعلقات تھے خصوصاً خان آرزو سے اس کو بڑی عقیدت تھی، اور اسی کی مساعی جمیلہ سے خان آرزو کو شاہی دربار سے منصب، جاگیر اور خطاب ملا، اس کے گھر پر اہل علم مثلاً آرزو، محمد قلی خان، مہتی یا سب خان، شاعر راؤ کرپا رام، فتح سنگھ وغیرہ کی مجلسیں برابر منعقد ہوتی تھیں، ان صحبتوں میں اس کے علمی ذوق کی جلا خوب ہوئی، اپنے نام کو زندہ اور روشن رکھنے کے لیے اس نے متعدد تصانیف چھوڑیں، مثلاً (۱) گلدستۂ اسرار، اس میں وہ خطوط تھے جو نادر شاہ کابل کے صوبہ دار کو لکھے تھے، انکو انشاء ام کے ذریعہ سے وزیر اعظم محمد شاہ کے حضور میں پیش کرتا تھا، (۲) بدائع وقائع میں تاریخی واقعات ہیں، خصوصاً نادر شاہ کے حملہ کا ذکر ہے، اس کتاب کو تذکرہ کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے، ایلیٹ نے جلد ہشتم میں اس سے کچھ اقتباس لیا ہے (۳) مرأۃ اصطلاحات، یہ کتاب فارسی الفاظ، محاورات اور اصطلاحات کی ایک فرہنگ ہے جس سے بعض تاریخی، معاشی اور صنعتی معلومات بھی حاصل ہوتے ہیں، (۴) رقعات مخلص، ان میں سے بعض خطوط ادبی اور تاریخی حیثیت سے مفید ہیں (۵) سفرنامہ، اس میں محمد شاہ کے محاصرہ بنگرہ کے واقعات کی تفصیل درج ہے، اس مہم میں آنند رام مخلص اپنے ولی نعمت نواب قمر الدین خان اعتماد الدولہ کے ہمرکاب تھا، اس نے اس سفر کا حال بطور روزنامچہ مرتب کیا تھا، جس سے بہت سی اہم باتیں خصوصاً تیموری حکمرانوں کے آخری دور کے طریق جنگ سے متعلق مفید معلومات حاصل ہوتے ہیں، پھر اس عہد کی بہت سی تاریخی شخصیتیں بھی متعارف ہو جاتی ہیں[1]، (۶) پری خانہ، یہ شاید ایک

---

[1] اس کتاب کو ڈاکٹر سید اظہر علی صاحب ایم اے پی ایچ ڈی (کنشٹپ) صدر شعبۂ عربی و فارسی، اردو پ... (باقی حاشیہ ص ۳۱۲)

مرقع کا دیباچہ ہے جس میں مشہور خوشنویسوں کی خطاطی کے نمونے تھے، (۷) چمنستان، حکایات و اقوال کا مجموعہ ہے۔ (۸) ہنگامۂ عشق، یہ کنور سندر سین اور رانی چندر پربھا کے عشق و محبت کا ایک قصہ ہے۔ (۹) کارنامۂ عشق، یہ شاہزادہ گوہر اور ملکہ ملوکات کے حسن و عشق کی کہانی ہے، (۱۰) روزنامچہ احوال، (۱۱) رباعیات، (۱۲) دیوان،

مخزن الغرائب میں مخلص کے بہت سے اشعار درج ہیں، جن میں سے ہم بھی کچھ یہاں پیش کرتے ہیں،

تاج بر سر ہیچ قیس از داغ سودائیم ما | قہرمان کشور ویرانِ صحرائیم ما
دیدہ ایم غزالے دو سر مشغول زیارت | افتادہ چو بر تربت مجنون گذر ما
بگلشن چند سروی دیدم و فریاد سر کردم | کہ یادم داد رنگین صحبت یاران موزونی
تا جستیم مخلص بسر رسم از شہر دل | ہر کجا جنس وفا باشد خریدائیم ما
عیاذ زائے محبت باز چو من ناتوانی را | غریبی در منیدی بکسی آزردہ جانی را
قصۂ کوہکن بیہودہ گویا | بودے خونِ امداد فسانۂ ما

مخلص کے کچھ اردو اشعار بھی ملاحظہ ہوں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۱۳) دہلی یونیورسٹی نے بڑی کاوش و محنت سے اڈیٹ کر کے سلسلۂ مطبوعات کتب خانۂ رامپور سے شائع کیا ہے، اس میں آنندرام مخلص کے سوانح حیات اور اسکی تالیفات پر بہت ہی سیر حاصل تبصرہ کیا ہے، ڈاکٹر سید عبداللہ ایم اے ڈی لٹ نے اپنی کتاب ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ میں آنندرام مخلص کی تصانیف پر پر مغز بحث کی ہے ہم انہی دونوں کتابوں کی مدد سے مخلص کی تالیفات کی فہرست دی ہے،

۵ مخزن الغرائب قلمی نسخہ دار المصنفین ورق ۱۲۱ اس کے ریختہ کے اشعار تذکرہ میر حسن اور گلزار ابراہیم میں ملاحظہ ہوں،

یون پکارے ہے کھڑا گلشن مین سرو ناز کیسی | پوچھو قمری کہ کیا آزاد جاتی ہے بہار
پھول پر نرگس کے گویا وہ نہ شبنم ہین | عاشقون کے حال پر آنکھیان بھر آتی ہین
دھوم آونے کی کس کے گلزار مین پڑی ہو | ہاتھ ار رستے کا پیالہ نرگس لیے کھڑی ہے[۱]

لال رام: باپ کا نام رائے دوبہ رام تھا، اس کا دادا رائے گھمن عالمگیری ملازمون مین تھا،

لال رام محمد شاہ کی سرکار مین نوکر تھا، ۱۱۳۷ھ مین تحفۃ الہند ایک مستند تاریخی کتاب لکھکر بادشاہ کی
مین تحفہ پیش کی،[۲] یہ فرخ سیر کے عہد تک ہندوستان کی ایک مختصر تاریخ ہے، ایران کے ابتدائی
دور کے بادشاہون کے بھی کچھ حالات درج کئے گئے ہین،

محمد شاہ کا علمی کارنامہ علم ہیئت سے متعلق ہے، یہ کارنامہ اس کے درباری پنڈت راجہ
جے سنگھ کچھواہا کے حسن ذوق اور مساعی جمیلہ سے تکمیل کو پہنچا، جے سنگھ عالمگیر اور اس کے جانشینون
کے عہد مین فوجی خدمت کے لئے ممتاز تھا، محمد شاہ کے عہد مین آگرہ اور مالوہ کا گورنر مقرر ہوا،
جے سنگھ ایک کامیاب فوجی افسر اور باوقار حاکم ہونے کے علاوہ علم و ہنر کا بھی سرپرست تھا،
عربی علوم و فنون مین خاص دستگاہ رکھتا تھا، علم ہیئت سے اس کو بڑی دلچسپی تھی، اس نے

۱؎ چمنستان شعرا از لچھمی نراین شفیق ص ۲۴۶، مخزن شعر گلزار ابراہیم ص ۲۱۶ مین اس طرح ہے،

آنے کی دھوم کس کی گلزار مین پڑی ہے | ہاتھ ار رستے کا پیالہ نرگس لیے کھڑی ہے،

۲؎ معارف نمبر ۴ جلد ۳۹، محمد شاہ کی علم نوازی کا پتہ اس سے بھی چلے گا کہ ایک بار اس نے نواب اعتماد الدولہ
قمر الدین خان کو مرزا مظہر جان جانان کے پاس بھیجکر کہلا بھیجا، کہ اتنا بڑا ملک خدا نے مجھکو دیا ہے، اس مین
جو کچھ چاہیے قبول فرمائیے، لیکن مرزا صاحب کے استغنا کا یہ حال تھا کہ سنکر فرمایا قل متاع الدنیا قلیل
خدا نے ہفت اقلیم کو قلیل فرمایا ہے، پھر ایک اقلیم مین سے ایک ولایت آپ کے تصرف مین آئی ہے،
کتنی ہے کہ فقیر اس کی طرف طمع کا ہاتھ بڑھائے، (ذکر دہلی، صفحہ ۱۳۷)

الغ بیگ کی زیچ جدید، ملا چاند اکبری کی تسہیلات، اور ملا فرید شاہجہانی کی زیچ شاہجہانی کے اصول پر زیچ محمد شاہی ترتیب دے کر بادشاہ کے حضور میں پیش کی، اس فن سے محمد شاہ کی دلچسپی اور شغف کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے حکم سے مسلمان، برہمن اور فرنگی علمائے ہیئت جمع کیے گئے، اور ۱۱۳۷ھ میں دلی میں ایک جدید رصد خانہ کی تعمیر شروع کی گئی، مرزا خیر اللہ مہندس اس کا مہتمم تھا، اس رصد خانہ میں بعض آلات ایسے تھے، جو سمرقند کے الغ بیگی رصد خانہ میں استعمال کیے جا چکے تھے، اور بعض خود راجہ مذکور کے ایجاد کیے ہوئے تھے[۱]۔

راجہ نے اس غرض سے کہ رصد خانہ کی تمام تحقیقات صحیح ہوں اور ان کی تصدیق ہوتی جائے، دلی کے رصد خانہ کے نمونے پر جے پور، متھرا، بنارس اور اجین میں بھی رصد خانے بنوائے، ان رصد خانوں میں ہندو مسلمان، اور فرنگی علمائے ہیئت نے سات برس تک کام کیا، یہی نہیں بلکہ کچھ لوگ پادری منوئیل کی معیت میں یورپ گئے، اور وہاں سے جو معلومات اور تحقیقات حاصل ہوئیں، ان کا مقابلہ یہاں کے اصولوں سے کیا گیا، پھر ان تحقیقات سے زیچ محمد شاہی تیار کی گئی جو تین مقالات پر مشتمل ہے، اول در معرفت سنین، دوم در معرفت طالع ہر وقت، سوم در معرفت رفتار سیارات و ثوابت[۲]، اس سلسلہ میں راجہ مذکور نے مزید قابل قدر خدمت یہ انجام دی کہ عربی زبان کی مستند علم ہیئت کی کتابوں کا ہندی ترجمہ کرایا، اور اس پر ہزاروں روپے صرف کیے[۳]۔

محمد شاہ کے بعد مغلیہ سلطنت کی مدت گننے کو تو ایک سو برس اور رہی، لیکن دلی کی حکومت بقول آزاد ایک ٹوٹی پھوٹی ہوئی درگاہ تھی جس کے پانچ اور سجادہ نشین ہوئے،

۱؎ ملاحظہ ہو علامہ سید سلیمان صاحب ندوی کا مضمون "مسلمانوں کے عہد میں ہندوؤں کی علمی و تعلیمی ترقی" (معارف نمبر ۵ ص ۳۲۹) ۲؎ ایضاً نیز دیکھو فہرست مشرقی کتب خانہ پٹنہ، جلد یازدہم ص ۶۹، ۳؎ ملاحظہ ہو علامہ سید سلیمان صاحب کا مضمون تھا۔

احمد شاہ | محمد شاہ کے بعد احمد شاہ تخت پر بیٹھا، اردو کے مشہور شاعر اشرف علی فغاں احمد شاہ کے رضاعی بھائی اور ندیم خاص تھے، احمد شاہ ان کی لطیفہ گوئی، بذلہ سنجی اور حاضر جوابی کا بے حد مداح تھا، اس لیے ظریف الملک کوکہ خاں بہادر کا خطاب عطا کیا، احمد شاہ کی معزولی اور قید کے بعد فغاں نے دہلی چھوڑ دی اور مرشد آباد چلے گئے، فغاں کو احمد شاہ سے نہ صرف محبت بلکہ عشق تھا، اس لیے محبوب کی یاد اور جدائی میں آنسو بہاتے ہوئے لکھتے ہیں :-

جہاں میں میرا ایک دلدار تھا — اسی سے مجھے تو سروکار تھا
نہ کچھ کام تھا مجھکو گلزار سے — نہ واقف تھا ہرگز گل و خار سے
نہ سمجھوں تھا بلبل کے فریاد کو — نہ جانوں تھا میں جور صیاد کو
نہ معلوم تھا مجھکو شمشاد بھی — سنا تھا نہ میں قیس ناشاد بھی
اگر ان کا کچھ درد پاتا تھا میں — تو کاسہ کو خاطر میں لاتا تھا میں
مجھے دردمندوں سے کیا کام تھا — سدا وصل کے بیچ آرام تھا
جب اس یار یوسف کو دیکھا تھا میں — تو یوسف کو قربان کرتا تھا میں
اسی کو میں کہتا تھا یہ ماہتاب — وہی تھا مرا مہر عالمتاب
میں پوچوں تھا نت اس صنم کے تئیں — نہ سجدہ کروں تھا حرم کے تئیں
وہی ماہ تھا اور وہی شاہ تھا — غرض کچھ ہی تھا، میرا اللہ تھا
سدا سیر کرتے تھے گلزار کے — کہیں طبع خوش ہو مرے یار کے
اگر اتفاقاً وہ نازک مزاج — چلے تھے وہاں سے تو ہیں لا علاج
یہ کہتا تھا وہ دستگار کے — نہ چھوڑا اس نے تو گلزار کے
اسے دیکھ کر شوق نرگس کا حال — کہ حسرت رہ گئی ہے آنکھیں نکال

حق طفلان کہ ز سی سال فراہم کردند — کردہ تاراج نمودند سبکساری ما

عہد و پیمان عیان دادہ نمودند وفا — محلیان خوب نمودند وفاداری ما

شیر دادیم بہ افعی بچہ پروردیم — عاقبت گشت بجز پئے خونخواری ما

قوم افغان و مغلیہ ہمہ بازی دادند — بسکہ گشتند بجز گرفتاری ما

این گداز دہ ہمدان کہ بہ دوزخ بردند — بانی جور و ستم شد بہ دل افگاری ما

گل محمد کہ ز مردان بہ شرارت کم نیست — چہ قدر کرد دکالت پئے آزاری ما

نامراد و سلیمان و بدل بیگ لعین — ہمہ بستند کمر بہر گرفتاری ما

شاہ تیمور کہ دارد سر نسبت با من — زود باشد کہ بیاید بہ مددگاری ما

مادہوجی سندھیہ فرزند جگربند من است — ہست مصروف تلافی ستمگاری ما

آصف الدولہ و انگریز کہ دستور من اند — چہ عجب گر بنمایند مددگاری ما

راجہ و راو زمیندار امیر و فقیر — چیست باشد کہ نسازند بہ غمخواری ما

نازنینان پری چہرہ کہ ہمدم بودند — نیست جز محل مبارک بہ پرستاری ما

گرچہ بالا ز فلک امروز حوادث دیدیم — باز فردا دہد ایزد سرداری ما

ان اشعار سے ظاہر ہے کہ شاہ عالم سخن گوئی میں کافی مہارت رکھتا تھا، اسکا تخلص آفتاب تھا، فارسی اور ہندوستانی دونوں زبانوں میں اشعار موزوں کرتا تھا۔ محمد حسین آزاد لکھتے ہیں کہ وہ بڑا مشتاق شاعر تھا جس کے چار دیوان اردو میں موجود ہیں[1] لیکن انڈیا آفس کے کتبخانہ میں ایک ہی جلد ہے[2]، پیرس، میونخ، برلن[3] اور اسپرنگر[4] کی فہرستوں میں بھی ایک ہی کا ذکر ہے۔ انڈیا آفس لائبریری کے دیوان میں شاہ موصوف کی ایک مثنوی موسوم بہ

[1] آب حیات ص ۱۴۳، [2] ملاحظہ ہو انڈیا آفس لائبریری کیٹلاگ نمبر ۹۳۴، [3] رفضہ ۶۲۶

[4] ایضاً ص ۳۱۸۔

"منظوم اقدس" بھی شامل ہے، جس میں شاہ جہاں مظفر شاہ کا قصہ ہے، مولوی ذکاء اللہ کا بیان ہے، کہ شاہ عالم نے نثر میں چار جلدوں میں ایک قصہ بھی لکھا ہے، جس سے ہر زمانے کے ادنی، متوسط اور اعلیٰ آدمیوں کا طرز معاشرت معلوم ہوتا ہے، اس کا نام "شاہ عالم کا قصہ" ہے[1]

شاہ عالم نے اپنے عہد کے تمام ممتاز شعراء مثلاً سودا، میر، درد، نصیر، انشاء، آزاد، مصحفی، احسان، قائم، اور فراق سے کچھ نہ کچھ ضرور واسطہ رکھا، جہاں دہلی کے تمام شعراء جمع ہو کر اپنی جولانی طبع دکھاتے تھے، وہاں شاہ عالم اپنی غزلیں بھیجا تھا، سودا کو اپنا کلام دکھاتا تھا، خواجہ میر درد کے یہاں محفل سماع میں شرکت کرنے کیلئے کبھی بار گیا[2]، ایک بار پاؤں میں درد تھا، ضبط نہ کر سکا، ذرا پاؤں پھیلا دیا، خواجہ صاحب اسکے متحمل نہ ہو سکے، فرمایا کہ یہ فقیر کے آداب محفل کے خلاف ہے، شاہ عالم نے عذر کیا، اور معافی چاہی، خواجہ صاحب نے فرمایا اگر طبیعت ناساز تھی تو تکلیف کرنے کی کیا ضرورت تھی[3]، سید انشاء اللہ خان انشاء کو خاص طور سے بہت محبوب رکھتا تھا، انکی ایک لمحہ کی جدائی اسکو گوارا نہ ہوتی تھی[4]، مگر عبرت کا مقام یہ ہے کہ جس کے اسلاف ایک ایک شعر کے صلہ میں شعراء کا منہ زر و جواہر سے بھر دیتے تھے اور انکو سونے چاندی میں تلواتے تھے، آج انکے وارث کے پاس اتنا بھی نہ تھا کہ اپنے محبوب شاعر کے بچوں کیلئے دودھ پینے کے لئے کچھ رقم دیتا[5]

شاہ عالم کی اردو شاعری کے نمونے ملاحظہ ہوں:

کیجیے ہمدم بھلا کیونکر نہ شکوہ یار کا — ہم تو بندے اس کے ہوں وہ آشنا ہو غیر کا

خانۂ دل کو جلایا اک نگہ سے اس نے آہ — ہو جیو یا رب بھلا اس چشم آتش بار کا

صاف کل انکھیں تری کہتی تھیں عاشق سے نگاہ — کر سکے عیسیٰ نہ اوا اپنے کب بیمار کا

خون ہو دیگا گلوں کو دیکھنا ہر گز صبا — نام مت لینا چمن میں اس بت خونخوار کا

کب تلک مشتاق بیٹھیں حشر میں طوبیٰ تلے — یاد آتا ہے دل میں جب سایہ تری دیوار کا

دیکھ کر گل بھی مری اون لگا کہنے طبیب — کوئی بھی جا نبر ہوا بیمار اس آزار کا

صرف کعبہ میں نہ کر اوقات کو ضائع تو شیخ — ڈھونڈتا جا کر ہر طرف نقش قدم دلدار کا

اسقدر افسردہ دل کیوں ان نوں آفتاب — دیکھ کر ہوتا ہے تجھ کو تنگ دل گلزار کا

۱۔ تاریخ ہندوستان ج ۹ ص ۳۱۱
۲۔ آب حیات ص ۱۸۲
۳۔ گل رعنا ص ۱۳۳
۴۔ " " ص ۱۶۱
۵۔ آب حیات ص ۲۸۳
۶۔ " " ص ۲۸۲

صبح تو جام سے گزرتی ہے　　شب دل آرام سے گزرتی ہے
عاقبت کی خبر خدا جانے　　اب تو آرام سے گزرتی ہے

ولہ

تصور ترا جس کو اسے یاد ہوگا　　اسے پھر سے کیا سروکار ہوگا
مرا لخت دل اشک میں ڈھونڈنا　　اسی قافلہ میں وہ سالار ہوگا
دیا دل تو ہے آفتاب اسکو لیکن　　خدا جانے کیا عاقبت کار ہوگا

ولہ

چھیڑنے کا تو مزہ ہے کہو اور سنو　　بات میں تم تو خفا ہو گئے لو اور سنو

ولہ

آئے جو خواب میں بھی دوپٹہ لگا کے منہ　　اے آفتاب دولت دیدار کیجئے
جوں شمع تا سحر شب فرقت میں آفتاب　　جلے انتظار مجھکو رلاتی ہے چاندنی
تری اس مانگ سے کیا معنی دیکھو آہ ہو پیدا　　شب معراج کی اس خط سے گویا راہ ہو پیدا
مدت سے اشتیاق ہے پیارے جو آسکے　　تعطیل رواق چشم میں سیریں دکھائیے[۱]

شاہ عالم ثانی پاچھے زبان کا بھی شاعر تھا، اور اپنے بیٹے ہی کلام کا مجموعہ "نادرات شاہی" کے نام سے مرتب کیا تھا جو اعلیٰ حضرت فرمانروائے رامپور دام اقبالہ کے حکم سے سلسلہ مطبوعات کتابخانہ عالیہ ریاست رامپور میں شائع ہو گیا ہے۔ اس کے شروع میں اردو زبان کے مشہور شیدائی علم و فن مولوی امتیاز علی خان عرشی کا مقدمہ اور دیباچہ بطور تعارف شامل ہے۔

[۱] یہ اشعار تذکرہ گلزار ابراہیم (انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد)، تذکرہ ہندی مصحفی اور گلشن ہند سے لیے گئے ہیں۔

بہادر شاہ ظفر

بہادر شاہ ظفر تیموری سلاطین کا خاتم ہے، وہ بادشاہ بنا لیکن حکمرانی کے لیے نہیں بلکہ اپنے اسلاف کی سطوت و عظمت کی یاد میں خون کے آنسو بہانے کے لیے، سلطنت ایک بیرونی قوم کے قبضہ میں جا چکی تھی، سکوں پر سے آل تیمور کا نام مٹ چکا تھا، بادشاہ محض ایک وظیفہ خوار کی حیثیت سے رہ گیا تھا، پھر بھی بادشاہ کہلاتا تھا، اس کی ساری بادشاہی قلعہ معلی کی چہار دیواری تک محدود تھی، جہاں نہ وہ سلطنت کے لیے فرامین صادر کرتا، اور نہ اعیان حکومت کی مجلسیں منعقد کرتا، بلکہ صرف دل کے پھپھولے توڑتا، اور جب وہ ٹوٹ کر بہ جاتے، تو اس کے سوز و گداز کا اظہار اپنے نالہائے موزون سے کرتا تھا، یہی وجہ ہے کہ اس کی آپ بیتی کو پڑھ کر دل پر جو اثر ہوتا ہے وہ اور شعراء کی جگ بیتی سے نہیں ہوتا، خود کہتا ہے:

اے ظفر یہ تیرے اشعار ہیں یا الہ زار   کیا بلا ہیں کہ جو یوں دل میں اثر کرتے ہیں

ظفر تاج و تخت کا گو نہیں لیکن اقلیم سخن کا بادشاہ ضرور تھا، جہاں اس نے اپنی ذہانت و ذکاوت اور طبیعت کی بے قراری کے ایسے جوہر دکھلائے کہ اگر وہ سیاسی امور میں انہی اوصاف کو کام میں لاتا تو کیا عجب تھا کہ وہ اپنی ظفریاب فوجوں کے ساتھ اغیار کے شہروں اور ملکوں پر اپنی فتح و کامرانی کا پرچم لہراتا نظر آتا، اور ایک کامیاب مدبر اور سیاستدان بھی ثابت ہوتا، لیکن نہ انتظام کی سرگرمیاں تھیں اور نہ رزم کی ہنگامہ آفرینیاں، لامحالہ ایک بے چین اور بے قرار ذہن کی تمام قوتیں ایک ہی طرف منتقل ہو گئیں اور وہ شعر و شاعری کا میدان تھا۔

ظفر کا دور ہندوستانی شاعری کا دورِ شباب تھا، نصیر، ذوق، ممنون، مومن، غالب، تسکین اور شیفتہ کی شاعری نے ریختہ کی زمین کو آسمان پر پہنچا دیا تھا، ان ہی اساتذہ کے ساتھ ظفر نے بھی طبع آزمائی کی، اور نمایاں حیثیت حاصل کی، نصیر نے ریختہ میں مضمون آفرینی کی بنیاد ڈالی، ذوق نے غزل کو زبان اور محاورات سے آراستہ کیا، مومن اپنی نازک خیالی اور شوخی ادا کے لیے ممتاز ہے، غالب کے طرزِ بیان، مسائل تصوف، اور نکات فلسفہ نے شاعری کو عرشِ معلی پر پہنچا دیا، مگر اس گروہ میں ظفر کی شاعری میں جو سلاست، صفائی، اور روزمرہ کی سادگی پائی جاتی ہے، وہ اسی کا حصہ ہے،

طرزِ سخن کا اپنے ظفر بادشاہ ہے ۔۔۔ اس کے سخن سے یاں نہ کسی کا سخن لگا

ظفر کلام میں تیرے عجب صفائی ہے ۔۔۔ کہ ہر سخن ترا در خوشِ آب سا چمکا

خدا نے وہ روانی دی ظفر تیری طبیعت کو ۔۔۔ ترا ہر شعر تر ہر بحر میں بحرِ المعانی ہے

ظفر شاعری سے طبعی مناسبت رکھتا تھا، ایامِ شاہزادگی سے زندگی کے اخیر دنوں تک شعر و سخن کی مشق کرتا رہا، ولی عہدی کے زمانہ میں دلی کے تمام باکمال شعراء مثلاً حکیم ثناء اللہ فراق، حافظ عبدالرحمٰن خان احسان، حکیم قدرت اللہ خان قاسم، میر قمر الدین منت، نظام الدین ممنون اس کے در دولت پر حاضر ہوتے تھے، ان کو اپنا کلام سناتا، اور ان سے ان کے نتائج فکر سنتا، سریر آرا حکومت ہوا، تو قلعہ معلی کے اندر بزم مشاعرہ منعقد کراتا، کبھی کبھی شہر میں جا کر مشاعروں میں شریک ہوتا، اپنی غزلیں پڑھتا، دوسروں کی سنتا، داد لیتا اور داد دیتا تھا، یہاں تک کہ اساتذہ فن میں شمار کیا جانے لگا تمام اربابِ نظر نے اس کی سخن سنجی اور نکتہ آفرینی کی دل کھول کر داد دی ہے[1]،

---

[1] نواب مصطفیٰ خان شیفتہ جو ظفر کے ہم عصر تھے اور اس کی صحبت میں شریک بھی ہوتے تھے، لکھتے ہیں:

باکثر صفات موصوف و بمحامد تمام معروف در اکثر یا من خیلو طاؤ و سعتگی ستو شناسیسته داره

(باقی ان شیہ صفحہ ۳۳۴)

ظفر شاعری میں پہلے تو نصیر پھر بے قرار، پھر ذوق، اور آخر میں غالب کا شاگرد ہوا، اگر اسکی
ذہین اور مجتہدانہ طبیعت نے کسی ایک کی بھی خاطر خواہ تقلید و پیروی نہیں کی، طبیعت میں خاکساری
تھی، اس لیے اساتذۂ فن کی شاگردی قبول کرلیتا تھا، مگر اساتذہ اپنے لائق شاگرد کو اپنے خیالات
اور جذبات سے متاثر نہ کرسکے، وہ شاید صرف فن کے اغلاط اور اسقام درست کردیتے تھے،
ورنہ اگر ظفر اپنی راہ چھوڑ کر اپنے استادوں کی راہ پر گامزن ہوتا، تو اس کے سارے کلام میں اول تو
نصیر کی مضمون آفرینی اور شکوہ الفاظ کے ساتھ نئی نئی تشبیہیں اور استعارے پائے جاتے، یا پھر ذوق
کی طرح عام زبان کی کہاوتیں، اور عام لوگوں کے اوہام و معتقدات کی کثرت ہوتی، یا آخر میں
غالب کے فلسفہ، تصوف کے عناصر اور فارسی کی پرشوکت ترکیبیں ہوتیں، مگر ان میں
سے کسی کے رنگ کی اثر پذیری اس کے کلام میں نہیں، وہ اپنے ہی رنگ اور طرز ادا کا مالک تھا،
بات یہ تھی کہ طبیعت میں شاعری کا مادہ بھرا تھا، پھر زندگی کچھ ایسی گذری کہ شاعر نہ بھی ہوتا، تو انقلابات

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۳۲) (بہ شاعری) بسیار مالوف است، شیخ ابراہیم ذوق از ملازمان قدیم او و وظیفہ خوار
است و کلام ایشان بجنسہ و اصلاح آوردہ است و ہموار۔"

منشی احمد حسین سحر گلزار بہار بے خزاں (۱۲۹۱ھ) میں ظفر کے متعلق لکھتے ہیں:-

"ظفر تخلص، مرزا ابوظفر بادشاہ دہلی، با فن شعر ربط و مناسبت تمام دارد، ابراہیم ذوق از
مخصوصان حضرت او ہست، و افکار ایشان با اصلاح او چون گوہر آبدار شد۔"

تذکرۂ بزم سخن میں ظفر کے بارے میں یہ ہے:-

"[illegible] گفتارش اگرچہ سادہ پرکار است، ہمواش خاطر شکار است
[illegible] و معاملہ [illegible] ان او"

منشی [illegible] ظفر [illegible]

(باقی حاشیہ صفحہ ۳۳۴ پر)

زمانہ اور حوادثِ روزگار سے خواہ مخواہ شاعر ہو جاتا، اسلاف کی عظیم الشان حکومت ہاتھ سے گئی، عزت و وقار کا خاتمہ ہوا، تو نانِ شبینہ کو محتاج ہو گیا، در بدر ٹھوکریں کھاتا پھرا، لختِ ہائے جگر کو خون میں تڑپتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھا، اور آخر میں خود ایک مجرم کی حیثیت سے محبوس و مقید ہو کر اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دی، شاعر بننے کے لیے اور کیا چاہیے تھا، اور شعرا نے بلبل کے نالہ و فریاد سے اپنی شاعری میں سوز و گداز پیدا کیا، ظفر نے اپنی ہی آہ و بکا سے اپنی شاعری میں درد اور درد میں تڑپ پیدا کی، اور شعرا نے عاشقانِ زبون حال کے طوق و سلاسل کی ہولناک تصویریں کھینچکر عبرت کا پیام دیا، ظفر کی اپنی ہی زندگی قید اور زنجیر کی داستان رہی، اس لیے اس کی ہر صدائے صحیح معنوں میں دنیا کی نیرنگیوں کی آواز بازگشت ہو گئی، اور شعرا نے ایک خیالی چمن کی بربادی اور اس کے پھولوں کی پامالی پہ دنیا کی بے ثباتی اور ناپائداری کا رونا رویا، ظفر نے اپنی سلطنت کے چمنستان کو اجڑتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھا، اس کے خیالات میں ختنر عیب نہ ہوتا تو آخر کس میں ہوتا؟ اپنی شاعری

(بقیہ حاشیہ ص۳۲۳) "شعر ایسا کہتے ہیں، کہ ہمارے زمانہ میں ان کے برابر کوئی نہیں کہہ سکتا، ابراہیم ذوق سے اصلاح لیتے ہیں، تیرہ چودہ برس کا عرصہ ہوا کہ تخت نشین ہوئے، ابتدا میں ولی عہد تھے، ان ایام میں بھی ان کے شعر بہت اچھے ہوتے تھے، تمام ہندوستان میں اکثر قوال ان کی غزلیں اور گیت اور ٹھمریاں گاتے ہیں، ہر ایک قسم کے شعر ہیں"

ظفر کی بابت مولوی امام بخش صہبائی کی ایک دلچسپ عبارت ملاحظہ ہو:-

"گوہر سخن اس کے لب سے ہم پایۂ اعجاز اور مضمون نیاز اس کے اشعار میں ہم پہلوئے ناز، شاہدان محفل قدس ہر راہ سے اس کے جادۂ قلم میں عنان افگن ہیں، اور نازنینان ملک تقدس ہر طرف سے اسی کے میدان صفحہ میں گامزن ہیں، اس کے قلم کی صریر ہے یا خوش خرامان معنی کی آواز پا اس کے الفاظ سے فروغ معنی جلوہ گر ہے، یا مینا سے پری نقاب کشا ...... اشعار مشہور و

(باقی حاشیہ ص۳۲۵ پر)

مین خون جگر خوب خوب بہایا، اس کی تمام شاعری مغلیہ سلطنت کی تباہی اور بربادی کا ایک مرقع ہے، یہ شاید قدرت کی طرف سے انتظام تھا کہ تیموری سلطنت کا آخری فرمانروا ایسا ہو، جو صحیح طور پر اپنے کمال کے زوال کا خونچکان ماتم کر سکے،

یہی وجہ ہے کہ ظفر کی شاعری حزن وملال، رنج والم اور یاس وحسرت کی سراپا داستان ہے، دیوان مین بعض غزلین ایسی ضرور ہین، جن مین رنگینیون اور سرمستیون کی جھلک ہے، بعض تو متانت اور سنجیدگی سے بھی گری ہوئی ہین، مگر یہ شاید غایت رنج ومصیبت اور شدت غم والم کا ردعمل ہے، ظفر کی اندوہناک زندگی مین کوئی ایسی صورت باقی نہین رہی تھی، کہ وہ چار گھنٹے بیٹھکر غم غلط کر لیتا، گذشتہ روایات کے مطابق ہر نکاد کی تفریحین تھین نہ عیش ونشاط کی محفلین، اور نہ قلعہ معلی کے اندر مسرت وشادمانی کی مجلسین، لامحالہ شدت غم سے چھٹکارا پانے کے لیے ظفر شاعری مین رندبلانوش اور غافل از تمکین وہوش ہوجاتا، ورنہ اور کوئی وجہ نہ تھی، کیونکہ مصیبت ونکبت کی وجہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۳۴) مین دیدہ بینا اور ابیات عاشقانہ مین چشم گریہ زا اور بین السطور بہار یہ مین خیابان او فلکیات مین کہکشان نقش شگفتگی الفاظ سے نسیم چمن او نگاہ تازگی رقم سے رشیۂ یاسمن
مصرع قامت شمشاد بیت ابروے خوبان تلخ و نوشاد،
عبدالغفور نساخ اپنے سخن شعراء (۱۲۹۱ھ) مین لکھتے ہین :-
"اکثر خطوط کو اچھی طرح سے لکھتے تھے، شعر نہایت شیرین ونمکین کہتے تھے"
موجودہ دور کے ادبا مین خواجہ الطاف حسین حالی تحریر فرماتے ہین کہ ظفر کا تمام دیوان زبان کی صفائی اور روزمرہ کی خوبی مین اول سے آخر تک یکسان ہے،
محمد حسین آزاد نے باوجودیکہ اپنے استاد کی محبت اور عصبیت مین ظفر کے تمام کلام کو ذوق کی طرف منسوب کر دیا ہے، پھر بھی وہ اس کو شعر وشاعری مین طبیعت اور ایجاد کا بادشاہ بتاتے ہین،

صدقے ترے ہیں کے ہوتا نہ پھر پھر کے آسماں | رکھتا سر زمیں پہ اگر آپ سا قدم
محروم تیرے دست مبارک سے رہ گیا | کیونکر نہ چاک اپنا گریباں کرے قلم
عالم کو تیرے نور سے پایا ہے شش ظہور | آدم ترے ظہور سے ہے مظہر اتم
ہیں زائران روضۂ اقدس ترے جہاں | آتا ہے پائے بوس کو واں روضۂ ارم
والیل تیرے گیسوئے مشکیں کی ہے ثنا | والشمس ہے ترے رخ پر نور کی قسم
انصاف تیرا دیکھیے جو داد خواہ کشاں | وہ داں ہیں آرہ کشاں بر سر ستم
قرآں میں جب کہ خود ہو ثنا خواں ترا خدا | کیا تاب پھر قلم کو جو کچھ کر سکے رقم
تیری جناب پاک میں جو ہے ظفر کی عرض | صدقے میں اپنی آل کے اے شاہ محتشم
صیقل سے اپنے لطف و عطا کے تو دور کر | آئینۂ ضمیر سے میرے غبار غم
پہنچا نہ آستان مقدس کو تیرے میں | اس غم سے مثل چشمہ رہی میری چشم نم
پر خاک آستاں کی تری اپنی چشم میں | کرتا ہوں سرمہ اپنا تصور سے دمبدم

اہل نظر جانتے ہیں کہ نعت کہنا کتنا مشکل ہے، بقول عرفی ۔ ع رہ بر دم تیغ است قدم را،
لیکن ظفر کے ہم عصر شعراء میں اتنا موثر نعتیہ قصیدہ کسی نے نہیں کہا، وہ کچھ اور نہ بھی کہتا تو صرف یہی
قصیدہ اس کے اچھا شاعر ہونے کی دلیل و برہان تھا، دیوان کا دوسرا، تیسرا اور چوتھا حصہ حمد سے
شروع ہوتا ہے جس کے بعض اشعار ملاحظہ ہوں،

شاباش و الا ربنا لک اللہ تعالیٰ | پہچانا ہے تو نے جسے دیکھا نہ بھالا
اے دیدہ تری جنبش مژگاں قلم کش | اک پل میں کئے تو نے دو عالم تہ و بالا

ادا ہووے نہ ہرگز حرف ثنا احمد یزداں کا | اگر صد زباں ہو وے زبان خامہ سخنداں کا
اگر ہو جائے سی پارہ دل اسکی آیت میں | تو پھر ہر پارۂ دل کو سمجھ سی پارہ قرآں کا

جسے خیال ہے کچھ رحمت الٰہی کا ۔۔۔ گناہ سمجھے ہے دعویٰ وہ بےگناہی کا

یہ لطف دیکھ کہ خود بے نیاز ہے لیکن ۔۔۔ وہیں ہے اسے بندوں کی خیرخواہی کا

تم اپنے جی میں عزیز اور ذلیل ٹھہرا لو ۔۔۔ خدا ہے ایک مہ و مہر و مرغ و ماہی کا

ظفرؔ کو اپنے حمد و نعت پر بہت زیادہ فخر تھا، چنانچہ کہتا ہے،

ظفرؔ مضمون حمد و نعت سے گل ہائے رنگین سے ۔۔۔ ورق میرے سخن دیوان کا ہے اک باغ رضوان کا

ظفرؔ کی المیہ شاعری | اوپر کی سطروں میں کہا گیا ہے کہ ظفرؔ کی تمام شاعری الم و یاس اور اندوہ و غم سے بھری ہوئی ہے، بعض غزلیں تو پوری کی پوری المناک جذبات سے لبریز ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے اسلاف کی مٹی ہوئی شوکت اور گذری ہوئی حشمت پر بے اختیار ہو کر روتا ہے، اور آنسو بہا بہا کر کہتا ہے:-

بلا سے گرچہ ہمارا دل اٹھتا ہے پھٹنے میں ۔۔۔ نہ روکو مجھ کو رونے سے مزا آتا ہے رونے میں

پڑا ہے کشتی افلاک کا رونا زمانے میں ۔۔۔ مری آنکھوں نے وہ طوفاں کیا برپا ہے رونے میں

مری دیوانگی کا اس پہ ہی ہے عجب عالم ۔۔۔ کبھی رونے میں ہنستا ہوں کبھی ہنستا ہوں رونے میں

سنا ہے نوح کے طوفان کو یاروں نے کانوں سے ۔۔۔ مگر آنکھوں اپنی ہم نے دیکھا ہے رونے میں

لگے آگ ایسے رونے کو کہ مثل شمع گھل گھل کر ۔۔۔ بہا جاتا مرا دل سوز ستا یا ہے رونے میں

ظفرؔ ہم اپنا رونا روئیں جا کر سامنے کس کے ۔۔۔ رہا کون اپنے آنسو پونچھنے والا ہے رونے میں

پھر بھی روتا جاتا ہے، اور اس کے رونے میں اتنی شدت ہے کہ اس کو خود احساس ہے کہ

لگ جائے جھڑی یہ ساون بھادوں کی جھڑی آنسو ۔۔۔ جھاڑوں جو دم گریہ میں دامن مژگاں کو

اور جب رو کر چپ ہوتا ہے، تو اپنے ٹوٹے ہوئے دل سے آہ سوزاں بلند کرتا ہے

شعلہ جو سوز دل سے گلوگیر آہ ہو ۔۔۔ پیکان تما عیاں وہ سر تیر آہ ہو

سیل سرشک چشم کبھی ہمراہ ہو اگر
چون سرو آبجو یہان تو قیر آہ ہو

دکھلائے جو سوزش دل کو تو برق بھی
حیران دیکھ عالم تنویر آہ ہو

کاک چلی تو شمع جگر سے بنا
مانی جو کھینچے تو مری تصویر آہ ہو

نالاں ہیں ایک عمر سے ہم اسپ ظفر
کیا اس کے دل میں دیکھیے تاثیر آہ ہو

اور جب آہ کھینچنے سے بھی اس کو تشفی نہیں ہوتی، تو چیخیں مارتا ہے، اس طرح جیسے کوئی نشتر اس کے تمام جسم میں چبھو رہا ہو۔

کیا رنگ دکھاتی ہے چشم ترا ہو ہو
خون جگر آیا لخت جگرا ہو ہو

اس ہستی یک دم پر افسوس ہے تو کیا کیا
ہنستا ہو شرارت سے کیا کیا شررا ہو ہو

اک وار میں دو ٹکڑے کرتی ہو مری دل کے
کیا تیز ہے قاتل کی تیغ نظرا ہو ہو

چھڑکے ہے نمک قاتل سا تکلے تلواران
سینہ میں مزے کیا کیا زخم جگرا ہو ہو

ہستی کی عدم سے مر مر کے پہنچتے ہیں
اک دم کی مسافت پر اتنا سفرا ہو ہو

اس پر بھی اس کو تسکین نہیں ہوتی ہے، تو اپنی حالت اس طرح بیان کرتا ہے کہ

سینہ میں اک دھواں کئی بار اٹھکے رہ گیا
نکلا نہ میرے دل کا بخار اٹھکے رہ گیا

آیا نہ میرے دیدۂ گریاں کے سامنے
سو بار دیکھا ابر بہار اٹھکے رہ گیا

دیتا چلا تھا آگ کو کہ خسیر ہو گئی
ساتھ آہ کے جو دل سے شرارہ اٹھکے رہ گیا

آتش غم سے اس کا دل جل کر داغدار ہو گیا تھا، وہ بھی ایسا کہ خود کہتا ہے۔

ذرہ جو دکھاتا ہوں داغ دل سوزاں کو
چمکتی ہے تپ لرزہ خورشید درخشاں کو

وہ اپنی مصیبتوں اور صعوبتوں سے گھبرا جاتا ہے، اور ظالم چرخ سے شکایت کرتا ہے کہ

سرگرد ش نہ تیرا ہم ہون اور نہ اکدم قرار ہو
یہ کیا انصاف ہے تیرا اے چرخ گردان یہ نہ ہو وہ ہو

مگر پھر اپنے کو یہ کہکر تسلی دیتا ہے کہ

ہو زیر فلک راحت کس طرح ظفر ہم کو　　　آرام نہین آپ ہی اس گنبد گردان کو

یہ تو ظفر کی واردات زندگی کا نا دو شیون تھا جن کے تاثرات کی گہرائی کو ظفر نے خود بیان کیا ہے کہ

ہمسر ہون میرے نالہ سو کیا نالہا سے نے　　　اس مین ظفر یہ سوز کہان اور کہان گداز

اب یہی سوز و گداز اس کی شاعری کے ہر پہلو مین نظر آتا ہے، جب وہ ایک شاعرین کر عشق کی تمام واردات یعنی محبوب کی کج ادائیان، ستم آرائیان، اور بے اعتنائیان بیان کرتا ہے تو طالب محبوب کی محویت، شیفتگی اور ہجوم آرزو مین صرف سوز و گداز ہی کی نیرنگیان دیکھنا چاہتا ہے، اس کا معشوق عام معشوقون کی طرح ظالم، پر فریب، حیلہ ساز اور دل آزار ضرور ہے، لیکن اس کے عاشق کے عشق مین ہوسناکی نہین وارفتگی ہے، وصال کی لطف اندوزی نہین، ہجر کی غم انگیزی ہے، اور حسن کی رسوائی نہین بلکہ عشق کی بے پائی ہے،

اس کا عاشق عشق کے میدان مین اس طرح آتا ہے، کہ

جو آگے عشق کے میدان مین بڑھائے پاؤن　　　تو شرط یہ ہے کہ پیچھے نہ پھر اٹھائے پاؤن

اور جب وہ سرکف ہوکر اس میدان مین آجاتا ہے، تو پھر وہ ہے اور ہر قسم کی مصیبتون کی ہلاکت خیزی، وہ ہے اور عشق کی آتش سوزی،

ہوتی ہے بری عشق کی آتش یہی ڈر ہے　　　گھر پھونک نہ دے آتش سوزان کسی کا

خانہ دل کو لگی ہے آگ سوز عشق سے　　　ہر بن مو سے نکلتے ہین شرارے بے طرح

مگر با این ہمہ وہ عاشق سے ضبط، تحمل، سرفروشی، بلکہ صرف تڑپ چاہتا ہے، اور وہ بھی ایسی

کہ جل کے خاک ہو دل اور خبر کسی کو نہ ہو

وہ تو عشق میں رونے کا بھی قائل نہیں،

رو رو کے میرا راز نہاں فاش کر دیا — خانہ خراب ہو جیو چشم پر آب کا

لیکن جب ہجر میں بے تاب ہو کر روتا ہے، تو پھر یوں کہ

نہیں اے ابر ہم قائل کہ آنسو سر بسر ٹپکے — وہ کیا آنسو ہو جو بے آمیزش خون جگر ٹپکے

ہر اک آنسو کا قطرہ ہو جو دانا کہربا کا سا — دم گریہ جگر کے آبلے کیا پھوٹ کر ٹپکے

مگر حقیقت میں وہ چشم گریان کا نہیں، بلکہ دل بریان کا قائل ہے، دل جل جائے مگر شرط یہ ہے کہ خاکستر نہ ہونے پائے بلکہ اس میں صرف سوزش ہو اور اس طرح کہ

دکھلائیں سوزش دل بیتاب اگر ہم — کانپ اٹھے شعلہ شوق سے نار جحیم کا

اور اس سوزش میں اتنی ٹیس ہو کہ

دونون گداز عشق سے بہ جائیں ہو کے آب — آہیں جو دل کے پاس ہو نیز جگر کے پاس

اور پھر اس کے دل میں کچھ باقی نہ رہ جائے،

دل میں تو کچھ نہیں ہے، دم دود اے ظفر — اک آہ رہ گئی ہے فقط اک جگر کے پاس

ظفر کے عشق کا فلسفہ یہیں پر ختم نہیں ہو جاتا، بلکہ اس کا عشق تو اس کا متقضی ہے کہ عاشق اس سوزش سے مضطرب، بے قرار اور بے چین ہونے کے بجائے لطف اندوز ہو، عشق کی آگ سے دل پر داغ پڑ جائیں، مگر:-

خانۂ دل میں رہے روشنئ داغ عشق — بجھنے نہ پائے مرا یہ کبھی یا رب چراغ

اور گو جگر میں زخم پڑ جائیں لیکن:-

بھایا نہ زخم دل سے اٹھا میرے چارہ گر — رہنے دے اس کو تو خم پر جوش سو ڈھنگا

کیونکہ

سب پہ کھل جائیگا میرے دل مجروح کا حال   دل کے زخموں کو ذرا بھی جو یہ سر کے بیٹھا

ظفر کے بیان ایک کامیاب عشق کے مدارج بیان بھی ختم نہیں ہوتے، اصلی سوز عشق تو یہ ہے، کہ

دفن ہوویگا ترا کوئی جہاں سوختہ جاں   سبزہ واں خاک سے پیدا کبھی ہوئیگا نہیں

بلکہ

اف ترے کشتہ کا تو دل کہ ظالم سنگ تھا   گور پر اس کے رہا محشر تلک جلتا ہوا

اور

رفاقت کیا کہوں آہ جگر اور داغ سوزاں کی   ہماری قبر پر حاجت نہیں ہے شمع گریاں کی

ظفر کی اخلاقی شاعری | گذشتہ صفحات سے معلوم ہوا ہوگا کہ ظفر کی طبیعت پر حزن و ملال کس قدر غالب ہے، تلخیوں ناکامیوں اور نامرادیوں کے ہجوم میں انکی زندگی گذری، داغ آتا اور بسر پا آرزو بکھر رہ گئی تھی، ظاہر ہے کہ ایسے حسرت زدہ اور رنجیدہ انسان کے دل و دماغ پند و نصیحت کے لئے کس قدر موزوں ہوں گے، ظفر نے اس سلسلہ میں جتنے اشعار کہے ہیں، وہ محض ایک فلسفی کے خیالات نہیں ہیں، بلکہ اپنی واردات زندگی سے جو کچھ اس نے محسوس اور اخذ کیا، ان کو اشعار کی سلک میں منسلک کر دیا ہے، وہ الفاظ کے گورکھ دھندوں اور خیالات کے پیچیدہ موشگافیوں میں اپنے ناظرین کو گم کرنا نہیں چاہتا ہے، بلکہ سیدھے سادے الفاظ میں جو کچھ کہنا چاہتا ہے پیش کر دیتا ہے، اس کی تلخ زندگی اور پھر اس کے اشعار آنکھوں کے سامنے ہوتے ہیں، تو پڑھنے والوں پر ایک خاص قسم کا اثر ہوتا ہے، جو غیر ارادی طور پر دل کی گہرائیوں میں اتر جاتا ہے،

شاہ جہاں اور جہانگیر کا آخری جانشین گویا اپنی سلطنت کی بربادی کا یہ نقشہ کس طرح کھینچتا ہے:-

غافلو اس نقش ہستی پر کہ ہے نقش برآب　　موج کے مانند کیوں پھرتے ہو بل کھائے ہوئے

اسی لئے وہ دنیا اور دنیا کی تمام چیزوں کو عبث اور ہیچ سمجھتا تھا، اس کی زندگی اور اس کی زندگی کی تمام نیرنگیاں عبرت کا پیام تھیں، ایک عظیم الشان سلطنت کی بیخ کنی اس کی نظروں کے سامنے ہو رہی تھی، ایک پُر جلال، پُر ہیبت اور پُر شکوہ خاندان کے خدم و حشم، عز و شان اور سطوت و جبروت کا خاتمہ اُس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا، تختِ طاؤس پر بیٹھنے والوں کا جانشین ہمالیہ سے راسکماری تک کے فاتح کا وارث اور کوڑیوں کی طرح زر و جواہر لٹانے والے کی یادگار، چند روپیوں کی محتاج ہو رہی تھی، ایسی حالت میں دل اور جگر کے زخموں کی ٹپک سے یہ درد انگیز چیخیں کیوں نہیں نکلتیں، کہ

سب کارِ جہاں ہیچ ہے سب کارِ جہاں ہیچ　　اس ہیچ سے اُمید ہے اے ہیچداں ہیچ

مانندِ حُباب ایک نفس میں ہے خرابی　　اس منزلِ فانی میں ہے بنیادِ مکاں ہیچ

اک عمر ہے مایۂ دنیا سے گراں بار　　آخر کو جو دیکھا تو بجز بارِ گراں ہیچ

اس باغ میں تھوڑی سی بہار اور پھر آئی　　اے تو گلِ خنداں مجھے تشویشِ خزاں ہیچ

ہو جنس تنک مایۂ ہستی کے نہ خواہاں　　یہ جنس، یہ بازار، یہ گوہر، یہ دکاں ہیچ

آوازِ طرب گوشِ دل محوِ فنا سے،　　جز نالہ و فریاد و بجز آہ و فغاں ہیچ

پایا نہ بجز داغِ سیہ کاری یک عمر　　نقشِ قدمِ قافلۂ عمرِ رواں ہیچ

کیا دیکھیں ظفر خانۂ ہستی کا تماشا

اس وہم کدہ میں بجز وہم و گماں ہیچ

مگر ظفر جانتا تھا کہ اس کی اور اس کے خاندان کی زندگی کی داستان خواہ کیسی ہی دردناک اور عبرتناک ہو وہ انسانیت کی دنیا میں گنہگار اور مجرم ہوگا، اگر وہ لوگوں کے لئے صرف

الم ویاس اور حسرت وحرمان کا پیام چھوڑ جائے گا۔ وہ اس سے واقف تھا، کہ زمانہ انقلاب آفرین ہے، اس دنیا مین:-

نہ دائم غم ہے نہ عشرت کبھی یون ہے کبھی وون ہے
تبدل یان ہے ہر ساعت کبھی یون ہے کبھی وون ہے

کوئی دن ہے بہار گل پھر آخر ہے خزان بالکل
چمن ہے منزل عبرت کبھی یون ہے کبھی وون ہے

اسی لیے اس کا پیام ہے، کہ فلک کے تمام مظالم کے باوجود انسان کی ہمت مردانہ کا اقتضا یہ ہے کہ ضبط وصبر سے کام لے اور خدا پر بھروسہ کرے، کہتا ہے:-

ستم کرتا ہے بے مہری سے کیا کیا آسمان پیہم
دل اسکے ہاتھ سے پر درد ہے اور چشم ہے پرنم

کرونگا پر نہ شکوہ گرچہ ہونگے لاکھ غم پر غم
کہے جاؤنگا مین ہر دم یہی جبتک ہے دم مین دم

خدا دارم چہ غم دارم خدا دارم چہ غم دارم

اور جب انسان خدا پر بھروسہ اور توکل کرنے لگتا ہے، تو پھر دنیا کے تمام لوگون سے مستغنی اور بے نیاز ہوجاتا ہے۔

بلا سے اگر نہین کوئی رفیق و آشنا میرا
خدا پر دھیان ہے میرا نگہبان ہے خدا میرا

خدا آسان کرے گا گو ہے مشکل مدعا میرا
خدا حامی ہے میرا اور خدا مشکل کشا میرا

خدا دارم چہ غم دارم خدا دارم چہ غم دارم

مگر ظفر کا خدا پر بھروسہ کرنے سے مطلب ہرگز یہ نہ تھا، کہ انسان اپنی زندگی کو خود سنوارنے کی کوشش نہ کرے، ظفر جانتا تھا کہ انسان کو اسی دنیا مین زندگی بسر کرنا ہے، وہ اپنے لیے کوئی نیا عالم اور نیا آسمان پیدا نہین کرسکتا ہے، مگر ہان اس کے لیے خوشگوار راہین کھلی ہوئی ہین، جن پر چل کر وہ اس دنیا مین مسرت و راحت کی زندگی گذار سکتا ہے، وہ کونسا راستہ ہے ملاحظہ ہو:-

اتنا نہ اپنے جامے سے باہر نکل کے چل — دنیا ہے چل چلاؤ کا رستہ سنبھل کے چل

نخوت، پندار، تکبر اور غرور کی راہ میں صرف تباہیاں اور بربادیاں ہیں، اس لیے

کم ظرف پر غرور ذرا اپنا ظرف دیکھ — مانند جوش غم نہ زیادہ ابل کے چل

فرصت ہے اک صدا کی یہاں سوز دل کے ساتھ — اس پر سپند وار نہ اتنا اچھل کے چل

اس دنیا میں قدم قدم پر مکر و فریب کا جال ہے، ہوش و خرد کا تقاضا ہے کہ انسان ان سے دامن بچا کر زندگی کی مشکل راہوں کو طے کرے،

یہ غول وش ہیں ان کو سمجھ تو نہ رہنما — سایہ سے بچ کے اہل فریب و دغل کے چل

مگر اس کے باوجود انسان کی زندگی کی منزلیں اسی وقت طے ہو سکتی ہیں جب وہ خود اپنے پاؤں سے چلے، اور اس کو اپنے بازو کی قوت پر اعتماد ہو

اوروں کے بل پہ بل نہ کر اتنا نہ چل نکل — بل ہے تو بل کے بل پہ تو اپنے بل کے چل

اور اس کے ساتھ ہی آنکھوں میں بصیرت کا نور چاہیے کہ اندھیری رات گم نہ کر سکے،

پھر آنکھیں بھی ہیں کہ رکھ دیکھ کر قدم — کہتا ہے کون تجھ کو نہ چل چل سنبھل کے چل

لیکن انسان کو اپنی تمام جد و جہد اور سعی و کوشش کے باوجود کارکنان قضا و قدر ہی کا بہرحال محتاج رہنا ہے،

انسان کو کل کا پتلا بنایا ہے اس نے آپ — اور آپ ہی وہ کہتا ہے پتلے کو کل کے چل

ظفر زندگی کے مسائل کو یہیں پر ختم نہیں کر دینا چاہتا ہے، بلکہ اس نے ایک عالمگیر لطف و کرم کا پیام دیا ہے، جس کے ذریعہ سے اس کا خیال ہے کہ انسان نہ صرف اپنے کو اوصاف حمیدہ اور اخلاق حسنہ سے متصف کر سکتا ہے، بلکہ وہ کائنات کی تمام چیزوں کو اپنے قابو میں لا سکتا ہے، ایک الہامی شاعر ہی کہہ سکتا ہے،

گوشِ دل مین مرے آئی سحر آوازِ سروش | کہ کسی یار کے شکوے نہ کر کچھ تو خروش
گر کہین یار برا لطف سے تو ہو خاموش | یار عیار ہے تو پھر یار ہے اے صاحب ہوش

لطف کن لطف کہ بیگانہ شود حلقہ بگوش

پھر لطف کی سحر آفرینیون پر رقمطراز ہے،

لطف سے وحشیِ صحرا ہی نہین تنہا رام | لطف سے ماہی و مرغ آئے تہ حلقۂ دام
لطف سے بنتے ہین انسان ہی فقط کیا خدام | لطف سے ہوئے پرستار پری، دیو غلام

لطف کن لطف کہ بیگانہ شود حلقہ بگوش

لطف سے کن کے ہوئے کہتے ہی ذُنون عالم | لطف سے روح ہوئی داخلِ جسمِ آدم
لطف سے گرچہ ہو معشوق بھرے عشق کا دم | لطف سے غیر بنے بندۂ بے دام و درم

لطف کن لطف کہ بیگانہ شود حلقہ بگوش

آگے چل کر جو شاعرانہ انداز سے گل افشانیان کی ہین ان مین دقتِ نظر کے ساتھ زورِ بیان بھی ملاحظہ ہو:-

حلقۂ موج ہوا قوسِ قزح قوس ہلال | گردشِ چرخ برین گردشِ مہ، گردشِ سال
گردشِ ساغرِ مے، گردشِ فانوسِ خیال | سب تجھے کہتے ہین یہ حلقہ بگوشون کی مثال

لطف کن لطف کہ بیگانہ شود حلقہ بگوش

اسی طرح بعض جستہ جستہ ناصحانہ خیالات دیوان مین بہت کچھ ملین گے مثلاً

ظفر آدمی اس کو نہ جانیے گا وہ ہو کیسا ہی صاحب فہم و ذکا
جسے عیش مین یاد خدا نہ رہی جسے طیش مین خوف خدا نہ رہا

عقل پر ناز ہے قدرت پر نظر کسکو ہے | سب کو فکر آج کی ہے کل کی خبر کسکو ہے

فنا ہے ساتھ تو پھر زندگی سے کیا حاصل — فنا سے پہلے فنا ہو کہ ہو بقا حاصل

جو دل کو صاف ہو کرنا تو خاکساری کر — کرے ہے خاک سے دیکھ آئینہ صفا حاصل

خاک کا پتلا ہے انسان اے ظفر اس کیلئے — سرکشی اچھی نہیں ہے خاکساری کیلئے

جب کوئی کہتا ہے ہستی کو کہ ہستی خوب ہے — اس کی غفلت پر فنا اس وقت ہنستی خوب ہے

دنیا کا ہے مزا ظفر انجام کار زہر — میٹھا سمجھ کے لوگ اسے للچا گئے تو ہیں

اے ظفر چاہیے بندے کو گنہ سے پرہیز — ورنہ کچھ شک نہیں غفار کی غفاری میں

گلشن دنیا نہیں جائے قیام اے غافلو — غنچہ سان تم دوش پر رخت سفر باندھے رہو

جو کہ ہے قسمت میں ہونا ہوگا آخر کو وہی — اے ظفر کیا شکوہ اسکا یوں ہوا یا وون ہوا

برے ہیں یا بھلے ہم تم ظفر لیکن غنیمت ہیں — کہ یا آئیں گے پھر پھر کر نہ ہم جیسے نہ تم جیسے

دنیا سے جس نے کھینچ لیا ہاتھ اے ظفر — پھیلائے پانوں کیوں نہ ہو کنج فراغ میں

آدمی کو چاہیے آدم شناسی اے ظفر — ہے یہ فرمودہ ہمارے حضرت تیمور کا

منعم اس دولت دنیا پہ نہ کر دیکھ غرور — سیکڑوں گور میں کیا کیا نہیں بہرام پڑے

ظفر کی صوفیانہ شاعری

یہی ناصحانہ خیالات آگے چل کر صوفیانہ خیالات میں تبدیل ہو گئے ہیں، حوادث زمانہ اور واردات زندگی نے ظفر کے دل میں اپنے مالک حقیقی کی لگن ایسی پیدا کر دی تھی کہ آخر میں وہ بادشاہ وقت ہونے کے بجائے ایک صوفی منش فقیر ہو گیا تھا، اس کی زندگی صبر، توکل، اور استغنا کی داستان ہے، طبیعت میں فقر و درویشی کا خمیر موجود تھا، ہجوم و مصائب نے اس کو اور تیز کر دیا۔ عہد طفلی ہی میں مولانا فخر الدین سے شرف بیعت حاصل کیا، چنانچہ خود کہتا ہے:-

مرشد پاک روان فخر الدین — قبلہ و کعبۂ جان فخر الدین

اک جہان فخر جہان کہتا ہے — پر ہے فخر دو جہان فخر الدین

مین گدا ہون ترے دروازے کا | جاؤن اس در سے کہان فخرالدین
موجزن ہے ترا دریاے کرم | از کران تا بہ کران فخرالدین
ہے مدد تیری توانائی بخش | مین ہون بیتاب توان فخرالدین
کیا کرون عرض عیان ہے تم پر | میرا سب راز نہان فخرالدین
رکھ ظفر ہر نفس و ہر ساعت | شغل دل ورد زبان فخرالدین

ایک جگہ اور کہتا ہے،

کیا خطر اس کو راہ دین مین ظفر | رہنما جس کا فخر دین ہو جائے

ایک دوسری جگہ لکھتا ہے[1]

اے ظفر مین کیا بتاؤن تجھسے جو کچھ ہون سو ہون | لیکن اپنے فخر دین کے کفش برداروں مین ہون

ظفر کو اس خاندان سے کچھ ایسی شیفتگی تھی، کہ مولانا فخرالدین کے انتقال کے بعد ان کے

---

[1] اس عقیدت کا اظہار اپنے دیوان مین متعدد بار کیا ہے، مثلاً

خاک پاے فخر دین ہے اپنے حق مین کیمیا | اے ظفر کیون خواہش اکسیر کرنی چاہیے
کہتا ہے ظفر جو کچھ اب جوش محبت مین | اے فخر جہان سب وہ تیری ہی عنایت ہے
جو خاک بھی ہون تو ہون فخر دین کے در کی | ظفر جھوڑ اے نہ مجھ سے اس آستان کو چرخ
اللہ اللہ جلوۂ حسن و جمال فخر دین | ہے اسی پر اے ظفر گرویدۂ دل گرویدۂ آنکھ
مدد اے فخر جہان تا ہو ن ظفر کے دل مین | سب ملال آپ کے الطاف و عنایات سے رفع
ظفر دشوار ہے ہر چند اہل معرفت ہونا | مگر صدقے مین فخرالدین کے ہان ہو سکتا ہے کچھ عجب
جس کا ہے سرمہ ظفر خاک در فخر الدین | چشم بد دور وہی، اور وہی تاثیر کی آنکھ
کوچۂ فخر جہان کی اے ظفر | خاک کی چٹکی بھی بس اکسیر ہے،

صاحبزادے مولانا قطب الدینؒ سے بیعت لی، خود رقمطراز ہے:-

مرید قطب دین ہون خاکپائے فخر دین ہون مین
گرچہ شاہ ہون ان کا غلام کمترین ہون مین

ان ہی کے فیض سے ہے نام روشن میرا عالم مین
وگرنہ یون تو بالکل روسیہ مثل نگین ہون مین

نہ کعبہ سے غرض مجھ کو نہ میخانہ سے کچھ مطلب
ہمیشہ گھستا ان کے آستانے پہ جبین ہون مین

رہون مین زندمیکش پہ رہون انکی محبت مین
نہین خواہش مجھے یہ صوفی خلوت نشین ہون مین

مجھے تو خانقاہ و میکدہ دونون برابر ہین
ولیکن یہ تمنا ہے کہ ان کا ہون کمین ہون مین

یہی عقدہ کشا میرے، یہی ہین رہنما میرے
سمجھتا ان کو اپنا حامی دنیا و دین ہون مین

بہادر شاہ میرا نام ہے مشہور عالم مین
ولیکن اے ظفر انکا گدائے رہ نشین ہون مین

اور جب مولانا قطب الدین کا وصال ہوا تو ان کے صاحبزادے غلام نصیر الدین عرف کالے صاحب سے وہی جوش عقیدت اور قلبی تعلق قائم رکھا، حالانکہ موخر الذکر اپنے والد کے انتقال کے وقت محض خورد سال تھے۔ ظفر نے ان کی طرف سے اپنے احساسات کا اظہار اس طرح کیا ہے:-

نظام خانۂ فخر جہان تمہین تو ہو
قیام سلسلہ و خاندان تمہین تو ہو

نہ کیونکر تم سے ہون ظاہر صفات قطب الدین
خدا رکھے تمہین ان کا نشان تمہین تو ہو

تمہارے در پہ جھکا کر سر ارادت خلق
کہے ہے کعبۂ امن و امان تمہین تو ہو

نثار تم پہ ہین پروانہ سان ہزارون دل
کہ شمع محفل صاحبدلان تمہین تو ہو

تمہاری قوت باطن سے تقویت ہے مجھے
کہ میرے باعث تاب و توان تمہین تو ہو

بغیر آپ کے ہون کیون نہ جان و دل بیچین
کہ راحت دل و آرام جان تمہین تو ہو

ظفر کی چاہیے نصرت تمہین نصیر الدین
کہ اس کے یار و مددگار تمہین تو ہو

ظفر کو نہ صرف اپنے مرشدون سے یہ ارادت و عقیدت تھی، بلکہ با کمال صوفیائے کرام سے

بھی یہی عقیدتمندانہ غلو تھا، حضرت معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ کی شان میں ایک مخمس لکھکر کہتا ہے :-

تم ہو جناب خواجہ معین الدین اسیرو زان حق پرست
تم ہو مرد آگاہ کن اور واقف سِرّ الست

تم مددگار ظفر ہو کیوں ظفر کو ہو شکست
پر فلک کی دیکھ گردش کانپتے ہیں ہاتھ دست

یا معین الدین چشتی دستگیری لازم است

اسی مخمس میں آگے چل کر لکھتا ہے :-

خاک پر سے جو کہ ہل سکتا نہ ہو جون نقش پا
تم اٹھاؤ تو وہیں ہو وہ سنبھل کر اٹھ کھڑا

عیسیٰ جان بخش ہو تم اور خضر رہ نما
دردمندوں کی دوا ہو ناتوانوں کے عصا

یا معین الدین چشتی دستگیری لازم است

ظفر نے خود اپنے ہاتھوں پر بھی بیعت لینی شروع کی تھی، قلعہ معلی کے لوگ، پھر سرکار کمپنی بہادر کے دیسی سپاہی اس کے حلقہ بگوش تھے، آگے چل کر تصوف کی چاشنی اس قدر بڑھ گئی تھی کہ سعدی کی گلستان کی شرح صوفیانہ نقطۂ نظر سے خود لکھی، اور اشغال و اذکار میں ایک کتاب سراج المعرفت نام مفتی میر لال سے لکھوائی،[1]

ظفر کی صوفیانہ طبیعت کے اثرات اس کی شاعری سے بھی ظاہر ہیں، لیکن وہ تصوف کا کوئی فلسفی نہیں، اس لیے خیالات اور مسائل کے اظہار میں نہ وہ نکتہ آرائی اور جدت طرازی کرتا ہے، اور نہ غالب کی طرح تصوف کے عقدہاے سربستہ کی تحلیل و تشریح میں دقیق اور غیر الفہم الفاظ استعمال کرکے خیالات کو ادق اور مشکل بناتا ہے، بلکہ اپنے قلب کے تاثرات اور احساسات کو

---

[1] یہ معلومات امیر احمد علوی صاحب بی اے کی کتاب بہادر شاہ ظفر سے لی گئی ہیں، بہادر شاہ ظفر کی ایک اور تصنیف موسومہ "لغت و اصطلاح دکن" تین جلدوں میں ہے لیکن یہ مفقود ہے، اس کا اشارہ شرح گلستان سعدی کے دیباچہ میں ہے، شرح گلستان ۱۲۵۹ھ میں مطبع سلطانی قلعہ سے شائع ہوئی تھی،

سیدھے اور سادے الفاظ میں پیش کر دیتا ہے جن کو پڑھنے کے بعد مفہوم کو سمجھنے کے لیے غور و فکر کی زیادہ ضرورت نہیں پڑتی، بلکہ بے اختیارانہ طور پر اس کے اثرات خود بخود دل پر قائم ہوتے جاتے ہیں، اسکی شاعری مادی خیالات سے ملوث ضرور ہے عشق مجازی کی تمام کیفیتیں بھی اس پر طاری ہیں لیکن اس عشق مجازی کی شراب سے اس میں عشق حقیقی کا نشہ پیدا ہو جاتا ہے، اور پھر اس نشہ کی سرمستی، بیخودی اور خود فراموشی اس پر اس قدر غالب آجاتی ہے کہ شعر کہتے کہتے خود اس میں گم ہو جاتا ہے، اور بیخود ہو کر کہتا ہے،

مے وحدت کی ہم کو مستی ہے　　بت پرستی خدا پرستی ہے،

اس "مے وحدت" کے خمار میں اس کو عالم ناسوت کی تمام چیزیں عالم لاہوت میں نظر آتی ہیں، اور ایک وجدانی کیفیت میں تصور کرتا ہے کہ

شعلہ ہے وہی شمع وہی ماہ وہی ہے　　خورشید وہی نور سحرگاہ وہی ہے

حور و ملک و دیو پری انس وہی جان　　سب صورتوں میں ماہی و نخواہ وہی ہے

یوسف ہو وہی، وہی زلیخا وہی یعقوب　　کنعان ہے وہی مصر وہی چاہ وہی ہے

رہرو وہی رہبر وہی وہی رہ مقصود　　گمراہ وہی راہ سے آگاہ وہی ہے

کیا حسن میں کیا عشق میں سب میں ہو وہی نور　　یہ موجب غمزہ، سبب آہ وہی ہے

مجنون خراباتی و دیوانہ و ہشیار　　درویش و گدا شاہ و شہنشاہ وہی ہے

خارا میں شرر ہے وہ ظفر لعل میں وہ رنگ　　واللہ وہی سب میں ہو باللہ وہی ہے

اسی کو اپنی ایک فارسی غزل میں کہتا ہے۔

اینکہ ہیچ ہمہ ہا قالب و جان ہمہ اوست　　بلکہ ہم قالب و ہم روح روان ہمہ اوست

آنچہ بیرون و درون ست ہمانست ہمان　　راز فاش ہمہ او و سر نہان ہمہ اوست

در پسِ پردہ و بے پردہ درآید از دل — بے نشان و سبب نام و نشان ہمہ اوست

نیست دیر و حرم از شیخ و برہمن آباد — ہمہ ہمان و یکینے مکان ہمہ اوست

اے دل آن گوہر یکتا کہ نیرزد دیدو کون — چشم بکشا و ببین زیب دکان ہمہ اوست

شعلۂ نار جحیم و گل گلزار نعیم — یک تجلی است کہ در جلوۂ شان ہمہ اوست

می زند اے ظفر امروز بباغ توحید — ہمچو بلبل دل شدہ دیدہ فغان ہمہ اوست

یہ شاید استاد غالب کے اس سوال کا جواب ہے کہ

ہستی ہے نہ کچھ عدم ہے غالب — آخر تو کیا ہے، اے نہیں ہے

لیکن اس حقیقت مستورہ کا احساس ہوا تو اس کا مشاہدہ بھی ضروری ہے، تصوف کی راہ میں ایک ایسا مقام بھی آتا ہے جب کہ طالب حقیقت وادی تحیر میں گم ہو کر رہ جاتا ہے۔

صفائے حیرت آئینہ ہے سامان زنگ آخر
تغیر آب برجا ماندہ کا پاتا ہے رنگ آخر (غالب)

اور پھر وہ ایسا حیرت زدہ ہو جاتا ہے، کہ ساری حقیقتیں سامنے ہوتی ہیں، لیکن وہ دیکھ نہیں سکتا ہے:

صد جلوہ رو برو ہے جو مژگان اٹھایئے
طاقت کہاں کہ دید کا احسان اٹھایئے (غالب)

ظفر پر بھی ایسی کیفیت طاری ضرور ہوتی ہے، وہ کہتا ہے:

میں ہوش میں ہوں یا رب یا کہ مجھے وحشت — کہ جوش ہنسی کا ہے، کہ گریہ کی شدت ہے

مجذوب ہوں یا سالک غافل ہوں کہ دیوانہ — کیا جانئے میں کیا ہوں اور کیا میری حالت ہے

پھر کہتا ہے:۔

دکھاتا یار ہے ہر رنگ میں جلوہ ہمیں لیکن
کہاں سے لائیں وہ آنکھیں جن آنکھوں سے ہم دیکھیں

مگر وہ مشاہدۂ جمال سے محروم نہیں ہوتا ہے، بلکہ حسن عالم افروز اور جمال جہان آرا کو دیکھتا ہے،

گر شعلہ میں گرمی ہے تو گل میں نزاکت ہے
ہر شے میں نظر آتی اللہ کی قدرت ہے،

جلوہ تجھے وہ اپنا ہر شے میں دکھاتا ہے
پردہ تری آنکھوں کا پر تیری ہی غفلت ہے

اور جب وہ دیکھ چکتا ہے تو بے خود اور سرمست ہو کر نعرہ زن ہوتا ہے،

ترا حسن ہم جلوہ گر دیکھتے ہیں
جہاں دیکھتے ہیں جدھر دیکھتے ہیں

کریں کیونکر دل کی نہ ہم پاسداری
کہ ہر دل میں ہم تیرا گھر دیکھتے ہیں

طالب حقیقت جب مطلوب کے دیدار سے شرف اندوز ہوتا ہے، تو اس موقع کی لذت کی کیفیت جو ظفر نے بیان کی ہے، وہ ملاحظہ ہو،

مری آنکھ بند تھی جب تلک وہ نظر میں نور جمال تھا
کھلی آنکھ تو نہ خبر رہی کہ خواب تھا کہ خیال تھا

کہو اس تصور یار کو کہوں کیوں نہ خضر خجستہ پے
کہ یہی تو دشت فراق میں مجھے رہنمائے وصال تھا

مرے دل میں تھا کہ کہوں گا میں جو ہیں رنج مجھ کو ملال کے
وہ جب آگیا مرے سامنے نہ تو رنج تھا نہ ملال تھا

وہ ہے بے وفا وہ ہے پر جفا وہاں لطف کیسا وفا کہاں
فقط اپنا وہم و خیال تھا یہ خیال امر محال تھا

پس ذبح سن کے تری صدا ترا شوق دید جو بڑھ گیا
مجھے اضطراب کمال تھا یہی وجد تھا یہی حال تھا

ظفر اس سے چھپ کے جو صحبت کی تو یہ جانا ہمنے کہ واقعی
فقط ایک قید خودی کی تھی نہ قفس تھا کوئی نہ جال تھا

ظفر اس قرب و وصال کو اہل تصوف کی طرح ایک راز ضرور سمجھتا ہے، لیکن اس کا خیال ہے کہ یہ راز ایسا نہیں جو صرف محدود طبقہ ہی کو معلوم ہو سکے، خودی کو مٹا کر جس کسی نے دیدۂ بینا، اور دل مصفا، اور پھر سرگرمی جستجو اور جوش جنون پیدا کر لیا، تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ اس کا دل حقیقت آشنا نہ ہو، کتنے سادے الفاظ میں اس نے حقیقت کے راز کو ہمارے سامنے کھول کر رکھ دیا ہے،

جو عرش سے ہے فلک تلک سب کچھ اسی مین ہے — دیکھ آنکھ کھول کر
کیا کیا نہین ہے اس مین کہ سب کچھ اسی مین ہے — پر چاہیے نظر

دل اپنا پہلے زنگِ کدورت سے صاف کر — مانندِ آئینہ
پھر تو بغور دیکھ کہ اس آرسی مین ہے — کیا حسن جلوہ گر

پیدا نگاہ کر کہ تجلیِ حسنِ یار — سب جا ہے آشکار
شعلہ سے طور کے نہین کم روشنی مین ہے — ہر سنگ کا شرر

کیون کعبہ و کنشت مین سر مارتا ہے تو — سرگرمِ جستجو
تو جس کو ڈھونڈھتا ہے چھپا وہ تجھی مین ہے — پر تو ہے بیخبر

جوشِ بہارِ حسن سے کس گل کے اے صبا — ہے یہ جنون کا جوش
مصروف اس قدر جو گریبان دری مین ہے — ہر غنچہ ہر سحر

ہے دورِ جام و صحبتِ یارانِ زندہ دل — کیفیتِ حباب
کچھ ہے اگر مزا تو یہی زندگی مین ہے — باقی ہے دردِ سر

اے خود پرست پوچھتا کیا ہے خدا کی راہ — ہے وہ بہت قریب
گم کردہ راہ آپ تو اپنی خودی مین ہے — اس سے ہے دور تر

صد داغ سوزِ عشق سے کھا بلکہ صد ہزار — ہر داغ دل پہ تو
لذت تجھے نصیب اگر عاشقی مین ہے — اے سوختہ جگر

افشاے رازِ عشق نہ کر کہکے جی کی بات — پردہ ہی خوب ہے
جی ہی مین اپنے رہنے دے جو کچھ کہ جی مین ہے — خاموش اے ظفر

ظفر کا خیال ہے کہ حقیقت مستور نہین، ہم اس کو دیکھتے نہین، محض اس لیے کہ ہماری

آنکھوں پر خودی اور نفس کا پردہ پڑا ہے، اگر یہ پردہ ہٹ جائے تو تمام رموز سربستہ اور اسرار پوشیدہ ظاہر ہوجائیں، اور دل انوار الٰہی کا مظہر بن جائے، پھر ہمارے اور خدا کے درمیان کوئی تفاوت باقی نہ رہے، اسی کو واضح کرکے کہتا ہے ؎

دیا اپنی خودی کو جو ہم نے اٹھا وہ جو پردہ سا بیچ میں تھا نہ رہا
رہے پردے میں اب نہ وہ پردہ نشین کوئی دوسرا اسکے سوا نہ رہا

ایک جگہ اور کہتا ہے،

اگر تجھ میں اور اس میں پردہ حائل ہو تو بس یہ ہے | اگر ہے دیکھنا اس کو اٹھا دے اپنی ہستی کو

پھر کہتا ہے :۔

ہر جائے ہے قدرت تماشا مرے آگے | لیکن مری غفلت کا ہے پردہ مرے آگے

اب اس کے لیے ظفر کے یہاں عرفی کی طرح "شعار ملت اسلامیاں"[1] چھوڑنے اور نہ غالب کی طرح رسوم و قیود کے ترک کرنے[2]، اور نہ عام صوفیوں کی طرح حال و قال اور مقام و قیام پر پابند ہونے کی ضرورت ہے، ظفر کے نزدیک تصوف کی راہیں پیچ در پیچ نہیں،

راہیں ہیں دو مجاز و حقیقت ہی جنکا نام | رستے نہیں ہیں عشق کی منزل کے چار پانچ

چنانچہ اسکے یہاں انوار معرفت حاصل ہوتے ہیں تو اس طرح کہ

پردہ دوئی کا بیچ میں حائل اگر نہ ہو | دیکھے جدھر نگہ وہی پیش نگاہ ہے

---

[1] عرفی نے کہا ہے :۔

شعار ملت اسلامیان بگذار اگر خواہی | کہ در دیر مغان آئی و اسرار نہان بینی

[2] مرزا غالب کہتے ہیں :۔

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم | ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہوگئیں

بیان کی سادگی | ظفر نے جس طرح خیالات کو آسان اور سادہ بنانے کی کوشش کی ہے، اسی طرح اپنی شاعری میں زبان بھی نہایت ہی آسان اختیار کی ہے، اس کا پورا دیوان پڑھ جائیے مشکل سے کوئی غزل ایسی نظر آئے گی جس میں فارسی کی مغلق ترکیبیں اور غیر مانوس الفاظ استعمال کئے ہوں گے، اسی لیے بعض ہمعصر شعرا، کی طرح اس کی غزلوں میں بہت کم بیان اور معنی کا الجھاؤ پیدا ہوتے پایا ہے، بعض غزلیں تو سلاست اور روانی کا نمونہ ہیں، کچھ ایسی بھی ہیں کہ اگر انکی نثر بنانا چاہیں تو لفظوں کو آگے پیچھے کرنے کی بھی ضرورت نہیں پڑے گی، مثالیں ملاحظہ ہوں :-

ان کے دل میں غبار ہے دیکھیں — کس طرح سے صفائی ہوتی ہے
عاشق! زیر تیغ سر دھر دو — ابھی مشکل کشائی ہوتی ہے

آشنا ہو تو آشنا سمجھے — ہو جو نا آشنا تو کیا سمجھے
ہم اسی کو بھلا سمجھتے ہیں — آپ کو جو کوئی برا سمجھے
تو ہی کعبہ میں تو ہی بتکدہ میں — ہے وہ مشرک جو دوسرا سمجھے
اے ظفر وہ کبھی نہ ہو گمراہ — جو محبت کو رہنما سمجھے

میں ہوں عاصی کہ پر خطا کچھ ہوں — تیرا بندہ ہوں اے خدا کچھ ہوں
جز و کل کو نہیں سمجھتا میں — دل میں تھوڑا سا جانتا کچھ ہوں
صنما ہم کہیں تو کیا کہویں — بخدا ہم کہیں تو کیا کہویں
مدعی کہنے ہی نہیں دیتے — مدعا ہم کہیں تو کیا کہویں

مثل فوارہ سر بلند نہ کر — کہ بلندی کے ساتھ پستی ہے
رنج و غم کو خدا رکھے آباد — خانۂ دل میں ایسی بستی ہے

وہ بیت جمال اور ہی ہے — اس میں دیکھا کمال اور ہی ہے

ترا ابرو کہان ہلال کہان	مہ جبین پہ ہلال ورہی ہے

سہل ممتنع کی مثال ملاحظہ ہو:۔

وہ دل اپنا صنم	کیون نہ ہم تجھ سے کہین
چپ رہا جاتا نہین	کب تلک چپکے رہین
پھر رہا ہے دل مرا	کیون نہ پھر آنسو بہین
چشم و دل دونون بہے	ہم بھلا کس کو کہین
یہ ترے جور و ستم	یار ہم کب تک سہین
اس غزل پر سب ظفر	آفرین تجھکو کہین

ظفر کی شاعری کا بڑا حصہ اسی سادگی کا مکمل نمونہ ہے، ہر جگہ طرز بیان صاف، سادہ اور سہل ہے، بھاری اور گران لفظ بہت ہی کم ہین، ظفر نے اس قسم کا طرز جانکر اختیار کیا، خود کہہ گیا ہے،

اے ظفر چاہیے ہان لطف سخن مین ایسا	کہ جسے سن کے ہون سب عالم وجاہل محظوظ

چنانچہ بعض اوقات یہ سادگی اتنی بڑھ جاتی ہے کہ اس کی شاعری روزمرہ کی گفتگو معلوم ہونے لگتی ہے، مثلاً :

مرگیا بیمار اس کے نرگس بیمار کا	دوستو اچھا ہوا اچھا ہوا اچھا ہوا
خبر تجھے ہے کیا ہوا بگڑی کہین اس یار سے	آج کیون تو اے ظفر پھرتا ہے گھبرایا ہوا
ساتھ میرے چلے چلو چپ چپ	راہ مین تم نہ کچھ کہو چپ چپ
گھر مین چل کر شکایتین کرنا	یان نہ مجھ سے گلہ کرو چپ چپ
میرے جاتے ہی ان کی غیرون سے	پھر لگی ہونے گفتگو چپ چپ
ابھی صیاد کی لگی ہے آنکھ	نہ کرو شور بلبلو چپ چپ

دل کسی غنچہ لب کو تم نے دیا — اے ظفر تم جو رہتے ہو چپ چپ

جس کو سناؤں درد دل آئے نہ اسکو تاب — سنتے ہی یہ کہے کہ بس اے دردمند بس

اتنی زبان دراز نہ ہو یاں بھی ہے زبان — بس آپ کے کیجیے زبان اپنی بند بس

میری نگاہ ہے وہ غضب دیکھکر جسے — خنجر تو الحفیظ کہے الامان تیغ

ہوں وہ مثل زلف برہم اور نہیں — ان کی زلفوں کی بلائیں لوں جو ہوش

آؤ گھر میرے اے صنم آؤ — تمھیں اللہ کی قسم آؤ

قاصد لاؤ جلد خط کا جواب — ایک دم جاؤ ایک دم آؤ

اے بتو میرے خانۂ دل کو — دیر تم سمجھو یا حرم آؤ

میری گریہ سے ہے اگر منظور — سیر آب رواں ادھر آؤ

اتنی تاثیر ہے کہاں کہ جو تم — سن کے میری فغاں ادھر آؤ

آگئی میری جان ہونٹوں پہ — اب تو اے میری جان ادھر آؤ

جاؤ تنہا نہ تم تمھارے ساتھ — جائے گی میری جان کھڑے تو ہو

ہے پڑی دل جلوں کی آہ جہاں — تاب کیا تم وہاں کھڑے تو ہو

قد پہ نازاں ہے اپنے سرو چمن — اک ذرا تم بھی ہاں کھڑے تو ہو

شکایت کس سے کی میں نے بلا تو سامنے اسکو — کروں گا شکوہ میں تیرا معاذ اللہ معاذ اللہ

قد جاناں کو دوں تشبیہ کیونکر نخل طوبیٰ سے — کہاں وہ قد کہاں طوبیٰ معاذ اللہ معاذ اللہ

جو کہ عاشق کو جلائے جوں شمع — وہ بھی جلتا رہے آمین اللہ

اپنے مرنے کی دعا مانگوں — وہ ستمگر کہے آمین اللہ

جو ستائیں تجھے ان کو بھی ظفر — عوض اس کا ملے آمین اللہ

محبت کے یہ معنی ہیں کہ میں نے — وہی چاہا کہ جو کچھ تو نے چاہا
فقیروں سے جو پوچھو لذتِ عشق — ہاہاہا ہاہاہا ہا ہا ہا ہا ہا

اس بے تکلفانہ طرزِ بیان اور اندازِ گفتگو کو سن کر اگر اہلِ سخن ظفر ہی کی زبان سے یہ کہیں کہ ان ع

اشعار کے تصدق اس گفتگو کے صدقے

تو شاید حق بجانب ہوں گے،

محاورات: اس سادگی کے باوجود ظفر کو زبان پر اتنی قدرت ہے کہ بادشاہ سخن ہیں کہ زبان اور الفاظ پر فرمانروائی کرتا ہے، یہی وجہ ہے کہ قلعہ معلّیٰ بلکہ اردو زبان کا کوئی محاورہ ایسا نہیں جو اس کے دیوان میں موجود نہ ہو، اور ان محاورات کو اس خوبی اور صفائی سے اپنے اشعار میں باندھ جاتا ہے، کہ اشعار کی روانی میں کہیں فرق نہیں آنے پاتا، مثلاً چرانا ہے، اب اس مصدر سے جو ممکن اور مروج محاورے تھے، ان سب کو ظفر نے اپنی ایک غزل میں استعمال کیا ہے، ملاحظہ ہو:-

محبت کی کوئی اب آنکھ تجھ سے ہم چراتے ہیں — علم ہوں گر چہ سو شمشیر کہیں کب دم چراتے ہیں
نہیں شمشیر سے بجلی جھپکتی آنکھ میدان میں — نظر وہ دیکھ تیرا ابرُو سے پر خم چراتے ہیں
نہ دیکھو کون کب تک اشکوں کو اڑا کون تو دیکھ — کہ بانی زخم دل لے دیدہ پرنم چراتے ہیں
طفل اشک ہیں وہ جو باندھے جو در مژگان ہے — کہ آنکھوں میں سے کاجل دیکھ لو ہم چراتے ہیں
ظفر سر عشق کو سر بانددیتے ہیں محبت میں — و گرنہ جان اپنی یاں بڑے رستم چراتے ہیں

یا مثلاً توڑنا سے، دم توڑنا، قسم توڑنا، ستم توڑنا، قدم توڑنا، توبہ توڑنا، قشقہ توڑنا، نفس سرکش کو توڑنا، ان تینے محاورے کو ظفر نے جس طرح استعمال کیا ہے، ان کو بھی دیکھیے۔

زیر خنجر ترے بسمل جو یہ دم توڑتے ہیں
کوچۂ ظلم میں پھر آنے کی قسم توڑتے ہیں

دل مرا ایسے کے جو وہ سنگِ ستم توڑتے ہیں
کیا ستم کرتے ہیں کیوں ساغرِ جم توڑتے ہیں

ہر قدم پر ترے دیوانے سرِ دشتِ جنون
سیکڑوں خار سدا زیر قدم توڑتے ہیں

ابر مژگان سے بندھی رہتی ہے اشکوں کی جھڑی
تار رونے کا نہیں دیدۂ نم توڑتے ہیں

جام مل دیتے ہیں گو کرتے تامل ساقی
تو یہ ہم آج ترے سر کی قسم توڑتے ہیں

ہیں یہیں سبحہ و زنار برابر دونوں
نہ ہم یہ جوڑتے ہیں اور نہ یہ ہم توڑتے ہیں

کرتے ہیں پھر سر کاوش کبھی حضرتِ عشق
سیکڑوں دل میں مرے نشترِ غم توڑتے ہیں

نفسِ سرکش کو ظفر توڑتے ہیں جو اپنے
میرے نزدیک بڑا ہی وہ صنم توڑتے ہیں

اسی طرح اڑ جانا سے خبر اڑ جانا، رونق اڑ جانا، نیند اڑ جانا، رنگ اڑ جانا، تاب اڑ جانا، مے اڑ جانا وغیرہ محاورے مستعمل ہوتے ہیں، ان کو بھی ظفر نے اپنے اشعار کی لڑیوں میں پرو دیا ہے۔

جب چمن میں اسکے آنیکی خبر اڑ جائیگی
گل کی رنگت دم میں لے باد سحر اڑ جائیگی

آپ کا کیا جائیگا گر خواب میں آؤگے تم
نیند آنکھوں سے ہماری رات بھر اڑ جائیگی

خون کو دل لیگا میرے تو کفِ پا سے ترے
سرخی رنگ حنا اے فتنہ گر اڑ جائیگی

آئیگا وہ مہر وش لے دل تو شبنم کی طرح
تاب و طاقت تیری اسکو دیکھکر اڑ جائیگی

پر صبا کے کوئی پوچھے تیرے کیا آئیگا ہاتھ
خاک میری اس کے کوچے سے اگر اڑ جائیگی

شعلۂ رخسار ساقی گر ہوا پرتو فگن
مے جو ہے ساغر میں تیرے اے ظفر اڑ جائیگی

بلا ڈال دینا، مصیبت ڈال دینا، زنجیر ڈال دینا، شمشیر ڈال دینا، قلم ڈال دینا، دریا میں ڈال دینا، جدائی ڈال دینا، آگ ڈال دینا، ناتیر ڈال دینا جیسے محاورات پر ظفر کی طبع آزمائی سنئیے۔

دل پر بلائے زلفِ گرہ گیر ڈالدی | تونے مصیبت اے مری تقدیر ڈالدی
جب روبرو وہ آئے تو پائے نگاہ میں | موج سرشک چشم نے زنجیر ڈالدی
اپنی بھویں بنا کے دکھائیں جو یار نے | شمشیر گرتے ہاتھ سے شمشیر ڈالدی
لکھا جو ہم نے اپنی سرافگندگی کا حال | گردن قلم نے بھی دم تحریر ڈالدی
جب ہم سمجھ گئے کہ ہے تقدیر کیمیا | دریا میں ہم نے جیسی تھی اکسیر ڈالدی
چوں مہر ومہ ہم ہوئے دو بار گرد ورنہ | تونے جدائی اے فلک پیر ڈالدی
کیا خاک دل مرا ہو خالی کہ اور بھی | تونے نہ آگ نالۂ شب گیر ڈالدی
مانی دکھا کے اپنا مرقع خجل ہوا | جب اس کے سامنے تری تصویر ڈالدی
کیونکر نہ ہو اثر دلِ عالم میں اے ظفر | تیرے سخن میں عشق نے تاثیر ڈالدی

کھینچنا کے مختلف محاورات بھی سن لیجیے :-

جو خنجر گل نے عندلیب زار پہ کھینچا | تو قمری کو بھی ہے سروِ چمن نے دار پہ کھینچا
کھڑا ہوں محوِ حیرت یوں لگا دیوار سے تیرے | کسی نے نقش ہو جیسے کوئی دیوار پہ کھینچا
وفا کا کر کے تو اقرار ہم سے ہو گیا منکر | تری الفت سے ہم نے ہاتھ اس انکار پہ کھینچا
جلا دیگا جہان کو دیکھ لینا یہ دلِ سوزان | جو نالہ اس نے اور اک آہ آتشبار پہ کھینچا
خطِ رخسار کو تیرے جو دکھلائے گلستاں میں | قلم سب خوشنویسوں نے خطِ گلزار پہ کھینچا
ہوئی کچھ تو دل بسمل کی اپنی صورت تسکین | تری تصویر کو جب سینۂ افگار پہ کھینچا
دل زخمی سے اپنے ناوک دلدوز کو اسکے | اگرچہ کھینچنا تھا اے ظفر دشوار پہ کھینچا

ظفر کے دیوان میں محاورہ بندی کی سیکڑوں مثالیں ملیں گی، ہم نے طوالت سے بچنے کے لیے صرف چند مثالوں پر اکتفا کیا ہے، لیکن انہی سے اندازہ ہوا ہوگا کہ ظفر کو زبان پر کتنی قدرت تھی

سچ تو یہ ہے کہ وہ اپنے کو الفاظ کا تابع نہیں بناتا ہے، بلکہ الفاظ کو اپنا تابع بناتا ہے، اسی لیے وہ الفاظ کے ساتھ کھیلتا ہے، اور اسی تفریح او رکھیل میں زبان اور بیان میں ایک خاص لطف اور چاشنی پیدا کر دیتا ہے،

صنائع لفظی | اس کا کلام لفظی صناعی سے جو متاخرین کے کلام کا زیور ہے خالی نہیں، پہلے مصرع کے لفظوں کو الٹ پلٹ کر دیکھئے کیسے دوسرا مصرع بنا لیتا ہے،

یہی ایک غم ہے، یہی اک الم ہے	یہی اک الم ہے یہی ایک غم ہے
مری چشم نم ہے اسی رنج و غم میں	اسی رنج و غم میں مری چشم نم ہے
خدا کی قسم ہے یہ کہتا ہوں سچ میں	یہ کہتا ہوں سچ میں خدا کی قسم ہے
کیا کیا رقم ہے، کوئی شکوہ میں نے	کوئی شکوہ میں نے کیا کیا رقم ہے
ظفر کیا ستم ہے ہوا دوست دشمن	ہوا دوست دشمن ظفر کیا ستم ہے

آیا سحاب ساقی تو لا شراب ساقی	تو لا شراب ساقی آیا سحاب ساقی
ہے پیچ و تاب ساقی زلفوں سے تیرے دل کو	زلفوں سے تیرے دل کو ہے پیچ و تاب ساقی
کیا مست خواب ساقی آنکھیں ہیں آج تیری	آنکھیں ہیں آج تیری کیا مست خواب ساقی
مے آفتاب ساقی ہے ہم خنک دلوں کو	ہے ہم خنک دلوں کو مے آفتاب ساقی
مست و خراب ساقی تو بزم میکشاں کو	تو بزم میکشاں کو مست و خراب ساقی
جام حباب ساقی دریا میں کس نے الٹا	دریا میں کس نے الٹا جام حباب ساقی
ہے یہ عذاب ساقی تو ہے ظفر سے بد تر	تو ہے ظفر سے بد تر ہے یہ عذاب ساقی

بدیع کی اصطلاح میں اس کو عکس کہتے ہیں، یہ صنعت اردو کے کسی اور شاعر کے یہاں میری نظر سے نہیں گذری، البتہ قدیم فارسی شعراء کے یہاں ملتی ہے، اس کے علاوہ دوسری لفظی صنعتیں

بھی ظفر کی شاعری مین پائی جاتی ہین، مثلاً

۱- تنسیق الصفات یعنی کسی موصوف کی پے در پے صفتون کا لانا، جیسے

شوخ چشمے خوش نگاہے بیوفائے بدگمانے — دلفریبے دلنوازے دلربائے دلستانے
مست نازے فتنہ سازے تند خوے جنگجوے — ظلم کیشے ظلم کوشے ظلم خواہے ظلم رانے
کج کلاہے کج ادائے پرفریبے پردغائے — بدطریقے بدشعارے بدمزاجے بدزبانے
خوش نگاہے خوبرویے بذلہ سنجے نغز گوے — ہوشیارے حرف گیرے نکتہ طبعے نکتہ دانے
خودپرستے خودنمائے خودپسندے خودستائے — خودسرے ناآشنائے سرکشے نامہربانے
ہم ظفر ہین اس پہ مفتون خواہ رسوا از جنون — وہ یہ مانے یا نہ مانے وہ یہ جانے یا نہ جانے

۲- لزوم مالایلزم یعنی قافیہ کے آخری حرف (روی) کے پہلے کسی خاص حرف کا التزام کرلینا، جیسے

توبہ اے ساقی نہین پینے کا مین جام شراب — مجھ کو اپنی بادۂ وحدت کی مستی خوب ہے
جس طرح مژگان بنے میرے ہین بندھے اشکو نکے تار — اس طرح بدلی نہین کوئی برستی خوب ہے
خواب مین جلوہ دکھا دیتا ہے وہ مہوش کسے — چشم میری دیکھنے کو جب ترستی خوب ہے
راہ بہتر ہے وہ ہموار رہرو کے لیے — نہ بلندی ہو بہت اچھی نہ پستی خوب ہے
خودپرستی چھوڑ دو ہے بت پرستی ہو صریح — غافلو حق مین تمھارے حق پرستی خوب ہے

۳- سیاق الاعداد یعنی کلام مین اعداد کا لانا جیسے

چلنا مریض غم کو تیرے آٹھ نو قدم — معلوم ہوئے ضعف سے دس بیس سو قدم
پہلے تھا ایک ستم پھر ہوئے ایک سے دو — دو سے پھر چار ہوئے ہو گئے اب چار سے چھ
چار یار آٹھ پہر مین ہین وہ ان سے ملتے — ان سے ملنے کی ہین معلوم جنھین گھاتین چار
ناحق کرین ہین زخمون کو دو دو ملا کے ایک — تھے آٹھ دس سو ہو گئے اب چھل کے چار پانچ

پھپھولے دل پہ جو دس بیس داغ ہیں تو ہیں — تو قمقمے ہیں بہت اور چراغ ہیں دو ہیں

۴۔ تلمیع یعنی کلام میں ایک حصہ دوسری زبان کا لانا، جیسے

جلوۂ شبنم و گل پر ہے رلاتی مجکو — دم گلگشت چمن یاد رخ پر عرقے

کچھ عوض دل کے وہ تکرار سے دیتا ہو تو کیا — اے برالمے یا قلقے برقطقے

رخ گلگوں پہ ترے اس گل کے نزنک کی تحریر — جلوۂ صبح بہاران و بہار شفقے

اے ظفر تم کو ہے منظور اگر رد حسود — تو پڑھا کیجیے قل اعوذ برب الفلقے

۵۔ حسن التکریر، اس کی مثالیں تو ظفر کے یہاں کثرت سے ہیں، ہم صرف چند اشعار پیش کریں گے،

مجھ میں اور گل اس میں باہم گفتگو تھی صاف صاف — بات کی لغزش نہ تھی واللہ جو تھی صاف صاف

نکہت گل لے گئی دل کو ہمارے باغ میں — تیری ہی سی لے سراپا ناز و بو تھی صاف صاف

شمع کی طرح سے ہم رات کو روتے رہتے — بہ گئے آنسوؤں میں صبح کے ہوتے ہوتے

موت یار آئی تو غفلت سے ہوں یوں ہم ہشیار — ڈر کے جوں خواب میں چونکے کوئی سوتے سوتے

آگاہ تو کیا مجھے لذت سے عشق کی — زخموں میں اس نے میرے نمک کر بھرا بھرا

کیا بھر دیے ہیں کان خدا جانے غیر نے — غصے میں جو بھرے ہے وہ کافر بھرا بھرا

گہ یاس و گہ امید و گہے رنج و گہہ خوشی — مہمان سرائے دل میں ہیں مہمان عجب عجب

اے چشم یار بار نہ ہو دیکھ اشک بار — ہر بار تجھ سے اٹھتے ہیں طوفان عجب عجب

گل جو چمن میں ہیں ہزار دیکھ ظفر ہو کیا بہار — سب کا ہے رنگ جدا جدا سب کی ہے بو الگ الگ

تجھے وے سیر چمن کے گلہائے تازہ — مرا دیدۂ خون چکان اچھے اچھے

گر آہ و نالہ دونوں پیدا ہوں ایک دل سے — لیکن الگ ہے تاثیر اپنی اپنی

خالی نہین جہان مین تمنا سے کوئی دل ‫ ‫ ہر ایک مین ہے گرچہ تمنا جدا جدا

ایک ہی تشبیہ کو طرح طرح سے ادا کرنا	ظفر کے یہان ایک چیز اور ہے جس سے اس کی قدرت کلام کا حال معلوم ہوتا ہے زلف اور سانپ کی تشبیہ معمولی چیز ہے، مگر دیکھیے کہ ظفر اس معمولی چیز مین اپنی

جدت طبع سے کیسی کیسی ندرتین پیدا کرتا ہے،

نہین اس رخ پہ زلف اوز بیر زلف اس کے لعل کا شہ ‫ ‫ چمن مین ناگ سا لڑتا ہوا ناگن سے نکلے ہین

دیکھ کر آئینے مین وہ زلف کو ہنسنے لگے ‫ ‫ بنہ پانی مین پڑا طرفہ کہین کا سانپ ہو

چاند پر دوڑتا ہے مار سیاہ شب تار ‫ ‫ رخ روشن پہ ترے زلف کے بل کھانے سے

زلف یون ہے عرق آلودہ پہ لہرا تی ہے ‫ ‫ جیسے چون ناگن کا ون پہ چاٹنے اوس آتی ہے

زلف یون چہرے پہ پلٹی ہے ہوا سے اسکے ‫ ‫ جس طرح مار سیہ کھائے ہے پل پانی کے بل

جس طرح مار سیہ گل سے لپٹ جاتا ہے ‫ ‫ زلف یون تیری گئی ہے گل رخسار سے مل

چون شانہ اسکو لے دل صد چاک تو نہ کھینچ ‫ ‫ مار سیہ سے کم نہین ہر گرہ تہ زلف

ناگنی زلف بتان کی ہے عجب کافر ہے ‫ ‫ کاٹ کے جیتی ہے یان ہو کے وہ تا اور ظفر

کیا تماشا ہے تری زلف کا عکس آئینہ مین ‫ ‫ سانپ کی طرح سے لہرکے ہے تالاب مین موج

نچوڑے زلف نہا کر جو وہ تو قطرہ آب ‫ ‫ وہ لن پہ مار سیہ کا لعاب تھا خالص

حلقہ ہے بلا زلف کا اسے پنجۂ شانہ ‫ ‫ دیکھو کہین انگلی نہ سیہ مار کے منہ مین

اڑکر بھی زلف یار سے ناگن نہ بچ سکی ‫ ‫ جس وقت اس کے منہ پہ پڑی مار کھا گئی

سو چتا ہی مین چھوٹ اس کی زلف دراز نکلی ‫ ‫ سانپ کی کہین کہین سانپ سی کو کھلا

نہین اس یار کے رخ پہ عرق آلودہ زلف ‫ ‫ اس کو چاٹتا ہے سانپ سیہ پیاسا کا لا

کیون نہ سوتے سوتے چونک اٹھے ہو اب ان ظفر ‫ ‫ وہ مار زلف دیکھ کے تھا ڈستے سے ہوا

دکھاتے کان کے بالے میں اسکو زلف الجھا کر — نہ دیکھا جس نے ہو مار سیہ سے لوٹتے بچھو کو

کہتا ہوں دل کو زلف کی ناگن سے کر حذر — جاتی پلٹ ہے دیکھ یہ بدذات کاٹ کے

زلف آ گئی صبا سے وہ خال دہن کے پاس — مار سیاہ کھسک کے گیا اپنے من کے پاس

ناگن سی باغ میں کوئی لہرا رہی ہے یہ — یا زلف تیرے چہرہ پہ کھائے ہے بل پڑی

ہوا سے یوں جو تیری زلف عنبریں الٹی — کسی کو ڈسکے یہ ناگن نہ ہو کہیں الٹی

یار کی زلف کو سنبل سے تشبیہ دینا عام بات ہے مگر دیکھئے کہ ظفر نے اسی ایک تشبیہ ذرا ذرا رنگ بدل کر کس کس طرح ادا کیا ہے ،

مجھے آئے نہ رونا دیکھ کر کیوں سنبل تر کو — کہ پھر جائے ہے اسکی زلف دل پر آنکھوں میں

سنبل کی لہر سے نہ رہے پھر یہاں مطلب — یاد مست جو تم کاکل خم دار دکھا دو

سنبل ہی کیا پریشان ہے دیکھ زلف تیری — موج نسیم کو بھی ہے پیچ و تاب ساقی

تا حشر نہ ہو خواہش نظارہ سنبل — تم ہم کو اگر زلف گرہ گیر دکھا دو

مرے مزار پہ روئیدہ کیوں نہ ہو سنبل — کہ تیری زلف سے ہے دل کو پیچ و تاب ہنوز

تری زلف کے سامنے تاب کیا — کہ بل باغ میں شاخ سنبل کرے

سنبل چمن میں کیوں نہ ہو غرق آب شرم — منہ دھو کے وہ بال سنوارے علی الصباح

اگر ہو عکس افگن یار کی کاکل سمندر میں — تو پیدا جائے موج آب ہو سنبل سمندر میں

انھیں ہے رشک سے اس زلف پرشکن کی عجب — کہ شاخ سنبل تر کھا کے پیچ و خم ٹوٹے

بیاں کیونکر بھلا ہووے صفت اس زلف پیچاں کی — نہ جب تک چل کے کیجیے سیر کچھ سنبلستاں کی

زلف اسکی پر شکن سے کیا بلا کرتی ہے بل — دیکھ کر کھا گئی گلستاں شاخ سنبل باغ میں

سنبل پیچاں اگے کیونکر نہ اسکی خاک سے — مر گیا جو دیکھ کر اس زلف عنبر بو کے بل

ہے نہ قربان ہی رخ قاتل خونریز پہ گل — کھاتی سنبل بھی ہے اس زلف دلاویز پہ گل

سنبل پہ گئی اوس ہی پڑ جب کہ دم غسل — پانی ترا اس زلف گرہ گیر سے ٹپکا

یار کے ابرو کو شمشیر سے تشبیہ ہر شاعر نے دی ہے، مگر دیکھیے کہ ظفر نے اس تلوار کے کیسے کیسے ہاتھ دکھائے ہیں،

جب ہو گئی وہ ابروئے خمدار سامنے — دی پھینک اپنے ہاتھ سے تلوار سامنے

کون ہمسر ہو سکے اس ابروئے خمدار سے — دم نہ اتنا تیغ میں ہے نے اس قدر خنجر میں ہے

کون منت کش شمشیر اجل ہو وقت قتل — طاق تیرا خم ابرو ہی ہے خونخواری میں

قتل کریں اک عالم کو وہ ابروئے پرخم ایسے ہیں — ان شمشیروں کے ہیں مقابل دیکھو یاں ہم ویسے ہیں

کس نے دیکھا خم ابرو کو جو بیگانے ہیں — چل رہی آج جو تلوار ہے ہمسائے میں

نہیں شمشیر سے جن کی چمکتی آنکھ میدان میں — نظر وہ دیکھ تیرا ابروئے پرخم چراتے ہیں

ہے طرفہ طلسم ابروئے دلدار میں تیرے — اک قبضۂ تلوار میں ہیں عربدہ گر دو

کیا لائے اس ابرو کی بھلا تاب دم تیغ — ہو جائے اسے دیکھتے ہی آب دم تیغ

جب جنبش ابرو سے تری قتل ہو عالم — پھر شرم سے ہو جائے نہ کیوں آب دم تیغ

جلاد دکھا اپنی تو شمشیر نہ مجھ کو — کشتہ ہوں میں ابرو کا جو ہے آب دم تیغ

تیغ ابرو سے میں جا نہ ظفر سینہ سپر — ہے ازل پڑا نہیں وہاں سے تلوار کے خط

ابرو پہ اس کے چیں کا عالم ظفر ہے اور — جوہر نہاں ہیں یہ کسی شمشیر میں غلط

ابرو کو اسکی کہتے ہیں سب تیغ اصفہان — ہے اصفہانیوں میں کمان ابروئے خم و تیغ

کہاں ہو دل میں گنجایش تری تیغ دو ابرو کی — میان کب اک میان میں دو شمشیر ہوتی ہیں

جہاں کو جنبش ابرو سے اس نے قتل کیا — الٰہی اسکی یہ شمشیر کل لگی تھی کیوں

جیسے ہو حسین اس ابروئے پر خم پہ خوشنما　　جوہر کہیں بھی ایسے نہ شمشیر پہ کھلے

ابرو چلی جو اس کی عجب سیر ہو گئی　　تلوار چلتے چلتے رہی تیر ہو گئی

معشوق کی مست آنکھوں کا نقشہ کس کس طرح کھینچتا ہے،

یاد چشم مست میں اس کی یہ کیفیت رہی　　ہوش باطن میں رہا ظاہر مجھے غفلت رہی

ہم نہ کہتے تھے کہ نرگس کو دکھا مت چشم مست　　نیند اس کی آنکھ دیکھ کے مست خواب اڑ جائیگی

کر دیا اک نگاہ میں بے خود　　چشم کا فن ہے کیا خدا جانے

تری آنکھوں نے خدا جانے کیا کیا جادو　　ہم بھی دانا تھے پر اب تک تو ہیں دیوانے

ہم کو اس دور میں ہو کیوں طلب ساغر مے　　یہ تو جب ہو کہ تری نرگس مخمور نہ ہو،

سو فتنہ خوابیدہ بیدار ہوں اک پل میں　　گر خواب میں بھی دیکھے اس نرگس فتاں کو

مجھے سوجھے ہے کیفیت جہان کی　　وہ چشم مست ساقی جام جم ہے،

عین مستی میں جو تو اپنی دکھلائے آنکھ　　شرم سے نرگس کی گلشن میں نہ کیوں جھک جائے آنکھ

اشک آنکھوں میں اپنی کیوں نہ ڈبڈبا کر　　ساغر مے دیکھ کر جس کو تری یاد آئے آنکھ

اپنی چشم مست کی گردش نہ اے ساقی دکھا　　دیکھ چکر میں ابھی جام شراب آ جائے گا

بھرا ہوا ہے تری چشم مست میں یوں ناز　　کہ جس طرح سے مے ناب ہو ایاغ کے بیچ

اٹھا کے آنکھ نہ دیکھا چمن میں نرگس نے　　رہا ہو اس کو تری چشم پر حیا کا لحاظ

کرے ہے فتنہ تری چشم فتنہ زا کا لحاظ　　یہ وہ بلا ہے بلا کو ہے اس بلا کا لحاظ

کشتہ ہوں چشم مست کا میرے مزار پہ　　لازم ہے جام بادۂ انگور کا چراغ

روشن ہو چشم مست کے کشتہ کے گور پہ　　روغن کی جائے بادۂ انگور سے چراغ

کیفیت اپنی چشم سیہ مست کی نہ پوچھ　　صوفی تمام دیکھ کے میخوار ہو گئے

منظور ہے ظفر کو لکھے وصف چشم یار　　نرگس کے دے قلم کوئی اے ہمنشین تراش

چشم مست اسکی ہے ہی جائے ہے ہوش　　گرچہ ہم ہوشیار رہتے ہین

چشم اس کی خود ہی سحر نگاہین ہین　　حاجت نہین ہے سرمہ جادو کی آنکھ مین

کاسۂ چشم تصور چھوڑ کر اپنا کبھی　　اے ظفر محو تماشا ہین نہ جام جم مین ہون

بغیر بادہ کبھی اس شوخ خود پرست کی آنکھ　　نشے مین حسن کے ایسی ہے جیسے مست کی آنکھ

مشکل بندی | مگر ذوق کا تو ربطیع اور کمال فن اس وقت نظر آتا ہے، جب وہ نہایت مشکل اور سنگلاخ ردیف اور قافیے اختیار کرتا ہے، اس کی مثالین اس کے دیوان مین اس کثرت سے ہین کہ اس کتاب کے محدود صفحے ان کے متحمل نہ ہو سکین گے، گو سخن شناسی کا تقاضا تو یہی تھا، کہ اس نے جتنے مشکل قوافی مین طبع آزمائی کی ہے، اور جن سنگلاخ زمینوں مین جولانیان دکھائی ہین، ان سب کی داد دل کھول کر دی جاتی، مگر ہم تھوڑے سے اشعار پر اکتفا کرتے ہین، قوافی کی مثالین:-

پارۂ ساغر و شیشہ نہین ابرک کے ورق　　ساقیا کیونکر کہون شیشے کو عینک کے ورق

یون ہین تختۂ دل سپارہ ہے اشک کے ساتھ　　جیسے قرآن سے ہوا ہین کو دھک کے ورق

اس غزل مین چابک کے ورق، زردک کے ورق، چشمک کے ورق، مشبک کے ورق، پھلک کے ورق وغیرہ بھی قافیے ہین،

ٹپکے ہے خاک پہ دامانِ پاش پاش کے پھینک　　چھپے نکلے ہی پاتو سر راہ اپنی کاش کے پھینک

ہلال عید تھا کہ بہ پہ مشغل کیا کیا　　زمین پہ ناخن پا تو جو شے تراش کے پھینک

پاش کے پھینک، تلاش کے پھینک، خراش کے پھینک، معاش کے پھینک، قماش کے پھینک کو بھی استعمال کیا ہے،

ترے بیمارِ غم کا حال ہے یہ ناتوانی سے　　کہ اس نے آج بستر پر ذرا کروٹ نہین بدلی

بقیہ قوافی کھٹ کھٹ نہین بدلی، پٹ پٹ نہین بدلی، چوکھٹ نہین بدلی، جھٹ پٹ نہین بدلی،

رٹ سٹ نہین بدلی، وغیرہ،

دل جل گیا ہمارا جگر بھن گیا تمام　　الفت تمھاری شعلہ رخو بھاڑ مین پڑے

کھڑ کاڑ مین پڑے، تاڑ مین پڑے، چوپاڑ مین پڑے، ہڑواڑ مین پڑے، بوچھاڑ مین پڑے،

دھاڑ مین پڑے وغیرہ

یہ خانہ باغ ہے موجود سینہ پر داغ　　جو سیر دیکھیے تو وہ دل کی شہ نشین پہ ٹکے

زمین پہ ٹکے، انگبین پہ ٹکے، آستین پہ ٹکے، مہ جبین پہ ٹکے، نگین پہ ٹکے، یاسمین پہ ٹکے وغیرہ،

اسیطرح مختلف سنگلاخ زمینون مین ظفر نے جو زورِ طبع دکھایا ہے، وہ خاص اسی کا حصہ ہے،

وہ نئی نئی زمینین نکالتا تھا، اور ان مین شعر کہکر اپنی مشکل پسندی کا اظہار کرتا تھا، اس کے معترف

مولانا محمد حسین آزاد بھی ہین، جو ظفر کے تمام کلام کو ذوق کے عنوان شاعری کی محض زلہ ربائی سمجھتے

ہین، وہ با دل ناخواستہ رقم طراز ہین کہ ظفر شاعری مین طبیعت اور ایجاد کا بادشاہ تھا،

اس کی ان جدتون کے نمونے بھی اس قدر زیادہ ہین، کہ ان کا ایک ایک شعر بھی نقل کرنا

طوالت کا باعث ہوگا، کچھ نمونے ملاحظہ ہون، خط کشیدہ قوافی مین پوری پوری غزلین ہین،

ہو درد ہوتا تو غل مچاتا جو سایہ ہوتا تو سر ہلاتا　　الٰہی دل کو مرض یہ کیا ہو نہ منہ سے بولے نہ سر سے کھیلے

ہم اپنا عشق چمکائین تم اپنا حسن چمکاؤ　　کہ حیران دیکھکر عالم ہمین بھی ہو تمھین بھی ہو

زبان مین ہو اثر میری تو شاید دل پھرے اس سے　　اگر نا صح دعا دل سے کوئی یون ہو تو یون بھی ہو

سجدہ کرنے کے ہان چشم عنایت ہو تو کینہ کیونکر ہو　　کہ بے اشک ندامت جوش رحمت ہو تو کیونکر ہو

رباب و چنگ ہو بزم طرب ہو اور مطرب ہو　　دف و نے ہو، دل ہو، پھر تو جلسین ہون تماشا ہو

کس سے انھوں نے شیوۂ مہر و وفا کی جس سے لیا دل اس سے دغا کی ‏ ‏ ان سے ہو کیا امید کرم یہ کس کے ہوئے اور کس کے ہوں گے

شرارہ سے کہتے تھے شعلے شب کو نالوں کے ‏ ‏ کہ چمکے چرخ پر اختر تو ہم جیسے نہ تم چمکے

نہیں گل تن پہ عشق دلربا میں پھول کھلتے ہیں ‏ ‏ تماشا ہم نے یہ رنج و بلا میں پھول کھلتے ہیں

غم نہیں ہونے نہ ہونے کا کہ بے پروا ہیں ہم ‏ ‏ ہے تو ہے سب کچھ میسر کچھ نہیں تو کچھ نہیں

خالی نہیں خلش سے محبت کے کوئی بھی ‏ ‏ یارو کھٹکتی جان میں یہ گل کی پھانس ہے

ظفر کی طبیعت کو مشکل زمینوں میں جولانی دکھانے میں خاص مناسبت تھی، وہ خود کہہ گیا ہے کہ

دل اپنا فکر غزل میں ظفر نہیں لگتا ‏ ‏ زمین غزل کی نہ ہوئے اگر انوکھی سی

اور اس مشکل پسندی کو وہ اپنا امتیاز سمجھتا ہے،

زمین سہل میں تو ہیں سبھی کچھ شعر کہہ لیتے ‏ ‏ ظفر لکھتے غزل جو اتنی مشکل میں تو آپ ہی ہیں

ایک دوسری جگہ کہتا ہے،

ظفر مشکل پسندی تیری سی ایک کسکو آتی ہے ‏ ‏ سخنور دیکھ کر یہ طرز مشکل ہاتھ ملتا ہے،

ایک جگہ تو چیلنج دیتا ہے،

ظفر ان قافیوں میں کہہ نہیں سکتا غزل کوئی ‏ ‏ اگر کہتا ہی ہے تو تجھ سے اصلاح غزل لے ہے

ظفر کی یہ تعلی ایک حد تک بجا ہے. اس کے ہمعصر شعرا میں سے کسی نے بھی ایسے سنگلاخ قافیوں ردیفوں، اور زمینوں میں غزل نہیں لکھی ہے، انشا اور شاہ نصیر کے یہاں اس کی مثالیں ملتی ہیں، مگر اتنی نہیں

ظفر اور اساتذۂ فن

ظفر کا زور طبع اسی پر ختم نہیں ہوتا، بلکہ ریختہ کے جتنے با کمال شعرا گذرے ہیں ان کی غزلوں پر غزلیں کہی ہیں، ان کی بعض مثالیں ملاحظہ ہوں ؛-

میر: فائدہ مصر میں یوسف رہے زندان کے بیچ
ہیچ تھے کیوں نہ زلیخا سی کنعان کے بیچ

ظفر: دم میں دم میرے نہیں جان نہیں جان کے بیچ
زلف کیا کہتی ہے جھک جھک کے ترے کان کے بیچ

درد: دیکھیے جس کو یاں اسے اور ہی کچھ دماغ ہے
کر یک شب چراغ بھی گوہر شب چراغ ہے

ظفر: دنیا فروغ دل میں محبت کا داغ ہے
رہتا بغیر داغ یہ گھر بے چراغ ہے

انشا: بنا کے چھوڑوں جو افیون کا شراب میں سانپ
تو صاف آئے نظر جرم آفتاب میں سانپ

ظفر: اگر شراب کی موجیں بنیں شراب میں سانپ
خط شعاع سے لہرائیں آفتاب میں سانپ

مصحفی: سر مشک کا ہے تیرا تو کافور کی گردن
نے موئے پری ایسے نہ یہ حور کی گردن

ظفر: دیکھے جو ہمائے بت مغرور کی گردن
غلمان کے تن سے ہو جدا حور کی گردن

آتش: ذرہ خورشید ہو پہنچے جو دربار کے پاس
سایہ میں جائے ہما اوس کے دیوار کے پاس

ظفر: آبلہ سینہ پہ ہے میرے دل زار کے پاس
پا کے شیشہ سا دھرا ساقی سرشار کے پاس

ناسخ: ایک شب تو بھی محفل میں نہ پائے یار شمع
صبح ہوتے ہوتے ہوتا تند رشتہ زار شمع

ظفر: دریا بہائے گر مژہ اشکبار شمع
تو بھی بجھے نہ سوز دل داغدار شمع

شیفتہ: دن سے یہاں آنے کی تدبیر ہے
کیا اثر نالۂ شب گیر ہے

ظفر: شوق غبار دشت دامن گیر ہے
اور مجنوں پائے در زنجیر ہے

غالب کا طرز بیان اور ان کی نکتہ آفرینیاں اپنی جگہ پر لیکن ایک ہی قافیہ اور ردیف میں ظفر نے اپنے استاد کی تقلید میں جو اشعار کہے ہیں، وہ بھی ذرا سن لیجیے:

غالب

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

ظفر

کیا ذکر کچھ کلام میں واعظ کے ہو مزا
محفل میں وصف بادہ و ساغر کہے بغیر

غالب	ظفر
سب کہاں کچھ لالہ و گل مین نمایان ہوگئین	واہ اس صورت کدہ مین دیکھتے ہی دیکھتے
خاک مین کیا صورتین ہونگی جو پنہان ہوگئین	صورتین کیا کیا نظر سے اپنے پنہان ہوگئین
وہ نگاہین کیون ہوئی جاتی ہین یارب دلکے پار	جس سے چار آنکھین تری اے آفت جان ہوگئین
جو مری کوتاہی قسمت سے مژگان ہوگئین	تیر سی اس کے جگر کے پار مژگان ہوگئین
نیند اسکی ہے، دماغ اسکا ہے، راتین اسکی ہین	اے ظفر دل کی پریشانی کا ہے میرے اثر
تیری زلفین جس کے بازو پر پریشان ہوگئین	یہ جو اس کافر کی زلفین ہین پریشان ہوگئین

اللہ رے ذوق دشت نوردی کہ بعد مرگ — یہان تلک ہے ذوق دشت نوردی کہ ڈھونڈتا ہے

ہلتے ہین خود بخود مرے اندر کفن کے پانو — ہین اپنے بعد مرگ بھی باہر کفن کے پانو

مومن کی ایک غزل کا مطلع ہے۔

"نامہ لکھتے ہین جو لکھا تو یہ بھیجیگا کاغذ — کہ بنا ہم گھر صفحۂ دریا کا غذ"

ظفر نے قافیہ کے تغیر کے ساتھ اسی ردیف مین کئی غزلین کہی ہین:

جوش گریہ کا یہ عالم ہے کہ ترے نامہ کو — دیا آنکھون سے بھی ہم کو نہ لگانے کاغذ

دل بیتاب کو تسکین ہو کیا قاصد کی باتون سے — نہ آئے جب تلک اس یار کی تحریر کا کاغذ

ظفر سے متقدمین یا اس کے معاصر شعراء کی غزلون کے مقابلہ مین جو اس کی غزلین نقل کی گئی ہین، ان کا ہرگز یہ منشا نہین کہ

ظفر تیرے سخن کے روبرو کسکا سخن چمکے — سخن کی تاب طاقت ہی نہین رہتی سخندان کو

یا:

سخنوری مین ظفر کون تم سے ہو ہمسر — خدا نے تمہین دل و دماغ دیا

بلکہ صرف اس قدر دکھانا مقصود ہے کہ

ظفر کہتے ہیں ہم بھی وضع استادانہ رکھتے ہیں

ظفر و میر | اوپر غزلوں میں ظاہری حیثیت سے باکمال شعراء کے کلام کے مقابلہ میں ظفر کا زور طبع دکھایا گیا ہے، معنوی حیثیت سے بھی اس کے کلام میں مختلف استادوں کا رنگ پایا جاتا ہے، میرؔ کے رنگ میں کہتا ہے:

تیرے جس دن سے خاک پا ہیں ہم — خاک میں لیک کیمیا ہیں ہم

تیرہ بختی میں ہیں یہ بخت سفید — کیا مگر سایۂ ہما ہیں ہم

ہم ہیں جوں زلف و عارض خوبان — گو پریشاں ہیں خوشنما ہیں ہم[1]

یہ کراہا تیرا بیمار الم درد کے ساتھ — کسی ہمسایہ کو بیمار نے سونے نہ دیا

میں وہ مجنوں ہوں کہ زنداں میں نگہبانوں کو — میری زنجیر کی جھنکار نے سونے نہ دیا

بالیں پہ اس کے شور مچاؤ نہ ہمدمو — نازک بہت ہے عشق کے بیمار کا دماغ

یہاں تلک روئے جدائی میں تیرے ہم اے شوخ — اشک کی جا چشم سے لخت جگر پیدا ہوا

میرؔ کے طرز پر چھوٹی بحروں میں بھی غزلیں لکھی ہیں مثلاً

گور کنج فراغ ہے اپنا — داغ اپنا چراغ ہے اپنا

کون کنج حزن میں ہمدمساز — ایک دل سوز داغ ہے اپنا

درد دل درد آشنا جانے — اور بے درد کوئی کیا جانے

---

[1] اسی قافیہ اور ردیف میں میر کی ایک غزل کا مطلع ہے:

گرچہ آوارہ جوں صبا ہیں ہم — لیک لگ چلنے میں بلا ہیں ہم

میرؔ کی اس غزل پر ظفر نے مخمس بھی لکھا ہے، جو اس کے دیوان جلد اول صفحہ ۱۹۳ پر ملاحظہ ہو۔

ہو نمک سود گر نہ زخم جگر — دل محبت کا کیا مزا جانے

میر اور ظفر کے ملتے جلتے ہوئے مضامین،

میر — کیا عشق خانہ سوز کے دل میں چھپی ہے آگ — اک سارے تن بدن میں مرے پھک رہی ہے آگ
ظفر — داغ دل میں آگ تختۂ دل میں چشم تر میں آگ — عشق کی سوزش سے پھیلی ہوئی گھر گھر میں آگ
میر — جل جل کے سب عمارت دل خاک ہو گئی — کیسے نگر کو آہ محبت نے دی ہے آگ
ظفر — ہو گیا میں خاک جل کر پہ وہی ہے سوز دل — اپنے دامن کو بچائے میرے خاکستر میں آگ
میر — یارب ہمیشہ جلتی ہی رہتی ہیں چھاتیاں — یہ کیسے عاشقوں کے دلوں میں رکھی ہے آگ
ظفر — جی جلائیں کیوں نہ میرا یہ بتان سنگدل — دل ظفر ان کا ہے پتھر اور ہے پتھر میں آگ
میر — اللہ ری عندلیب کی آواز دلخراش — جی ہی نکل گیا جو کہا ان نے ہائے گل
ظفر — آجائے گر ہوائے گلستان قفس تلک — بلبل کا دم ہوا ہو جو کہہ کر ہائے گل
میر — تیری ہی جستجو میں گم ہوا ہے کہ کہاں کھویا — جگر خوں گشتہ دل آزردہ میرا اس خانہ ویران کو
ظفر — تجھے دل دے کے میں اے کافر بے مہر کھو بیٹھا — خرد کو ہوش کو طاقت کو جی کو دین و ایمان کو

ظفر میر کے رنگ میں خود میر صاحب کی طرح سے خراج تحسین حاصل کرتا ہے۔

یہ غزل پڑھتے اگر بزم سخنداں میں ظفر — کیونکہ تحسین کے لیے پھر نہ سر میر ہلے

ناسخ و ظفر ظفر کی قادر الکلامی کا یہ عالم ہے کہ وہ متضاد رنگ میں کامیاب طبع آزمائی کرتا ہے، ناسخ اور میر کا اختلاف ذوق ظاہر ہے، مگر میر کے بعد جب وہ ناسخ کے رنگ کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو وہ رند مشرب عاشق بن جاتا ہے، اور اس کوچہ کا بھی ویسا ہی کامیاب رہ نورد نظر آتا ہے، مثلاً :-

کرتا ہے قتل وقت جواب سخن مجھے — ہنس دینا ان کا اور نہ کہنا جواب کے

اللہ رے شرم، آئے جو وہ شب کو خواب میں — پنہاں نگہ حجاب سے منہ کو نقاب میں

کبھی افسوس وہ اور ہم نہ محفل میں بہم بیٹھے — جو ہم اٹھے تو وہ بیٹھے جو وہ اٹھے تو ہم اٹھے

وصل کی رات نہ باتوں میں گذارو ساری — بس لگے ہونے چلے گر ہیں تو سحر ہے دیکھو

جس کو سمجھے لب پان خوردہ مالیدہ مسی — وہ دہان دیکھئے پھولی وہ کہیں شام نہ ہو

ہے دوپٹہ سرخ جو وہ شوخ گل اوڑھے ہوئے — باغ میں گل برقع خجالت میں گل اوڑھے ہوئے

گلوں کے ہوگئے گریبان چاک گلشن میں — رہیں گے بند قبا تیرے گر کھلے کے کھلے

نہیں ہے سرخ دوپٹا جبین شکن پہ — یہ غور دیکھ ظفر ہے بہار شام شفق

جھلک رخسار آتشناک کی بجلی سی کوندتی ہے — ہوا کے جھوک سے اس غنچہ رخ جب چلمن ہلاتی ہیں

یہ معاملہ بندی جس طرح ناسخ کے یہاں اعتدال سے بڑھ کر رکیک و سخیف بن گئی ہے، اسی طرح ظفر کے یہاں بعض اوقات بہت ہی مبتذل ہو گئی ہے، مگر اس قسم کے خارجی مضامین میں ناسخ کے ساتھ طبع آزمائی کرکے ظفر اپنی تخئیل نگاری اور مضمون بندی کا ثبوت دیتا ہے، مثلاً:-

ناسخ — کیا اثر پھیلا ہے تیرے رشک آتشناک کا — صورت شمع ہے دیوار کے ہر روزن میں آگ

ظفر — حلقہ زلف میں ہو اس کا رخ آتشناک — بحر حسن کی روشن ہوئی گرداب میں آگ

ناسخ — اسقدر سوزش ہے اے جراح میرے زخم میں — لگ اٹھیگی دم میں تنکے کی طرح سوزن میں آگ

ظفر — ہے شرار اشک خونیں چشم طوفان زا میں آگ — عشق کی گرمی سے دیکھو لگ گئی دریا میں آگ

ناسخ — میری آنکھوں سے اگر لخت دل سوزان گرے — بولے ہمدم دیکھئے ہے آپ کے دامان میں آگ

ظفر — تیرے دیوانے کی آنکھوں سے جو ٹپکا اشک گرم — کیا تعجب گر لگا دے دامن صحرا میں آگ

آتش وظفر | اسی طرح آتش کے ساتھ طبع آزمائی کرتا ہے،

آتش — مے نے کیٔ عذایت شوخ و سنگ سرخ — کندن کا اور آگ مین ہوتا ہے رنگ سرخ

ظفر — کب چشم سرمہ سا ہی تیری مست خواب سرخ — اس جام نیلگون مین ہی رنگ شراب سرخ

آتش — دل دوستی بت کا نہ پابند ہو یارب — دشمن کا بھی دب جائے نہ پتھر کے تلے ہاتھ

ظفر — فرہاد میسر آتا ہے اس عشق کے شیرین — پر کیا کرے جو دب گیا پتھر کے تلے ہاتھ

آتش — تبدیل شب وصل سے ہو روز جدائی — بالش کے عوض ہو سر دلبر کے تلے ہاتھ

ظفر — ہے جی مین تمنا یہ کہ سوتے ہین تو گاہے — آجائے مرا عارض دلبر کے تلے ہاتھ

آتش — مستی مین طلبگار تو ساقی سے ہے مے کا — کاٹون گا مین کاسے کا جو ساغر کے تلے ہاتھ

ظفر — دل ہاتھ مین اس کا لیا پر ہے یہ ظفر حال — جنبش مین رہے جیسے کہ ساغر کے تلے ہاتھ

آتش — پاؤن کو ان کے چھوا مین نے تو ہنسکر بولے — کاٹے جاتے ہین تو ایسے ہی گنہگاروں کے ہاتھ

ظفر — مین نے چوری سے جو شب زلف کو چھیڑا تو کہا — کاٹنے چاہیئے اس دزد سیہ کار کے ہاتھ

آتش — کرتا ہے تازہ وہ شہ خوبان نئے نئے — آئین تازہ تازہ ہین فرمان نئے نئے

ظفر — ناز و ادا و غمزہ تو ہین شیوہ قدیم — انداز ان کے اور ہین اکثر نئے نئے

آتش — رخسار خط نکالے گا اس شاہ حسن کا — پیدا کرے گا مور سلیمان نئے نئے

ظفر — آغاز خط سے کیا ہی نکالے ہین دیکھنا — طوطی باغ حسن نے یہ پر نئے نئے

آتش — خاک چھنوا رہی ہے کوچہ قاتل کی تلاش — ساتھ اپنے خراب اپنی قضا پھرتی ہے

ظفر — وصل کے دل قاتل بے رحم کو پھیرون کیونکر — کہ نہ تقدیر پھرے ہے نہ قضا پھرتی ہے

اور کہین کہین تو دربیان مین ظفر آتش سے سبقت لیجاتا ہے، مثلاً

آتش — چھوٹا لحد مین دل کا پھپھولا تو دیکھنا — ہو جائے گا مزار کا آتش کے سنگ سرخ

ظفر — خون جوش مین ہے تیرے شہید دفن زیر خاک — نکلا زمین کے پردے سے جو آفتاب سرخ

آتش — سوزش دل کا بیان کچھ کیا تھا راتکو / موم ہو کر بہ گئی سن کر مرا افسانہ شمع

ظفر — دریا بہائے گر مژہ اشک بار شمع / تو بھی بجھے نہ سوز دل داغدار شمع

آتش — داغ دل کی روشنی کافی ہے آتش گور میں / غم نہیں اس کا نہ ہوا پنے سر مدفن چراغ

ظفر — اس دل جلے کو چاہیے کیا گور کا چراغ / ہے داغ دل ہی کشتہ رنجور کا چراغ

آتش — کٹواتی ہے سر شمع جو ثابت قدمی سے / آنسو بھی نہ اندیشۂ گلگیر سے ٹپکے

ظفر — ہر اک آنسو کا قطرہ ہے جو دانہ کہربا کا سا / دم گریہ جگر کے آبلے کیا پھوٹ کر ٹپکے

آتش — جوش جنون نے گو کہ مجھے زرد کر دیا / چہرے کو میرے رکھتے ہیں لڑکو کے رنگ سرخ

ظفر — ہے میرے اشک خون سے ظفر راہ عشق میں / ہر سنگ ریزہ صورت لعل خوش آب سرخ

سراپا نگاری — سراپا نگاری کا جتنا مکمل نمونہ ظفر کے یہاں ہے، وہ کسی اور شاعر کے یہاں نہیں معشوق کے اوصاف و لوازم کی تصویریں کھینچی ہیں تو اس نے پوری پوری غزلیں کہی ہیں، جن میں زیادہ تر رنگ ناسخ و آتش کا ہے لیکن بعض اوقات زبان کی سادگی، بیان کی بے تکلفی اور خیالات کی برجستگی میں ظفر ناسخ و آتش سے بھی بڑھ جاتا ہے، مثلاً ظفر زلف یار کو کالی گھٹا سے تشبیہ دیتا ہے،

کھول کر زلف سیہ اس نے جو دیکھا آئینہ / صاف دریا پر نظر کالی گھٹا سی آگئی

کھول دی اس نے عرق افشاں جو زلف دراز / کیا زمیں سے جھوم کر بدلی برسنی آگئی

زلف کو کھول کے آئینہ جو دیکھا تو نے / رنگ بدلی نے بھی کیا کیا لب جیحون بدلے

ڈھانپ لے منہ کو قمر سے وہیں دامان سحاب / تیرے عارض پہ اگر زلف گرہ گیر سے ہلے

زلف اس رخ سے جو سر کی تو یہ سوجھا نہ کہ / اے ظفر مہ نکل آیا جو گئی ہٹ بدلی

آتش اور ناسخ نے بھی زلف یار کو کالی گھٹا سے تشبیہ دی ہے، مگر ان کے یہاں مضمون

ایک ایک شعر ملا،

آتش — کم نہین کالی گھٹا سے یار کی زلفِ سیاہ — دیکھ لے طاؤس کا فر کو تو چلانے لگے

ناسخ — ہمیشہ رہتی ہین زلفین عذارِ تابان پر — عجب ہے چاند کہ ہوتا نہین سحاب جدا

زلف یار کی ناگن سنبل اور زنجیر سے تشبیہین آتش، ناسخ، اور ظفر کے یہان بکثرت ہین، مگر مندرجۂ ذیل اشعار ظفر کی ندرتِ تخئیل اور جدتِ طبع کا نمونہ ہین، جو ناسخ اور آتش کے یہان نہین،

زلف یون روے عرق آلود پر لہرائے ہے — صبح جون ناگن گلون پر چاٹنے اوس آئے ہے

زلف یون چہرے پہ ہلتی ہی ہوا سے اسکے — جس طرح مار سیہ کھائے ہے پیچ پاؤنکے بل

رخ گلنار پر تیرے کہان ہے زلف خم گشتہ — یہ لے بحر خوبی حلقہ گرداب وہ آتش ہے

اسکی زلف پہ عرق گرا بر تر بن جائے گی — برف تو میری بھی آہ پہ شرر بن جائے گی

ہٹا دو زلف کو تم مصحفِ رخ سے غضب یہ ہے — کہ پھیلے سوے قرآن پاؤن اس کج طبع کافر کے

خدا محفوظ رکھے اس صنم کی زلف سے دلکو — کہ یہ سید ہا مسلمان اور وہ کج طبع کافر ہے

زلف اس روے کتابی پر ظفر — سورۂ و اللیل ہے قرآن مین

مصحفِ رخسار پر کافر ترے گیسو ہین دو — ہے تماشا حافظ قرآن ہوے ہندو ہین دو

لکھی عجب انداز سے ہے رخ پہ تری زلف — ایسا خط تعلیق مین بھی لام نہ پایا

"خال رخ یار" پر ظفر نے جو مضمون بندی کی ہے، وہ بھی آتش اور ناسخ کے یہان نہین، مثلاً

چشم مست بت مے نوش پہ یہ خال نہین — نیلوفر کا ہے دھرا ساغر لبریز پہ گل

خال ہے دنبالہ چشم فسون گر کے تلے — نیلوفر کا پھول ہی، یا شاخ عنبر کے تلے

خال رخ پر زلف کب ہان سر بسر جنبیدہ ہے — شاخ سنبل نیلوفر پر پہ مگر جنبیدہ ہے

خال اب نہ تہ زلف سیاہ فام دکھا
تارا مجھے مست ایک سر شام دکھاؤ

نہین رخسار پر اس مہ جبین کے خال کا جل کا
خدا جانے کہ یہ کن تیرہ بختون کا ستارا ہے

خال رخ یار کا کشتہ ہون
لایا گردش مین ستارا مجھے

دیکھے ہے خال رخ یار کو یون طائر دل
دانہ پر جیسے پڑے مرغ ہوا گیر کی آنکھ

سورۂ صاد ہے چشم اس کی کہ جس پہ ظفر
خال سے کاتب قدرت نے بنایا مطلق

اے ظفر اس خال رخ پر بال نفو کے نہین
من سوا پنے ہین یہ کالے لہر کھا کر کھیلتے

یہ سیاہی سے لکھا مضمون خال رخ ترا
ہے بیاض ماہ پر تنویر مین لکھا ہوا

چشم یار کو ناسخ اور ظفر جام سے تشبیہ دیتے ہین، مثلاً

ناسخ — کر دیا ہے یار چشم و گردن جانان نے مست
سامنے سے ساقیا اب شیشہ و ساغر اٹھا

ظفر — ہم کو اس دور مین ہو کیون طلب ساغر سے
یہ تو جب ہو کہ تری نرگس مخمور نہ ہو

ناسخ — چشم ساقی سے نہ کیون عشق ہو میرے دل کو
کون شیشہ ہے بھلا جس کو نہین جام سے کام

ظفر — مجھے سوجھے ہے کیفیت جہان کی
وہ چشم مست ساقی جام جم ہے

قامت یار پر ناسخ، آتش اور ظفر تینون نے طبع آزمائی کی ہے،

ناسخ — کون ہے جو نہین مرتا ہے تری قامت پر
کیون نہ ہو سرو چمن قالب بیجان ہوتا

آتش — سرو گڑجائین گے گل خاک مین مل جائینگے
پانون رکھے تو چمن مین وہ سرافراز اپنا

ظفر — صدقے اے رشک چمن اس قد موزون کے ترے
سیدھا ایسا کوئی سرو چمنی ہووے تو ہو

نزاکت یار پر آتش و ظفر کی شاعرانہ تخییل دیکھیے،

آتش — وہ نازنین یہ نزاکت مین کچھ یگانہ ہوا
جو پہنی پھولون کی بدھی تو دردِ شانہ ہوا

ظفر — کیا نزاکت ہے کہ گل عکس در گوش سے آہ
یہ پڑا بوجھ کہ درد اس کے ہوا شانے مین

آتش   نہ نزاکت پری میں دیکھی نہ حور میں یہ نزاکت تنش   جو ہار پھولوں کا اس نے پہنا تو بوجھ اٹھایا ہزار من کا

ظفر   چہ قدر اللہ رے نزاکت کہ اگر زلف کا عکس   بوجھ ڈالے تو لچکتی وہ کمر اور بھی ہے

ناسخ اور آتش اپنی اپنی جگہ پر مسلم الثبوت استاد ہین، لیکن ظفر کے اشعار مین نمایان خصوصیت یہ ہے کہ اس کے طرز بیان مین تکلف اور تصنع اور آورد نہین، شاید اسی وجہ سے کہہ گیا ہے کہ

اے ظفر ایک ہے تو فن سخن مین استاد   کیون نہ قائل ہون ترے ناسخ و آتش دونون

خاتمہ | ظفر کی شاعری پر میری طویل خامہ فرسائی ناظرین کے لیے بار خاطر ہو رہی ہو گی، مگر یہ طوالت شاید اس کا رد عمل ہے، کہ ظفر جس نے ہزارون اشعار لکھکر اپنے خون جگر کو کاغذ کے صفحون پر بہایا ہے اسکو یا تو عام طور سے ادنی درجہ کا شاعر یا ذوق کے خوان ادب کا محض زلہ ربا سمجھا جاتا ہے حالانکہ

انصاف یہی ہے اہل سخن مین نہ ہو ظفر   چاہے سخن کی اپنی کوئی ان سے داد خاک

اس کی شہرت کو سب سے زیادہ نقصان مولانا محمد حسین آزاد سے پہنچا جنھون نے اس کے کلام کے مجموعون کو "سرتاپا" ذوق کی طرف منسوب کر دیا اور ایک زمانہ تک اہل نظر بھی اس کی شاعری کو ذوق کی کمائی سمجھکر قابل التفات نہین سمجھتے تھے لیکن ارباب نظر نے اصل حقیقت کو دکھا کر اس غلط فہمی کو دور کیا، اور ظفر ایک مستقل شاعر مان لیا گیا مگر پھر بھی غالب مومن اور ذوق کے آوازۂ شہرت کے سامنے اس کی شاعری دب گئی، اس کے علاوہ اہل ذوق کی طبیعتین بھی بدل گئین، غالب کی فلسفہ طرازی، مومن کی بلند پروازی، اور دونون کی دلنشین فارسی ترکیبون کے سامنے ظفر کی شاعری پھیکی اور بے مزہ ہو گئی،

ظفر کی شاعری مین غالب اور مومن کی معجز طرازیان گو نہ سہی لیکن قادر الکلامی کا دائرہ تنگ بھی نہین، جس نے سوز و گداز اور حزن و ملال کا صحیح مرقع کھینچا، اخلاقی مسائل اور صوفیانہ نکات کو عام فہم بنایا، سادگی اور سلاست بیان کا اعلی نمونہ پیش کیا، قلعۂ معلی کی زبان اور

محاورات کو اپنی شاعری مین محفوظ کیا، اور اپنے زور طبع سے پرانے اساتذۂ فن کی یاد تازہ کی، کیا اس کو ہم ایک قادر الکلام شاعر اور استاد نہین کہہ سکتے ہین ؟

سخن دان و سخن گو یون تو دنیا مین ہزارون ہین ۔۔۔ ظفر یہ ہم نے تیری سی سخنگوئی نہین دیکھی

بے شبہ اس کی شاعری معائب سے خالی نہین، گو وہ خود تو یہ کہہ گیا ہے:-

آج کس اہل سخن کو دسترس مقدور ہے ۔۔۔ کر سکے جو اے ظفر تیرے سخن پر اعتراض

تاہم جس نے بیس ہزار اشعار کہے ہون، ظاہر ہے کہ وہ سب اچھے نہ ہون گے، خصوصاً جب وہ اپنے رنج و الم اور اندوہ و غم کو بھول کر تفریح طبع کے لیے اشعار کہتا ہے تو اکثر ان کا رنگ بہت ہی شوخ ہو جاتا ہے، اور ان کے مضامین جرأت کی معاملہ بندی سے بھی گر جاتے ہین، یا جب وہ محض مشکل قوافی اور سنگلاخ زمینون کی خاطر اشعار کہتا ہے تو وہ بھی بہت ہی معمولی درجہ کے ہوتے ہین اور خود اسکو یہ احساس تھا کہ مشکل قوافی اور زمینون مین اعلی معیار کا شعر کہنا مشکل ہے۔

ظفر ہے تیری غزل کی وہ سنگلاخ زمین ۔۔۔ کہ تیغ فکر سخنور کی دھار گر جائے

پھر بھی صرف اپنی قادر الکلامی کے اظہار کے لیے غزلین لکھتا ہے، اور اپنی جدت اور ذہانت پر تعلی کرتا ہے،

جنھین سخن کا ہے دعوی ذرا کہو ان سے ۔۔۔ کہ ایسی جلد رقم تم کوئی غزل تو کرو

لیکن ظفر کے پورے دیوان پر خود اسی کا ایک شعر بہت ہی جامع تبصرہ ہو سکتا ہے،

کوئی غزل پر اپنی جو نازان آگے تیری غزل کے ہو ۔۔۔ شعر سنا دے اسکو ظفر اک اس ہی زمین کا

یعنی ظفر خود اس کا خواہان تھا کہ اس کے دیوان کا انتخاب ہو، مگر اس کو نہ خود اتنی فرصت نصیب ہوئی، اور نہ کوئی اس کا قدردان پیدا ہوا، کہ میر اور غالب کی طرح اس کے

دیوان سے بھی اچھے اور عمدہ اشعار منتخب کر کے ایک مجموعہ تیار کرتا، اب بھی اگر کسی صاحب ذوق کی کوشش سے اس کے دیوان کا انتخاب شائع ہو جائے تو یہ کہنے مین تامل نہ ہوگا کہ

پروئے تو نے کیا تار سخن مین گوہر معنی ظفر تحسین کنان محفل مین آب ہمارے سخندان ہین

اور شاید یہ بھی کہ

ترا سخن وہ مزے دار ہے کہ حشر تلک رہین گے اسکے ظفر طبع نکتہ دان پہ مزے

شہزادے

ہندوستان میں تیموری سلطنت کے بانی یعنی بابر کی اولاد نرینہ میں ہمایون کے علاوہ
آٹھ اور لڑکے پیدا ہوئے، کامران، عسکری، ہندال، الور، بارل، فاروق، شاہ رخ اور احمد
جن میں موخر الذکر پانچ کا انتقال اسی کی زندگی ہی میں ہوگیا لیکن ہمایون، کامران، عسکری
اور ہندال اس کے سامنے پروان چڑھے، اور اس کی علم پرور صحبت میں تعلیم و تادیب سے
فیضیاب ہوئے، اس کی موت کے بعد اس کے لڑکوں کو وراثت میں تنہا اس کی شجاعت،
اولوالعزمی اور پامردی ہی نہیں، بلکہ علم و ہنر کا شوق اور شعر و شاعری کا ذوق بھی ملا،

مرزا کامران

بابر نے اپنی ہنگامہ پرور زندگی کے باوجود کامران کی مذہبی اور اخلاقی
تعلیم کے لیے اپنی مشہور مثنوی مبین لکھی، اور اس کے ادبی مذاق کے لیے اپنی تزک اسکے
مطالعہ میں دی، اس کے ذوق شعری کو فروغ دینے کے لیے اپنا منظوم رسالہ والدیہ اور اپنے
اشعار تحفے میں بھیجے، اور پھر علم و ہنر کی چاشنی کیلیے جہان چھان گیا، وہاں کے کتب خانون سے
اس کے پاس کتابیں بھیجیں، چنانچہ بابر کی کوششیں رائگان نہیں گئیں، مرزا کامران
سخن گوئی و سخن وری کا مالک بنا،

اس کا ایک **دیوان** زمانہ کی دستبرد سے معلوم نہیں کیسے کتب خانہ خدابخش خان پٹنہ
میں محفوظ رہ گیا ہے، اس میں مرزا کے ترکی و فارسی کلام ہیں ترکی میں ۳۰ غزلیں، تین قطعے
چھبیس رباعیاں چودہ مثنویاں اور کچھ مفردات ہیں، اسی طرح فارسی میں ۲۳ غزلیں

تین قصیدے، قطعے، چار رباعیان، چار چھوٹی چھوٹی مثنویاں، اور ایک ساقی نامہ ہے، فارسی کلام کو پروفیسر محفوظ الحق صاحب مرحوم (پریزیڈنسی کالج کلکتہ) نے اڈٹ کر کے ایک پر مغز مقدمہ کے ساتھ معارف پریس میں چھپوا کر شائع بھی کر دیا ہے، جو اس وقت میرے پیش نظر ہے۔

مرزا کے کلام میں گو مضامین کی جدت اور خیالات کی بلندی نہیں، لیکن تغزل کا پورا رنگ موجود ہے، مثلاً:-

یار قیبان ہمدم و ہمراز دیدم یار را ۔۔۔ یارب آسان کن بمن این حالت دشوار را
دہ چہ باشد بے قراران را دہد صبر و قرار ۔۔۔ آنکہ می بخشد خرام آن سرو خوش رفتار را
در تکلم لعل او دندان کہ می ریزد گہر ۔۔۔ چون نگہ دارم ز گریہ چشم گوہر بار را
غیر جانان در جہان چیزی نہ بیند از دگر ۔۔۔ ہر کہ بر دارد ز پیش این پردۂ پندار را
کامران ماند مرا چشم و دست چیزی در نظر ۔۔۔ تا بکام خویش دیدم دولت دیدار را

دست قد رعنائے تو سرو گلستان حسن ۔۔۔ روی دلارای تو لالہ بستان حسن
روی خوش خوش سرشتہ تازہ گل باغ لطافت ۔۔۔ سرو قد دلکشت نخل گلستان حسن
شمس و قمر را نماند، بادہ رقا رونقی ۔۔۔ تا تو برآوردہ سر ز گریبان حسن

مرزا جب عشق مجازی کے بجائے عشق حقیقی کی کیفیات منظوم کرتا ہے، تو اس کا کلام نسبتہً موثر ہو جاتا ہے، مثلاً

زلیخا کہ جمال خود آراستہ می آئی ۔۔۔ ور زہد شکست آری در عشق بیفزائی
چون چہرہ بیارائی رخسارہ بر افروزی ۔۔۔ خود گوی کجا ماند آئین شکیبائی
گر سر بگریبانم در ناظر خود با غم ۔۔۔ در سینۂ تو پنہانی در دیدۂ تو پیدائی
از صحبت [illegible] شکستہ سیاہ [illegible] ۔۔۔ ای وا ستادان [illegible] ازلی

گفتی کہ امشب دانم گر خوانم و گر رانم
من بندۂ فرمانم ہر نوع کہ فرمائی

گر دیر نشین سازد ور رہبر دین سازد
ما را بتو دیدار او ور است توانائی

سودائے کسی وارہ بازاین سر و سامان
جائے ہوس وارد بازاین دل ہرجائی

مرزا کے کلام میں اس قسم کے صوفیانہ جذبات کی کمی نہیں، دیوان کا آغاز تو ایک ایسی غزل سے ہوا ہے جس میں شروع سے آخر تک صوفیانہ احساسات اور معتقدات ہیں،

چون بمقصود نشد ہیچ کسے رہبر ما
بعد ازین خاک در پیر مغان و سر ما

کار ما چون ز در بستہ نہ اہد نکشود
بو کزین پس ز خرابات کشاید در ما

بارگی سست و شب تیرہ و رہ سنگین
وائی گر ہادی لطفت نشود رہبر ما

خو گرفتیم بدرد و غم عشقت بفرست
دم بدم درد و غمے بر دل غم پرور ما

دہ کہ از شوق دلم می طپد و مضطرم
می رسد مژدۂ وصلی مگر از دلبر ما

کامران سوختم از آتش ہجران کسے
کہ بکویش نرسد ذرۂ خاکستر ما

ایک رباعی میں بھی یہی خیالات موجزن ہیں،

یارب نہ کرم در ہی برویم بکشائی
زنگ غیر از دل حزینم بزدائی

پیوند من از جملہ علائق بگسل
از ہر دو جہان سوی خودم راہ نمائی

ایک قطعہ میں کچھ پند و موعظت بھی ہے،

اے برادر ز من شنو سخنے
کہ از ان بہرہ ور شوی شاید

دل بکار جہان منہ کز ان
بار غم بر دل تو افزاید

کار عقبیٰ ابساز ور نہ ترا
کار و بار جہان چہ کار آید

کامران کی ہنگامہ خیز زندگی اور اس کا دردناک انجام نظر کے سامنے ہو تو یہ قطعہ

کتنا موثر اور عبرت انگیز ہو جاتا ہے، ایک مثنوی کی تمہید مین تو اس نے شاید اپنی زندگی کا مرقع ہی کھینچ دیا ہے،

تا چہ سازد جہان بے سر و بن　　غافل از مکر آسمانِ کہن

رفت کارم ز دست و دست از کار　　نیست کارم بغیر نالۂ زار

نے ز نخلِ امید من ثمرے　　نے ز تخم نشاط و عیش برے

بکشاید دلم ز باغ و بہار　　نیست مقصود من ز جملہ نگار

اس کی تمنا تھی کہ

بیا ساقی آن مے کہ خامی دہد　　ز دنیا و عقبی خلاصی دہد

اور یہ پوری ہوئی، وہ دنیا کے ہنگامون اور آلودگیون سے کنارہ کش ہو کر ساقی حقیقی کے اصلی میخانہ مین مخمور اور سرشار رہو کر جان بحق ہوا، یعنی اسکی وفات مکہ میں ایام حج مین ہوئی،

مرزا کی شعر گوئی محض اس کی ذہانت و ذکاوت کا نتیجہ تھی، وہ حالات سے متاثر ہو کر شعر موزون کرتا، اور کبھی کبھی فی البدیہہ اور برجستہ کہتا تھا، چند مثالین ملاحظہ ہون،

باپ کے مرنے کے بعد زمانہ کی عام روش کے مطابق وہ بھی تخت و تاج کا خواہان ہوا، بابر نے اپنی زندگی مین اس کو قندھار کی مملکت عطا کی تھی، لیکن اس کے مرنے کے ساتھ ہی سلطنت کی ہوس مین اس نے لاہور پر بھی قبضہ کر لیا، ہمایون نے اپنے باپ کی وصیت اور کچھ اپنے مصالح کی خاطر کامران کے خلاف کوئی جارحانہ تدبیر نہ کی، بلکہ ایک فرمان لکھکر اس کو کابل اور قندھار کے علاوہ پنجاب کا بھی مالک بنا دیا، کامران نے متاثر ہو کر تشکر مین ہمایون کی خدمت مین مندرجۂ ذیل غزل پیش کی،

حسنِ تو دمبدم افزون بادا　　طلعت فرخ و میمون بادا

ہر غباری کہ ز راہت خیزد	کحل چشم منِ محزون بادا
خاک کو از رہ لیلیٰ خیزد	جاے او دیدۂ مجنون بادا
بندۂ حلقہ بگوش تو چو من	صد چو دارا و فریدون بادا
ہر کہ گرد تو چو پرکار نگشت	او ازین دایرہ بیرون بادا
کامران تا کہ جہان راست بقا	خسرو دہر ھمایون بادا

ہمایون نے اس غزل کے صلہ مین کامران کو حصار فیروزہ انعام دیا،[۵۷]

مگر دونون بہائیون کی باہمی شفقت و محبت بہت دنون تک قائم نہ رہی، اپنے اپنے مصالح کی بنا پر دونون ایک دوسرے سے برسرپیکار رہے، اور آپس کے نفاق سے دونون کو بُرے دن دیکھنے نصیب ہوئے، ہمایون کو اپنے باپ کی سلطنت سنبھالنی تھی، وہ چارون طرف سے دشمنون کے نرغہ مین گھرا ہوا تھا، اسے دشمنون کو پسپا کرنا، ان کے ملکون کو تسخیر کرنا اور تیموری سلطنت کی بنیاد رکھنی تھی، اسکو امید تھی کہ اسکے بھائی اس مصیبت مین اس کی غمگساری اور رفاقت

---

[۵۷] اکبرنامہ جلد اول ص ۱۲۵، بنگال ایشیاٹک سوسائٹی پروفیسر محفوظ الحق صاحب نے تذکرہ ہفت اقلیم کے استناد سے لکھا ہے، کہ مذکورۂ بالا غزل کے علاوہ یہ غزل بھی اس موقع پر بھیجی تھی،

چشم بر راہ تو داریم شد ایامے چند	وقت آن شد کہ نہی جانب ما گامے چند
آنکہ ہرگز نفرست سوی ما پیغامے چند	چہ شود گر کندم شاد بدشنامے چند
تا کے میل دلم را بہ خست سپے نبرد	دولت وصل تو خواہم ز دلارامے چند
ہر صید دل ما دانۂ خال تو بس است	ہر دم از زلف منہ بر سر ما دامے چند
ما خراباتی و بدنام تو با ما منشین	حیف باشد کہ نشینی تو بہ بدنامے چند
کامران این غزل نو بہمایون بفرست	باشد ارسال کند سوے تو انعامے چند

کرین گے. لیکن کامران جس نے باپ کی ہمت مردانہ اور جوش عمل وراثت مین پایا تھا، باپ کے تخت و تاج کے حصول کیلئے کیونکر قسمت آزمائی نہ کرتا، چنانچہ وہ ہمایون سے الگ ہوکر اس کا حریف بن گیا، ہمایون نے شیرشاہ سے پے در پے شکستین کھائین تو کامران نے ان شکستون سے فائدہ اٹھانا چاہا، لیکن اپنی قسمت کے لکھے ہوئے کو کیونکر مٹا سکتا تھا، ہمایون جب تیرہ سال کی آوارہ گردی کے بعد اپنی کھوئی ہوئی سلطنت کی بازیابی کے لیے لوٹا، تو پہلے اس نے اپنے بھائیون کے خلاف جنگ کی، کامران اس وقت کابل مین تھا، دونون بھائیون مین سخت جنگ ہوئی، کامران قلعہ مین محصور ہوگیا، مگر ہولناک جنگ جاری رہی، جب لڑائی طول کھینچی تو ہمایون نے بھائی کو ایک رقعہ لکھا، جس کو ابوالفضل نے اس طرح درج کیا ہے

اے برادر بدخواہ اے عزیز جنگ جو از تدبیر این کار (کہ باعث کار زار و موجب قتل و آزار مردم بیشمار است) باز آی، و بر مردم شہرے و لشکرے رحم نمائے، امروز این ہمہ مردم کشتہ می شود و فردائے قیامت،

بود خون آن قوم بر گردنت　　　بود دست آن جمع در دامنت

ہمان بہ کہ بر صلح رائے آوری　　　طریق مروت بجائے آوری

مگر کامران نے اپنی اولوالعزمی اور بلند حوصلگی مین سرشار ہوکر یہ شعر لکھ بھیجا،

عروس ملک کسے در کنار گیرد چست　　　کہ بوسہ بر لب شمشیر آبدار دہد[۵۱]

اس جنگ مین کامران کو شکست ہوئی لیکن وہ شکست ماننے کو تیار نہ تھا، موقع موقع سے وہ ہمایون کے خلاف جنگ کرتا رہا لیکن قسمت نے اس کا کبھی ساتھ نہ دیا، ایک بار شکست کھاکر سلیم شاہ سوری کے دربار مین پہونچا، جہان اس کو امید تھی کہ ہمایون کے خلاف اس کو امداد ملے گی

---

۵۱ اکبرنامہ جلد اول ص ۲۲۸

لیکن یہان اس کی امید برنہ آئی اور اس کو ہر قسم کی ذلتین اٹھانی پڑین، سلیم شاہ نے پہلے اسکی علمیت کو نیچا دکھانے کی کوشش کی، تاریخ داؤدی ہے،

مرزا کامران ہمایون شاہ کے یہان سے بھاگ کر سلیم شاہ کے یہان پناہ گزین ہوا پہلی مجلس مین سلیم شاہ نے کامران مرزا کے امتحان طبع کے لیے تین شعر جن مین ایک اہل عراق کا، دوسرا فضلاے ہندوستان کا، اور تیسرا افغانستان کا تھا، پیش کر کے کہا یہ اشعار کیسے ہیں؟ کامران مرزا نے کہا کہ آپ شعر کی خوبی کے متعلق سوال کرتے ہین یا یہ پوچھتے ہین کہ یہ کس کے اشعار ہین؟ سلیم نے کہا کہ مین یہ جاننا چاہتا ہون کہ یہ تینون شعر کس کے ہین؟ کامران نے کہا کہ پہلا شعر جو آپنے پڑھا وہ عراق کے مغل کا، دوسرا شعر اہل ہند کا، اور تیسرا افغانی کا ہے، سلیم شاہ اور تمام حاضرین مجلس نے مرزا کامران کے فہم و فراست کی تعریف کی،

پھر بھی سلیم شاہ کے درباری اس سے تمسخر کرنا چاہتے تھے، لیکن وہ اپنی ذہانت اور قوت گویائی سے ان کو خاموش رکھتا تھا، ملا بدایونی لکھتے ہین،

سلیم شاہ کبھی مرزا کو بلا کر مشاعرہ کرتا تھا، اور یہ صحبت بے لطفی سے گذرتی تھی، مرزا ان تکلفات اور تواضعات سے بہت تنگ آ کر زندگی سے بیزار ہوگیا تھا، اور بھاگنے کا موقع ڈھونڈھتا تھا، افغانی ہندی زبان مین اس کا مذاق اڑاتے تھے، اور جب وہ دربار مین آتا تو وہ کہتے کہ مورو (مرغ) آرہا ہے، مرزا نے سلیم شاہ کے سامنے ایک مقرب درباری سے پوچھا کہ مورو کس کو کہتے ہین، درباری نے جواب دیا کہ جلیل القدر ذات کو کہتے ہین، مرزا نے کہا کہ اگر ایسا ہے تو سلیم شاہ بڑا مورو ہے اور شیر شاہ اس سے بھی زیادہ، (منتخب التواریخ ج ۱ ص ۳۹۰)

ایک موقع پر سلیم شاہ نے کامران کو اپنا شعر سنانے کو کہا، کامران نے جل کر برجستہ یہ شعر پڑھا،

گردش گردون گردان گردنان را گردکرد — بر سر اہل تمیز ان ناقصان را مرد کرد

سلیم شاہ بہت خفیف ہوا، ملا بدایونی لکھتے ہین کہ

سلیم شاہ فحواے کلام را دانستہ و این ادا را فرو بردہ بمو کلان بنہانی حکم فرمود تا مرزا چشم بند نگاہ دارند[۱]

کامران یہان سے نکلا تو ادہر ادہر بھٹکتا رہا، کابل جا رہا تھا کہ ہمایون کے آدمیون کے ہاتھون گرفتار ہوا، کامران نے بے بس ہوکر ایک عرضداشت لکھ بھیجی[۲] لیکن اس کے دن پورے ہو چکے تھے، اس کا وہی حشر ہوا جو تیموری سلطنت کے ہزیمت خوردہ دعویدارون کا ہوا یعنی اس کی آنکھون کی روشنی زائل کر دی گئی، جب اس نعمت سے وہ محروم ہو گیا تو اس کا محبوب غلام بیگ ملوک اس کے پاس آیا، وہ اس کے ہاتھون کو اپنی آنکھون سے لگاتا اور یہ شعر پڑھتا تھا،

ہر چند کہ چشم تربیت پردہ کشید است — بیناست بچشمی کہ بروی تو دیدہ است

کتنا حسرتناک شعر ہے، فرشتہ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمایون بھی اس کا عبرتناک انجام دیکھنے آیا، وہ جب اس کے پاس پہنچا، تو کامران نے استقبال مین یہ شعر پڑھے،

۱۔ منتخب التواریخ ج اص ۳۹۵، ۲۔ پروفیسر محفوظ الحق صاحب نے مسٹر بیورج کے ایک مضمون (جرنل آف رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن بابتہ ۱۹۰۲ء ص ۱۳۲ - ۱۱۵) کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اس عرضداشت کے ساتھ کامران نے معذرت مین ایک غزل بھیجی تھی، مسٹر بیورج کو یہ غزل اکبر نامہ کے ایک قلمی نسخہ بلگرام مین ملی تھی لیکن افسوس ہے کہ مسٹر بیورج نے اس غزل کو اپنے مضمون مین نقل نہین کیا، اور نہ یہ غزل اکبر نامہ کے مطبوعہ نسخہ مین موجود ہے،

زقدر و شوکت سلطان نگشت چیزے کم — ز التفات بہ مہمان سرائے دہقانی

کلاہ گوشۂ دہقان بآفتاب رسید — کہ سایہ بر سرش افگند چو تو سلطانی

ان کو سن کر ہمایون پر گریہ طاری ہو گیا،[۱]

کامران کے لیے دنیا اور اسکی نیرنگیوں میں اب کوئی دلچسپی باقی نہیں رہی تھی، ہمایون جب کابل جارہا تھا تو اس نے سندھ کے قریب حج بیت اللہ کی اجازت مانگی جو مل گئی، بھائی کو رخصت کرنے کے لیے ہمایون جب اس کے خیمے میں آیا، تو کامران کی زبان پر پھر دو چبھتے ہوئے شعر تھے،

کلاہ گوشۂ درویش بر فلک ساید — کہ سایہ ہیچو توشاہے فگند بر سر او

بجانم از تو ہر چہ رسد جائے منت است — گر ناوک جفا است و گر خنجر ستم

ان اشعار کی خلش ابو الفضل نے بھی محسوس کی، وہ لکھتا ہے،

اگرچہ بیت ثانی جانب شکر دارد، اما سخن شناس دریابد کہ از شکایت لبریز است

آنحضرت (کہ جہان مردمی و مہربانی بودند) اینہا منظور نداشتہ رفتہا فرمودند"[۲]

کامران اپنے بچوں کو ہمایون کے حوالہ کر کے اپنی بیوی جوجک بیگم کے ساتھ حج کو چلا گیا، اور وہیں زندگی کے بقیہ دن گذارے، تین بار حج کی سعادت سے مشرف ہوا، آخری بار جب حج کا فریضہ ادا کر رہا تھا، کہ منا کے میدان میں ۱۱ ذی الحجہ ۹۶۴ھ میں اپنے مالک حقیقی سے جاملا، کامران کی موت پر قطعۂ تاریخ متعدد شعرا نے لکھا ہے،[۳] مگر ملا بدایونی کو کامران کی ذات

---

[۱] فرشتہ صفحہ ۲۴۷ نولکشور پریس، [۲] اکبر نامہ جلد اول صفحہ ۳۳۰ [۳] مولانا قاسم کاہی نے مندرجہ ذیل قطعہ لکھا،

کامران آنکہ پادشاہی را — کس نہ بودست ہیچو او درخورد

شد ز کابل بکعبہ و آنجا — جان بحق داد و تن بخاک سپرد

(باقی حاشیہ صفحہ ۳۶۸ پر)

سے شاید بڑی دلچسپی تھی، انھون نے خاقانی کے رنگ مین اس کا ماتم کیا ہے،

ہرگز بباغ عہد گیا ہے وفا نکرد	ہرگز نشست چرخ خدنگی خطا نکرد
خیاط روزگار ببالاے ہیچ کس	پیراہنے نہ دوخت کہ آنرا قبا نکرد
نقشے نہ داو دور کہ آنرا بدل نشد	دردے نیاخت دہر کہ آن را دوا نکرد
گردون در آفتاب سلامت کرانشاند	کورا چو صبح روشن اندک بقا نکرد
خاقانیا بچشم جہان خاک درفگن	کو درد چشم دید ترا و دوا نکرد[۵۱]

مرزا کی شعر گوئی کی تعریف ہر زمانہ کے مورخون اور تذکرہ نویسون نے کی ہے،

بدایونی نے لکھا ہے

"ہمیشہ با علما و فضلا صحبت می داشت و اشعار او مشہور است[۵۲]"

داؤدی مین ہے،

مرزا کامران در شعر آرائی و سخن فہمی طبیعت درست داشت

بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۸۳) گفت تاریخ او چنین کاہی | پادشہ کامران بکعبہ مرد

وسی نے لکھا

شہ کامران خسرو نامدار	کہ در سلطنت سر بکیوان رساند
مجاور شد اندر حرم چار سال	بکلی دل از قید عالم رہاند
ز بعد وقوف حج چارمین	باحرام حج جان بجانان فشاند
چو در خواب وسی درآمد شبے	عنایت نمود و سوی خویش خواند
بگفت از پے سنہ فوت ما	بگو شاہ مرحوم در مکہ ماند

[۵۱] بدایونی ج ۱ صفحہ ۴۵۳، [۵۲] ایضاً

صاحب ہفت اقلیم کہتا ہے:۔

مرزا کامران در مضمار شاعری ہم دو مرکب سواری نمودہ"

نواب حسین قلی خان عشق مؤلف تذکرہ نشتر عشق نے لکھا ہے:

"طبع لطیف و معنی یاب داشت"

اس کے بعد مرزا کی موت پر جو قطعۂ تاریخ درج کیا ہے، اس میں بھی اسکی شعرگوئی کے سلیقہ کی داد ہے۔

اختر برج سخن آن نکتہ دان | وہ چہ شام از این جہان شد رہگرائے
از سر جاہش بگفتم سال فوت | کامران آسود در فردوس ہائے

مجمع النفائس کے مؤلف نے مرزا کامران کے حسب ذیل اشعار کو خاص طور سے پسند کیا ہے:

یا زو امان خود آن شہ بالا زدہ است | کس بدامانش مگر دست تمنا زدہ است
عیب ما چند کنی قصہ عشاق بشنو | کہ بیک جلوہ رہش و خرد ما زدہ است
سوئے مقصد نشد از ہیچ کسے رہبر ما | بعد این خاک در پیر مغان و سر ما

صاحب مخزن الغرائب لکھتے ہیں

وے طبع موزون داشتہ و شعری چون در مکنون

صبح گلشن میں ہے:

طبع مستقیمش لطائف سخن را پشت و پناہ

دیوان کامران کے مرتب پروفیسر محفوظ الحق صاحب رقمطراز ہیں:

مرزا واقعی غزل گو ہے۔ اور جو کچھ اس نے کہا تھا، اس کے کلام میں صفائی اور

سلاست کافی حد تک ہے، گو خیالات میں کوئی ندرت نہیں، اور نہ کلام میں ہندان پختگی معلوم ہوتی ہے، لیکن طرز ادا قابل ستایش و داد ہے، کلام برجستہ و بے تکلف اور نمکین ہے، اور بعض اشعار میں تصوف کی بھی چاشنی ہے[1]

مرزا ابوالقاسم شوکتی

مرزا کامران کی اولاد نرینہ میں مرزا ابوالقاسم بھی باپ کی طرح شاعر ہوا، شوکتی تخلص رکھتا تھا، ہفت اقلیم کا مولف اس کو فطین و ذکی بتاتا ہے، اس کے اصلی الفاظ یہ ہیں:

"مرزا ابوالقاسم در غایت فطنت و ذکا، در نہایت ملاحت و صفا .... بشعر گفتن میلی تمام داشتہ و سخن نیک می رسید، و شوکتی تخلص می کرد، این دو بیت مراو راست"

یار ہر شانہ کہ در زلف سمن سا زدہ است	نشتر غم بدل غم زدہ ما زدہ است
قصد کشتن من این قدر شتاب مکن	بخواہم از سمت مردہ اضطراب مکن[2]

ریاض الشعراء کا مصنف لکھتا ہے کہ

"رخسارۂ حالش بزیور دانش و کمال آراستہ و پیراستہ بود"[3]

صبح گلشن میں ہے،

در بزم و رزم بہیبت و شوکت قدم می گذاشت[4]

مرزا ابوالقاسم اکبر کے حکم سے قلعہ گوالیار میں مقید رہا اور آخر میں اس کے حکم سے

---

[1] دیوان مرزا کامران مرتبہ پروفیسر محفوظ الحق صاحب، (مطبوعہ معارف پریس اعظم گڈھ)
[2] ہفت اقلیم قلمی نسخہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی [3] ریاض الشعراء قلمی نسخہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی۔ [4] صبح گلشن ص ۳۳۹

قتل کر دیا گیا، فرشتہ کی روایت ہے کہ قتل کے وقت اس کی زبان پر یہ شعر تھا،

فلک بکشتنِ من این قدر شتاب مکن بخواہم از ستمت مرد اضطراب مکن[۱]

اس کے بعد مرزا کامران کی کوئی اولاد نرینہ نہ رہی، اس لیے کسی نے اس کی وفات کا قطعہ تاریخ کہا،

نماند از کامران نام و نشانی[۲]

عسکری و ہندال معاصر مورخون نے عسکری و ہندال کا ذکر شعرا کی حیثیت سے نہین کیا ہے، لیکن بعض تذکرون مین ان دونون کے نام شاعرون کی فہرست مین داخل ہین مخزن الغرائب مین ہندال کی ایک رباعی ہے، جو ندرت کے لحاظ سے خوب ہے،

ز ان قطرۂ شبنم کہ نسیم سحری از ابر جدا کرد بصد حیلہ گری

تا بہ رخ گل چکاند از رشک پری حقاکہ ہزار بار پاکیزہ تری

اسی مین عسکری کے مندرجۂ ذیل اشعار منقول ہین،

چنان بیخود شدم از دوری آن گلعذار امشب کہ ہر دم گریہ دارد میدہد بے اختیار امشب

چنین کز خوے گرفتم با آشنائی تو ہلاک می کندم آن شب جدائی تو

گوشہ میخانہ جائے دلکشائی بودہ است بے تکلف گوشہ میخانہ جائے بودہ است

اے عسکری ار مست مدام خوش باش در معتقد بادہ و جامی خوش باش

گفتی بخرابات نباشم بے او با یار اگر درین مقامی خوش باش

شاہ ابو المعالی ہمایون کی اولاد نرینہ مین اکبر کے علاوہ حکیم مرزا بھی تھا، اس شہزادہ کے ذوق علم کا ذکر معاصر مورخون نے نہین کیا ہے، لیکن ہمایون کا ایک داماد یعنی جہان بیگم

---

[۱] فرشتہ ص ۲۴۱ نولکشور پریس۔ [۲] ریاض الشعرا

کی لڑکی اور مرزا حکیم کی بہن فخر النسا کا شوہر میر شاہ ابو المعالی ایک خوش مذاق شاعر تھا، اور شہیدی تخلص کرتا تھا، مآثر الامرا میں ہے،

"شاہ ابو المعالی خوش طبع وسلیقہ بشعر موافق داشت"[۱]

مرزا دانیال | اکبر کے تین لڑکے تھے، سلیم، دانیال اور مراد، جن میں دانیال فارسی اور ہندی کا شاعر تھا، اس کے ذوق شعری کا ذکر کرکے جہانگیر نے اپنی تزک میں لکھا ہے کہ

بہ تفنگ وشکارے کہ بہ تفنگ کنند میل تمام داشت، یکے از تفنگہائے خود را یکہ وجنازہ نام نہادہ بود، این بیت را خود گفتہ فرمود کہ بر آن نقش کنند"

از شوق شکارے تو شود جان تر و تازہ ‏ ‏ ‏ بر ہر کہ خورد تیر تو یکہ وجنازہ

اس کی ہندی شاعری کے بارے میں وہ رقمطراز ہے۔

بہ نغمۂ ہندی مائل بود، گاہے بزبان اہل ہند و باصطلاح ایشان شعرے می گفت بدنبود"[۲]

دانیال کے دربار میں شاعروں کا ایک مجمع رہتا تھا، انہی میں ملا محمد رضا نوعی (المتوفی سنہ ۱۰۹۰ھ) اور میر حسین کفری تھے،

ملا رضا **نوعی** خبوشان (خراسان) کے رہنے والے تھے، صغر سنی میں باپ کے ساتھ ہندوستان آئے، مگر تھوڑے دنوں کے بعد وطن واپس چلے گئے، باپ کی وفات کے بعد پھر ہندوستان آئے، اور مرزا یوسف خان کے دربار میں ملازم ہوئے، اس کے ساتھ کشمیر گئے تو وہاں کی بہشت زار میں ان کی طبیعت میں بھی رنگ وبو پیدا ہوا، اور طبع آزمائی کرنے

---

[۱] مآثر الامرا میں جلد سوم ص ۹۱ و ۱۸۹، نیز حالات کے لیے دیکھو اکبر نامہ ج ۲ ص ۱۹۸ و ۲۰۶، طبقات اکبری جلد ۲ ص ۶۹ و ۱۲۵، منتخب التواریخ جلد ۲ ص ۶۳-۵۷، [۳] تزک جہانگیری ص ۱۷، نولکشور پریس

لگے. نوعی تخلص رکھا، اشعار خواص و عوام مین مقبول ہونے لگے،

رفتہ رفتہ بتقریب بہ سمع مبارک شاہزادہ عالی جاہ شاہزادہ دان (یعنی دانیال)

شاہ رسید آن قدردان نکتہ سنجان از روے خواہش نوعی را از مرزا یوسف خان

گرفتہ داخل بساط بوسان محفل حشمت و شوکت خود گردانید........... چون

داخل مداحان آن شہزادہ عالی مقدار گردید. قصائد غرا در مدح آن جوان بخت

عالی تبار گفت،[1]

مآثر رحیمی کا مولف لکھتا ہے،

بیت

شاہزادہ مومی الیہ (یعنی دانیال) راصحبت مولائی مذکور پسند افتادہ در ترقی ورتبہ

اورا کوشیدند و سر بے نیازی اورا فرق فرقد سای گردانیدند"[2]

دانیال کی فرمایش پر ملا نوعی نے ایک مثنوی "سوز و گداز" لکھی جس مین ایک ہندو

عورس کے عشق کا قصہ مرقوم ہے، عورت کا شوہر بیاہ کے دن ایک چھت کے گرجانے سے

دبکر مرگیا، وہ ستی ہونے چلی. تو اکبر نے اس کو روکنا چاہا، لیکن شوہر کے عشق مین وہ آگ

مین کود پڑی، اسی واقعہ کو نوعی نے دانیال کی فرمایش سے منظوم کیا ہے،

نوعی کا قابل فخر کارنامہ "ساقی نامہ" ہے، جس کے صلہ مین مرزا عبدالرحیم خانخانان نے

اس کو دس ہزار روپے اور ہاتھی گھوڑے عنایت کیے تھے، اس ساقی نامہ مین سات سو اشعار

تھے، ابتدائی حصے ملاحظہ ہون،

توئی اولین پیر میخانہا	بیاد تو سرشگیر پیمانہا
زنامت کر رنگ لب و آبروست	لب لعل پیمانہ لبیک گوست

[1] میخانہ مولفہ ملا عبدالنبی مرتبہ پروفیسر محمد شفیع [2] مآثر رحیمی جلد ۳ ص ۱۴۳

بیا پوسس نام تو در انجمن | کند شیشہ رامی زبان در دہن
زنامت کہ پیمانۂ ہر لبیست | صراحی زمی بای تا سر لبیست
بحوزری کہ منظورہ ہر محفل است | ز بزم تو بوسے کباب دلست
صبوح چمن کافرین خوان تست | شکر خندۂ بزم مستان تست
توئی مجلس آرای ہشیار وست | چو گل بر سر و ہم چو ساغر بدست
ز بزمت کہ شد صبح دل شام او | چراغیست خور کرد گل نام او
گل و بادہ انشا گر راز تست | شب و روز زیر و بم ساز تست

میر حسن کفری خراسان کا رہنے والا تھا، تیموریوں کی علم نوازی کا شہرہ سنکر ہندوستان آیا اور شاہزادہ دانیال کے سایۂ عاطفت میں پناہ لی، مآثر رحیمی میں ہے، مدتے ملازم شہزادہ خورشید بود شاہزادہ دانیال شد، در ملازمت آن شاہزادہ بختیار کمال تقرب و منزلت بہم رسانید و قصائد غرا بمدح آن شاہزادہ گفتہ۔

شاہزادہ کی وفات کے بعد عبدالرحیم خانخانان کی زلہ ربائیوں سے متمتع ہوا[1]

عبدالرحیم خانخانان کی شان میں بہت سے قصیدے اور رباعیاں لکھیں، ان میں سے ایک ذیل میں درج کی جاتی ہے جس سے اس کے کلام کا اندازہ ہوگا،

اے گوہر خور ز آئینہ بار گہت | وین ظلمت شب نشان گرد رہت
یعقوب ز مصر و موسی از طور نیافت | آن بہرہ کہ من یافتم از خاک رہت

شہزادہ | اکبر کے چھوٹے لڑکے شہزادہ مراد کے دربار میں بھی شعر و سخن کا چرچا رہا، نظیری نیشاپوری کی رسائی جب اس کی محفل میں ہوئی، تو اس کی تصویر مولانا شکیلی[؟] اپنے

[1] مآثر رحیمی ص ۸۰۰ جلد سوم

دلاویز انداز مین اس طرح پیش کرتے ہین ،

"حج سے واپس آکر اس نے مراد کے دربار مین رسائی حاصل کی، اکبر نے شہزادہ مراد کو دکن کی مہم پر بھیجا تھا، وہ ان اطراف مین فوجین لیے ہوئے پڑا تھا، نظیری چلتا پھرتا اس طرف جا نکلا، دربار مین جانا چاہتا تھا کہ راہ مین ایک قدردان سخن کی نظر پڑ گئی، اس نے بڑھ کر کہا کہ خوب موقع پر آئے، نوروز کا جشن ہے قصیدہ لکھکر پیش کیجیے، خود جاکر شہزادہ سے تقریب کی، چوبدار آکر لوا گیا، دربار مین سجدہ بجا لانے کا دستور تھا، لیکن دربار کی شان و شوکت دیکھکر نظیری کے حواس جاتے رہے، اس لیے آداب اور آئین سب بھول گیا، نقیبون نے باز پرس کی تو جواب دیا کہ مین نے آجتک یہ شان و شوکت نہیں دیکھی تھی، اس لیے حواس ٹھکانے نہ رہے، یہ تمام واقعات نظیری نے خود قصیدہ مدحیہ مین لکھے ہین" (شعر العجم جلد سوم ص۱۳۷)

اس قصیدہ کے خاص خاص اشعار یہ ہین

دران بساط کہ بر خود مرا شعور نبود — ز دور دیدۂ دانا دلے بمن افتاد

بمن گفت کہ اے زیب بخش مجمع انس — بیا بیا کہ بوقت آمدی مبارک باد

بساط مجلس و آئین جشن فرودی است — تو نیز جلوۂ آئین نظم خواہی داد

ہمین و دید و بگفت وہنوز پیدا بود — کہ قند غزیو کزین قطرہ کرد دریا باد

چنان بپایۂ دولت ندم شتاب زدہ — کہ چند بار سرم در مقام پا افتاد

ز بسکہ تیز بہ آن بارگاہ در رفتم — ادب ز پایۂ خود پاے بیقرار نہاد

ز دلفریبی آئین و فر سلطانی — نگاہ تہنیتم رسم سجدہ رفت از یاد

چو خوب رسم ادب را بجا نیاوردم — ندا رسید کہ اے روستاہی مادرزاد

بساط عرش و تکبیر، ترا چه پیش آمد | حریم کعبه و غفلت، ترا چه حال افتاد

جواب دادم و گفتم بجرم معذورم | که تا ستم بچنین دو ستی نگشتم شاد

نظیری کو شہزادہ مراد سے بڑا قلبی تعلق تھا، شہزادہ کی موت پر اس نے بڑی دلسوزی کے ساتھ مرثیہ لکھا ہے،

اے بزم تیرہ رخ چون ارغوان کجاست | وے رزم درہمے شہ گیتی ستان کجاست

شوق سجود و حرمت تعظیم کمتر است | آن ناز صدر و سرکشی آستان کجاست

برگ و شکوفہ ریخت، ثمر از کجا خوریم | بشکست شاخ برگ، ہزار آشیان کجاست

کس را سر دو درخور این تعزیت نبود | پیدا کنید کاہل این آستان کجاست

حلقے بہ شیون اند، و نگویند حال چیست | صبر سخن شنیدن و تاب بیان کجاست

آفاق در مصیبت او ممتحن شدہ

این مرگ باعث الم مرد و زن شدہ

نغمہ خاست، در پیالہ ای از ساغر افگنید | شاد بزم تیرہ پردہ از آن رخ بر افگنید

شمعی کہ دہر روشن از و بود، مردہ است | پروانہ را بپیلہ و بجا بستر افگنید

در بزم او ز حلقۂ ماتم خرام نیست | این حلقہ را ز صحن سرا بر در افگنید

ریحان جلوہ، یاسمن عشوہ، ریختہ | چینید و ہم بران قدحان پر و افگنید

رفت آن سری کہ تاج بادو سرفراز بود | بر سر کنید خاک و کلاہ از سر افگنید

خیزید تا بہ آن سر تابوت دم زنیم

عرضی کنیم و کار دو داغش بہم زنیم

نظیری نیشاپوری کے علاوہ مراد کے دربار سے مرزا لعلی بھی وابستہ تھا، مرزا لعل بیگ لعلی

ولد شاہ قلی سلطان بدخشی تشکیل، جمیل، متواضع، اور خاکسار ہونے کے علاوہ شعر و شاعری اور تاریخ و سیر سے بھی ذوق رکھتا تھا، ملا عبد القادر بدایونی کو اس سے بڑی محبت تھی اور اس کے حسب ذیل شعر کو خاص طور سے پسند کیا ہے،

بیہگذار تو چون خاک رہ شدم ترسم ۔۔۔ کہ نگذری بمن و بگذری براہ دگر[1]

پرویز جہانگیر کے لڑکوں میں شہزادہ پرویز نے بھی شعر و شاعری اور علم و فن کی محفل سجائی، اس کے دربار کے بعض شعراء و فضلا حسب ذیل تھے،

حکیم فغفوری گیلانی، نام محمد حسین، مولد لاہجان تھا اس لیے فغفوری لاہجی بھی کہلاتا تھا پہلے سنجی پھر فغفوری تخلص رکھا، ہندوستان آیا تو پرویز کے دربار کو اپنے فضل و کمال سے رونق بخشی اور اس کی شان میں بہت سے قصائد کہے، طب، ریاضی، موسیقی اور شاعری میں "یکتائے روزگار" سمجھا جاتا تھا، میخانہ میں ہے:

حکیم فغفور یگانۂ سخن سرایان دہر و نادرۂ صیرفیان این عصر است .... از اکثر ناظمان نامی این عہد ممتاز در شعر فہمی و تازہ گوئی بے انباز بود" (ص ۱۳۱)

اس دیوان میں قریب پانچ ہزار اشعار تھے، ساقی نامہ کے طرز پر ایک ترجیع بند لکھا ہے جس کی ابتدا میں اپنے زور بیان کا مظاہرہ اس طرح کیا ہے،

ساقی بدہ آن بادہ کہ خورشید شرار است	چون آتش گل ریز بدامان بہار است
آن آتش بے دود کہ موسیش مجوسیت	و آن نور فروزندہ کہ سوزندۂ نار است
چون غنچہ جامش ز دم شیشہ بخندد	گوئی کہ لبالب و بنشین از لب یار است
آنجا کہ رسن تاب شود گیسوی تاکش	صد ست چو منصور نخمیازہ دار است

---

[1] بدایونی جلد سوم ص ۳۲۰، [2] مخزن الغرائب،

موج قدحش دل برازد ست حریفان	چون طرۂ پرتاب کہ بر روی نگار است
خم کوی صلاحت می آتش زدہ دردی	نے خشت بود بر سر خم سنگ فراز است
آن روز کہ از مشرق خم مست صبوحیم	روز بش فشاریم اگر روزہ شمار است
آن را کہ نظر نیست بر آئینہ جامش	بر آئینہ دیدۂ او نور غبار است
برخاست دل ما زجہان تا بحے افتاد	از غرقۂ این بحر دو عالم بکنار است

ما دجلۂ کشتی یاد گرہ فلتیم ز استاد

ما را خط بغداد بداز خطۂ بغداد

ریاضی میں اس کی ایک مفید تالیف "رسالہ اصابع" ہے،[1]

میر ملکی قزوینی، اس کا باپ میر ظہیر الدین ابراہیم قزوین کے معزز لوگوں میں سے تھا،

ملکی قزوینی اکبر کے جود و سخا کی شہرت سنکر ہندوستان آیا، اور شاہی دربار سے وابستہ ہوا، اکبر کی وفات پر اس نے جو مرثیہ لکھا تھا، وہ بہت مقبول ہوا، اس کے کچھ اشعار یہ ہیں:

دارائے روزگار و مدار زمانہ رفت	امروز کہ خدای جہان از میانہ رفت
آئینہ دار دیدۂ اہل نظر گذشت	رونق فزای دفتر این کارخانہ رفت
سنگی رسید و شیشۂ اہل وفا شکست	دردا کہ باعث سخن عارفانہ رفت
شایستۂ شہی و سزاوار سروری	مسند نشین انجمن اکبر ازہ رفت

زد سکہ بر سر زر خورشید خاوری

بر چرخ برد سکۂ اللہ اکبری

اکبر کی وفات کے بعد جہانگیر پھر اس کے بعد امرا میر معز الملک، نہایت خان، خان جہان

[1] فہرست کتبخانہ شاہ اودھ، اسپرنگر ص ۳۹۱،

اور رستم مرزا اسکے خوان کرم کی ریزہ چینی کرنے کے بعد پٹنہ مین شہزادہ پرویز کے سایۂ عاطفت مین پناہ لی، اور کچھ مدحیہ اشعار کے ساتھ ایک ساقی نامہ اس کی خدمت مین پیش کیا جس کو اس کی مجلس کے تمام شرکا و نے بہت پسند کیا، شہزادہ نے میخانہ کے مؤلف ملا عبدالنبی قزوینی سے اس ساقی نامہ کو میخانہ مین درج کرنے کے لیے خاص طور پر فرمایش کی، اس کے ابتدائی اشعار ملاحظہ ہون،

ولاہ رزادہ کام دز فور وزِ ماست ۔ مے ارغوانی دل افروز ماست

شدہ رشک جنت گلستانِ ما ۔ بہشت برین گشتہ بستانِ ما

نخواہیم جامے بجز جام مے ۔ نجوئیم نامے بجز نام مے

چہ مے آنکہ میخانہ اش جان تو ۔ چہ مے آنکہ ..... مستان تو

بمن دہ کہ ہم رنگ مستان شوم ۔ چو آتش سراپا گلستان شوم[۱]

خود میخانہ کا مؤلف ملا عبدالنبی فخر الزمانی قزوینی بھی شہزادہ پرویز کی علم نوازی کا معترف تھا، ملا عبدالنبی ملازم تو مرزا امان اللہ امانی، مرزا نظامی اور سردار خان کے رہے، لیکن وہ اپنے ولی نعمت مرزا نظامی کے قیام پٹنہ کے زمانہ مین شہزادہ پرویز کی شعروشاعری کی مجلسون مین بھی شریک ہوتے تھے، چنانچہ اپنی تصنیف میخانہ مین شہزادہ کی جابجا مداحی کی ہے:

شہی کز مہر او دلہاست لبریز ۔ پناہ بے پناہا شاہ پرویز[۲]

فخر ملکان وشاہِ شاہان ۔ سلطانِ زمانہ شاہ پرویز[۳]

ملا عبدالنبی کی سب سے اہم تصنیف میخانہ ہے جس مین شعرائے متقدمین و متاخرین کے حالات کے ساتھ ان کے ساقی نامے درج ہین، ہندوستان

---

[۱] میخانہ ص ۴۴۴، [۲] ص ۳۲۵، [۳] ص ۴۶۳

اسکے مایۂ ناز اہل علم جناب محمد شفیع صاحب (سابق پرنسپل اورینٹل کالج لاہور) نے بڑی محنت سے اسکو اڈٹ کرکے شائع کیا
ملا عبد النبی کی دو اور کتابیں بھی ہیں، ایک دستور الفصحا جو قصہ گوئی کے آداب پر قصہ خوانوں کے لیے
ایک دستور العمل ہے، دوسری نوادر الحکایات یا بحر النوادر جس میں کچھ قصے تھے،

علماء و فضلاء میں مرزا عبد اللہ اور مرزا محمد قاسم گیلانی پرویز کے دربار سے وابستہ تھے،
مرزا عبد اللہ نشاپور سے ہندوستان آئے، مرزا محمد قاسم معقولات ومنقولات کے عالم تھے ہندوستان
آکر پہلے عادل شاہی دربار کے امیر الامرا شاہنواز خان شیرازی کے یہاں رہے، پھر عبد الرحیم
خانخاناں کی فیاضیوں سے متمتع ہوئے شہزادہ پرویز نے بھی ان کو اپنے یہاں بلاکر رکھا، اور
ان کو انعام واکرام سے سرفراز کرتا رہا[۱]، جہانگیر کے دربار میں بھی ملازم رہا جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے،

شہریار جہانگیر کا لڑکا شہزادہ شہریار بھی شاعر تھا جنگ جانشینی میں جب اس کو شکست
ہوئی، اور اس کی آنکھوں کی بصارت زائل کردی گئی، تو قید خانہ میں اسنے اپنے حسب حال
یہ دو شعر کہے، جس سے اس واقعہ کی تاریخ بھی نکلتی ہے،

زنرگس گلاب ارچہ نتوان کشید کشیدند از نرگس من گلاب
چہ پرسد کسے از تہِ تاریخ من نگو کور گشتند و دیدہ آفتاب[۲]

دارا شکوہ علمی حیثیت سے تیموری شہزادوں کا گل سرسبد دارا شکوہ تھا، وہ
ایک باکمال مصنف، شاعر اور خطاط تھا، اس کو شروع میں تصوف اور مبدء میں ہندو
مذہب سے گہرا شغف ہوگیا تھا، نثر میں اس کی تصانیف ہیں، ان ہی دو موضوعوں پر ہیں
ان تصانیف سے دارا شکوہ کے جن مذہبی اعتقادات اور صوفیانہ خیالات کا اظہار ہوتا ہے
ان پر بحث کرکے ہم ناظرین کو اس کی جانب سے بدظن کرنا نہیں چاہتے، بلکہ صرف اس کے

---

[۱] مزید حالات کے لیے دیکھو مآثر رحیمی جلد سوم صفحہ ۳۹، [۲] ید بیضا، ورق ۹۱

علمی کمالات پر روشنی ڈالنے کی کوشش کریں گے۔[۱] مگر اس کی تصانیف کی تاریخ وار ترتیب سے ناظرین کو خود اندازہ ہو جائے گا، کہ وہ کس طرح رفتہ رفتہ خالص اسلام سے ہٹ کر خالص تصوف اور پھر ہندو مذہب کی طرف مائل ہو گیا،

۱۔ سفینۃ الاولیاء دارا کی یہ پہلی تصنیف ہے کہ جو اس نے اپنی عمر کے پچیسویں سال ۱۰۴۹ھ میں لکھی، اس کتاب کے شروع میں رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر مبارک ہے، اور پھر خلفائے راشدین، حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہم اور ان کے بعد کے ائمہ کے مناقب ہیں، اس کے بعد اولیاء اللہ کے احوال ہیں، جن میں قادریہ، نقشبندیہ، چشتیہ، کبرویہ اور سہروردیہ سلاسل کا ذکر خاص طور پر ہے، ایک باب میں متفرق سلسلوں کے صوفیائے کرام کے بھی کچھ حالات ہیں، آخر میں ازواج مطہرات اور بنات طاہرات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ان خواتین کا ذکر ہے، جنھوں نے راہ سلوک میں کمال حاصل کیا، یہ کتاب مختلف مطبعوں میں چھپ گئی ہے، ۱۸۵۳ء میں مطبع صدر آگرہ سے ایک انگریز مسٹر بیل کے اہتمام میں جو نسخہ شائع ہوا تھا، اس کے صفحات کی تعداد ۲۴۰ ہے،

دارا شکوہ، نفحات الانس، کشف المحجوب، تذکرۃ الاولیاء، اور طبقات سلطانی وغیرہ جیسے تذکروں سے مطمئن نہ تھا، کیونکہ اس کے خیال میں ان کتابوں میں صوفیائے کرام کے حالات سلسلہ بہ سلسلہ علیحدہ علیحدہ منقول نہ تھے، اور نہ ان کی پیدائش اور وفات کی تاریخ کی تفصیل بھی اطمینان بخش تھی، اس لیے ان خامیوں کو سفینۃ الاولیاء لکھ کر پورا کیا، تمام تذکروں

---

[۱] دارا شکوہ کی ایک تصنیف مجمع البحرین کو پروفیسر محفوظ الحق (پریذیڈنسی کالج کلکتہ) نے اڈٹ کیا ہے، اور اس کے دیباچہ میں دارا کی تصنیفات اور تراجم پر بڑی محنت و کاوش سے ایک انگریزی مقالہ لکھا ہے، جناب سید نجیب اشرف صاحب ندوی سابق رفیق دارالمصنفین نے بھی مقدمۂ عالمگیر میں دارا کی تصانیف پر بحث کی ہے، ۲ سفینۃ الاولیاء مطبع صدر آگرہ ۱۸۵۳ء دیباچہ

نے اس کو ایک مستند تذکرہ قرار دیا ہے، سفینۃ الاولیاء کی تحریر کے وقت داراشکوہ حنفی المشرب تھا، اور تصوف میں سلسلہ قادریہ سے متوسل تھا، مگر آگے چل کر اس کے عقائد میں اسلامی تصوف کی شان بالکل مفقود ہو گئی،

اس کتاب کے ادب و انشاء کے متعلق دارا خود لکھتا ہے:

واگرچہ عبارت این کتاب راست پراست است و در عبارت آرائی مقید نشدہ وفارسی سادہ عام فہم نوشتہ لیکن بعضے جا اقتدار بعبارت نفحات الانس قطب الاولیاء قدوۃ اتقیا، نیر آسمان عرفان خورشید فلک ایقان حضرت مولای نور امامت والدین عبدالرحمٰن جامی قدس سرہٗ انشاءے کہ کمال فصاحت ومتانت دارد وایشان را استاد خود می داند کردہ در زبان روزمرہ خود را نیز ترک ساختہ[1]

۲- سکینۃ الاولیاء - دارا نے یہ کتاب اپنی عمر کے اٹھائیسویں سال ۱۰۵۲ھ میں لکھی اس میں اس نے اپنے پیر لسان اللہ ملا شاہ محمد یا محمد شاہ بدخشانی اور پیر کے مرشد میاں میر (ملا جیو) کے حالات، ملفوظات، کرامات اور ان کے خاندان اور خلفاء کے احوال کی تفصیلات لکھی ہیں،

اس کتاب کی وجہ تصنیف یہ بتائی ہے:

سکینۃ الاولیاء .... اور کتابوں کی طرح اولیائے حق کے معتقدوں اور مخلصوں کے لیے بطور یادگار ہے، اور معلوم ہو جائے کہ کوئی زمانہ اس عالی گروہ سے خالی نہیں رہا، اور نیز یہ کہ اس زمانے میں بھی جب کہ ۱۰۵۲ھ ہے، اس قسم کے لوگ ہیں اور تھے،[2]

---

[1] سفینۃ الاولیاء ص ۴۲۷ [2] مجھکو سکینۃ الاولیاء کا فارسی نسخہ نہیں مل سکا، اس کا اردو ترجمہ جو فضل الدین ملک چنن الدین گگے زئی تاجران کتب قومی منزل نقشبندیہ کشمیری بازار لاہور نے شائع کیا ہے، میرے پیش نظر ہے،

دارا نے راہ سلوک کی منزلیں جسطرح طے کین، اس کا حال اس طرح لکھتا ہے :

جمعرات کے روز جو بیس سال کی عمر مین خواب مین فرشتہ نے مجھے آواز دی اور چار مرتبہ کہا "تجھے اللہ تعالٰی ایسی چیز عنایت کرے گا، جو روئے زمین پر کسی بادشاہ کو نصیب نہین ہوئی" نیند سے بیدار ہو کر مین نے اپنے دل مین سوچا کہ اس قسم کی سعادت البتہ عرفان ہوگی، اور بے شک اللہ تعالٰی محض اپنے فضل و کرم سے مجھے یہ دولت بخش دے گا، ان اللہ غفور رحیم، مین ہمیشہ اس دولت عظمٰی کا طالب رہا، یہان تک کہ ۲۹ ماہ ذی الحجہ ۱۰۴۹ھ کو ایک دوست خدا کی صحبت مین پہنچا، وہ مجھپر نہایت مہربان ہوا، جو بات دوسرے لوگون کو ایک مہینہ مین حاصل ہوتی تھی، وہ مجھے پہلی رات مین مل گئی، اور جو کچھ دوسرے ایک سال مین حاصل کرتے تھے، مجھے ایک مہینہ مین حاصل ہوگئی، جہان اور کوئی طالب سالہا سال کے مجاہدون اور ریاضتون سے پہنچتا، مین محض اللہ تعالٰی کے فضل و کرم سے بغیر ریاضت یک بارگی پہنچ گیا، دونون جہان کی محبت میرے دل سے اٹھ گئی اور فضل و رحمت کے دروازے میرے دل پر کھل گئے، اور جو مین چاہتا تھا وہ مجھے مل گیا" (ص۵)

گو ہم دارا کے صوفیانہ عقائد سے بحث کرنا نہین چاہتے، لیکن یہ کہنا نامناسب معلوم نہین ہوتا، کہ دارا نے جس عجلت اور تیزی سے راہ سلوک کی منزلین طے کین، وہ ہندوستان کے صوفیائے کرام مین کسی اور نے نہین کین، حضرت خواجہ معین الدین چشتی نے بیس سال تک اپنے مرشد کے پاس رہ کر ریاضت کی، اور برسون سمرقند، بغداد، ہمدان، تبریز، استرآباد، سبزوار، حصار، بلخ اور ہندوستان وغیرہ کی بادیہ پیمائی کرنے کے بعد راہ سلوک کی منزلین طے کر سکے، حضرت بختیار کاکیؒ بیس برس تک رات کو مطلق نہ سوئے، حضرت فریدالدین گنج شکرؒ نے اپنے مجاہدے کیے کہ ایک بار حضرت معین الدین چشتی ان کے حجرے مین تشریف لائے

تو وہ ضعف سے ان کی تعظیم کے لیے کھڑے نہ ہو سکے، حضرت شرف الدین یحییٰ منیریؒ نے ۳۰ سال تک جنگلوں میں عبادت کی، اس لیے دارا کا یہ لکھنا کہ اس نے یکبارگی "سب کچھ" حاصل کر لیا مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے،

دارا کو اپنے مرشد ملا جیو سے والہانہ عقیدت تھی، وہ ایک قصبہ "باری" میں عزلت نشین تھے، اس لیے دارا ان کو باری تعالیٰ کہتا تھا، (حسنات العارفین ص۵۳)، ملا جیو نے خواب میں اس کو مشاہدہ اور مراقبہ کرنا سکھایا اور خواب ہی میں اپنے سینہ کی امانت اس کے سینے میں منتقل کی جس کے بعد دارا شکوہ کو سلوک میں فتح پر فتح حاصل ہوئی، (ص۱۴۳)

ملا جیو کو بھی اپنے مرید سے غیر معمولی شیفتگی تھی، وہ اپنے "یاروں" اور "مریدوں" سے کہا کرتے تھے کہ جس طرح میں دارا کے حال کی طرف متوجہ رہتا ہوں، تم بھی رہا کرو، اگر تم اس کی طرف متوجہ نہ ہوگے، تو خدا سے پھر جاؤ گے" (ص۱۴۳) (العیاذ باللہ) وہ اپنے مریدوں کو دارا شکوہ ہی کی صورت کا مراقبہ کرنے کی تلقین کرتے تھے، (ص۱۴۳)

لسان اللہ شاہ محمد، دارا کے اصلی مرشد کو بھی دارا سے بڑی محبت تھی، انھوں نے اس کی شان میں ایک غزل کہی تھی، لیکن یہ اس قدر غلط اور بے معنی یا اتنی مسخ چھپی ہے کہ بالکل مہمل ہو گئی ہے، ایک شعر جس کے کچھ معنی سمجھ میں آتے ہیں، یہ ہے:-

اے سپہر عالم راز لسان دل　　　روز سے شود کرتہ شوقی قربان دل

ملا شاہ محمد کو دارا شکوہ سے یہ امید تھی، کہ وہ ہندوستان میں طریقہ قادری کو رواج دیگا، لیکن ان کی یہ امید بر نہ آئی، (ص۱۳۳)

دارا شکوہ نے اپنے مرشد کے خوارق و کرامات کی بہت سی تفصیلات لکھی ہیں، اور انہی کے ذریعہ سے ان کی روحانی عظمت کو ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے، آخر میں اس کے مرشد

کی ہمشیرہ بی بی جمال خاتون کے احوال وکرامات بھی درج ہین، اور اس کے بعد ملا جیو کے خلفا کا ذکر ہے، دارا نے ان خلفا کے اشعار کے انتخابات بھی اس کتاب مین دیے ہین، کتاب مین جابجا کشف المحجوب، نفحات الانس، غنیۃ الطالبین، تفسیر عرائس تفسیر قشیری، فصل الخطاب، بحر الحقائق تفسیر حسینی، صحیح مسلم، مشکوٰۃ، معجم البلدان وغیرہ کے حوالے ہین جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کتابین دارا کے زیر مطالعہ رہین،

۳- رسالہ حق نما:- میری نظر سے نہین گذرا،

۴- حسنات العارفین یا شطحیات:- دارا اس کتاب کی تمہید مین لکھتا ہے، کہ "وجد وذوق" کی حالت مین اس کے منہ سے ایسے کلمات بلند حقائق" نکل جاتے تھے، جن کو سن کر "پست فطرت"، "دون ہمت" اور "زاہد خشک" نے اپنی کوتاہ بینی سے اس پر تکفیر کے فتاوی صادر کئے، اس تکفیر سے بچنے کے لیے اس نے مذکورہ بالا کتاب تالیف کی جس مین نامور صوفیاے کرام اور علماے عظام بلکہ رسول اللہ صلعم اور خلفاے راشدین رضی اللہ عنہم کے ایسے کلمات اور اقوال نقل کئے ہین جو اس کے خیال مین شطحیات ہین، ان اقوال سے وہ یہ ظاہر کرنا چاہتا ہے، کہ توحید و معرفت کے منازل و مدارج مین ایک ایسا مقام بھی آتا ہے جب ایک سالک شریعت و طریقت، کفر و ایمان، خیر و شر اور عبد و معبود سے بالکل بے نیاز ہو جاتا ہے، اور بے خودی مین اس کی زبان سے ایسے کلمات نکلتے ہین، جو بظاہر مذہب و ایمان کے منافی ہوتے ہین، لیکن وہ قابل مواخذہ نہین ہوتے، چنانچہ دارا یہ بتانے کی کوشش کرتا ہے کہ راہ سلوک مین ایسے ہی مقام پر پہنچ کر اس کی زبان سے شطحیات صادر ہوئین، اور اسی مقام کے وجد و ذوق مین وہ صوم وصلوٰۃ سے مستغنی ہو گیا،

دارا نے جتنے کلمات و اقوال نقل کیے ہین، ان پر مفصل بحث کر کے یہ دکھایا جا سکتا ہے کہ

ان کلمات کی نسبت غیر معتبر مشکوک اور مجہول الروایت ہے، اور بعض اقوال کی تشریح و توضیح صحت سے دور ہے، مگر اس مضمون میں ہم اس قسم کی بحث سے قصداً پرہیز کرنا چاہتے ہیں، اس میں شک نہیں کہ بعض شطحیات ایسی ضرور ہیں، جو بعض صوفیائے کرام کی زبانوں سے غیر اختیاری طور پر نکلیں، لیکن وہ خود کسی حال میں بھی دارا کی طرح ان کے جواز کے قائل نہ تھے، کیونکہ اسلامی تصوف شریعت کے دائرہ سے الگ نہیں ہے، اور شطحیات کو علما وصوفیہ میں سے کسی نے بھی روا نہیں رکھا ہے، چنانچہ ہندوستان کے اکابر مشائخ اور صوفیہ کاملین کا عمل اسی پر رہا ہے، ان کے افعال و اقوال اس کے شاہد ہیں،

۵۔ **مجمع البحرین** :۔ یہ کتاب دارا نے اپنی عمر کے ۴۲ ویں سال میں لکھی، اس میں اسلام اور ہندو مذہب کو ایک ہی سمندر کے دو دھارے بتایا ہے، اور ان دونوں کو ملانے کی کوشش کی ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ اسلامی تصوف اور فلسفۂ ویدانت میں لفظی اختلاف کے سوا کوئی اور فرق نہیں، توحید کے شیدائی ان دونوں میں سے جس کی بھی تقلید کریں حقانیت کی منزل تک پہنچ سکتے ہیں اس کتاب کی اشاعت پر دارا کو مرتد اور ملحد قرار دیا گیا، اور آگے چل کر اس کے یہی عقائد اس کے زوال اور موت کا سبب بنے، یہ کتاب اپنی نوعیت کے لحاظ سے پہلی اور آخری تصنیف ہے[1]

دارا کی تصانیف یہی پانچ ہیں، اس کے بعد اس نے زیادہ تر ہندو مذہب کی کتابوں کے ترجمے کئے یا کرائے، ان ترجموں کی تمہید میں دارا نے اپنے جن خیالات کا اظہار کیا ہے، ان سے پتہ چلتا ہے کہ وہ حنفی المشرب اور سلسلۂ قادریہ کا پیرو ہونے کے بجائے رفتہ رفتہ ہندو ہونے کی کوشش کر رہا تھا، یا کم از کم وہ اپنے عقائد کو ایسے سانچے میں ڈھال رہا تھا، کہ ہندو اس کی طرف مائل ہو کر تخت و تاج کے حصول میں اس کے معاون اور مددگار ہوں،

[1] پروفیسر محفوظ الحق کلکتہ نے مجمع البحرین کو بہت ہی دقت نظر کے ساتھ اڈٹ کر کے اس کے انگریزی ترجمہ کے ساتھ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ سے شائع کیا ہے،

۷۔ سِرِّ اکبر:- یہ اوپنشد کے پچاس ابواب کا فارسی ترجمہ ہے، جو دارا شکوہ نے ۱۰۶۷ھ میں
بنارس کے پنڈتوں کی مدد سے کیا، اس کتاب میں بسم اللہ کے بجائے گنیش جی کی تصویر دی ہے
اور دیباچہ میں لکھا ہے کہ اصل قرآن مجید یہی ہے، (نعوذ باللہ) اس کی وجہ تصنیف کے متعلق
وہ خود لکھتا ہے، (نقل کفر کفر نہ باشد)

"جب یہ فقیر بے اندوہ محمد دارا شکوہ ۱۰۵۰ھ میں کشمیر جنت نظیر گیا تھا، تو میں نے
عنایتِ الٰہی اور اس کے فضلِ نامتناہی سے کاملوں کے کامل، عارفوں کے خلاصہ،
استادوں کے استاد، پیشواؤں کے پیشوا، اور حقائق آگاہ کے متقدا یعنی حضرت ملا شاہ سلمہ اللہ
سے بیادت اور ارادت حاصل کی، مجھکو ہر گروہ کے عارفوں کو دیکھنے اور توحید کے متعلق اعلیٰ
باتیں سننے کا ذوق تھا، اور تصوف کی بہت سی کتابیں نظر سے گذر چکی تھیں، اور کچھ رسالے
بھی تصنیف کیے تھے، لیکن طلب توحید میں جو ایک بحر بیکران ہے، اور بھی تشنگی ہر وقت
بڑھتی گئی، دقیق مسائل ذہن میں آتے تھے، جن کا حل بجز کلام الٰہی اور استاذ ذات نامتناہی
کے ممکن نہ تھا، چونکہ قرآن مجید وعظیم اور فرقان کریم کی اکثر باتیں رمزی ہیں، اور آج کل انکے
جاننے والے کم ہیں، اس لیے میں نے چاہا کہ تمام آسمانی کتابوں کو پڑھوں، کیونکہ کلام الٰہی
اپنی تفسیر آپ ہے، یعنی جو بات مجمل ہوگی دوسری کتابوں میں مفصل پائی جائیگی، اس تفصیل سے اجمال
معلوم ہو جائے گا، میں نے توریت، انجیل، زبور اور دوسری کتابیں پڑھیں، لیکن ان میں
توحید کا بیان مجمل اور اشارات میں تھا، اور ان آسان ترجموں سے جن کو اہل غرض نے کیا ہے
تھا، مطالب معلوم نہیں ہوتا تھا اس لیے اس بات کی فکر میں ہوا کہ ہندوستان وحدت عیان
میں توحید کی گفتگو کیوں بہت زیادہ ہے، اور قدیم ہند کے ظاہری اور باطنی علماء کو وحدت
سے انکار اور موحدوں پر کوئی اعتراض نہیں، بلکہ ان پر اعتبار ہے، برخلاف اس کے جہلائے وقت

خدا شناسوں اور موحدوں کے قتل، کفر اور انکار میں مشغول ہیں، اور توحید کی تمام
باتوں کو جو کلام پاک اور صحیح احادیث نبوی سے ظاہر ہیں، رد کرتے ہیں، وہ خدا کے
راستے کے راہزن ہیں، ان باتوں کی تحقیق کے بعد معلوم ہوا، کہ اس قوم قدیم (یعنی ہندوؤں)
کے درمیان تمام آسمانی کتابوں سے پہلے چار آسمانی کتابیں تھیں، رگ بید، سام بید،
اتھربن بید...... اور اس وقت کے سب سے بڑے نبی برہما یعنی آدم صفی اللہ
پر یہ تمام احکام نازل ہوئے، اور یہ باتیں ان کتابوں سے ظاہر ہیں........ اور محض توحید
کے اشغال اس میں درج ہیں، جس کا نام اپنکھت ہے، اس زمانہ کے ابنیاء نے ان کو
علیحدہ کرکے ان پر شرح وبسط کے ساتھ تفسیریں لکھی ہیں، اور ہمیشہ ان کو بہترین عبادت
سمجھکر پڑھتے ہیں، اس خاکسار کی نظر چونکہ وحدت ذات کی اصل پر تھی نہ کہ عربی، سریانی،
عبرانی، اور سنسکرت زبان پر، اس لیے چاہا کہ ان اپنکھت کو جو کہ توحید کا خزانہ ہے اور
جس کے جاننے والے اس قوم میں بھی کم رہ گئے ہیں، فارسی زبان میں بغیر کسی کمی اور بیشی اور
نفسانی غرض کے لفظ بلفظ بالمقابل ترجمہ کرکے سمجھوں کہ یہ جماعت اس کو اہل اسلام سے پوشیدہ
اور پنہاں رکھتی ہے، اس کا کیا بھید ہے؟ شہر بنارس جو اس قوم کا دار العلم ہے، اور جہاں
پنڈت اور سنیاسی جو کہ سرآمد وقت اور بید اور اپنکھت کے جاننے والے تھے........ اس
خاکسار سے تعلق رکھتا تھا...... ۱۰۶۷ھ میں بے غرضی کے ساتھ اس کا ترجمہ کیا، اور توحید
کے متعلق ہر قسم کی مشکل اور اعلیٰ باتیں جن کا میں طلب گار تھا، لیکن حل نہیں پاتا تھا، اس
قدیم کتاب کے ذریعہ سے معلوم ہوئیں، جو بلا شک وشبہہ پہلی آسمانی کتاب ہے، اور بحر توحید
کا سرچشمہ ہے اور قدیم ہے، اور قرآن مجید کی آیت بلکہ تفسیر ہے، اور صراحۃً
ظاہر ہوتا ہے کہ یہ آیت بعینہ اس کتاب آسمانی سرچشمہ بحر توحید اور قدیم کے حق میں ہے،

انه لقرآن کریم فی کتٰب مکنون لا یمسہ الا المطھرون تنزیل من رب العٰلمین

یعنی قرآن کریم ایسی کتاب میں ہے، جو پوشیدہ ہے، اور اس کو نہیں چھوتے ہیں، مگر وہ جو کہ پاک ہیں، وہ نازل ہوئی ہے خداوند عالم کی طرف سے متعین طور سے معلوم ہوتا ہے، کہ یہ آیت توریت اور انجیل کے حق میں نہیں، لفظ تنزیل سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ لوح محفوظ کے حق میں ہے، چونکہ اپنکہت کہ ایک مخفی راز ہے، اصل وہ اختصار ہے، اور قرآن مجید کی آیتیں بعینہٖ اس میں پائی جاتی ہیں، پس تحقیق کہ چھپی ہوئی کتاب یہی کتاب قدیم ہے، اس فقیر کا جس نے بے جانی ہوئی چیز کو جان لیا، اور بے سمجھی ہوئی چیز کو سمجھ لیا، اس ترجمہ کے کرنے میں اس کے سوا کوئی مطلب اور مقصد نہ تھا، کہ وہ اور اس کی اولاد، اس کے دوست اور حق کے طلب گار فائدہ اٹھائیں ‘‘

مولانا شبلی مرحوم نے سراکبر کے ترجمہ کو ۱۹۰۶ء میں ندوۃ العلماء کے سالانہ اجلاس منعقدہ بنارس کی علمی نمائش گاہ میں دیکھا تھا اس کتاب کے دیباچہ کو پڑھ کر ان پر جو اثرات طاری ہوئے ان کا اظہار اس طرح کرتے ہیں کہ ’’عالمگیر نے داراشکوہ کے مقابلہ کا جب قصد کیا تو اس کا یہ سبب ظاہر کیا کہ داراشکوہ بدعقیدہ اور بددین ہے، اس لیے اگر وہ ہندوستان کا فرمانروا ہوا تو ملک میں بددینی پھیل جائے گی، عام مورخوں کا خیال ہے، کہ یہ محض ایک فریب تھا، نہ داراشکوہ بے دین تھا اور نہ عالمگیر کی مخالفت کا یہ سبب تھا، دونوں کا حال خدا کو معلوم لیکن اس کتاب کے دیباچے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ داراشکوہ بالکل ہندو بن گیا تھا، اور کچھ شبہ نہیں کہ اگر وہ تخت شاہی پر متمکن ہوتا تو اسلامی شعار اور خصوصاً سنن بالکل مٹ جاتے ‘‘ (مقالات شبلی ج ہفتم ص ۱۰۱)

علمی حیثیت سے اس ترجمہ سے یہ فائدہ ہوا کہ برہمنوں کا علمی بخل جاتا رہا، اور اب تک ان کے جو علوم مخفی رازہائے سربستہ تھے، وہ بالکل فاش ہو گئے، اور اس فارسی ترجمہ کے ترجمے یورپ کی

مختلف زبانوں میں ہوئے، اور کہا جاتا ہے کہ جرمنوں کو اپنشد کے راز سر اکبر ہی کے ذریعہ معلوم ہوئے

سر اکبر کا ایک خوش خط قلمی نسخہ دار المصنفین کے کتبخانہ میں ہے، گمان یہ ہے کہ اس نسخہ کا خط

دارا شکوہ یا اس کے کسی منشی کے ہاتھ کا ہے، آخر کی عبارت یہ ہے۔

این ترجمہ اپنکہات بیہ چہار وید کہ موسوم بسر اکبر است و تمام معرفت نور الانوار از فقیر

بے اندوہ محمد دارا شکوہ خود بعبارت راست براست در مدت شش ماہ آخر دو شنبہ بست و ششم

ماہ رمضان سنہ یکہزار و شصت و ہفت در شہر دہلی، در منزل نکمبود دہ باتمام رسانیدہ از

گنج معرفت بہرہ ور از ہستی موہوم خلاص گشتہ بہستی حق رسید ہرنگار جاوید گردید، تمام شد کتاب

ترجمہ اپنکہار موافق چتر بید،[۱]

۲۔ بھگوت گیتا:۔ اس کا ایک نسخہ برٹش میوزیم میں ہے، جس کے شروع میں یہ عبارت ہے:

گیتا بزبان فارسی تصنیف شیخ ابو الفضل علامی از کتاب مہابھارت از فن ششم کہ آنرا

بھکم پرب گویند سری کرشن جیو وارجن سنباد۔"

اس تحریر سے یہ ظاہر ہوتا ہے، کہ بھگوت گیتا کا فارسی ترجمہ شیخ ابو الفضل کا کیا ہوا ہے، لیکن

برٹش میوزیم کے فہرست نگار نے اس کی بقیہ عبارت اور اس ترجمہ کی عبارت میں تطبیق نہیں

پائی، جو اکبر کے عہد میں کیا گیا تھا[۲] اس کا ایک نسخہ انڈیا آفس لائبریری میں بھی ہے، اس کے فہرست

نگار نے اس نسخہ کے ترجمہ کو دارا شکوہ کی طرف منسوب کیا ہے، اور یہ بھی واضح طور سے بتایا ہے کہ

برٹش میوزیم کے نسخہ کو ابو الفضل کی طرف منسوب کرنا درست نہیں[۳]، لاہور سے آرٹ پیپر پر نہایت

۱؎ معارف نمبر ۶ جلد ۱۴ میں سر اکبر کے موضوع پر ایک بہت ہی مفصل تبصرہ شائع ہوا ہے جس کا مطالعہ

ناظرین کے لیے مفید ثابت ہوگا ۲؎ برٹش میوزیم کیٹلاگ جلد اول ص ۵۹ ۳؎ انڈیا

آفس کیٹلاگ جلد اول کالم ۱۰۸۹،

عمدہ طباعت کے ساتھ ایک صاحب نے بھگوت گیتا شائع کیا ہے جس کو فیضی کا ترجمہ بتایا گیا ہے

اکبری عہد کے مختلف تراجم کی فہرست معاصر تاریخون مین درج ہے، اس مین میری نظر سے

کہین یہ نہیں گزرا کہ فیضی نے بھگوت گیتا کا منظوم ترجمہ کیا تھا،

انڈیا آفس کے فہرست نگار نے ایک اور کتاب **نادر النکات** دارا شکوہ کی طرف

منسوب کی ہے، مگر اس کا نام صرف سفینۃ الاولیا کے سلسلہ مین آگیا ہے، فہرست نگار نے اس

کی کوئی تفصیل نہین لکھی ہے، پروفیسر محفوظ الحق کا خیال ہے کہ یہ کتاب شاید رسالہ حق نما یا

مکالمہ بابا لال و دارا شکوہ کا دوسرا نام ہو، کیونکہ خدا بخش خان لائبریری پٹنہ مین جو آخرالذکر

نسخہ ہے، اسکا دوسرا نام مخزن نکات بھی ہے،

خزینۃ الاصفیار کے مصنف دارا شکوہ کے تذکرہ مین لکھتے ہین :-

"از تصانیف مشہورہ وسے کتاب سفینۃ الاولیا، وسکینۃ الاولیا، وسر اکبر و دیوان

اکسیر اعظم و رسالہ معارف وغیرہ است"

رسالہ **معارف** میری نظر سے نہین گذرا، دیوان اکسیر اعظم کا ذکر آگے آئیگا،

مخزن الغرائب کے مؤلف نے اپنے دیباچہ مین ان کتابون کی فہرست دی ہے جن سے

انھون نے استفادہ کیا ہے، اس فہرست مین دارا شکوہ کی بیاض کا حوالہ ان الفاظ مین دیا ہے،

"**بیاض** محمد دارا شکوہ ولی عہد شاہجہان بادشاہ قادری تخلص صاحب مجمع البحرین کہ باصطلاح

صوفیہ ہند نوشتہ"

مگر اس بیاض کا ذکر کسی کتب خانہ کی فہرست میں نہین، ورنہ اس سے دارا کے شاعرانہ

ذوق کا اندازہ ہوسکتا تھا، لیکن مخزن الغرائب کے ..... دقیق النظر تذکرہ نگار کا اس بیاض سے

استفادہ کرنا دارا شکوہ کے کمال شاعری کی سند ہے،

پروفیسر محفوظ الحق صاحب نے مجمع البحرین کے دیباچہ میں مختلف ماخذوں سے دارا کی تین اور تالیفات کا ذکر کیا ہے۔ پیرس کے قومی کتب خانہ میں ایک مخطوطہ نگارستان منیر ہے جس کے آخر میں ایک مرقع کا دیباچہ ہے، کتب خانہ مذا کے فہرست نگار کا بیان ہے کہ اس دیباچہ کی تحریر دارا شکوہ کی ہے، پروفیسر صاحب کا خیال ہے کہ شاید دیباچہ اس مرقع کا ہو جو دارا نے اپنی محبوب بیوی نادرہ بیگم کو ۱۰۵۱ھ میں بطور تحفہ دیا تھا، مخزن ستمبر ۱۹۰۲ء میں دارا کی ایک فارسی مثنوی اور پنجاب ہسٹاریکل سوسائٹی جرنل (جلد دوم نمبر ۱) میں دارا کی ایک تزک کا ذکر ہوا ہے، مگر ان کتابوں کے نام کسی تذکرہ اور تاریخ میں نہیں پائے جاتے،

ان تالیفات کے علاوہ حسب ذیل کتابیں دارا کے حکم سے لکھی گئیں،

ا۔ مکالمۂ دارا شکوہ و بابالال، بابالال بیراگی ذات کا کھتری اور قصور کا باشندہ تھا لیکن اس کا استھان دھیان پور (بٹالہ) میں تھا، میاں جیو کا دوست تھا، اس لیے دارا شکوہ کو بھی اس سے عقیدت تھی، اپنی کتاب شطحیات میں بابالال کے متعلق لکھتا ہے:

بابالال عندیہ کہ از کمال عرفاست و در ہنود بہ عرفان و متانت وسے کسے دیدہ نشد، مرا گفتند، در ہر قومے عارفے و کاملے می باشند کہ حق سبحانہ تعالیٰ بہ برکت او آن قوم را نجات می دہد، و تو منکر ہیچ قومے مباش۔" (صفحہ ۲۲ مطبع مجتبائی)

مجمع البحرین میں بابالال بیراگی کا نام مسلمان صوفیۂ کرام کے ساتھ آیا ہے، (صفحہ ۲) دارا شکوہ ۱۰۶۳ھ میں قندھار کی مہم سے واپس آیا تو لاہور میں بابالال سے ملا، اور دونوں کی گفتگو سات مجلسوں میں ختم ہوئی، ان مکالموں کو دارا شکوہ کے حکم سے اس کے میر منشی چندر بھان برہمن نے قلمبند کر لیا تھا، مکالمے دلچسپ ہیں، جن میں یہ دکھایا گیا ہے کہ حق و صداقت کسی

ایک مذہب کی ملکیت نہیں، اب سے بہت پہلے یہ رسالہ مع اردو ترجمہ کے مطبع مجیب ہند دریا گنج دہلی سے چھپ گیا ہے۔ اس کا اردو ترجمہ ایک ہندو لالہ چرنجی لال نے کیا ہے،

۲۔ **جوگ بششت** : یہ سنسکرت کی مشہور کتاب "یوگ واسی ششت" کا فارسی ترجمہ ہے، جو دارا شکوہ کے حکم سے اس کے ایک درباری نے سنہ ۱۰۶۶ھ میں کیا، ترجمہ کی وجہ دارا نے یہ بتائی ہے:

> اس کتاب کے انتخاب کا ترجمہ جو شیخ صوفی کے ساتھ منسوب ہے ہم نے مطالعہ کیا تو رات کو خواب میں دیکھا کہ دو بزرگ مقبول صورت ایک اونچے پر اور دوسرے کسی قدر اس سے نیچے کھڑے معلوم ہوئے، جو اونچے پر کھڑے تھے بششٹ تھے، اور دوسرے رام چندر ...... میں بے اختیار بششٹ کی خدمت میں حاضر ہوا، بششٹ نے نہایت مہربانی سے ہاتھ میری پیٹھ پر رکھا، اور فرمایا کہ اے رامچندر یہ سچا طالب ہے، اور سچی طلب میں تیرا بھائی ہے اس سے بغلگیر ہو، رامچندر بکمال محبت کے ساتھ مجھ سے ملے، اس کے بعد بششٹ نے رامچندر کے ہاتھ میں مٹھائی دی، تاکہ مجھے کھلا دے، میں نے وہ شیرینی کھائی، اس خواب کے دیکھنے سے ترجمہ کی خواہش از سر نو زیادہ ہوئی، اور دربار عالی کے حاضرین میں سے ایک شخص مقرر اس خدمت پر ہوا، اور ہندوستان کے پنڈتوں سے ...... اس کتاب کے لکھنے میں اہتمام و انصرام کیا۔[۱]

اس ترجمہ کا ایک نسخہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی میں ہے، اس کا اردو ترجمہ منہاج السالکین کے نام سے مولوی ابوالحسن صاحب نے کیا ہے، جو نولکشور پریس لکھنؤ میں طبع ہوا ہے، اوپر کی عبارت سے معلوم ہوگا، کہ دارا ہندوؤں پر یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا، کہ وہ بھی رامچندر

---

[۱] بحوالہ مقدمہ رقعات عالمگیری مرتبہ نجیب اشرف ندوی رفیق دار المصنفین،

کی طرح ایک اوتار ہے،

۳۔ **تاریخ شمشیر خانی**: یہ شاہنامہ کی گویا تلخیص ہے، جو دارا کے حکم سے کی گئی، دارا کے وسیلہ سے جو کتابیں لکھی گئیں، ان میں جناب پروفیسر سید نجیب اشرف صاحب ندوی نے **قصص الانبیا** کا نام بھی گنایا ہے،

دارا کی علمی سرپرستی کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ بعض اہل قلم اپنی کتابیں لکھ کر اس کے نام سے منسوب اور معنون کرتے تھے، نورالدین محمد بن عبداللہ بن عین الملک نے ۱۰۵۶ھ میں طب پر ایک ضخیم کتاب لکھی، اور اس کا نام **طب دارا شکوہی** رکھا، پیرس کے قومی کتب خانہ کے فارسی مخطوطات کی فہرست میں اس کا نام **علاجات دارا شکوہی** ہے، ابراہیم مسکین نے اپنی کتاب ترجمۂ **اقوال واسطی** میں ابوبکر بن محمد بن موسیٰ الواسطی کے اقوال کا فارسی ترجمہ کیا، اور اس کو دارا شکوہ کے نام سے معنون کیا،

دارا نثر نگار ہونے کے علاوہ ایک ممتاز شاعر بھی تھا، اس کی شاعری کی داد اس کے مرشد نے "بے نظیر" اور "دلپذیر" کہکر دی تھی، کلمات الشعراء کے مصنف سرخوش نے لکھا ہے:

"طبع بلند و ذہنے رسا داشت، مطالب صوفیہ در رباعی و غزل منظوم می کرد، بحسب اعتقادی کہ بسلسلۂ عالیہ قادریہ داشت، قادری تخلص می کرد............ دیوان مختصر از وجمع شدہ"

خزینۃ الاصفیاء[1] کے مصنف کا بیان ہے کہ دارا شکوہ کے دیوان کا نام **اکسیر اعظم** تھا، اور وہ اس کی شاعری کی تعریف ان الفاظ میں کہتے ہیں:

"سخنش دریائے توحید است کہ از زبان گوہر افشانش او روان گشتہ و یا خورشید نسبت حداست کہ از افق بیان مطلع انوارش طلوع شدہ مغزی باید کہ سخنش را بفہمد و دلی باید کہ معانی آن در دی امکان پذیرد" (خزینۃ الاصفیاء ص ۱۷۰ جلد اول)

[1] سکینۃ الاولیاء ص ۱۴۳

دارا کا دیوان نایاب تھا، مگر کچھ دن ہوئے کہ خان بہادر ظفر الحسن صاحب (محکمۂ آثار قدیمہ) کو اس کے ایک دیوان کا نسخہ ملا ہے، موصوف نے بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کے ایک ماہانہ جلسہ (جولائی ۳۹ء) کے مضمون میں یہ بتایا ہے کہ اس دیوان میں دارا کی ۱۳۴ غزلیں اور ۳۰ رباعیاں ہیں، اور یہ نسخہ دارا کی زندگی ہی میں لکھا گیا تھا، اب تک شاید اس دیوان کی طباعت نہ ہوسکی ہے، مختلف تذکروں میں ہم کو دارا کے جو جستہ جستہ اشعار ملے ہیں، ان کو ناظرین کی دلچسپی کے لیے ذیل میں درج کرتے ہیں، اس سے دارا کے ذوق شعری کا اندازہ ہوگا،

تذکرۂ سرخوش :-

هر خم و پیچی که شد از تاب زلف یار شد | دام شد، زنجیر شد، تسبیح شد، زنار شد

خاطر نقاش در تصویر حسنش جمع بود | چون بزلف او رسید آخر پریشانی کشید

بشکست دل ابله از گردش پایم | در کار من این هم گرهی بود که وا شد

نقد و مال باشد سرگرانی | ز وزن زر فزاید بار دستار

بخیه بر خرقۂ فقر کیشان | موج آب حیات را ماند

همه چیز تو خوب لیک این به | که تو بیا دو به من آئی

تا دوست رسیدیم چو از خویش گذشتیم | از خویش گذشتن چه مبارک سفری بود

مخزن الغرائب : رباعی

معروف شدیم تا که بعرفان گشتیم | عارف شدم و ز خویش عریان گشتم
پیدا کردی مرا و لیکن من هم | پیدا کردم ترا و پنهان گشتم

دیگر

عارض دل و جان تو مزین سازد | خاریکه بود باشش گلشن سازد

کامل ہمہ را ز نقص بیرون آرد یک شمع ہزار شمع روشن سازد

حسنات العارفین مین دارا شکوہ نے شطحیات کی تائید و حمایت مین بکثرت اشعار نظمین اور رباعیان لکھی ہین، ان مین جو اشعار اور رباعیان اس نے اپنی طرف منسوب کی ہین ان کو ہم ذیل مین درج کرتے ہین، مثلاً وہ اس مضمون کو کہ ذاکر مذکور سے غافل ہوسکتا ہے، مگر اس کا غافل ہونا عوام کے غافل ہونے سے مختلف ہے، یون ادا کرتا ہے،

خوش گرچہ بیاد خود نشستن ہمہ وقت این قید چہ لازم است بر من ہمہ وقت
غافل شدن خلق ز حق از حق ست خود را تعب است یاد کردن ہمہ وقت

یا توحید کی حقیقت خود توحید کو فراموش کرنا ہے،

توحید خموشی ست و فکر است مدام بحث آمد و شد ز دست توحید تمام
یک گفتن تو بہین قوی ثابت کرد توحید دو ز نقطہ چون گیری نام

ابو عبد اللہ خفیف سے پوچھا گیا کہ تصوف کیا ہے، تو فرمایا "غفلت را ہم وجود اللہ دانستن" دارا نے اس کو اس طرح ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے،

ہر چند کہ خلق را گرفتہ کوبی غفلت شدہ است بر ہمہ مستولی
مشغول بحق ست بغفلت باشد ہر کس کہ بہر چیز کند مشغولی

جو شخص خدا کے ساتھ مشغول ہے، اس کے لیے ایمان کا سوال باقی نہین رہتا،

کافر گفتی تو از پے آزارم این حرف ترا راست ہمی پندارم
پستی و بلندی ہمہ شد ہموارم من مذہب ہفتاد و دو ملت دارم

منصور نے صرف اپنے مین خدا کو دیکھا، لیکن عارف ہر چیز مین خدا دیکھتا ہے

عارف بجز و اطلاق خدائی نکند از فرط لطیفت تو جدائی نکند

گر بندہ کسے بود خدا او باشد   چون جملہ خدا است خود نمائی نکند

توحید علم سے حاصل نہین ہوتی ہے لکھنا اور ہے اور ہوتا کچھ اور ہے ،

خواہی کہ شوی واصل ارباب نظر   از قال بحال بایدت کرد گذر

از گفتن توحید موحد نشوی   شیرین نشود دہان ز نام شکر

عارف کسی کی پیروی نہین کرتے ہین ،

ہر دم برسد بعارفان ذوق جدید   خود مجتہد اند نے ز اہل تقلید

شیران نخورند جز شکار خود را   روباہ خورد رفتادۂ لحم قدید

دنیا کی تمام چیزون کو معرفت حاصل ہے لیکن یہ راز صرف عارف کو معلوم ہوتا ہے ۔

توحید شناخت ہر کرا حالی نیست   در راہ طلب ہمت او عالی نیست

خوش آنکہ میان خویش حق را بشناخت   او در ہمہ جاست ہیچ جا خالی نیست

عرفان اپنے کو پہچاننے اور اپنے کو فنا کر دینے مین ہے ۔

کے کار تو در شمار حق حق می آید   قطرے تو در اعتبار حق می آید

باید کہ تو عین خویش دانی حق را   فانی شدنت چہ کار حق می آید

بر عارف اطلاق مردن جایز نہ وجہ جان بجانان پیوست آب آب شد و خاک خاک و ہوا ہوا و آتش آتش ،

بیرون و درون کوزہ پر بود ہوا   پیچید درون کوزہ آواز و صدا

کوزہ چو شکست و گشت آواز آواز   بشکست حباب و گشت عین دریا

خدا کا نام لے کر ذکر کرنا غفلت کا باعث ہے ۔

ہستی وجود خویشتن کردم رد   گر دید مساوئیم ہمہ نیک و بد

اکنون نتوان نام خود و نامش برد — گر نام بگیرم ز من او می رنجد

فقیر اور عارف کا کوئی نام نہیں ہوتا،

یک ذرہ ندیدیم ز خورشید سوا — ہر قطرۂ آب ہست عین دریا

حق را بچہ نام کس نتواند خواندن — ہر نام کہ ہست ہست از اسما خدا

داراشاہ دلربا کو ایک رقعہ میں لکھتا ہے، کہ اس کے دل سے اسلام مجازی محو ہوگیا، اور اب کفر حقیقی کا جلوہ نظر آتا ہے، اور اس کفر حقیقی کی قدر معلوم کرنے کے بعد وہ زنار پوش، بت پرست بلکہ خود پرست اور دیر نشین ہوگیا ہے، اور اس کے لیے کسی چیز کے اقرار و انکار کا سوال باقی نہیں رہا ہے،

مسلمان گر بدانستے کہ بت چیست — بدانستے کہ دین در بت پرستی است

اگر کافر ز اسلام مجازی گشت بیزار؟ — کرا کفر حقیقی شد پدیدار،

درون ہر بتے جانیست پنہان — بزیر کفر ایمانیست پنہان

تبرسا زادہ دادم دل بیک بار — مجرد گشتم از اقرار و انکار[1]

داراشکوہ نہ صرف شاعر تھا، بلکہ شاعروں کا سرپرست اور مربی تھا، میر رضی دانش مشہد سے ہندوستان آیا تو داراہی کے دامن دولت سے وابستہ ہوکر درجۂ عروج پر پہنچا، مرآۃ الخیال کا مولف میر رضی دانش کے ذکر میں لکھتا ہے:

"از تربیت کردہ ہائے شاہ بلند اقبال سلطان داراشکوہ است و بدست یاری استعداد و پایمردی طالع بمحفل ہمایونش راہ دانست"

رضی دانش کے متعلق مخزن الغرائب میں ہے:

[1] رقعات عالمگیر مرتبہ سید نجیب اشرف ندوی ص ۳۲۳،

شاہزادہ داراشکوہ ...... و بیراتہ بیت کلی فرمودہ از باعث قدر دانی شہزادہ
نہایت عزت و شہرہ بلند یافت۔"

مراۃ الخیال کے مولف کا بیان ہے، کہ رضی دانش کی مندرجۂ ذیل غزل پر دارا نے
ایک لاکھ روپے بطور انعام دیئے[۱]

موسمے آن شد کہ ابرتہ چمن پرور شود | نکہتِ گل مایۂ شور جنون در سر شود
تاک را سیراب سازاے ابرنیسان در بہا | قطرہ تا مے میتواند شد چرا گوہر شود
نالۂ بلبل نہان در پردۂ برگِ گل ست | بیدِ ماغم کاش ازین یک ذرہ نازک تر شود
ما بذوق گریۂ مستی درین بزم آمدیم | مے بدہ ساقی بقدرِ آنکہ چشمم تر شود
راز پوشیدن نیاید دانش از بے تابِ عشق | در میان انجمن پروانہ خاکستر شود

مراۃ الخیال میں ہے کہ دارا کو مطلع بہت پسند آیا لیکن سرخوش رقمطراز ہے کہ اس کو دوسرا
شعر مرغوب ہوا، چنانچہ اس شعر کو مصرع طرح بنا کر شعراء کو غزلیں لکھنے کی فرمائش کی، اس نے بھی
اس پر ایک غزل کہی جس کا ایک شعر یہ ہے،

سلطنت سہل ست خود را آشنائے فقر کن | قطرہ تا دریا تواند شد چرا گوہر شود[۲]

داراشکوہ اپنے میر منشی چندر بھان برہمن کی نثر و نظم کی سادگی کا بھی دلدادہ تھا، اور یہ مراۃ الخیال
کے مولف کے لیے باعث تعجب ہے، چنانچہ وہ لکھتا ہے:

"عجب کہ شاہزادہ باآن ہمہ مستعدان کہ در عرصۂ روزگار، بہ رنگ آمیزی الفاظ آبدار
صفحہ خاطر ارباب دانش را چون شگفتہا ئے موسم بہار بہزار رنگ گلگونہ می ساختند خاطر مبارک
بسخن سادہ اش فرود آوردہ بود، این معنی خالی از دو چیز نبودہ باشد، یا مذاق شاہزادہ

---

[۱] مراۃ الخیال، کلکتہ ایڈیشن ۲۵۵ [۲] سرخوش مخطوطہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی،

یہاں طرز آشنائی داشت، یا او بہ ورطالع بدین پایہ رسید"

دارا شکوہ کو برہمن کا یہ شعر بہت پسند تھا،

مرا دلیست بکفر آشنا کہ چندین بار ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ بکعبہ بردم و بازش برہمن آوردم

دارا شکوہ نے برہمن سے شاہجہان کے سامنے بھی یہ شعر پڑھایا، شاہجہان سنکر برافروختہ ہوا لیکن افضل خان نے اس کا غصہ سعدی کا یہ شعر پڑھ کر ٹھنڈا کیا،

خر عیسیٰ گرش بمکہ برند ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ چون بیاید ہنوز خر باشد[1]

چندر بھان برہمن کے علاوہ محمد علی ماہر اور بنوالی داس ولی بھی دارا شکوہ کے ساتھ کچھ دنوں وابستہ رہے، محمد علی ماہر کا ذکر پہلے آچکا ہے، دارا شکوہ نے ان کو مرید خان کا خطاب دیا تھا، بنوالی داس[2] دارا کے منشیوں میں سے تھا، ملا شاہ بدخشی کی صحبت میں فقر و درویشی سے متاثر ہوا، اور ترک تجرید کی زندگی اختیار کرلی، اور دارا کی ملازمت سے کنارہ کش ہوگیا، دارا نے اس کنارہ کشی کو پسند نہیں کیا، اور کچھ برہم ہوا، مگر ولی نے بطور معذرت یہ رباعی لکھ بھیجی،

بشنو ز ولی وفا ے دنیا اے شاہ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ مغرور مشو بدولت و حشمت و جاہ

ہر چند چو ور ہمے نماید لیکن ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ آن قطرۂ شبنم ست بر نوک گیاہ[3]

مگر برٹش میوزیم کے فارسی مخطوطات کی فہرست سے پتہ چلتا ہے کہ مذکورہ بالا رباعی بنوالی داس کی تاریخی تصنیف راجاولی کے آغاز میں مرقوم ہے، یہ تاریخ راجہ جدھشٹر سے شاہجہان کے عہد تک کی ہے،[4] بنوالی داس نے کچھ مثنویاں بھی لکھیں، مثنوی ولی رام کا ذکر کتبخانہ شاہ اودھ کی فہرست میں ہے۔ (ص ۵۸۹)

---

[1] مرآۃ الخیال ص ۲۱۵-۲۱۴، [2] روز روشن میں نوازی داس لکھا ہی مرقوم ہے بعض جگہ بھوانی داس بھی ہے۔
[3] روز روشن ص ۷۶۲، [4] برٹش میوزیم کیٹیلاگ جلد دوم ص ۸۵۵،

داراشکوہ فن خطاطی میں بھی ید طولیٰ رکھتا تھا، یہ فن اس نے شاہجہانی عہد کے مشہور استاد آقا عبدالرشید دیلمی سے سیکھا، اور وہ اس کا بہت ہی محنتی اور لائق شاگرد تھا، تذکرۂ خوشنویسان میں ہے،

"داراشکوہ پسر شاہجہان بادشاہ شاگرد عبدالرشید آقا ست باوجود اشتغال امور شاہزادگی و دیگر علوم رسمیہ آقا عبدالرشید شاید کسے مثل او نوشتہ باشد"[1]

دارا کو نستعلیق اور نسخ دونوں میں کامل مہارت تھی، پروفیسر محفوظ الحق نے اس کی خطاطی کے بہت سے نمونوں کا ذکر مجمع البحرین کے دیباچہ میں کیا ہے، مثلاً اس کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک کلام پاک کتب خانہ باغ لائبریری حیدرآباد دکن میں ہے، جس کے حروف شروع سے آخر تک سنہرے ہیں، ایک مرقع بخط نسخ اور ایک "دہ پند ارسطو" کا نسخہ بخط نستعلیق وکٹوریہ میموریل ہال کلکتہ میں محفوظ ہے، آصفیہ لائبریری حیدرآباد میں اس کے خط کی دو کتابیں ہیں، رسالہ حکمت ارسطو اور شرح دیوان حافظ (فہرست کتب خانہ آصفیہ جلد اول ص۳۹) ان کے علاوہ اس کی لکھی ہوئی وصلیاں مختلف جگہوں میں پائی جاتی ہیں، بعض کتابوں پر اس کے دستخط اور مختصر تحریریں ہیں، جو خطاطی کے نادر نمونے کہی جا سکتی ہیں،

سپہر شکوہ | خزینۃ الاصفیا کے مصنف کا بیان ہے کہ داراشکوہ کے قتل کے بعد جب اس کا نو سالہ لڑکا اورنگزیب عالمگیر کے سامنے پیش کیا گیا تو اس نے اس بچہ کا حال پوچھا، بچے نے فی البدیہہ یہ شعر پڑھا،

پدر وا ویلا من کمتر از یعقوب نیست   او پسر گم کردہ بود و من پدر گم کردہ ام

عالمگیر یہ جواب پاکر رنجیدہ ہوا، اور [illegible] اور اس کے بچے کی پرورش کرنا منظور کیا[illegible]

---

[1] تذکرۂ خوشنویسان ایشیاٹک سوسائٹی بنگال ص[illegible]

کا کام نہیں، چنانچہ اس بچہ کو مروا ڈالا۔[۱] خزینۃ الاصفیاء کے مصنف نے نو سالہ بچے کا نام نہیں لکھا ہے، مصنف موصوف کی مراد شاید سپہر شکوہ سے ہو، مگر یہ روایت صحیح نہیں، کیونکہ عالمگیر نے اپنے سولہویں سال جلوس ۱۰۸۳ھ میں اپنی لڑکی نواب زبدۃ النساء بیگم کو شہزادہ سپہر شکوہ کے نکاح عقد میں دیا تھا۔[۲]

شجاع و مراد | شاہجہان کے لڑکوں میں تخت و تاج کے لیے جو خونریز جنگ ہوئی، اس میں مورخین شجاع اور مراد کا عبرتناک انجام دکھانے میں اس قدر محو ہو گئے، کہ ان دونوں کے علمی فضل و کمال کو بالکل نظرانداز کر دیا ہے۔ حالانکہ شاہجہان کے دو لڑکے دارا اور اورنگزیب جس تعلیم و تربیت کی بدولت آسمان علم پر مہر و ماہ بن کر چمکے، ظاہر ہے کہ اس سے شجاع اور مراد بھی ضرور فیضیاب ہوئے ہوں گے، مگر جس طرح وہ صفحہ ہستی سے مٹا دیے گئے، اسی طرح ان کے علمی اوصاف بھی صفحہ تاریخ سے گم کر دیے گئے، لیکن ان دونوں کی علمی قابلیت ان کے رقعات سے اور ان کی علم نوازی کا حال ان کے درباری شعراء اور متوسلین سے معلوم ہو سکتا ہے، شجاع اور مراد کے رقعات مختلف کتابوں میں جستہ جستہ ملتے ہیں۔ ان کے مطالعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اورنگزیب اور دارا کی طرح گو بلند پایہ ادیب اور انشاء پرداز تو نہ تھے، پھر بھی ان کی تحریروں میں اس زمانہ کے ذوق ادب کی پوری چاشنی ضرور ہے۔

شجاع اور مراد دونوں شعراء اور ارباب کمال کے قدردان اور سرپرست تھے، ملا محمود جونپوری شاہجہانی عہد کے بہت ہی ممتاز عالم تھے، فلسفہ میں ان کی تصنیف شمس بازغہ اور معانی و بیان میں فوائد فی شرح الفوائد اب تک پڑھائی جاتی ہیں۔ ۱۰۵۶ھ میں جب ان کا انتقال ہوا، تو ان کے استاد مولانا محمد افضل جونپوری پر اتنا اثر ہوا کہ شاگرد کی وفات کے بعد ان کے لبوں پر کبھی مسکراہٹ نہیں دیکھی گئی اور کل چالیس روز کے بعد وہ بھی شاگرد سے جا ملے،[۳] شجاع ملا محمود جونپوری

۱؎ خزینۃ الاصفیا ص ۱۶۵ ج ۱، ۲؎ مآثر عالمگیری اردو ترجمہ ص ۵۰ دار الترجمہ حیدرآباد دکن، ۳؎ تذکرۃ العلما ص ۲۲۱،

کے فضل وکمال سے فیضیاب ہونا چاہتا تھا، اس لیے ان کو اپنے دربار میں آنے کی ان الفاظ میں دعوت دی جس سے اس کے دل میں ان کی عزت واحترام کا اندازہ ہوتا ہے،

"افادت وافاضت پناہ فضائل وکمالات دستگاہ ملا محمود بعنایت بے نہایت خسروانی ممتاز گشتہ بدانند کہ چون بیامن برکات الہی خاطر فیض آثر ہموارہ متوجہ آن است کہ ارباب علم و حکمت واصحاب دین وملت از ملتزمان محفل فیض منزل بودہ، دقائق علمی وحکمی را بموقف عرض می رسانیدہ باشند و آنچہ بر ضمیر الہام پذیر پاک کہ آئینہ صور غیبی و گنجینۂ اسرار لاریبی است پرتو انداختہ باشد، بآن جماعت می فرمودہ باشیم تا کار ہا بر وفق احکام الہی وسنت نبوی بعمل می آمدہ باشند بنابران از روئے مہربانی یاد آن دانش آگاہ حقائق انتباہ نمودہ طلب فرمودہ ایم کہ بدرقہ الطاف سلطانی طریق سعادت پیمودہ خود را بشرف حضور تمام فیض سراسر سعادت معزز گرداند بہار ان کہ مشرف اندوز ملازمت گردد و چندے فیض ظاہر و باطن از حضور معلی برگیرد اگر خواہد بوطن معاودت نماید، او را مشمول عنایات ومورد توجہات فرمودہ رخصت انصراف ارزانی خواہیم داد، واگر خواہش بودن درین آستان سلطنت آشیان داشتہ باشد، بنوعے کہ باطمینان دل وفراغ خاطر گذراند، درباب او توجہ مبذول خواہیم داشت، باید کہ بمجرد وصول این منشور کرامت وافضال بے توقف روانہ عتبہ بوس گردد و در عہدہ شناسد"[1]

فارسی سخنگویوں میں شیخ منعم لاہوری[2]، اور ہندی شعراء میں چنتامن ساکن کوڑہ جہان آباد شجاع کے مقربین خاص میں تھے، چنتامن اپنے عہد کا بہت ہی مشہور سنسکرت کا عالم تھا، اسکی

---

[1] رقعات عالمگیری مرتبہ سید نجیب اشرف ندوی ص ۲۴۴ [2] ان کی شاعری کے نمونے کے لیے دیکھو مخزن الغرائب قلمی نسخہ ص ۴۰۸ دار المصنفین اعظم گڈھ

ہندی کلام کا مجموعہ "کبت بہار" کے نام سے موسوم ہے، اس میں سلطان زین الدین محمد بن شاہ شجاع کی مدح میں بھی بہت سی کبتیاں ہیں۔[1]

شاہزادہ مراد کا مصاحب شاعر سعید قریشی تھا، جو ملتان کا باشندہ تھا، جب مراد کو گجرات کی نظامت تفویض ہوئی، تو سعید قریشی بھی اس کے ساتھ گیا، اور اپنی بذلہ سنجی، شیریں بیانی، اور شعرگوئی کی بدولت مراد کی نگاہوں پر اتنا چڑھا کہ دربار کے تمام امراء اس پر فریفتہ ہو گئے،

مراۃ الخیال کا مصنف اس کی تعریف میں یوں رطب اللسان ہے،

"بیان بزرگی صوری و شرح حالت معنوی و ذکر وسعت مشرب و اظہار محاسن شیم و ابراز مکارم اخلاق و ادائے کشادگی پیشانی و تقریب تعلیمی وقت و تحریر استعداد سخنش زبان قلم و قلم زبان برنتابد۔"

اوائل ملازمت میں ایک روز سعید قریشی مراد کے دربار میں جانا چاہتا تھا، دربانوں نے چونکہ از جملۂ باریافتگان نبود اندر آنے کی اجازت نہ دی، سعید قریشی نے فوراً یہ رباعی لکھ کر مراد کے پاس بھیجی:

اے شاہ جنابت چو جناب اللہ است   ہر حکم تو چون حکم کتاب اللہ است
این چیلہ و بوفضل مناع درست   ابلیس بہشت نائب باب اللہ است

مراد رباعی پڑھ کر بہت محظوظ ہوا، اور سعید قریشی کو زنانخانے کے علاوہ ہر جگہ بے کھٹکے جانے کی اجازت دیدی،

ایکبار عید الضحیٰ کے موقع پر مراد مینڈھوں سے کھیل رہا تھا، ایک بکرے کی آنکھوں پر چربی چڑھی ہوئی تھی، مراد نے بکرے کی آنکھوں کو دیکھا، اس کی نظر سعید قریشی کی طرف اٹھی، سعید قریشی

---

[1] مآثر الکرام جلد دوم ص ۲۶۳۔

مراد کو اطلاع کیے بغیر گجرات سے نکل بھاگا، مراد کو خبر ہوئی تو اس کی جدائی گوارا نہ کر سکا، اور اس کو واپس بلانے کے لیے قاصد دوڑائے، لیکن سعید قریشی نے واپس آنے کے بجائے یہ غزل معذرت میں لکھ بھیجی،[1]

مشکل بود بکوی تو دیگر نشست ما	پیچیده است لطف تو بر هم شکست ما
چون سبزه در ره تو بجز پا فتادگی	اے سرو من بگو که چه آید ز دست ما
در دم که با رقیب تو خاطر نشان کند	جز تیر بے خطا که بر آمد ز شست ما
دل بسته در خیال میان چنان بند زلف	سد سکندری شده این بند بست ما
فارغ ز دین و کفر شده بعد ازین سعید	ما و سر نیاز و بت خود پرست ما

سلطان محمد اورنگزیب عالمگیر کا سب سے بڑا لڑکا اور نواب بائی کے بطن سے تھا، اورنگزیب ایک شفیق اور دوراندیش باپ کی طرح اپنے لڑکوں کی اعلیٰ تعلیم و تربیت کے لیے ہمیشہ کوشاں رہتا تھا کہ اس کے بعد اس کی وسیع اور عظیم الشان سلطنت کا جانشین لائق اور ہوشمند شخص ہو، مگر اس کی یہ کوشش بار آور نہیں ہوئی، سلطان محمد کو مختلف اوقات میں سفر و حضر کی حالت میں سونے جاگنے، نہانے دھونے، کھانے پینے، اور نماز و وظائف میں مشغول ہونے، لکھنے پڑھنے اور شکار کھیلنے، دربار منعقد کرنے یہاں تک کہ اٹھنے بیٹھنے، امراء سے ملنے جلنے اور فوجوں کے معائنہ کرنے وغیرہ کا لائحہ عمل لکھتا رہتا تھا، اس میں خاص اوقات میں کلام پاک کی تلاوت اور عربی زبان کے مطالعہ کی بھی تاکید ہے، مگر سلطان محمد کو تعلیم سے زیادہ شکار سے دلچسپی تھی، اس لیے اورنگزیب کبیدہ خاطر ہو کر اس کو لکھتا ہے:۔

"تا زمانیکہ ایشان را ہیچ اندیشہ در خدمت غیر از شکار بودہ الہی تا سعادت دارید چہ"

---

[1] مرآۃ الخیال ص ۲۶۳۔

چہ آن بلند اقبال تا لذت شکار یافتہ اند، از اکتساب کمالات از خواندن و نوشتن و مانند آن دست باز داشتہ، چندان رغبتے باین امور ندارند ایشان راچون خواہم گذاشت کہ بدین شغل از کسب کمال باز مانند"

سلطان محمد کو اورنگزیب کی خاص ہدایت تھی کہ وہ ترکی زبان سیکھ کر اس میں بول چال کی مہارت پیدا کرے، مغل فوج میں ترکی النسل سپاہی اور افسرون کی تعداد کافی ہوتی تھی، اس لیے اس سے براہ راست تعلق رکھنے کے لیے ترکی زبان کا سیکھنا تیموری شاہزادون کے لیے ضروری تھا، مگر سلطان محمد کو اس زبان سے رغبت نہ تھی، چنانچہ جب وہ شمالی ہند کی ایک مہم پر روانہ ہوا تو ترکی کے استاد کو ساتھ نہ لے گیا، اورنگزیب کو یہ ناگوار ہوا، اس نے غصہ کی حالت میں ایک خط لکھا، کہ استاد کو اپنے پاس بلاکر ترکی میں گفتگو کرنے کی مشق جاری رکھے، سلطان محمد نے اپنے استاد کی پیری و ناتوانی کا عذر کرکے اس سے اغماض کرنے کی کوشش کی، مگر اورنگزیب نے قبول نہ کیا، اور دوبارہ ایک غضب آلود رقعہ لکھا،

پیری و ناتوانی را عذر نمی شود، و اگر باشد، عذر بے فراست، آن جوان بخت در حضر نیز او را معدوم انگاشتہ و بین کیال کہ او نوکر است و ملیغہا در وجہ مواجب از سرکار نامدے یافتہ اصلا التفاتے بخواندن ترکی نداشتند و بعد بہت حالی از تعین معلمان کسب کمالات ایشان است و الا این ہمہ ممنونیت آن مردم چرا باید کشید؟ ہر گاہ آن والا گہر قدر این عواطف ندانستہ و فرصت را مغتنم نداشتہ در تحصیل امورے کہ سبب آراستگی و کمال نفس انسانیت و ابناے سلاطین را پیرایہ خوشتر از آن نیست رغبت نہ نمایند، مارا چہ زیان، الحال کہ بہوش آمدہ اند و نیک را از بد می شناسند، وآنچہ بہبود ایشان باشد خود کماہی نخواہند نمود"

اورنگزیب سلطان محمد کو فارسی تحریر و تقریر میں مہارت پیدا کرنے کی بھی برابر ہدایت کرتا رہتا تھا

اور اس کیلئے خاص خاص کتابوں خصوصاً اکبرنامہ کے مطالعہ کی تائید کرتا تھا، ایک رقعہ میں ہے،

"اگر در نوشتن احتیاط نمودہ و عبارت مطابق آداب و قاعدہ نباشد جاے انفعال است در اوقات فرصت بمطالعۂ کتب نیز علی الخصوص اکبرنامہ پرداختہ از مشق انشاء غافل نہ گردند، و ہمگی جہد مصروف آن سازند کہ تقریر و تحریر پاکیزہ و پسندیدہ شود تا معانی الفاظ و ربط مناسب آن بواقعی خاطرنشان نہ گردد، در گفتن و نوشتن بکار نبرند و ہر چہ بگویند و بنویسند باید کہ فہمیدہ و سنجیدہ باشد"

چنانچہ سلطان محمد نے اکبرنامہ کا مطالعہ شروع کیا، اور جب اورنگزیب کو خط لکھا تو اکبرنامہ کے مصنف کی تقلید میں "بسم اللہ" کے بجائے "اللہ اکبر" اور "جل جلالہ" تحریر کیا، اورنگزیب کو یہ ناگوار ہوا تو اس نے تنبیہ کی،

"مقصود از خواندن اکبرنامۂ شیخ ابوالفضل تتبع عبارت آن کتاب است نہ اتباع مذہب مصنف کہ از روے بدعت اسلوب سنن را تغیر دادہ ...."

اسی طرح سلطان محمد نے اکبرنامہ کی تقلید میں اپنے عریضہ کو "نشان والا" اور مہر کو "مہر خاص" لکھا تھا، اورنگزیب نے اس پر بھی فہمایش کی، کہ یہ الفاظ شاہی رقعہ اور مہر کے لیے خاص ہونے چاہئیں،

ایک بار سلطان محمد نے اورنگزیب کو لاپروائی میں خراب کاغذ پر بُرے مسطر میں رقعہ لکھ دیا، اورنگزیب نے اس کو ڈانٹ کر لکھا،

"ہر چہ نویسند درست نگاہ داشتہ بر کاغذ صاف بنوشتہ باشند بے پروائی حسن خط را برہم زند"

مگر افسوس ہے کہ اورنگزیب کی یہ ساری تمنائیں رائگاں گئیں، اور سلطان محمد عنفوان شباب ہی میں دنیا سے چل بسا،

محمد اعظم شاہ یہ عالمگیر کا منجھلا لڑکا بائی اودے پوری کے بطن سے تھا، اور شہزادوں کی طرح اس کی بھی اعلیٰ تعلیم ہوئی، مورخوں اور تذکرہ نگاروں نے اس کے علم و فضل کی تعریف کی ہے، اس زمانہ کے بعض مشہور شعراء، مرزا عبدالقادر بیدل، محمد حسین شہرت، امیر محمد شعار، تربیت خاں راسخ، اور حاجی اسلم سالم کی صحبت میں شریک رہنے کی وجہ سے خود بھی کبھی کبھی شعر موزوں کر لیتا تھا، اس کی ایک رباعی ہے،

قدر سخن از دو عالم بیش است | با خیل خیال بادشہ درویش است
چو مصرع شوخ نیست فرزند عزیز | یک معنی بیگانہ بہ از صد خویش است[۱]

اکبر و کام بخش شاہزادہ اکبر ملکہ دلرس بانو کے بطن سے تھا، ۱۰۹۱ھ میں راجپوتوں کے خلاف جنگ میں مشغول تھا کہ ان کے ورغلانے پر باپ سے منحرف ہو کر باغی ہو گیا، اور جب اس کی بغاوت ناکام رہی تو ہندوستان سے بھاگ کر ایران چلا گیا، اور وہاں ۴۸ھ جلوس عالمگیری میں فوت ہوا، عالمگیر اس کی دو باتوں کا مداح تھا، ایک یہ کہ اس نے نماز با جماعت کبھی قضا نہیں کی، دوسرے مذہب کا اتنا دلدادہ تھا کہ مذہبی جوش میں مخالفین ملت سے کبھی خوفزدہ نہیں ہوا[۲]

کام بخش اودے پوری کے بطن سے تھا، عالمگیر کے ۳۰ ویں سال جلوس میں حفظ کلام اللہ کی سعادت حاصل کی، عالمگیر نے اس خوشی میں اس کو خلعت دو اسپ با ساز طلا، دستار پیچ مرصع ومالائے مروارید و سپر با گل مرصع و ترکش با کمان عطا کیے[۳]، مآثر عالمگیری کے مصنف کا بیان ہے، کہ تحصیل علوم میں اپنے تمام بھائیوں پر سبقت لے گیا تھا، اس کو ترکی زبان میں خاص مہارت حاصل تھی، اور مختلف اقسام کے خطوط کی کتابت میں استاذ زمانہ تھا[۴]

۱؎ تذکرہ روز روشن ص۵۵ ۲؎ مآثر عالمگیری دار الترجمہ عثمانیہ ص۳۹۳ ۳؎ ر ر ص۱۰۸، ۴؎ ر ر ص۳۹۴

اورنگزیب عالمگیر کی وفات کے بعد مغلیہ سلطنت کی تاریخ جنگ و جدل اور انتشار و اختلال کی ایک داستان ہو، مورخین اس درجہ خون آشام واقعات کو قلمبند کرنے میں ایسا محو ہوگئے، کہ ان کی ساری توجہ بادشاہ وقت اور امرا کی سیاست اور ریشہ دوانیوں میں الجھ کر رہ گئی، اس لئے شاہزادوں کے علمی حالات پر تاریکی کے پردے پڑگئے، حالانکہ اورنگزیب کے پوتے شہزادہ عظیم الشان کے بارے میں عام طور سے مشہور ہے، کہ جب اس نے اشوک کے دارالسلطنت پاٹلی پترا یا شہر پٹنہ کو عظیم آباد کے نام سے مستقر حکومت بنایا تو وہ شاہجہان آباد دہلی ہی کی طرح سیاسی اور علمی حیثیت سے نمایان ہوگیا، مگر اس زمانہ کی علمی مجلسون کے غلغلے مستند متداول تاریخون میں بلند نہین ہوئے، اس لیے شہزادہ عظیم الشان کے علمی کارنامون پر اعتبار و وثوق کے ساتھ روشنی نہین ڈالی جاسکتی،

آخری شاہان تیموریہ سے اکبری جاہ و جلال، شاہجہانی سطوت و شہامت، اور عالمگیری تدبیر و ہوشمندی رخصت ہوچکی تھی، اسی کے ساتھ وہ اپنی زبان بھی کھو بیٹھے تھے، محمد شاہ کے زمانہ سے دربار مین عام چرچا اردو زبان ہی کا رہنے لگا، اور زمانہ کے عام مذاق کے مطابق دربار کے شہزادے اسی زبان مین غزل گوئی کی مشق کرنے لگے، غزل گو شہزادون کی تعداد بہت ہے، لیکن ہم مثال کے طور پر صرف دو چار ایسے شہزادون کا ذکر کرنا چاہتے ہین جن کی سخنگوئی اور علم نوازی کا حال بعض مستند تذکرہ نویسون نے بھی لکھا ہے، لیکن ان کے علمی ذوق پر روشنی ڈالنے سے پہلے ایک ایسے باکمال شہزادہ کا ذکر ضروری ہے، جو اگرچہ تخت و تاج کے وارثون مین نہ تھا لیکن علمی حیثیت سے تیموری خاندان کا نہایت ممتاز شہزادہ تھا،

مرزا علی بخت بہادر محمد ظہیر الدین اظفری گورگانی	یہ مرزا علی بخت بہادر محمد ظہیر الدین اظفری گورگانی ہے، یہ شاہ عالم بادشاہ کا ہم جد اور اورنگزیب عالمگیر کی پوتی نواب عفت آرا

بیگم کا نواسہ تھا، ۱۱۷۲ھ میں قلعہ معلی دہلی میں پیدا ہوا، اور وہین تعلیم و تربیت پائی، یہ وہ زمانہ تھا جب مغلیہ سلطنت کا چراغ ٹمٹما رہا تھا، بادشاہ وقت اور شہزادے ایک غیر اسلامی حکومت کے وظیفہ خوار اور نظر بند ہو کر رہ گئے تھے، اظفری بھی قلعہ معلی دہلی میں ایک قیدی کی حیثیت سے زندگی بسر کر رہا تھا، مگر کچھ عرصہ کے بعد خفیہ طور سے وہاں سے فرار ہو گیا، اور جے پور، جودھپور وغیرہ ہوتے ہوئے لکھنؤ پہنچا، نواب آصف الدولہ نے اس کی پذیرائی کی، اظفری لکھنؤ میں سات سال تک رہا، وہاں سے مدراس پہنچا، اور وہیں ۱۲۳۴ھ میں سپرد خاک ہوا۔

اظفری کو عربی فارسی اردو اور ترکی چاروں زبانوں میں مہارت تھی، آخر عمر میں مدراس پہنچکر انگریزی بھی سیکھ لی تھی، مختلف علوم و فنون مثلاً طب، رمل، عروض، قافیہ اور خصوصاً فن شاعری میں دسترس رکھتا تھا، فارسی اردو اور ترکی میں صاحب دیوان بھی تھا، مگر افسوس ہے کہ اس کا فارسی اور ترکی دیوان مفقود ہے، اس کا اردو دیوان مدراس یونیورسٹی کی طرف سے شائع ہونے والا ہے، یہ سطور لکھتے وقت اس کی ایک کتاب واقعات اظفری پیش نظر ہے، جس کا اردو ترجمہ مدراس یونیورسٹی نے شائع کیا ہے، اس میں اظفری نے اپنے سفر کے علاوہ قلعہ معلی کے بہت سے حالات لکھے ہیں، اس لیے یہ کتاب تاریخی اور جغرافی حیثیت سے بھی اہم ہے، اس میں شاہ عالم کے زمانہ کے بہت سے ایسے حالات درج ہیں، جو عام سیاسی تاریخوں میں نہیں ملتے، نظر بند شہزادوں کے عادات و اطوار، رسم و رواج، جاہ و حشم اور تعلیمات کے متعلق بھی بہت سی معلومات ہیں، پھر قلعہ سے فرار ہونے کے بعد اس نے جن جن مقامات کی سیر کی، وہاں کی عجیب عجیب چیزوں، رسم و رواج اور معتقدات کا بھی ذکر کیا ہے، آخر میں اپنی مختلف تالیفات کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے :-

اپنے قیام لکھنؤ کے زمانہ میں میں نے ایک سال کے اندر ایک ترکی چغتائی لغت کی

کتاب تالیف کی جس میں قدیم مؤلفین کے طرز کے خلاف تفصیل کے ساتھ آسان طریقے پر نئے نئے فوائد لکھے ہیں،

ایک مہینہ میں نسخہ "محبوب القلوب" کا مقفیٰ نثر میں فارسی زبان میں ترجمہ اور کچھ اُس پر اضافہ کیا ہے، اصل کتاب میر نظام الدین علی شیر متخلص بہ نوائی کی تصنیف اور ترکی زبان میں ہے۔

ایک ہفتہ میں "نصاب ترکی" "صنعت مقلوبات" میں مرتب کیں جس میں دو سو بیس شعر ہیں، تین روز میں امیر خسرو کی "خالق باری" کے جواب میں اسی وزن پر ایک مختصر رسالہ ترکی اور ہندی زبان میں مرتب کیا۔ اس میں ساڑھے چھ سو شعر ہیں، اور اسکا نام میں نے تنکری تار کھا ہے۔

حکیم حسین رضا خان کی استدعا پر جو ہماری سرکار کے ملازم ہیں، چند ہفتوں کے اندر بقراط کے "رسالہ قبریہ" کا فارسی میں ترجمہ کیا پھر اسے نظم کا لباس پہنایا، یہ رسالہ عربی زبان میں مریضوں کی ردی علامتوں کے بیان میں ہے۔

اس کے بعد نسخہ "سانحات" کی تالیف میں مشغول ہوا جنہیں میری اکثر نصیحتیں تنبیہیں مذکور ہیں، اب تک اس میں ایک سو تو سانحے درج ہو چکے ہیں۔

جس وقت میں عظیم آباد پہنچا تو رائے ٹیکا رام کی خواہش پر سات دن کے اندر ایک اور کتاب "نصاب ترکی چغتائی" تصنیف کی جس میں چار سو باون اشعار ہیں، رائے ٹیکا رام ہمارا موروثی خانہ زاد ہماری سرکار کا بخشی .... ہے،

جب میں مقصود آباد میں وارد ہوا تو .... مرزا جان ٹپش کی خواہش پر اپنے واقعات کی تالیف شروع کی (واقعات اظفری مراد ہے)

مرزا جہاندار شاہ | شاہ عالم ثانی کے جن لڑکون نے باپ سے شعر و شاعری کا ذوق ورثہ مین پایا، ان کے نام حسب ذیل ہین،

مرزا جہاندار شاہ، مرزا احسن بخت، مرزا سلیمان شکوہ اور مرزا فرخندہ بخت جہان شاہ،

شاہ عالم نے مرزا جہاندار شاہ کو ولی عہد بنایا تھا، مگر اس نے عالم شباب مین سفر آخرت کیا، واقعات اظفری، طبقات الشعرا، مجموعۂ نغز، تذکرۂ ہندی اور گلزار ابراہیم اور گلشن بیخار مین اس شاہزادہ کا ذکر شاعرون کی فہرست مین اچھے الفاظ مین کیا گیا ہے، واقعات اظفری کے مصنف کا بیان ہے کہ شاہزادہ جہاندار شاہ بہت بذلہ سنج، ظریف اور شوخ طبع تھا، اس کے اردو اشعار مین بڑی شوخی تھی، موسیقی سے بھی ذوق رکھتا تھا، فارسی اور اردو دونون زبانون مین جہاندار تخلص کرتا تھا،

طبقات الشعراء مولفہ قدرت اللہ شوق سنبھلی مین ہے،

"جوانی بود مجمع قابلیت ...... جدت ذہن و جودت طبع و فہم رسا و فکر بجا داشت و اشعار فارسی و ہندی ہر دو را موزون می ساخت"

قدرت اللہ قاسم نے اس کو "شیرین گفتار" لکھا ہے، گلزار ابراہیم کے مصنف نے اس کے کچھ دوہے کے بیان مین بڑی تر زبانی دکھائی ہے، یہ شاہزادہ ۱۱۹۸ھ مین دہلی سے لکھنؤ آیا اور یہان آکر اس نے جو علمی بزم سجائی اس کا حال گلزار ابراہیم مین اس طرح ہے:

اس شاہزادہ عالی تبار کی طبیعت شعر کی طرف اس قدر راغب تھی کہ مہینے مین دو بار مشاعرہ کی اپنے دولت خانہ مین ٹھہرائی تھی، شعرائے باوقار کو اپنے چوبدار بھیجکر مشاعرے کے دن بلواتے اور ہر ایک سے نہایت التفات اور عنایت کے ساتھ گرمجوشی فرماتے، چنانچہ راقم حقیر کو جب یاد فرمایا تو اس ہیچمدان نے یہ عذر کہہ بھیجا کہ

کمترین نے مشاعرے کا جانا مدت سے موقوف کیا ہے، از بس کہ ان صحبتوں میں مناظرہ ہی کو یاران عالی حوصلہ نے رواج دیا ہے، اگر ارشاد ہو تو سوائے مشاعرے کے ایک دن بندگی میں حاضر ہوں اور اس تخم ناکاشتنی بے مغز کو موافق ارشاد کے زمین عرض میں بوؤں، پذیرانہ ہوا، اور پھر چوبدار آیا اور یہ ارشاد فرمایا کہ تیرا حاضر ہونا مشاعرے میں نہایت ضروری ہے، مناظرہ کا مطلق ہمارے یہاں نہیں دستور ہے، غرض ایا سے نواب آصف الدولہ مرحوم کے حاضر ہوا، اور شرف سعادت ملازمت کا حاصل ہوا، مکرر غزلیں اس دن ازراہ تفضلات کے پڑھوائیں، اور ہر شعر پر کیا کہوں کہ کیا کیا عنایتیں فرمائیں، پھر اپنی طبع زاد سے بہت کچھ ارشاد فرمایا، اور سامعین کو مورد عنایت و امداد فرمایا۔[1]

اس شہزادہ کا انتقال ۱۲۰۱ھ میں بمقام بنارس ہوا، مختلف تذکروں میں اس کے اشعار منقول ہیں، نمونہ کے طور پر ہم یہاں اس کے کچھ اشعار درج کرتے ہیں،

واقعات اظفری :-

تری جب سے الفت کے پالے پڑے ہیں ہمیں اپنے جینے کے لالے پڑے ہیں
پھرے ڈھونڈتے پا برہنہ تجھے یہاں تک کہ پاؤں میں چھالے پڑے ہیں

فارسی کلام

فتادہ مشکل دیگر ز عشق جان مرا کہ کس نمی شنود شرح داستان مرا
فزودہ ایم غرورت ز عرض بیتابی باین گناہ برآرد کسے زبان مرا
دلم ز سینہ برآرید و پیش او ببرید ز نام ما برسانید این پیام ظفر

---

[1] گلزار ابراہیم، انجمن ترقی اردو صفحہ ۹۔ گلشن بے خار میں اس شہزادہ کے متعلق یہ الفاظ لکھے ہیں :-
"بفہم و فراست و عقل و کیاست ممتاز اقران و امثال خود بودہ"

طبقات الشعراء :-

زلف آشفتہ جو رخ پہ صنم رکھتے ہین | روز اور شب کو باعجاز بہم رکھتے ہین

میرا دل داغدار بھی کچھ گل سے کم نہین | منظور ہو جو گوشہ دستار کے لیے

جز جیب آستین نہین مونس جہان مین کوئی | دیکھا تو اپنے دیدۂ خونبار کے لیے

اس زلف عقدہ گیر کا کیا ذکر اے صنم | بس ہے جہان کے سبحہ و زنار کے لیے

گلزار ابراہیم مین ہے :-

نہ پوچھو دہر مین کیا کر چلے ہم | اسی کی آرزو مین مر چلے ہم

رہے اک شب جو اس ماتم کدے مین | بسان شمع رو رو کر چلے ہم

تذکرہ ہندی :

کونسی بات تری ہم سے اٹھائی نہ گئی | پر جفا جو یہ تری قت کی لڑائی نہ گئی

قصہ ہر چند کیا سیکھنے کا بلبل نے | وضع نالہ کی مگر اس سے اڑائی نہ گئی

بیمار عشق اتنک جانبر بھی کوئی ہوا ہے | تو اے طبیب ناحق میری دوا کرے ہے

بیٹھا بٹھایا تو اگر سنتا ہے اسے جاندار | دیتا تو ہے دل اس کو لیکن برا کرے ہے

کون دلکش لے جاندار آج گذرا باغ مین | ہاتھ مین ہر شاخ گل کے مے کا پیالہ دکھیا

مرزا احسن بخت | قدرت اللہ شوق سنبھلی نے اپنے تذکرہ طبقات الشعراء مین شہزادہ کا ذکر ان الفاظ مین کیا ہے:

از راہ قابلیت ذاتی برائے تفنن طبع گاہے متوجہ فن شعر می شود و سال و ماہ آن غزل فارسی و ہندی بہم می رساند این چند ابیات آن احسن بخت کہ بزبانی بعضے منقول و منصب ایراد و سمع رسیدہ بتحریر می آید ہا اگرچہ نو مشق است فاما ذہن صاحب فکر

مناسب وارد۔

اس کے بعض اشعار یہ ہیں :-

فرقت میں اسکی یارب کھینچیں ہم آہ کبتک ... انکھیں تو تھک گئی ہیں دیکھینگے راہ کبتک

یاد ہے گلعذار کی صورت ... گل ہے نظروں میں خار کی صورت

کیا نیا مست ہوا اسکی نوک مژہ ... خنجر آبدار کی صورت

مرزا سلیمان شکوہ | متاخرین کے آخر زمانہ میں مرزا سلیمان شکوہ کا نام علمی حیثیت سے بہت نمایاں ہے۔ اس شہزادہ کے متعلق قدرت اللہ شوق کا بیان ہے،

"خزان قابلیت وعلم ومعدن ونسانیت وحلم .... از بسکہ جودت طبع وحدت ذہن بسیار دارد، از راہ قابلیت ذاتی گاہے متوجہ فن شعر می شود وغزل فارسی وہندی ہم می رساند واکثر درخدمت او مشاعرہ شعرا می شود"

گلشن بے خار میں ہے :-

"مرزا سلیمان شکوہ .... مدتے جلوہ فرمائے لکھنؤ بود، اکثر شعرائے آنجا از خوان نعمتش بہرہ ور وکامیاب بودند، چند سال است کہ دہلی وارد شدہ بود، الحال تربیت شعرائے مستقر الخلافۃ اکبرآباد است" (ص ۱۳۶، مطبع دہلی اردو اخبار پریس)۔

سلیمان شکوہ نے دہلی چھوڑنے کے بعد لکھنؤ میں جو علمی مجلس آراستہ کی تھی، آزاد نے اسکی تصویر اس طرح دکھائی ہے،

"مرزا سلیمان شکوہ شاہ عالم کے بیٹے تھے .... شاعر بھی تھے، چنانچہ عام اہل دہلی کے علاوہ شعراء کا مجمع دونوں وقت ان کے ہاں رہتا تھا، سودا، میر ضاحک، میر سوز وغیرہ کا ورق زمانہ الٹ چکا تھا، مصحفی، جرأت، مرزا قتیل وغیرہ شاعروں اور شعر فہموں کے

جلسے رہتے تھے، جو محفل اپنے گلشن فصاحت کے گلدستوں سے سجائی جاتی وہاں کی رنگینیاں کیا کچھ ہوں گی، جی چاہتا تھا کہ ان کی باتوں سے گلزار کھلا دوں، مگر اکثر پھول ایسے فحش کانٹوں میں الجھے ہوئے ہیں کہ کاغذ کے پرزے ہوتے جاتے ہیں، اس لیے صفحہ پر پھیلاتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ پہلے مرزا سلیمان شکوہ مصحفی سے اصلاح لیا کرتے تھے، جب سید انشاء پہنچے، تو مصحفی کا مصحف طاق پر رکھا گیا، بزرگوں سے سنا، اور طرز کلام سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ شاہزادہ موصوف کے سر دیوان کی غزل اور اکثر غزلیں بھی سید ممدوح کی اصلاح کی ہوئی یا کہی ہوئی ہیں،

فحش کانٹوں سے مراد شاید سلیمان شکوہ کے دربار کے اہل علم اور شعراء کا حسد اور رشک و رقابت ہو، مولوی عبدالحق صاحب (انجمن ترقی اردو) تذکرہ ہندی مؤلفہ غلام ہمدانی مصحفی کے مقدمہ میں رقمطراز ہیں:—

دلی کے شہزادے، شاہ عالم کے بیٹے مرزا سلیمان شکوہ اس زمانہ میں لکھنؤ میں تھے، صاحب عالم نے لکھنؤ کی سرزمین پر چھوٹی سی دلی بسا رکھی تھی، اور سارا ٹھاٹھ وہی قائم کر رکھا تھا، دلی سے جو جاتا پہلے ان کی سرکار میں اپنا ٹھکانا ڈھونڈتا، شعر و سخن سے ذوق رکھتے تھے، اور شعراء اور اہل کمال کے قدردان تھے، انشاء، جرأت، سوز، مصحفی وغیرہ انہی کے دربار میں ملازم تھے، یا انعام و اکرام سے سرفراز ہوتے تھے، بارہ سو ساتا آٹھ ہجری میں مصحفی بھی میر انشاء اللہ کی وساطت سے اس دربار میں داخل ہوئے، ہمارے درباروں میں حسد و رشک، رقابت و غمازی اور ساز و باز کی گرم بازاری ہمیشہ رہی ہے ....

انشاء، جرأت، اور مصحفی خواجہ تاش اور ہم پیشہ تھے، اول اول شاعرانہ چشمک رہی، بعد میں بڑھتے بڑھتے جنگ و جدل اور فحش اور پھکڑ تک پہنچ گئی، .... غرض ایک ہنگامہ برپا

ہو گیا جس کے مزے صاحب عالم ..... بھی لینے لگے، اور شہر والوں کو ایک دل لگی ہاتھ آگئی، نتیجہ یہ ہوا کہ انشا، اپنی طراری، تیزی اور رسوخ سے بازی لے گئے، اور مصحفی کو خفت نصیب ہوئی، صاحب عالم کی نظریں ان کی طرف سے پھر گئیں۔"

طبقات الشعرا میں مرزا سلیمان کے اشعار کے جو نمونے ہیں ان میں سے بعض یہ ہیں:

کس سے سلیمان پوچھے اس کے مکان کا پتا ۔۔۔ واقف حال کب کوئی اسکے ہے بود و باش سے

وفور اشک سے کیونکر ہو اپنی چشم تر خالی ۔۔۔ جو دریا جوش سے بہتا ہے سو ہوتا ہے کم خالی

بھر آتا ہے دل جب دیکھتے ہیں شکل سائل کی ۔۔۔ نہیں ہوتا ہے ظرف ہمت اہل کرم خالی

تاج شہی کا وارث تو کیوں نہ ہو سلیمان ۔۔۔ تیمور کا تو پوتا عباس کا نواسا

گلشن بے خزاں میں ہے:-

جنازہ تیرے دیوانے کا اس تو قہر سے اٹھا ۔۔۔ کہ شور نالہ ہر یک خانۂ زنجیر سے اٹھا

گالیاں سیکڑوں ہر بات میں اب دینے لگے ۔۔۔ دیکھو جھڑتے ہیں کیا منہ سے مرے یار کے پھول

مرزا فرخندہ بخت جہان شاہ یہ بھی شاہ عالم کا لڑکا تھا، شاعری میں قمر تخلص رکھتا تھا۔ شفیق [illegible] کا بیان ہے:

"جوانے بود بوجہ مجمع قابلیت و نیز عالی حوصلہ و خوش سلیقہ قدردان انسان کامل بسیار قابل و خوش تلاش و خوش فکر بود، فاما اجلش مہلت نداد"

واقعات اظفری میں ہے:

"ہر علم و فن خاصکر خوشنویسی اور آداب و حکمت میں سارے تیموری خاندان میں منتخب تھے، آہ کہ پچیس سال کی عمر میں بعارضہ سرسام دنیا سے چل بسے" (ص ۱۹۴)

اس کے بعض اشعار یہ ہیں:

نہوتا آفتاب عشق کا جلوہ اگر پیدا — تو کب ہوتا شب تاریک سے نور سحر پیدا

جلا مت استخوان میری تجھے اے عشق کہتا ہون — ہوا ہے اس نیستان بیچ دل سا شیر نر پیدا

قمر اس بت نے جب سے صندلی پوشاک پہنی ہے — ہوا ہے ایک عالم کو تب ہی سے درد سر پیدا

کوئی سینے پہ نہ آیا مجرمون کے غیر صبر — مفت میزان ستم مین ہم گئے قاتل کو تل

اے قمر دلگیر مت ہو کھول دینگے آن مین — حضرت مشکل کشا عقدے تری مشکل کی کل

بہادر شاہ کے زمانہ مین قلعہ معلی شعر و شاعری کا گہوارہ تھا، جیسا کہ "آخری شاہان تیموریہ کے ذکر" کے سلسلہ مین اوپر بیان کیا جا چکا ہے قلعہ معلی کے شہزادون مین شاید ہی کوئی ایسا شہزادہ ہوگا جس کو شعر و شاعری سے لگاؤ نہ رہا ہو، اور وہ مشاعرون مین حصہ نہ لیتا رہا ہو، لیکن اس کی تفصیلات طویل بھی ہین، اور اردو کی بعض مطبوعہ کتابون مین ان کے جستہ جستہ حالات بھی ملتے ہین، اس لیے ہم ان کو قلم انداز کرتے ہین،

-------- ◦ --------

شہزادیان

ہندوستان کے شاہان تیموری کی علم دوستی اور حسن مذاق کا یہ نمایاں ثبوت ہے کہ جہان انھون نے حکومت کا نظم و نسق سنبھالنے اور ملک داری کے لیے اپنے شہزادون کو اعلی تعلیم و تربیت سے آراستہ کیا، وہان انھون نے شہزادیون کو بھی اس سے محروم نہ رکھا، اور نہ صرف ان کے دربارون مین علم و فن کی مجلسین قائم تھین، بلکہ ان کے خلوت کدون مین بھی علم و ادب کی بزم آراستہ تھی، یہ دیکھکر حیرت ہوتی ہے کہ فتوحات کی معرکہ آرائیون اور جنگ جانشینی کی خون آشامیون کے باوجود تیموریون نے جلوت اور خلوت دونون کو علم و ہنر کی شمع سے منور رکھا، چنانچہ علمی حیثیت سے تیموری شاہزادون کے ساتھ ایسی تیموری شاہزادیان بھی ملتی ہین جن کی ذات پر ارباب علم و فضل کو بجا طور پر ناز ہو سکتا ہے،

گلبدن بیگم

تیموری شاہزادیون کی علمی بزم مین سب سے پہلے گلبدن بیگم پر نظر پڑتی ہے جو بابر کی بیٹی تھی، بابر کے لڑکون مین ہمایون کامران، ہندال اور عسکری نے میراث مین علم، ادب، شعر و شاعری کا ذوق پایا، اسی دودمان فضل و کمال کے گہوارہ مین گلبدن بیگم نے بھی پرورش پائی اور اپنی اعلی تعلیم و تربیت کی بدولت ترکی اور فارسی زبان کی قابل قدر انشا پرداز اور شاعر ہوئی، فارسی زبان مین اس کی ایک مستقل تصنیف ہمایون نامہ ہے، جو اپنے طرز انشا کے لیے ایک بے مثل کتاب اور بابر و ہمایون کے عہد کے تمدنی، معاشرتی اور تاریخی واقعات کے لیے ایک قیمتی ماخذ ہے،

یہ کتاب دراصل اکبر کے حکم سے اکبر نامہ کی ترتیب و تدوین کے وقت بابر اور ہمایون کے

متعلق معلومات فراہم کرنے کے لیے لکھی گئی تھی، لیکن اپنی مختلف خصوصیات کی بنا پر ایک اہم تالیف ہوگئی، یہ کتاب عرصہ تک پردۂ گمنامی میں پڑی تھی، لیکن انگلستان کی ایک علم دوست خاتون نے اس کے متعدد نسخے بہم پہنچائے، اور اس کو بڑی محنت و کاوش سے اڈٹ کرکے ۱۹۰۲ء میں لندن سے شائع کیا، اس کے دیباچہ میں خاتون مذکورہ نے گلبدن بیگم کی مفصل سوانحعمری لکھی اور کتاب میں بیگمات کے جتنے نام آئے ہیں، ان سب کے بھی حالات قلمبند کیے، اس کے علاوہ جابجا جو ترکی الفاظ استعمال کیے گئے ہیں، ان کی تحقیق کی، اور پھر فارسی متن کے ساتھ انگریزی ترجمہ بھی منسلک کیا، اس کتاب کی اشاعت پر مولانا شبلی مرحوم کو بڑی خوشی ہوئی تھی، اور اس پر الندوہ جلد ۵ نمبر میں ایک مفصل ریویو لکھا تھا جس سے بہتر ریویو آج بھی کوئی اہل قلم نہیں لکھ سکتا ہے، مولانا مرحوم نے اس کتاب کی جو خصوصیات اور خوبیاں بتائی ہیں، ہم اس مضمون میں ان کو اختصار کے ساتھ بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ ایک عدیم المثال ادیب اور مورخ کی تحریر کی روشنی میں اس کتاب کی ادبی اور تاریخی اہمیت کا صحیح اندازہ ہوسکے۔

اس کتاب کی انشاء پردازی کے متعلق مولانا مرحوم رقمطراز ہیں:

"فارسی زبان میں سادہ اور صاف واقعہ نگاری کا عمدہ سے عمدہ نمونہ تزک جہانگیری اور رقعات عالمگیری ہیں، اور اس میں شبہ نہیں کہ یہ کتابیں سادگی اور لطافت کے لحاظ سے اس قابل ہیں کہ ہزاروں ظہوری اور وقائع نعمت خاں ان پر نثار کردی جائیں، لیکن انصاف یہ ہے کہ ہمایوں نامہ کچھ ان سے بھی آگے بڑھا ہوا ہے، چھوٹے چھوٹے فقرے، سادہ اور بے تکلف الفاظ، روزمرہ کی عام بول چال، طرز ادا کی بے ساختگی دل کو بے اختیار کردیتی ہے۔"

عبارت کی سادگی اور طرز ادا کے بے ساختہ پن کی مثالیں بکثرت ہیں، ہم طوالت کے

خیال سے ان کو یہاں پر نقل نہیں کرتے، مولانا شبلی نے نمونے کے طور پر چند اقتباسات پیش کیے ہیں، جو مقالات شبلی جلد چہارم میں پڑھے جا سکتے ہیں، البتہ مولانا مرحوم نے جو روزمرہ کے محاورے کتاب سے چن کر جمع کیے ہیں، ان میں سے بعض ملاحظہ ہوں:

پاسے می داد (ہار جاتا تھا)، طرفگیہا می کرد (شوخیاں کرتا تھا)، بیایید تا یکدیگرم را دریابیم (آؤ گلے لگیں)، خفتن شد (سونے کا وقت آیا) سر حضرت شوم (آپ پر قربان ہوں) رُستائی گری (گنوارپن) وغیرہ وغیرہ، مولانا شبلی کا بیان ہے کہ اس قسم کی روزمرہ کی زبان اس عہد کی تصنیفات میں بہت کم ملے گی،

مولانا شبلی رقمطراز ہیں کہ تاریخی حیثیت سے اس کتاب کی قابل قدر خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اس عہد کے تمدن، شائستگی، معاشرت اور خانگی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو روشن کر کے دکھایا گیا ہے، مثلاً وہ کسی شادی یا جلسہ کی تقریب کا حال لکھتی ہے، تو اس کی ہوبہو تصویر کھینچ دیتی ہے، عورتوں کے متعلق وہ بہت سے نئے معلومات فراہم کرتی ہے، مثلاً عورتیں لکھنے پڑھنے کے علاوہ فنون سپہگری سے بھی خوب واقف ہوتی تھیں، سفر اور سیر و شکار میں عموماً گھوڑے پر سوار ہوتی تھیں بعض اوقات وہ مردانہ لباس بھی پہنتی تھیں، مہر انگیز بیگم (یعنی مظفر حسین مرزا بیگرہ کی بیٹی) کے بارہ میں لکھتی ہے، کہ وہ مردانہ لباس میں ملبوس رہتی تھی، اور مختلف ہنر مثلاً تیر اندازی، چوگان بازی، تیر اندازی اور ساز بجانے میں ماہر تھی، ہمایوں جب ایران گیا تو اس کی ایک بہن ہمیشہ ایک گھوڑے پر سوار اس کے عقب میں چلتی تھی، خاندان کے آدمی جب ایک جگہ مل کر بیٹھتے تھے، تو عورتیں بھی گانے میں شریک ہوتی تھیں، لیکن یہ احتیاط رہتی تھی، کہ اس وقت کوئی بیگانہ آدمی نہ ہو، عورتوں کا نہایت احترام کیا جاتا تھا، بابر کی بیوی ماہم بیگم کابل سے ہندوستان آئی تو بابر دو کوس تک پیدل استقبال کو گیا، ملکی معاملات میں عورتوں سے بھی مشورے لیے جاتے تھے،

اور ہر قسم کے امور میں ان کی شرکت ضروری سمجھی جاتی تھی وغیرہ وغیرہ، مولانا شبلی مرحوم نے اس کتاب کی ایک اہم تاریخی خصوصیت یہ بتائی ہے کہ گلبدن بیگم تاریخی واقعات لکھنے میں اس بات سے بخوبی واقف ہے، کہ کس واقعہ کو سمیٹ کر اور کس واقعہ کو پھیلا کر لکھنا چاہیے، وہ خوب جانتی ہے کہ کونسا واقعہ کیا اثر رکھتا ہے، اور اس لیے اس کے اسباب و علل سے کہاں تک بحث کرنی چاہیے،

ریاض الشعراء (قلمی نسخہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی) اور مخزن الغرائب (قلمی نسخہ دارالمصنفین) میں گلبدن بیگم کا نام بھی شعراء کی فہرست میں درج ہے، لیکن دونوں تذکروں میں اس کا صرف مندرجہ ذیل ایک شعر منقول ہے اور مسز بیورج نے اسی شعر کو ہمایون نامہ کے دیباچہ میں میر مہدی شیرازی کے تذکرۃ الخواتین سے نقل کیا ہے،

ہر پریروے کہ او با عاشق خود یار نیست　　تو یقین میدان کہ ہیچ از عمر برخوردار نیست

اکبر نامہ (جلد سوم ص ۸۱۷) میں ہے کہ گلبدن بیگم کے عالم نزع میں مریم مکانی اس کے سرہانے کھڑی تھی، دونوں میں بڑی محبت تھی، مریم مکانی گلبدن بیگم کو بیگم جیو کہکر بار بار پکار رہی تھی، گلبدن بیگم نے آخری بار آنکھیں کھولیں، اور مریم مکانی کی طرف دیکھ کر یہ مصرع پڑھا،

من نداریم و دم عمرت یاد دار زندگی

گلرخ بیگم

بابر کی ایک دوسری لڑکی گلرخ بیگم صالحہ سلطان بیگم کے بطن سے تھی، وہ بھی شعر و شاعری سے ذوق رکھتی تھی، اور اشعار موزون کرتی تھی، صبح گلشن مؤلفہ نواب علی حسن خان مرحوم میں اس کی شاعری کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے،

"بگلرخی شگفتہ روئی و سلیقۂ شاعری سر آمد زمرۂ نسوان، غنچۂ دہانش بنسیم اشعار لطیف شگفتہ می"

ریاض الشعراء، مخزن الغرائب اور صبح گلشن میں اس کی طرف یہ شعر منسوب ہے:-

بیچگان سرخ گل رخسائیے اغیار نیست　　راست بود است آنکہ در عالم گل بے خار نیست

سلیمہ سلطان بیگم | یہ بابر کی نواسی اور گلرخ بیگم کی بیٹی تھی، پہلے خانخانان بیرم خان سے بیاہی گئی، ان کے انتقال کے بعد اکبر کے حبالۂ عقد میں آئی، سیاسی واقعات میں اس کا نام نمایاں اس وقت ہوا جب شہزادہ سلیم نے اکبر کے خلاف علم بغاوت بلند کیا، سلیمہ سلطانہ ہی کی مساعی جمیلہ سے اکبر اور سلیم میں مصالحت ہوئی، اس سلسلہ میں اکبر نامہ، منتخب التواریخ اور لب التواریخ میں اسکا ذکر بار بار آتا ہے، جہانگیر اس کی علمی قابلیت کا معترف ہے، اس کے انتقال پر تزک جہانگیری (صـ۱۲۳ نولکشور پریس) میں لکھتا ہے:-

"بہ جمیع صفات حسنہ آراستگی داشتند، در زنان این مقدار ہنر و قابلیت کم جمع می شود"

اس کو شعر و شاعری سے بھی زیادہ مناسبت تھی، آئین اکبری، اقبال نامہ جہانگیری، اور مآثر الامرا (جلد اول صـ۳۷۶) میں ہے کہ اس کا تخلص مخفی تھا لیکن مخزن الغرائب کے مؤلف کا بیان ہے کہ اسکا تخلص مخلص تھا، تذکروں میں صرف اس کا ایک شعر نقل کیا گیا ہے:

کاکلت را من زمستی رشتۂ جان گفتہ ام	مست بودم زین سبب حرف پریشان گفتہ ام

مخزن الغرائب (ورق ۳۶۰) میں فیضی کے مرثیہ پر حسب ذیل رباعی درج ہے، جو ایک خاتون کاملہ بیگم کے ذکر میں نقل کی گئی ہے، کاملہ بیگم کے حال میں کسی قسم کا کوئی تعارف نہیں، مگر تذکرہ نگار نے رباعی لکھنے سے پہلے یہ بھی تحریر کیا ہے کہ بعض نسخوں میں رباعی سلیمہ بیگم کی طرف بھی منسوب ہے۔

فیضی مخور این غم کہ دلت تنگی کرد	با پاے امید عمر لنگی کرد
میخواست کہ مرغ روح بیتو ز دوست	زین واسطہ از قفس شتابہنگی کرد

مورخین سلیمہ بی بی کی کتب بینی کے شوق کے بھی معترف ہیں، اس شوق کی تکمیل کے لیے اس کے پاس ایک ذاتی کتب خانہ بھی تھا،

ماہم بیگم | یہ بیگم دودمان تیموری کی چشم و چراغ تو نہ تھی، لیکن ہندوستان کے سب سے بڑے تیموری بادشاہ

یعنی اکبر بادشاہ کی مرضعہ تھی، اس لیے اس کا ذکر اس سلسلہ میں بیجا نہ ہوگا، ماہم بیگم ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون تھی، اسی لیے علم و فضل کی ترویج کی خاطر اس نے دہلی میں ایک اعلیٰ پیمانہ کا مدرسہ خیر المنازل کے نام سے قائم کیا، سر سید احمد خان نے آثار الصنادید میں اس کا ذکر کیا ہے، یہ مدرسہ پرانے قلعہ کے پاس واقع تھا، اس کی عمارت اب منہدم ہوگئی ہے، اس پر جو کتبہ منقوش تھا، اس کو سر سید احمد خان نے اپنی کتاب (باب اول ص۱۳۱) میں نقل کیا ہے، اور وہ یہ ہے:-

بدوران جلال الدین محمد — کہ باشد اکبر شاہان عادل

چو ماہم بیگم عصمت پناہی — بنا کرد این بنا بہر افاضل

ولے شد ساعی این بقعہ خیر — شہاب الدین احمد خان باذل

زہے خیریت این بقعہ خیر — کہ شد تاریخ او "خیر المنازل"

اس مدرسہ کے ساتھ طلبہ کے لیے ایک بہت ہی حسین مسجد بھی تھی، ایک انگریز ماہر آثار قدیمہ نے اس مسجد کو دیکھ کر اس کا دلکش نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے:-

"مسجد پانی سے گھسے ہوئے نوکدار پتھروں کی بنی ہوئی ہے، جہاں نقش و نگار نہیں وہاں سرخ پتھر اور گرینیٹ لگائے گئے ہیں، پھاٹک گو اب مسمار ہو چکا ہے لیکن بہت ہی خوبصورت ہے، مسجد کا اندرونی حصہ رنگین پلاسٹر اور چمکدار اینٹوں سے مزین ہے، عمارت کا رخ اور پھاٹک رنگین تمغوں اور ترشے ہوئے پتھر کے پھولوں سے منقش ہیں، ان میں رنگ نیلے، زرد، سرخ، ارغوانی، سپید اور سیاہ استعمال کیے گئے ہیں، اس مسجد میں صرف ایک گنبد ہے جس کی گردن نیچی ہے، اس کا کنگرہ بہت ہی عجیب و غریب ہے، جو مسجد قلعہ کہنہ کے کنگورے سے مشابہ ہے، مسجد کی دیواریں عمودی ہیں، لیکن مینارے ڈھلوان ہیں، مسجد موتی کی طرح پیچھے سامنے نکلے ہوئے ہیں، اس میں حجرے ہیں جو اور مسجد میں نہیں دیکھے گئے،

(۱) رکیالوجی آف دہلی، موئفہ سی اسٹیفن بحوالہ پروموشن آف محمڈن لرننگ مرتبہ ان لا صفحہ ۱۶۶)

یہ مسجد جس فیاضی اور فراخدلی سے طلبہ کے لیے بنائی گئی تھی، وہ ماہم بیگم کی تعلیمی دلچسپی کی بڑی دلیل ہے،

جانان بیگم بیرم خان کی لڑکی عبد الرحیم خانخانان کی بہن اور اکبر کے لڑکے شاہزادہ دانیال کی بیگم تھی، بڑی حسین وجمیل، عاقلہ اور تعلیم یافتہ خاتون تھی، اس کی فیاضی اور مکارم اخلاق کا بڑا شہرہ تھا، علماء و فضلاء کی قدر دان اور فقراء و مشائخ سے عقیدت رکھتی تھی، شاہزادہ دانیال کے انتقال بعد شاہزادہ سلیم اس کے حسن وجمال پر فریفتہ ہوگیا، لیکن اس کی آرزو پوری نہ آئی، اکبر کے بعد جب وہ خود تاج و تخت کا مالک ہوا تو جانان بیگم کو نکاح کا پیام دیا، اس وفا شعار و عفت مآب خاتون نے اس کے جواب میں کل دانت نکلوا کر اور زلفیں ترشوا کر جہانگیر کے پاس بھجوا دیں، وہ عفت و حیا کا یہ نمونہ دیکھ کر دنگ رہ گیا، اور پھر کبھی نکاح کی خواہش نہیں کی، جانان بیگم زیارت حرمین شریفین سے بھی مشرف ہوئی، اور کلام مجید کی تفسیر لکھنے کی سعادت بھی حاصل کی، شاعرہ بھی تھی، کلام کا نمونہ یہ ہے

خیز تا رہ بہ گذار کنیم   خویش راچشم انتظار کنیم

زراہ امن و سلامت کسے باو برسد   غبار تا نشود خاک پا باو نرسد[1]

نورجہان بیگم نورجہان بیگم بھی نسلاً تیموری نہ تھی، لیکن ایک تیموری حکمران کی بیوی بن کر شاہی حرم اور حکومت کے لیے باعث رونق و زینت بنی، اس لیے اگر اس کا ذکر ان صفحوں میں نہ کیا جائے گا تو ہماری یہ کتاب نامکمل رہے گی،

نورجہان نے شاہی محل میں داخل ہوتے ہی اپنے جمالیاتی ذوق سے حرم کی عورتوں کا

---

[1] مراۃ العالم ورق ۳۷۵

سارا مذاق ہی بدل دیا، پہننے اوڑھنے، بناؤ سنگار، فرش فروش اور زیور و آرایش کی چیزون مین اتنی جدتین پیدا کین، کہ سارے ملک مین یہی رنگ غالب آگیا، اس حسن مذاق کے ساتھ قدرت نے نورجہان کو علم و ادب کی دولت سے بھی مالامال کیا تھا، ایک علم پرور باپ کی بیٹی اور ایک اعلیٰ ادیب و انشا پرداز اور شاعر کی بیوی تھی، اس لیے باپ کی وراثت اور شوہر کی رفاقت سے اس کی علمی صلاحیت اور لیاقت کو اتنی جلا ہوئی کہ اب تک اس کی استعداد علمی اور سخن سنجی کی داد دیجاتی ہے، مرآۃ الخیال کے مولف کا بیان ہے:-

"در بذلہ سنجی و سخن گوئی و شعرفہمی و حاضرجوابی از نسا ے زمان ممتاز بود" (ص ۱۲)

ید بیضا مولفہ آزاد بلگرامی (قلمی نسخہ دارالمصنفین) مین ہے،

"ورا دادی شعر بسیار خوش سلیقہ است"

اس کی تصدیق منتخب اللباب اور مآثرالامرا سے بھی ہوتی ہے، نورجہان کی بدیہہ گوئی اور حاضرجوابی کے لطیفے آج کل کی علمی مجلسون مین مشہور ہین، اگرچہ پھر بھی اس مضمون مین ان کا اعادہ شاید دلچسپی اور تفریح سے خالی نہ ہوگا،

ایک روز جہانگیر نے لباس تبدیل کیا جس کا تکمہ "لعل بے بہا" کا تھا، نورجہان نے اس کو دیکھتے ہی فوراً یہ شعر پڑھا:

ترا نہ تکمہ لعل است بر قبا ے حریر شدہ است قطرۂ خون منت گریبان گیر

ایک موقع پر جہانگیر نے عید کا چاند دیکھکر یہ مصرع موزون کیا،

ہلال عید براوج فلک ہویدا شد

نورجہان نے فی البدیہہ دوسرا مصرع پڑھا،

کلید میکدہ گم گشتہ بود پیدا شد[۱]

۱؎ تذکرۂ سرخوش قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال و خافی خان جلد اول ص ۲۷۰، و مرآۃ الخیال ص ۱۲۹،

مفتاح التواریخ (مولفہ سر طامس ولیم بیل) میں نورجہان کی بدیہہ گوئی کی کچھ اور مثالیں منقول ہیں، ایک مرتبہ جہانگیر نورجہان سے کئی روز کے بعد ملا، ملنے کی خوشی میں نورجہان کی آنکھوں سے آنسو رواں ہوگئے، جہانگیر نے اس کیفیت کو دیکھکر یہ مصرع پڑھا،

گوہر ز اشک چشم تو غلطیدہ می رود

نورجہان نے فوراً دوسرا مصرع فی البدیہہ کہا،

آبے کہ بے تو خوردہ ام از دیدہ می رود

ماہ محرم ۱۰۲۵ھ میں ایک دمدار ستارہ نظر آیا، نورجہان نے اس کو دیکھکر یہ شعر موزون کیا،

ستارہ نیست بدین طول سر برآوردہ　　فلک بشادی شہ گر برآوردہ

ملک الشعراء طالب آملی ایک بار شاہی عتاب میں پڑکر محبوس ہوگیا، حالت حبس میں نورجہان کے پاس یہ شعر لکھکر بھیجا،

ز شرم آب شدم آب را شکست نیست　　بحیرتم کہ مرا آبرو ز چہ شکست

نورجہان نے فوراً یہ لکھکر جواب دیا، "یخ بست و بشکست"[۱]

مآثر الامراء کے مؤلف کا بیان ہے کہ نورجہان کا تخلص مخفی تھا[۲]، مگر نہ جانے کیا بات ہے کہ تیموری شہزادیون میں جب کسی نے شعر و شاعری میں طبع آزمائی کی، اس کی طرف یہی تخلص منسوب کردیا گیا، مراۃ الخیال[۳]، منتخب اللباب[۴] اور مآثر الامراء[۵] کے مؤلفین نے نورجہان کے یہ اشعار اپنی کتابون میں نقل کئے ہیں،

---

[۱] یہ تمام روایتیں میری نظر سے مفتاح التواریخ (ص ۲۴۱) کے علاوہ کسی اور تاریخ اور تذکرہ مین نہین گذرین [۲] مآثر الامراء جلد اول ص ۱۳۴ [۳] مراۃ الخیال ص ۳۲ [۴] منتخب اللباب از خافی خان جلد اول ص ۲۷۰ [۵] مآثر الامراء جلد اول ص ۱۳۴ ۔

گر شوی سایہ نشین رو کہ بیخت باغبان | سایہ بر خورشید انداز د درخت باغبان
ناخشی چون دید بے گل باغ را نالید و گفت | از چہ رو با گل نرفت این جان سخت باغبان
جشن نوروز است و فراش بہار از فیض طبع | طرح کرد از سبزہ و گل تاج و تخت باغبان

نورجہان نے جمال کو جس طریقے سے شاہی دربار میں روشناس کرایا، اس کا ذکر جہانگیر کے سلسلہ میں آچکا ہے، نورجہان کی مصاحبت میں بعض ایسی عورتیں بھی تھیں جو شاعری میں کافی دسترس رکھتی تھیں، ان ہی میں ایک مہری ہروی تھی جس کے بارے میں مراۃ الخیال کا مولف لکھتا ہے:

"مسماۃ مہری ہروی خورشید طلعتی بود کہ کرشمہ جمالش عروسان بہشت را جلوہ گری آموختے و از تاب عذارش آفتاب عالم تاب در آتش غیرت سوختے، با این ہمہ حسن و رعنائی بالماس فکر گوہر ہائے مضامین آبدار سفتے و سخن را لب یار نازک گفتے۔"

مراۃ الخیال میں مہری ہروی کا ایک دلچسپ لطیفہ درج ہے، نورجہان مہری ہروی کے ساتھ محل کے بالا نشین پر بیٹھی تھی، کہ مہری ہروی کا شوہر خواجہ حکیم نیچے نظر آیا، نورجہان نے ہروی کو اس کے شوہر کو اوپر بلا لینے کا حکم دیا، حکم پا کر خواجہ حکیم نے اضطراب اور عجلت میں حاضر ہونے کی کوشش کی، مگر گھبراہٹ میں اس کے پاؤں لڑکھڑا ئے، اس اضطراب، عجلت اور گھبراہٹ کی حالت کو دیکھکر نورجہان نے مہری ہروی کو ان کیفیات پر اشعار موزوں کرنے کی فرمایش کی، مہری ہروی نے خواجہ حکیم کو مخاطب کرکے کہا:۔

مرا با تو سر یاری نماندہ | سر مہر و شنا وری نماندہ
ترا از ضعف پیری قوت نہ زور | چنانکہ پای بیداری نماندہ

نورجہان ہنس پڑی، اور مہری کو اس صلہ میں نقد و جنس کی صورت

میں انعام دیا[1]

ممتاز محل | شاہجہان کی محبوب بیوی ارجمند بانو بیگم الملقب بہ ممتاز محل بھی زیورِ علم و فضل سے آراستہ تھی، اور وہ نہ صرف سخن فہم بلکہ سخن سنج بھی تھی، اس کا اندازہ اس مشہور واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ ایک بار شاہجہان جمنا کے کنارے بیٹھکر دریا کے مناظر دیکھ رہا تھا، کہ اس کی موجوں کی طرف اشارہ کرکے ممتاز محل سے کہا

آب از برائے دیدنت می آید از فرسنگہا

ممتاز محل نے اس کا دوسرا مصرع فوراً موزون کیا،

از ہیبتِ شاہجہان سر می زند بر سنگہا[2]

جہان آرا بیگم | شاہجہان اور ممتاز محل کی بیٹی تھی، جو سیاسی واقعات کے لیے بھی اپنے عہد میں بہت نمایان رہی، ممتاز محل کی گود اور نورجہان کی صحبت اور شاہجہانی عہد کی علمی فضا میں رہ کر علم و فضل کے لحاظ سے بھی مشہور ہوئی، بچپن میں تعلیم ستی النساء خانم سے حاصل کی

---

[1] مراۃ الخیال ص ۳۰۵، مہری کی ایک غزل ملاحظہ ہو،

حل ہر نکتہ کہ بہ پیرِ خرد مشکل بود	آز مودیم بیک قطرۂ مے حاصل بود
گفتم از مدرسہ پرسیم سببِ حرمتِ مے	در ہر کس کہ زدم بے خود و لایعقل بود
خواستم سوزِ دلِ خویش بگویم با شمع	داشت او خود بزبان آنچہ مرا در دل بود
در چمن صبحدم از گریۂ زاری من	لالہ سوختہ خون در دل و پا در گل بود
آنچہ از بابلِ و ہاروت روایت کردند	سحر چشم تو بدیدم ہمہ را شامل بود
دولتے بود تماشای رخت مہری را	حیف صد حیف کہ این دولت مستعجل بود

[2] یہ روایت بعض اردو کی کتابون میں منقول ہے، مگر فارسی تذکرون میں اور تاریخون میں میری نظر سے نہیں گذری،

جو ملک الشعرا طالب آملی کی بہن اور حکیم رکنا کاشی کے بھائی کی بیوی تھی، یہ خاتون حافظ تھی، اور فارسی ادب سے واقف تھی، اور علم قرات و تجوید میں امتیازی حیثیت رکھتی تھی، ممتاز محل اور شاہجہاں دونوں اس کے قدردان تھے، ممتاز محل کی مہردار تھی، اور اس کے انتقال کے بعد محل کی صدارت اس کے سپرد ہوئی، اس کی وفات کے بعد شاہجہاں نے تیس ہزار روپیہ خرچ کر کے اس کا مقبرہ بنوایا، جو روضہ تاج گنج میں ہے، جہاں آرا بیگم نے اسی خاتون کے زیر تعلیم رہ کر قرآن مجید حفظ کیا[1]، اور یہ بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ جہاں آرا بیگم نے اعلیٰ قسم کی تعلیم پائی، کیونکہ وہ مصنفہ بھی تھی اور شاعر بھی، چنانچہ ۲۵ سال کی عمر میں ۱۰۴۹ھ میں مونس الارواح لکھی، جس میں حضرت معین الدین چشتیؒ اور ان کے سلسلہ کے اکابر خلفا مثلاً شیخ حمید الدین ناگوریؒ، حضرت قطب الدین کاکیؒ، حضرت فرید الدین گنج شکرؒ، حضرت نظام الدین اولیاءؒ، اور حضرت چراغ دہلیؒ کے بہت ہی عقیدت مندانہ احوال مندرج ہیں، جس سے اس کے مذہبی اور صوفیانہ ذوق کا صحیح طور پر اندازہ ہوتا ہے، اس کتاب کی تالیف میں اس نے بڑی احتیاط کی ہے، چنانچہ ایک جگہ وہ رقمطراز ہے۔

"احوال این بزرگانرا کہ صدر این درگاہ صمدیت اند از کتب و رسائل معتبرہ باحتیاط تمام بیرون آوردہ بقید تحریر آوردہ شد و اعتقاد این ضعیفہ آنست کہ در این رسالہ ثبت گردیدہ صحت تمام دارد امید کہ خوانندگان را فیض و بہرۂ تمام از آن حاصل آید"

اس احتیاط کے علاوہ کتاب کی دو اور خصوصیات ہیں، ایک تو یہ کہ یہ بہت ہی ادب اور احترام کے ساتھ لکھی گئی ہے، حضرت معین الدین اجمیریؒ کے ذکر کی ابتدا ان اشعار کے ساتھ کرتی ہے،

آن شہنشاہ جہانِ معرفت ۔۔۔ ذات او بیرون ز ادراکِ صفت

---

[1] مآثر الکرام جلد دوم ص ۹۲-۹۱۔

خسرو ملک فنا بے تخت و تاج — از خود و از غیر خود بے احتیاج

غرق بحر عشق از صدق و صفا — از خودی بیگانہ با حق آشنا

کردہ مرغ ہمتش ز اوجِ کمال — بیضۂ افلاک را در زیر بال

اختر برجِ سپہر لم یزل — گوہر درجِ کمالِ بے بدل

آن معینِ دین و ملت بے نظیر — فارغ از دنیا بملکِ دین امیر

در ثنائے او زبانم را چہ حد — فیض او باید کہ فرماید مدد

وہ جب حضرت معین الدین چشتیؒ کے مزار مبارک کی زیارت کے لیے گئی تو وہاں کے جن تاثرات کو قلمبند کیا ہے، ان سے بھی اس کی والہانہ عقیدت مندی اور اخلاص کا اظہار ہوتا ہے،

"می گوید فقیرۂ حقیرہ جہان آراء کہ چون از یاوری بخت وفیروزی طالع از دارالخلافہ اکبر آباد در خدمت والد بزرگوار خود متوجہ خطۂ پاک حضرت اجمیر بے نظیر شدم از تاریخ ہژدہم ماہ شعبان المعظم سنہ یکہزار و پنجاہ سنہ ہجری تا تاریخ جمعہ ہفتم ماہ رمضان المبارک کہ داخل عمارت کنار تال اناساگر گشتم، موفق شدم باین معنی کہ ہر روز و ہر منزل دو رکعت نماز نافلہ ادا می کردم و یکبار سورہ یٰسین با فاتحہ از کمال اخلاص و عقیدتمندی خواندہ و ثواب آنرا بروح پرفتوح مطہر منور حضرت پیر دستگیر خواجہ معین الحق والدین رضی اللہ عنہ نثار می نمودم و چند روز کہ در عمارات مذکورہ توقف واقع شد، از نہایت ادب شبہا بر پلنگ نخوابیدم و پا بطرف روضہ متبرکہ حضرت پیر دستگیر یا دراز نساختم، بلکہ پشت بآنجانب نکردم و روزہا در زیر درختان می گذرانیدم .... و در مسجد سنگ مرمر کہ پدر بزرگوار حق شناس این حقیرہ راست کردہ اند، رفتہ نماز ادا کردہ و باز در گنبد مبارک نشستہ سورہ یٰسین

فاتحہ بروح پُرفتوح خواندم تا وقتِ نمازِ مغرب در آنجا بودم و شمع بار رواح آنحضرت روشن کردہ، روزہ یا بِ جہا لرہ افطار کردم عجیب شامی دیدم آنجا کہ بہتر از صبح بود، اگرچہ اخلاص و محبت این فانیان تقاضا نے آن نمی کرد کہ باین قسم جاے متبرک پرفیض گوشۂ عافیت رفتہ باز بخانہ بیاید، اما چہ چارہ ؎

رشتۂ در گردنم افگندہ دوست | می برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

اگر اختیار میداشتم ہمیشہ در روضۂ حضرت کہ عجیب گوشۂ عافیت است و من عاشق گوشۂ عافیتم بسر می بردم و بہ سعادت طواف نیز مشرف می شدم ناچار بچشم گریان و دل بریان بصد ہزار افسوس ازان درگاہ رخصت شدہ بخانہ آمدم و تمام شب طرفہ بیقراری در من بود۔"

مونس الارواح کا سنہ تالیف ۱۰۴۹ھ ہے لیکن یہ عبارت ۱۰۵۳ھ میں بطور ضمیمہ لکھی گئی ہے، جو دار المصنفین کے قلمی نسخہ مرقومہ ۱۰۶۰ھ میں ہے،

اس کتاب کی دوسری خصوصیت اس کا طرز انشا ہے، مولانا شبلی مرحوم نے اس کی عبارت کو نہایت صاف اور شستہ[1] بتایا ہے، جیسا کہ اوپر کے اقتباس سے بھی معلوم ہوگا،

مونس الارواح چھپ گئی ہے مگر اس کا ایک بہت ہی خوشخط نسخہ دار المصنفین میں ہے، یہ نسخہ جہان آرا نے دربار کے مشہور خوشنویس عاقل خان سے وصلیوں پر لکھوایا تھا، اور پوری کتاب کو طلائی نقش و نگار اور زرین افشان سے مزین کرایا تھا، اس پر سنہ کتابت ۱۰۶۰ھ مرقوم ہے، یعنی تصنیف کے اونیس سال کے بعد اور جہان آرا کی عمر کے ۴۷ برس[1] میں یہ نسخہ لکھا گیا، جس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ کتاب میں جن بزرگوں کے حالات ہیں،

---

[1] الندوہ اپریل ۱۹۱۱ء

اُن سے جہان آرا کی عقیدت و ارادت سنِ کہولت میں بھی بدستور قائم تھی، اس قلمی نسخہ کا سائز ۱۷ × ۲۷ سم ہے، ہر صفحہ میں گیارہ سطریں ہیں، اور کل صفحات کی تعداد ۴۴ ہے، مولانا شبلی مرحوم نے اس کو ایک بڑی رقم میں خریدا تھا، اور اپنی قلمی کتابوں کے ذخیرہ میں اس کو بہت ہی عزیز رکھتے تھے، (الندوہ، اپریل ۱۹۱۱ء) یہ کتاب خطاطی کے اعلیٰ نمونہ کے طور پر لندن کی نمایش منعقدہ سنہ ۱۹۱۱ء میں بھی بھیجی گئی تھی،

جہان آرا کے علمی مشاغل میں زیادہ تر صوفیائے کرام کے حالات کا مطالعہ ہی رہا کرتا تھا، مونس الارواح میں ایک جگہ لکھتی ہے،

"این ضعیفہ راجیہ از ادائے فرض و واجبات و تلاوت قرآن مجید ہیچ امرے شریف‌تر از ذکر حالات و مقامات اولیائے کرام قدس اللہ ارواحہم نمی داند، بنا برین خلاصہ اوقات خود را بمطالعہ کتب و رسائلے کہ مشتمل بر احوال سعادت مآل بزرگان دین و اکابر صاحب یقین ست صرف می نماید"[1]

---

[1] جہان آرا بیگم کے ایک سوانح نگار نے اس کی تالیفات میں ایک سیاحت نامہ اور ایک مثنوی بھی بتائی ہے، مگر میری نظر سے ان دونوں کتابوں کے نام کسی مستند تذکرہ اور تاریخ میں نہیں گذرے، ۱۹۳۱ء میں لندن سے ایک انگریزی کتاب ایک انگریز خاتون Andrea Butensch نے Mogul princess. gahan Ara Begum کے نام سے شائع کی ہے، خاتون مذکورہ نے اس کتاب کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ وہ آگرہ کے قلعہ کو دیکھنے میں مصروف تھی کہ ثمن برج کے ایک شکستہ پتھر کے نیچے سے کچھ مسودے ملے، مسودے کو پڑھنے کے بعد یہ معلوم ہوا کہ وہ جہان آرا کی خود نوشتہ تحریریں ہیں، جن کو اس نے شاہجہان کے محبوس ہونے کے بعد قلمبند کیا تھا، وہ بھی شاہجہان کے ساتھ قید تھی، اس لیے قید ہی کے زمانہ میں اس نے اپنی پچھلی زندگی کے واقعات (باقی صفحہ ۴۵۲ پر)

جہان آرا شاعرہ بھی تھی، مونس الارواح مین جا بجا اس کے اشعار درج ہین، نمونہ کے طور پر حمد کے اشعار ملاحظہ ہون:-

آنجا کہ کمال کبریائے تو بود | عالم نمے از بحر عطائے تو بود
مارا چہ حد حمد و ثنائے تو بود | ہم حمد و ثنائے تو سزائے تو بود

دیگر

اے بوصف بیان ما ہمہ ہیچ | ہمہ آن تو آن ما ہمہ ہیچ
ہرچہ بیند خیال ما ہمہ ہیچ | ہرچہ گوید زبان ما ہمہ ہیچ
ما بکنہ حقیقتت نرسیم | اے یقین و گمان ما ہمہ ہیچ

(بقیہ حاشیہ ص۴۵۱) لکھنے شروع کیے، اور انکو ثمن برج کے ایک پتھر کے نیچے یہ لکھکر چھپا دیا کہ ثمن برج کا پتھر جب خستہ ہو جائیگا تو یہ تحریر لوگون کے ہاتھ آئے گی جس سے اس کے اصلی خیالات، جذبات اور حالات روشن ہون گے، تحریر مین رومانی اور تمثیلی رنگ بہت غالب ہے، اور اسلوب بیان بہت ہی دلکش اور موثر ہے، چنانچہ اس تحریر کا انگریزی ترجمہ دیدہ زیب لکھائی چھپائی کے ساتھ لندن سے ۱۹۳۱ء مین شائع کر دیا گیا ہے، ہم نے اس کتاب کو شروع سے آخر تک بہت ہی غور سے پڑھا، اور اس کو سر اسر جعلی اور نقلی پایا، یہ محض ایک نئے اور دلنشین انداز مین جہان آرا بیگم کے اخلاق اور کیرکٹر کو مسخ کر کے دکھانے اور اورنگزیب کی ذات سے نفرت پیدا کرنے کی کوشش مین لکھی گئی ہے، اس کتاب مین بعض لغو اور لاطائل واقعات ایسے ہین، جن کی تردید کرنا محض تضییع اوقات ہے، مثلاً جہان آرا بیگم راجپوتون کی بہت ہی مداح ہے، وہ ایک راجپوت سردار پر عاشق ہو گئی ہے، وہ شادی اس لیے نہین کر سکتی ہے کہ اکبر نے یہ قانون بنا رکھا تھا کہ مغل بادشاہون کی لڑکیاں رشتۂ ازدواج سے محروم رہین، چنانچہ جہان آرا چھپ چھپ کر اپنے محبوب راجپوت سے ملتی ہے عشق و محبت کی باتین کرتی ہے، اور اپنی یاد تازہ رکھنے کیلیے اسکو کئی تحفے دیتی ہے، جب دارا اور اورنگزیب مین خانہ جنگی شروع ہوتی ہے، تو جہان آرا کی محبت اور عشق مین

جہان آرا بیگم کے اردو سوانح نگار منشی سیل چند، مصنف تاریخ آگرہ کے حوالہ سے اس کا ایک مرثیہ بھی نقل کرتے ہیں، جو اس نے اپنے باپ کی وفات کے موقع پر کہا تھا، اسکے تین اشعار یہ ہیں:

اے آفتاب من کہ شدی غائب از نظر	آیا شب فراق ترا ہم بود سحر؟
اے بادشاہ عالم، وی قبلۂ جہان	بکشائے چشم رحمت و بر حال من نگر
نالم چنین ز غصہ و یا دم بود بدست	سوزم چو شمع در غم و دودم رود ز سر

جہان آرا بیگم کے ذوق شعری اور اس سلسلہ میں اس کے جود و سخا کی متعدد روایتیں تذکرون

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۵۲) راجپوت سردار، دارا کی حمایت میں اورنگزیب کے خلاف لڑتا ہے، جنگ میں راجپوت جہان آرا کے ایک دوسرے عاشق کے ہاتھوں مارا جاتا ہے، مگر اس کا ایک ہار کسی طرح سے جہان آرا کو مل جاتا ہے جس کو وہ قیمتی یادگار سمجھکر اپنے پاس محفوظ رکھتی ہے، اس کتاب میں اسی قسم کے اور بھی خرافات ہیں، سب سے مضحکہ خیز بات تو یہ ہے کہ جہان آرا بیگم کا لباس ساری دکھایا گیا ہے، اور وہ ہندو دیوتاؤن سے مثلاً شیوجی اور وشنو وغیرہ سے بڑی عقیدت رکھتی تھی، اسی طرح کی اور بہت سی باتین ہین جو محض اورنگزیب اور ہندوستان کے مسلمان بادشاہون کی گذشتہ تاریخ کو بدنام کرنے کی غرض سے لکھی گئی ہین، برنیئر منوکی اور اسمتھ وغیرہ جیسے متعصب یورپین مورخین نے جہان آرا بیگم کی ذات کے ساتھ بہت ہی نازیبا حکایتین منسوب کر دی تھین لیکن سنجیدہ مورخون نے حقائق کی روشنی مین ان کی تردید کر دی ہے، ایک اچھوتے انداز مین پھر اس شہزادی کی ذات پر نا روا حملے کیے گئے ہین، مگر یورپین مورخون کی ہرزہ سرائی اور دشنام طرازی اس قدر عام ہو گئی ہے، کہ ان کی طرف توجہ کرنے کی بھی ضرورت نہین۔

اورینٹل کالج میگزین (اگست ۱۹۳۶ء) مین جہان آرا کے ایک انڈیا آفس کے نسخہ رسالۂ صاحبیہ پر ایک مضمون بھی شائع ہوا تھا، مضمون نگار کا بیان ہے کہ جہان آرا بیگم نے اس رسالہ مین اپنے پیر و مرشد ملا شاہ بدخشی کے سوانح کے علاوہ اپنے حالات بھی قلمبند کیے ہین، آخر مین کچھ اسکے اشعار بھی ہین، یہ رسالہ میری نظر سے نہین گذرا ہے، اس لیے اس پر تبصرہ کرنے سے قاصر ہون۔

میں پائی جاتی ہیں، کلمات الشعراء (سرخوش)، ریاض الشعراء اور خزانۂ عامرہ میں ہے کہ جہاں آرا بیگم ایک دفعہ باغ کی سیر کو ہاتھی پر برقعہ ڈالے نکلی، میر صیدی طہرانی چھپ کر تماشا دیکھنے لگا، جب ہاتھی اس کے پاس سے گذرا تو اس نے بے ساختہ یہ مطلع پڑھا،

برقع برخ افگندہ برد ناز بباغش   تا نکہتِ گل بیختہ آید بدماغش

جہاں آرا نے حکم دیا کہ شاعر کو کشاں کشاں سامنے لائیں، وہ آیا تو اس سے بار بار مطلع پڑھوا کر سنا اور پانچ ہزار روپے دلوائے، لیکن ساتھ ہی حکم دیا کہ اس کو شہر سے نکال دیا جائے، کیونکہ جہاں آرا بیگم کو شعر تو پسند آیا، لیکن گستاخی پسند نہ آئی، مولانا شبلی مرحوم اپنے مقالہ "زیب النساء" میں اس روایت کو نقل کرکے رقمطراز ہیں کہ اس واقعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ بیگمات کے لیے کس قسم کے آداب مقرر تھے،

کلمات الشعراء (قلمی نسخہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی) میں جہاں آرا بیگم کی علمی فیاضی کی ایک اور مثال درج ہے، مرزا حسن بیگ رفیع قزوینی نے جو شاہجہانی دربار کا ایک معزز منصبدار اور شاعر تھا، شاہجہان آباد پر ایک مثنوی لکھی، اس شہر کے باغ حیات بخش کی تعریف میں جو اشعار لکھے وہ جہاں آرا کو پسند آئے، اس کے صلہ میں اس نے پانچ سو روپے انعام اسکے پاس بھجوا دیے،

ید بیضا (قلمی نسخہ دار المصنفین) مولانا غلام علی آزاد لکھتے ہیں کہ مرزا محمد علی ماہر نے جہاں آرا کی مدح میں ایک مثنوی لکھکر اس کی خدمت میں پیش کی، مثنوی کے اس شعر پر جہاں آرا نے اس کو پانسو روپے انعام دیے،

بیا بنگر تو صفات کردگار است   کہ خود پنہان و نقشش آشکار است

مگر مولانا غلام علی آزاد اس روایت کو سرو آزاد (ص ۱۱۳) میں نقل کرکے لکھتے ہیں کہ شعرائکی نظر سے نعمت خان عالی کی اس مثنوی میں بھی گذرا ہے جو اس نے زیب النساء کے خرگاہ پر لکھی تھی،

تذکرۂ مخزن الغرائب (قلمی نسخہ دار المصنفین) میں ہے کہ مرزا محمد علی ماہر نے نو سو اشعار کی ایک مثنوی زیب النساء کی شان میں لکھی جس میں مذکورۂ بالا شعر زیب النساء کو بیحد پسند آیا، واللہ اعلم بالصواب

جہاں آرا کی علم پروری اور اسکے ساتھ مذہبیت کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ آگرہ کی جامع مسجد اسی کی بنوائی ہوئی ہے، اس نے مسجد کے ساتھ ایک مدرسہ بھی قائم کیا تھا جو بہت دنوں تک نہایت کامیابی کے ساتھ چلتا رہا،

جہاں آرا بیگم نے مرنے کے بعد بھی خواجگان چشتیہ سے اپنی عقیدت قائم رکھی، یعنی حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کے مزار پر انوار کے ٹھیک پائین میں اپنی خواہش کے مطابق دفن ہوئی، اس کی پرہیزگاری، نیکی، انکساری اور ذوق شعری اسکے حسب ذیل شعر سے بھی ظاہر ہے، جو اس کی معمولی اور سادہ قبر پر مکتوب ہے، اس مزار کا کٹہرا تو سنگ مرمر کا ہے، لیکن تعویذ بالکل خام ہے، جو ہمیشہ سبزہ سے ڈھکا رہتا ہے،

بغیر سبزہ نہ پوشد کسے مزار مرا — کہ قبر پوش غریبان ہمین گیاہ بس است[1]

زیب النساء بیگم | یہ وہی شہزادی ہیں کے علمی چمنستان کا گل سرسبد زیب النساء بیگم ہے، یہ اورنگ زیب عالمگیر کی سب سے پہلی اولاد دلرس بانو بیگم کے بطن سے تھی، دستور کے مطابق اس کو سب سے پہلے کلام پاک پڑھایا گیا،[2] جس کے لیے عالمگیر کی ایک درباری امیر کی ماں مریم کو مقرر کیا گیا، جو کلام پاک کی حافظہ تھی، زیب النساء نے بھی کلام پاک حفظ کیا، مآثر عالمگیری کے مولف کا بیان ہے کہ اس سعادت کے صلہ میں عالمگیر نے زیب النساء کو تیس ہزار اشرفیاں بطور انعام مرحمت فرمائیں، زیب النساء نے عربی اور فارسی کی بھی اعلیٰ تعلیم حاصل کی، عالمگیر نامہ، مآثر عالمگیری اور مراۃ العالم میں ہے کہ:-

"بتحصیل علوم عربی و فارسی بہرۂ تمام اندوختہ"

---

۱ آثار الاخیار ج ۲ ص ۳۰۹ ۲ مآثر عالمگیری اردو ترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی ص ۲۹۴

زیب النساء کے معلمون میں صرف ملا محمد سعید اشرف ماژندرانی کا نام تاریخون مین مذکور ہے، جو اس کی عمر کے اکیسوین سال مین درسی کتب کے علاوہ، فقہ، اصول فقہ، اور علم حدیث کی تعلیم کے لیے مقرر ہوئے۔ زیب النساء نے شعر و شاعری مین بھی انہی سے اصلاح لی[۱]، اس نے علم کی تکمیل کے لیے فن خطاطی مین بھی کمال حاصل کیا، مآثر عالمگیری کا مولف رقمطراز ہے کہ وہ ہر قسم کے خطوط یعنی نسخ، نستعلیق اور شکستہ نہایت خوبی کے ساتھ تحریر کرتی تھی[۲]، یہ فن شاید اس نے ملا محمد سعید اشرف ماژندرانی ہی سے سیکھا تھا، کیونکہ وہ نہ صرف ایک ممتاز شاعر اور عالم تھے، بلکہ خطاط اور خوشنویس بھی تھے، زیب النساء کے علم و ہنر کی بنا پر یہ قیاس کیا جاتا ہے کہ اسکی علمی کاوش اسکی علمی و ادبی تصنیفات مین بھی ظاہر ہوگی، مگر وہ اب ناپید ہیں، مخزن الغرائب کے مولف نے اس کی صرف ایک کتاب زیب المنشآت کا حوالہ ان الفاظ مین دیا ہے،

""زیب المنشآت کہ از تالیف آنجناب است فقیر آن را زیارت نمودہ، (قلمی نسخہ دار المصنفین)

"زیب المنشآت" زیب النساء کے خطوط اور رقعات کا مجموعہ تھا، اس کی ایک بیاض خاص بھی تھی، جو اس کی ایک خاص ارادت فہم نامی کے ہاتھ سے حوض مین گر کر ضائع ہوگئی، ملا سعید اشرف ماژندرانی نے اسکی معذرت مین ارادت فہم کی طرف سے ایک طویل قطعہ لکھکر زیب النساء کی خدمت مین پیش کیا،

زیب النساء کے نام سے ایک مرقع بھی منسوب ہے جس مین قطعات، مشہور کاتبون اور خطاطون کے کمالات کے نمونے، ماہر نقاشون اور مصورون کے ہاتھ کی بنائی ہوئی انواع و اقسام کی تصویرین تھین، یہ مرقع ناپید ہے لیکن اسکا دیباچہ جس کو ایک شاعر و نثار ملا رشا راشد نے لکھا تھا، خدابخش خان لائبریری مین موجود ہے، یہ دیباچہ ملی جلی نظم و نثر مین لکھا گیا ہے، اس سے زیب النساء کی علمی مجالس کا حال معلوم ہوتا ہے، شاعر مذکور لکھتا ہے کہ بیگم کی علمی مجلسون مین نظم و نثر، صرف و نحو، ہندسہ و نجوم، معانی و بیان، اور ہیئت و مرایا پر علماء و فضلاء جمع ہوکر بحث و مباحثہ اور تحقیق و تفتیش کیا کرتے تھے،

۳۹۴

۱ے ملا محمد سعید اشرف ماژندرانی پر ایک مفصل مضمون معارف نمبر ۲ ج ۱۲ میں ملاحظہ ہو، نیز دیکھو مآثر الکرام ج ۲ ص ۱۱۶ ۲ے مآثر عالمگیری

۳

نہان بود آنچہ در آثار قدرت | بفضل آوردہ دستِ او ز قوت

ملازم دارد آن علامۃ العصر | ز اہل فضل و حق چون ابو النصر

سوالِ تسعہ را حاضر جوابی | ز کلیاتِ دانش انتخابی

عقول لاتی عشر عشری زگفتار | ز علم ظاہر و باطن خبردار

گہے تفتیش علم صرف می شد | سخن از اسم و فعل و حرف می شد

گہے در مجلسش از نحو مذکور | ز مرفوع و ز منصوب و ز مجرور

گہے از ہندسہ می کرد تعداد | ز قدر خط و سطح و جسم و ابعاد

گہے می رفت حرف از علم تنجیم | ز اسطرلاب و استخراج و تقویم

گہے می کرد وصفِ علم اعداد | صحیح و کسر و زوج و فرد و تعداد

گہ از علم بیان کردی حکایت | ز تلمیح و ز تشبیہ و کنایت

گہ از علم معانی بود گفتار | ز اسناد و ز مسند با خبردار

گہ از آثار علوی یاد می کرد | حدیث ابر و برق و باد می کرد

بہیئت مطلع از طبع درّاک | ز تسکین زمین، تحریک افلاک

شد از علم مرایا بسکہ آگاہ | بذات شخص برد، از سایہ اش راہ

اس دیباچہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ زیب النسا بیگم طب روحانی مین بھی حاذق تھی،

بعلم طب روحانیہ حاذق | بتہذیب است اخلاقش موافق

اور وہ علم موسیقی سے بھی واقف تھی۔

ز موسیقی داز الحانش آگاہ | بگوش استماعش لیک اکراہ

بیگم کی انشا پردازی اور علمی کمال کے بارے مین لکھتا ہے:

بلفظ مختصر معنی مطوّل | عبارت مجمل و معنی مفصل
بعلم اولی تر از ہر چیز دانی | نہ در اعمال گنجد حرف ثانی

ایک دوسری جگہ رقمطراز ہے :-

باہل فضل شامل جود خاصش | بعلم و شرع دایم اختصاصش
سخن سنجان معنی آفرینان | زخرمنہائے فضلش خوشہ چینان
سخن فہم و سخن سنج و سخن دان | سخنور را نسنجد جز بمیزان[1]

شعر و شاعری کی زبان کے علاوہ شاعر نے دیباچہ کی نثر میں بھی بیگم کی انشا، خوشنویسی اور شاعری کا ذکر بہ شاندار اور باوقار الفاظ کے ساتھ کرتا ہے، مورخین اور تذکرہ نویس بھی اسکی علمی سرپرستی اور قدردانی کے بیان میں رطب اللسان ہیں، مآثر عالمگیری میں ہے، کہ علما و فضلا اور خوشنویسوں کا ایک گروہ زیب النسا بیگم کی سرکار سے فیضیاب ہوا کرتا تھا (ص ۵۳۴)

غلام علی آزاد ید بیضا میں لکھتے ہیں :-

ہمت بہ ترقیہ حال ارباب فضل و کمال مصروف می داشت، و جماعت کثیر از علما و شعرا و منشیان و خوشنویسان بہ سایۂ قدردانی او آسودہ بود. وکتب و رسائل بسیار بنام او سمت تالیف پذیرفتہ (ید بیضا، قلمی نسخہ، دار المصنفین)

بقول مولانا شبلی مرحوم زیب النسا کا دربار حقیقت میں ایک اکاڈمی (بیت العلوم) تھی، اس بیت العلوم میں ہر فن کے علما، و فضلا، نوکر تھے، جو ہمیشہ تصنیف و تالیف میں مصروف رہتے تھے، کتابیں عموماً اس کے نام سے موسوم ہوتی تھیں یعنی ان کتابوں کے نام کا پہلا جزء زیب

---

[1] پروفیسر محفوظ الحق (پریزیڈنسی کالج، کلکتہ) نے مرقع کی نقل رسالہ شمع آگرہ، بابت ماہ دسمبر ۱۹۲۵ء میں شائع کی تھی، یہ اشعار اسی سے لیے گئے ہیں،

کا لفظ ہوتا تھا، چنانچہ مآثر عالمگیری کے مولف کا بیان ہے کہ ملا صفی الدین اردبیلی نے بیگم کے حکم سے تفسیر کبیر کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا، تو اس کا نام زیب التفاسیر رکھا گیا، (ص ۴۳۹) مولف مذکور کا یہ بھی بیان ہے کہ اس کتاب کے علاوہ اور دیگر رسائل بھی بیگم کے نام سے موسوم ہوئے، (ص ۴۹۴) مگر ان رسائل کے نام کہیں اور راقم حروف کی نظر سے نہیں گذرے، زیب التفاسیر کا پانچواں حصہ بوڈلین لائبریری آکسفورڈ میں موجود ہے، یہ حصہ ۴۱۶ صفحوں میں ختم ہوا ہے، اور خاتمہ کی تاریخ ۱۰۸۱ھ مرقوم ہے، فہرست نگار کا خیال ہے کہ یہ نسخہ خود مولف کے ہاتھ کا لکھا ہے،

زیب النساء نے اپنے بیت العلوم کے علماء و فضلا کے استفادہ کے لیے ایک اعلیٰ قسم کا کتبخانہ بھی قائم کیا تھا، مآثر عالمگیری کے مولف کا بیان ہے کہ ہنر پرور اور علم شناس شہزادی ہمیشہ کتابوں کے جمع کرنے اور نیز جدید تصنیف و تالیف کو جاری رکھنے میں کوشاں رہتی تھی، اسکا کتب خانہ ہر حیثیت سے نادر الوجود تھا، (ص ۴۹۴)

زیب النساء شاعرہ بھی تھی، مگر اس کی شاعری کے متعلق بہت سی بے سروپا اور بے بنیاد باتیں منسوب ہو گئی ہیں، جن کی تشہیر غیر مسلم مصنفوں نے زیادہ کی ہے، "وزڈم آف دی ایسٹ سیریز" میں لندن سے دیوان زیب النساء کے نام سے ایک کتاب شائع ہوئی ہے، جس میں زیب النساء کی اول پچاس فارسی غزلوں کا انگریزی ترجمہ مگن لال اور جیسی ڈنکن ویسٹ بروک نے کیا ہے، شروع میں ۲۳ صفحے کا ایک مقدمہ ہے، جو موخر الذکر انگریز خاتون ڈنکن ویسٹ بروک کا لکھا ہوا ہے، یہ مقدمہ بظاہر بہت ہی پر از معلومات ہے، اس میں زیب النساء کے معاشقہ اور اس ضمن میں اس کی بدیہہ گوئی اور حاضر جوابی کے بہت سے ناپسندیدہ قصے اور واقعات درج ہیں، مگر ان کی تاریخی حیثیت [illegible] تردید ایک دوسرے غیر مسلم مورخ سر جادو ناتھ سرکار نے ایک مضمون میں بہت جچی تلی کی ہے، جادو ناتھ سرکار اورنگ زیب عالمگیر کے سب سے بڑے ہجو نگار ہیں، اس لیے

[illegible] ص ۹۰ - ۷۹

اورنگزیب کی لڑکی زیب النسار کی حمایت مین ان کا کچھ لکھنا بجز اکراہ حق وصداقت کا اظہار کرنا ہے،

مولانا شبلی مرحوم نے بھی زیب النسار سے متعلق جو مہمل اور لغو روایتیں مشہور ہوگئی تھین ان کی تردید اپنے مضمون "زیب النسار" مین کردی ہے[1]

زیب النسار کے عشق ومحبت کی طرح اس کا دیوان بھی محض افسانہ بن کر رہ گیا ہے، زیب النسار کا ایک مجموعۂ کلام "دیوان مخفی" کے نام سے مختلف مطابع سے چھپ کر بازار مین فروخت ہوتا ہے، مگر ارباب نظر ان متداول نسخون پر اپنے خیالات ظاہر کرچکے ہین، کہ دیوان کی اندرونی شہادت کی بنا پر اس کو کسی طرح زیب النسار کا دیوان نہین کہا جاسکتا ہے، پروفیسر محفوظ الحق ڈپریزیڈنسی کالج کلکتہ نے معارف نمبرہ جلد ۱۱ مین یہ بتایا ہے، کہ دیوان مخفی دراصل مخفی رشتی کا دیوان ہے جسکا وطن باصطرخ تھا، وہ شاہجہان کے عہد مین خراسان سے ہندوستان طلب منفعت کے لیے آیا، مگر یہان کی ہوا اس نہین آئی اور دشمنون کی ریشہ دوانیون سے قید کردیا گیا، چونکہ شاہی دربار مین اس کی رسائی نہ ہوسکی، اس لیے اس کا کلام اورون کی طرح مشہور نہ ہوسکا، اور ایک مدت تک مخفی مگر محفوظ رہا، اس کا دیوان بعض غیر محقق مصنفون کے ہاتھ لگا اور اسے دیکھے اور سمجھے بغیر غالباً محض مخفی کی رعایت کی بنا پر بیگم کی جانب منسوب کردیا،

مستند تذکرہ نویسون مین احمد علی سندیلوی بھی مخزن الغرائب مین زیب النسا کے ذکر مین لکھتے ہین:-

"اما دیوان اشعارش جاسے بنظر نیامدہ اگرچہ در تذکرہ انتخابش بنظر آمدہ لیکن اعتبار را نشاید

بسبب آنکہ اکثر شعرا اساتذہ صاحب آن تذکرہ بنام بیگم نوشتہ بودہ"

---

[1] مقالات شبلی ج ۵ ص ۱۱۶ - ۱۰۶ ملاحظہ ہو اور نیشنل پبلک لائبریری کیٹلاگ ج ۳ ص ۱ - ۱۵۰، اور پروفیسر محفوظ الحق کا مضمون زیب النسار اور دیوان مخفی ، معارف نمبرہ ج ۱۱ ،

اسی سلسلہ میں احمد علی سندیلوی نے زیب النسا کے قریب پندرہ ایسے اشعار نقل کیے ہیں، جو بعض تذکروں میں زیب النسا کی طرف منسوب ہیں لیکن یقین کیساتھ نہیں کہا جا سکتا ہو کہ یہ اشعار واقعی اسی کے ہیں، مولانا شبلی مرحوم کا خیال ہے کہ اس کا سارا کلام شاید اس بیاض میں جمع ہو، جو اتفاقیہ ایک حوض میں گر کر ضائع ہو گئی، بہرحال زیب النسا کے شاعر ہونے میں کسی کو انکار نہیں ہو سکتا ہے،

مرقع کا دیباچہ نگار اس کی شاعری کی تعریف میں اس طرح رطب اللسان ہے:

ز تحصیل طبع و ذہن اندیشہ کردہ — چہ کاوید و دلہا را در ریشہ کردہ

ز طبعش موج زن بحر معانی — بہ بحر شعر آبش زندگانی

ز نطقش تشنہ معنی زند جوش — شود سامع چو صورتہای خاموش

ز نظم و نثر نطقش آنچہ گفتہ — در ناسفتہ گوہرہاے سفتہ

مولانا شبلی مرحوم نے بعض تذکروں کے استناد پر صرف مندرجۂ ذیل رباعی کو زیب النسا بیگم کی طرف منسوب کیا ہے،

بشکند دستے کہ خم در گردن یارے نشد — کور بہ چشمے کہ لذت گیر دیدارے نشد

صد بہار آخر شد و ہر گل بہ فرقے جا گرفت — غنچۂ باغ دل ما زیب دستارے نشد

مگر پروفیسر محفوظ الحق نے معارف کے مضمون ہذا میں اس رباعی کو بھی مشکوک بتایا ہے،

زیب النسا کا ذوق شعری اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ اس کی خدمت میں شعرا اپنے معروضات اشعار ہی میں پیش کرتے تھے، اوپر یہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ زیب النسا کی بیاض اسکی ایک کنیز کے ہاتھ سے حوض میں گر گئی تھی، زیب النسا کے استاد ملا سعید اشرف مازندرانی نے کنیز کی طرف سے ایک طویل معذرت نامہ لکھ کر زیب النسا کی خدمت میں پیش کیا، یہ قطعہ مخزن الغرائب میں درج ہے جسکی پوری نقل مقالات شبلی حصہ پنجم کے مضمون زیب النسا میں بھی ہے، ہم یہاں اس کے صرف چند اشعار

ناظرین کے لیے پیش کرتے ہین :-

اے ادا فہمے کہ پیشت فاضلان عصر را ‏‏‏ شستن مجموعۂ اندیشہ بآب افتادہ است

در غم افلاطون زیاد دانشت سرخوش بود ‏‏‏ ہمچو مجموعے کہ در فکر شراب افتادہ است

ذہن صافت تا علم گردید در دانشوری ‏‏‏ طبع افلاطون زبس در اضطراب افتادہ است

دفتر فرہنگ در چنگش مجزا گشتہ است ‏‏‏ از کفش مجموعۂ دانش در آب افتادہ است

آن بیاض خامۂ شاہی کہ در اطراف آن ‏‏‏ جاے افشان نقطہاے انتخاب افتادہ است

آن مرصع خوان گہر ریزی کہ باشد جلوہ گر ‏‏‏ دُرّ الفاظش پیے بآب و تاب افتادہ است

مآثر الکرام مین غلام علی آزاد بلگرامی، ملا سعید اشرف مازندرانی کے ذکر مین لکھتے ہین، کہ ایک بار زیب النساء بیگم نے استاد کی خدمت کے لیے ایک کنیز بھیجی، مگر ملا سعید اس سے خوش نہ رہ سکے، اور اسکی ہجو مین ایک قطعہ لکھکر زیب النساء بیگم کے پاس بھیجا۔ غلام علی آزاد نے اس قطعہ کا صرف پہلا مندرجہ ذیل شعر نقل کیا ہے،

قدر دانشور شناسا! لوز چشم عالما ‏‏‏ اے کہ ہرگز قدرت ہم چشمیت حور را نداشت

اس کے بعد وہ لکھتے ہین کہ اس ہجو مین ملا سعید نے کلام پاک کے الفاظ قاب قوسین او ادنیٰ کو بہت ہی فحش طریقہ پر استعمال کیا، مولانا شبلی مرحوم نے بھی اس واقعہ کو نقل کیا ہے لیکن ان کو تعجب ہے کہ ملا سعید نے اس قسم کی بے اعتدالی کی جرأت کس طرح کی کیونکہ شاہی بیگمات کے آداب اور زیب النساء کا زاہدانہ مذاق اس قسم کی جرأت کا متحمل نہین ہو سکتا تھا،

ملا سعید کو زیب النساء کی ملازمت مین جب کافی مدت گذر گئی، تو وطن واپس جانے کی تمنا ہوئی، اور رخصت کی درخواست ایک مدحیہ قصیدہ مین لکھکر دی، اس قصیدہ کے آخر مین لکھتے ہین :-

یکبارہ از وطن نتوان برگرفت دل ‏‏‏ در غربتم اگرچہ فزون است اعتبار

پیش تو قرب و بعد تفاوت نمی کند | گو خدمت حضور نباشد مرا شعار
نسبت چو باطنی است چہ دہلی چہ اصفہان | دل پیش تست تن چہ بکابل چہ قندھار

(ماثر الکرام ص ۱۱۶ جلد دوم)

ریاض الشعراء (قلمی نسخہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی) میں زیب النسا کی خدمت میں شاعرانہ معروضات کے سلسلے کا ایک اور واقعہ منقول ہے، نعمت خان عالی نے جو اس زمانہ کا ایک مشہور شاعر تھا، زیب النسا کے پاس ایک مرصع کلغی فروخت کے لیے بھیجی، زیب النسا نے اس کی قیمت بھیجنے میں دیر کی تو نعمت خان نے یہ رباعی لکھکر پیش کی،

اے بندگیت سعادت اختر من | در خدمت تو عیان شدہ جوہر من
گر جیغہ خریدنی است پس کو زر من | ور نیست خریدنی بزن بر سر من

اس رباعی کے صلہ میں زیب النسا بیگم نے پانچہزار روپے دلوائے، اور کلغی بھی واپس کردی، مولانا شبلی مرحوم نے بھی اس واقعہ کو خزانہ عامرہ سے نقل کیا ہے،

سنہ ۱۰۹ھ میں زیب النسا نے ابرک کا ایک بڑا خیمہ بنوایا جو تمام تر شیشہ کا معلوم ہوتا تھا، نعمت خان عالی نے اس کی تعریف میں ایک چھوٹی سی مثنوی کہی، اس کے کچھ اشعار مولانا شبلی نے اپنے مضمون زیب النسا میں بھی نقل کیے ہیں، (دیکھو مقالات شبلی جلد پنجم ص ۱۱۶) زیب النسا کے دربار کے شعر و شاعری کے اسی چرچے کی بنا پر مولانا شبلی لکھتے ہیں کہ عالمگیر کی خشک مزاجی سے شاعری اور شعرا کو جو نقصان پہنچا تھا اس کی تلافی زیب النسا کے حسن مذاق سے ہوگئی تھی،

اورنگزیب کی دوسری لڑکیان | اورنگزیب کی دوسری لڑکیون کا علم و ہنر زیب النسا کی علمی شہرت کے سامنے ماند پڑ گیا ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ زیب النسا کی طرح آسمان علم و ادب کی مہرو ماہ تو نہ بن سکیں، مگر مختلف قسم کے علوم و فنون سے آراستہ و پیراستہ تھیں، مآثر عالمگیری کے مولف

بیان ہے کہ اورنگزیب کی لڑکیوں میں زینت النساء بیگم نے بھی باپ کی توجہ اور فیض تربیت سے علمی کمالات حاصل کیے، وہ عقاید مذہبی، احکام دینی اور مسائل شرعی سے بخوبی واقف و آگاہ تھی، (مآثر عالمگیری ص ۵۳۹) "صبح گلشن" میں زینت النساء بیگم کا ذکر ایک شاعرہ کی حیثیت سے کیا ہے، مولف کے الفاظ یہ ہیں: (ص ۱۹۲-۱۹۱)

زینت النساء بیگم ہمشیرۂ زیب النساء بیگم از بنات اورنگزیب عالمگیر بادشاہ است عالمہ و شاعرہ و حافظ کلام اللہ بود، زینت المساجد بنا کردہ اش الی الآن در شہر شاہجہان آباد موجود و معمور و بر سنگ مزارش کہ در صحن ہمان مسجد ست این شعر خودش منقوش و منقور، ؎

مونس ما در لحد فضل خدا تنہا بس است　　سایۂ از ابر رحمت قبر پوش ما بس است

مآثر عالمگیری کے مولف کا بیان ہے کہ اورنگزیب کی لڑکی بدر النساء بیگم حفظ کلام اللہ کی سعادت اور علوم دینی کی تعلیم سے بہرہ ور ہوئی، اور ہمیشہ علم کے ساتھ عمل کو بھی ملحوظ رکھا، عالمگیر کی ایک دوسری لڑکی زبدۃ النساء بیگم کے بارے میں مولف مذکور لکھتا ہے کہ ہمیشہ طاعت و عبادت و تحصیل علم میں عمر بسر کی، اور ذخیرۂ سعادت فراہم کرتی رہی،

غلط نامہ بزم تیموریہ

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۵	۱۱	پیری	پیرزی	۳۷	۴	خواستہ شود	خواست شود
۶	۹	جابجا ذکر ہے	جا بجا ذکر کیا ہے	۳۹	۴	از ایجاز	ز ایجاز
۷	۱۸	پنج	پا پنج	"	۸	ابو الواجد	ابوالوجد
۱۹	۵	ز افعال	از افعال	۴۰	۵	مہمل	محمل
۲۷	۱۳	بنگرہ بہا	بنگر بہ بہا	"	۶	است کنون	رست کنون
۲۸	۱۷	ور دست اجل ہے	وز دست اجل ہے	۴۴	۴	سوانح حیات	سوانح عمری
۲۹	۱۳	نشینم	نشینیم	۴۵	۱۹	تین اوزتالیفات	دو او زتالیفات
۳۱	۱۴	وائے آنست	وئے آنکس	۴۸	۱	ہیئت	تو ہیئت
۳۳	۳	جبین تن	جبین من	۴۹	۵	مباحث	مباحثہ
"	۵	کمین	کمین	۵۳	۱۵	خوانی جو	خوانی نے جو
"	۱۳	ز مہوشے	از مہوشے	۵۶	۱۴	لکھ نہیں سکتا تھا	لکھ نہیں سکتا تھا!
۳۴	۴	غمزدہ است	غمزدہ ات	۵۸	۳	مجنون را	مجنون زار
"	۱۰	ایزد	ایزد	۶۰	۵	من یا ودلم	من یار دلم
"	۱۱	ہم سیرت ہم آنکہ	ہم سیرت آنکہ	۶۳	۱	جس سے	اس سے
"	"	ہم صورت آنکہ ترا	ہم صورت آنکہ او ترا	۸۶	۱۱	از اوسنے ملا	از اوسنے جو ملا
۳۵	۲	کرد دست	گرد دست	۹۹	۷	زین جامہ	زین خامہ

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱۰۰	۷	حیات آنی	حیات ثانی	۱۲۱	۵	بکشو وقفل	نکشو قفل
۱۰۱	۲	برورش	پرورش	؍؍	۲	عرق	غرق
؍؍	۱۵	محو	بحو	؍؍	؍؍	کزعیب	کزغیب
۱۰۳	۱۹	بسیارند	بسپارند	۱۲۲	۱۵	ہرکہ	ہرگہ
۱۰۸	۱۲	نشاندہی	نشاندۂ	۱۲۳	۷	نکرا پنے	نگروہ اپنے
۱۰۹	۱۰	این است	این نست	۱۳۶	۱۲	ولاسانامہ	ولاسانامہ در غایت محنففت
۱۱۰	۱۸	گرہی	گرمی	۱۴۳	۲	کروسے	گروسے
۱۱۰	۱۹	من دل بادل	من و دل بال	۱۵۳	۴	راوہاسے	زاد رہائے
۱۱۲	۱۴	خود چشانی	خودچشانی	۱۵۷	۱۸	خاک	کز خاک
۱۱۳	۲	طبقات اکبری جلد سوم	طبقات اکبری جلد دوم	۱۵۸	۱۱	کجکلاہی	کجکلاہے
۱۱۳	۴	از خاک	ز خاک	۱۶۱	۰	[illegible]	گر بصحرا
۱۱۷	۲	ساتھ اپنے ساتھ اپنے	ساتھ اپنے	[illegible]	۳	تذکرہ	[illegible]
۱۱۸	۸	یا فتم	پا فتم	۱۶۸	۱۳	گہرمی گفت	گہری سفت
؍؍	حاشیہ	جلد سوم	جلد دوم	۱۸۱	۱۲	نشانی	نشان
۱۱۹	۴	تحبتم	تجنتیم	۱۸۴	۱۱	حاکم اور	حاکم بنا کر
؍؍	۱۲	جلد سوم صـ۲۴۹	جلد سوم صـ۲۹۱	۱۸۵	۱۷	بیاران	یاران
۱۲۰	۱	جلد سوم صـ۲۱۸	جلد سوم صـ۲۹۸	۱۸۶	۸	حشم	چشم
؍؍	۵	تاریدھم	[illegible]	؍؍	؍؍	ہزوہ	ہژہ
؍؍	۱۰	نزد	چو نزد	۱۸۸	۱۲	نکرد	نگرد
؍؍	۱۹	وانکہ	زانکہ	۱۸۹	۴	ہ قرین	کامد قرین

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱۹۷	۱۱	شدت	شدست	۲۳۹	۱۰	مقربان سے سرفراز فرمایا	مقربان کے خطاب سے ممتاز فرماکر
۱۹۸	۱۹	ازچہ	ارچہ	۲۴۰	۱۳	لبعی	ربعی
۱۹۹	۳	شنید	سپند	۲۴۱	۴	سرچشمہ پھوٹا	دوسرچشمہ پھوٹا
〃	۴	کم وکاست	کم کاست	۲۵۰	۸	نالی معاوضہ	مالی معاوضہ
〃	۸	نشنید	نشنیند	۲۵۱	۲	جہانگیر	عالمگیر
〃	۱۱	پردلہا	تردلہا	۲۶۶	۷	زاری	رازی
۲۰۰	۱۱	این مصرعہ	این دو مصرعہ	۲۶۰	۱	دریاکنان	دریاکشان
۲۰۲	۱۱	زیرتسبیح	زہرتسبیح	〃	۱۲	محی الدین	محی الدیق
۲۰۴	۱۲	بزیان	بزبان	۲۶۲	۱۰	رکھ مطالعہ	رکھکر مطالعہ
〃	۱۳	پتان	بیان	۲۶۴	۱۹	حپشم	چشم
〃	۱۵	یدبلی	بدہلی	۲۶۵	۵	باب	باپ
〃	۱۶	گلشن	پہ گلشن	۲۶۶	۱۲	برہ	براہ
〃	۱۸	دبلی	دلی	۲۶۹	۶	لاس	بہ لاس
۲۰۵	۱۴	غزل کے شعر	غزل کے کچھ شعر	۲۸۳	۵	گرفت	ریخت
〃	۱۸	عرق	غرق	۲۸۷	۶	اس کے نظم ونثر	اس کی نظم ونثر
۲۱۱	۱۴	بڑی ورک حاصل تھا	بڑا درک حاصل تھا	۲۹۰	۶	جن میں	ان میں
۲۲۸	۸	یہ سعادت تیموری	یہ سعادت [illegible] کے	۳۱۲	۱۰	مہرسم	میرسیم
		بادشاہوں میں	تیموری بادشاہوں میں	〃	۱۱	میاذر	میازار
۲۳۰	۱۱	مصنف لکھ کر بھیجا	مصنف لکھ کر	۳۱۵	۱۶	چلے تھے	چلے تھا
			مدینہ منورہ بھیجا	〃	۱۸	مزے	مزے میں

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۳۲۹	۱۸	شرارہ	شرر	۳۶۶	۱۱	میرا	میر
۳۳۱	۴	آنسو ہے جو	آنسو جو	۳۶۷	۱	پنہا	پنہان
"	۱۰	آہین	آہن	۳۶۹	۶	زنگ سرخ	سنگ سرخ
۳۳۵	۳	نہ ہے	نے	۳۷۱	۱۰	ساغرسے	ساغرے
۳۳۷	۱	شکوے	شکوے سے	"	۱۵	کل	گُل
"	۲	ہے تو پھر	ہے پھر	۳۷۲	۱۶	زینا کہ	زینانکہ
۳۳۸	۹	یا آئین	یان آئین	۳۷۷	۱۳	پژہ اسی	بزداسی
۳۴۲	۱۲	وہی	وہ ہی	۳۷۸	۶	بکشا ید	نکشا ید
۳۴۴	۱۰	خواب تھا	یہ خواب تھا	۳۸۲	۱۳	دیدہ است	دید است
۳۴۷	۸	عاشق !	عاشقو	۳۸۴	۴	نیاخت	نباخت
۳۵۵	۱۴	بھرے	پھرے	"	۱۷	ششے	شبے
۳۵۶	۵	نکلنے ہین	نکلے ہے	"	۱۸	اثہ	ابد
"	۹	ماریہ	مار سیہ	۳۹۳	۱۳	اس	اس کے ویران
"	۱۸	اس	اوس (یعنی شبنم)	"	۱۸	ناکشش	تاکشش
۳۵۷	۸	دل اوپر	دل آویز	۳۹۶	۲	دستور لفصحار	دستور الفصحار
"	۱۴	دھوکے	دھوکے گہ	۴۰۱	۱۹	کھایا	دکھایا
۳۶۰	۳	نگاہین ہین	نگاہین بھی سحر ہین	۴۱۲	۳	عاقل	غافل
"	"	سرمہ	سرمہ کی	۴۱۳	۲	کہنا اور	کہتا اور
"	۲۰	مشکل بندی	مشکل پسندی	۴۱۶	حاشیہ	لکھا ہی مرقوم ہے	مرقوم ہے
۳۶۲	۲	کہتے تھے	یہی کہتے تھے	۴۴۸	۱۳	ثبیب	ثبت
۳۶۳	۵	چھونڈ دون	چھوڑ دون	صفحہ ۴۳۴ کے بعد ۴۲۸، ۴۲۹ اور ۴۲۹ کے بجاے ۴۳۸ الخ			
۳۶۴	۱۹	دلی	کیا دل	۴۲۹		ہونے	چاہئین

تاریخ ہند وسیری کتابیں

مقدمۂ رقعاتِ عالمگیر

اس مین رقعات پر مختلف حیثیتون سے تبصرہ کیا گیا ہی جس سے اسلامی فنِ انشار اور شاہانہ مراسلات کی تاریخ، ہندوستان کے صیغۂ انشا کے اصول نہایت تفصیل سے معلوم ہوتے ہین، اور خود عالمگیر کے انشار اور اس کی تاریخ کے ماخذ اور عالمگیر کی ولادت سے برادرانہ جنگ تک کے تمام واقعات و سوانح پر خود ان خطوط و رقعات کی روشنی مین تنقیدی بحث کی گئی ہی قیمت للعہ، حجم، ۳۹ صفحے،

(از سید نجیب اشرف ندوی)

رقعاتِ عالمگیر

اورنگ زیب عالمگیر کے خطوط و رقعات، جو زمانہ شہزادگی سے برادرانہ جنگ تک اعزہ کے نام لکھے گئے ہین، اس جلد مین جمع کیے گئے ہین، اور اُن سے علم ادب، سیاست اور تاریخ کے بیسیون حقائق کا انکشاف ہوتا ہے، قیمت: عہ ر ۴۰۰ صفحے، (مرتبہ سید نجیب اشرف ندوی)

تاریخ سندھ

اس مین سندھ کا جغرافیہ، اسلامی فتوحات کے مفصل حالات، خلافتِ راشدہ کے زمانہ سے لے کر آٹھوین صدی ہجری تک کی حکومتون کی پوری تاریخ، اور اُن کے نظام حکومت، علمی و تمدنی حالات اور رفاہ عام کے جو جو کام انجام پائے، ان سب کی پوری تفصیل ہے، (مؤلفہ مولانا سید ابوظفر ندوی) قیمت:- چھ روپئے،

ضخامت:- ۴۰۰ صفحے،

"منیجر"

([illegible])